

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینس چٹا جھنڈ

ماہنامہ

اپریل 2013

نمبر 1

مجلد اول

LuraTech

www.luratech.com

گاؤں کے جس زندہ ماحول
میں سب جاب آسمان کا شاخشاہ

شاخشاہ
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
155

آپ کے آہوں کی گنگ ننگ
تیرا بندہ آپ کے ذوق کا آہنگ

مختار چیمبر
قاریین
152

ڈاکٹر شہیر شاہ
211

ناصر ملک
168

شہر آباد کی بھول
211

میرزا ارچ
168

شہر آباد کی بھول
211

میرزا ارچ
168

شاخشاہ
221

میرزا ارچ
168

شاخشاہ
221

میرزا ارچ
168

شاخشاہ
221

میرزا ارچ
168

سپین کی شہر آباد کی بھول
میں سب جاب آسمان کا شاخشاہ

شاخشاہ
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
155

آپ کے آہوں کی گنگ ننگ
تیرا بندہ آپ کے ذوق کا آہنگ

مختار چیمبر
قاریین
152

ڈاکٹر شہیر شاہ
211

ناصر ملک
168

شہر آباد کی بھول
211

میرزا ارچ
168

شاخشاہ
221

میرزا ارچ
168

شاخشاہ
221

میرزا ارچ
168

شاخشاہ
221

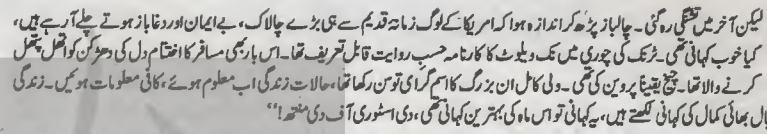
میرزا ارچ
168

اندازہ

جو سماج افلاس اور جہالت کے دردناک عذاب میں مبتلا ہو وہ زندگی کا کوئی صحت مند خواب نہیں دیکھ سکتا اور نہ شاید اس کا حق ہی رکھتا ہے۔ ہم بار بار تعمیر و ترقی کا ذکر کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ تعمیر و ترقی کی باتیں اسی قوم کو زب دیتی ہیں جو معاشی استحکام اور تعلیمی ترقی کے ایک خاص نقطے تک پہنچ چکی ہو۔ اس سے پہلے تعمیر و ترقی کے امکانات پر غور کرنا دماغی معاشی اور ذہنی بدکاری کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ہم قومی حیثیت سے افلاس اور جہالت کے جس نقطے پر کھڑے ہیں۔ وہاں سے تعمیر و ترقی کی منزل اتنی دور ہے، اتنی دور ہے کہ اس کے بارے میں سوچنا بھی اپنے آپ کو بہت غلطی اور بڑوں ہمتی کے آزار میں مبتلا کرنا ہے۔ ہم اپنی اس پسماندگی اور ماندگی کے سلسلے میں قابل ملامت بھی ہیں قابل رحم بھی اور ایک حد تک قابل معافی بھی کیونکہ ہماری موجودہ زندگی کے پس منظر میں صرف غلامی ہی کی ایک صدی نہیں، سماجی، اخلاقی، معاشی اور تعلیمی انحطاط کی بھی کئی صدیاں شامل ہیں اور ہمیں ماضی کے اس زبردست نقصان کی غلامی کے لیے جو مہلت ملی ہے وہ یقیناً بہت مختصر ہے اور اسی مختصر مہلت میں ہمیں صدیوں انسانوں کے قرضے چکانا ہیں لیکن اس معقول عذر کے باوجود ہم اپنی غیر ذمے داریوں کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے۔ یہ عذر صرف اسی صورت میں قابل سماعت تھا جب ہم نے اپنے فرائض کو پوری طرح ادا کیا ہوتا، اصلاح حال کے لیے ہر وہ کوشش کی ہوتی جو ممکن تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ یہی نہیں بلکہ قوم کے بعض طبقوں نے تو اس نازک دور میں وہ طرز عمل اختیار کیا اور اختیار کیے ہوئے ہیں جس کو سہہ لینا ایک، پس ماندہ اور پریشان حال قوم کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

اس موقع پر کس کس سے مواخذہ کیا جائے۔ کس کس کا نام لیا جائے کہ یہ سیاہ نامہ بہت طویل الذیل ہے مگر ایک خاص طبقے کا ذکر کیے بغیر چارہ بھی نہیں۔ ہمارا اشارہ قوم کے دولت مند طبقے کی طرف ہے ہمارے اس رعایت یافتہ اور برگزیدہ طبقے نے آزادی کے بعد جس مجنونانہ اور مجرمانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال نہیں مل سکتی، ان حضرات نے لکھ بیتی سے کروڑ بیتی بننے کی جوشان دار ہر محوڑے ہی عرصے میں سر کر لی ہے اسے دوسرے شاید صدیوں میں بھی نہیں کر سکتے، پاکستان میں اگر کسی طبقے نے اپنی غیر معمولی اور قابل رشک صلاحیتوں سے دنیا کو مہبوت کر ڈالا ہے تو وہ یہی طبقہ ہے اس کی موجودگی میں جو لوگ علمی و ادبی تہذیبی اور سماجی میدانوں میں پاکستانی قوم کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ غلطی پر ہیں اور انہیں اس ہونہار قوم کا کوئی عرفان حاصل نہیں۔ اگر اس قوم کی استعداد اور کارکردگی کا اندازہ لگانا ہے تو اس کے لیے دولت غنی اور منفعت اندوزی کے شعبے کا انتخاب کرنا چاہیے کہ یہی تو ایک شعبہ ہے جس میں ہماری قوم نے حیران کن فتوحات انجام دی ہیں اور عجیب العقول مجتہدے دکھائے ہیں۔ سماج کا یہی وہ ادارہ ہے جس کے حوصلہ مند نمائندوں نے ایک ایک رات میں سبجز مینوں سے گلے اگائے ہیں اور ایک ایک دن میں دولت و ثروت کی فصلیں کاٹی ہیں۔ یہ بات انہی لوگوں نے ثابت کی کہ آزادی ایک نعمت ہے اور غلامی ایک لعنت اگر یہ ارجمندان دولت نہ ہوتے تو پاکستان میں کوئی بھی آزادی کی نعمتوں اور برکتوں کا قائل نہ ہوتا۔ ہمیں اس موقع پر عبارت آرائی کا شکار نہیں ہونا چاہیے، ہمارا فرض ہے کہ اس ضمن میں پوری متانت اور جھنجیڈی سے کام لیں، اس گروہ نے سماج کی صحت مند قدروں کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ یہ لوگ ”زرگر“ اور زر پرستی کے علاوہ کوئی قدر نہیں مانتے۔ ان کا صرف ایک نصب العین ہے یعنی دولت کھینچنا قوم بہنم میں جائے۔ انہیں تو اپنے کام سے کام ہے۔ زندگی میں ان کا سب سے بڑا ہتھیار دولت ہے اور سب سے مضبوط ہتھیار جہالت۔ ان کے نزدیک تعمیر و ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ کوششوں کے نئے نئے ذریعہ انہوں اور کاروں کے نئے نئے ماڈلوں کے ذریعے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی جائے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ پاکستان کی فاقہ کشی فلاکت زدہ اور در ماندہ قوم ان مجنونانہ حرکات اور مجرمانہ رجحانات کی آخر کہاں تک متحمل ہو سکتی ہے۔ واقعی ہمیں اپنی قوت برداشت کا اندازہ لگانا چاہیے۔

[illegible]

۱۸۷۲ء برادر وارث سندیلے نوالی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ "ماہِ راج" کا شمار 20 فروری کی صبح کا لہری پوری ملوہ نیری ورحٹالی سمیت ایک خوش سلسلے سے ملا اور دل خوش ہو گیا۔ محفل میں حصہ لے بائی تو کرسیِ مہمانت پر پا کر مبارکباد دینے کو دل چاہا۔ آپ نے آغا فرید کے متعلق چچا۔ آغا بی نے بھی، آغا فرید کو بہت کثرت سے ہوں لیکن ہاتھیں دو ہاں کھائے گئے ہیں۔ سارہ آپ کی چڑیوں کی بات پر خوش ہوئیں تو ذرا کھلنے کے حین کی نکالیں بھی لیں۔ بہر حال باقی سب کے خطوط اچھے تھے۔ اسرار مسافر سے کیا لیکن چچاں ملک صاحب کیوں اتنا استہجیل رہے ہیں سوائے غزالہ کے۔ فرید خان کے اور کوئی بات چچ کی نہ تھی۔ آخری صفحات پر بھی کہانی پڑھی، پسند آئی لیکن پھر رائزے کے گزارش سے کاب پرین میرو والی اور کینرو والی "قدیم" کے بارے میں بھی اور ناولوں میں بھی۔ سب سے زیادہ جس کہانی نے متاثر کیا وہ "مجموعہ انیمالے راحت کی" "قدیم" کا تھا۔ ہر گل نے کیا صاحب کا انتقام لیا، کسی کے بارے میں بھی نہ سوا چچ کہتے ہیں کہ گورنر کا انتقام اٹھا ہوتا ہے۔ بہت خوب صورت اور اسٹوری آف دی ٹی۔ طاہر علی مغفل کی نشا نہ اور کاشف ذہیر کی کہانیاں بھی نے حد پسند آئیں۔"

ایم ازم علی گور جانی، دابل، ملیر راجن پور سے... بجھلے ٹائز پر تیرے کے ساتھ حاضر کی دے رہے ہیں بہت عرصے سے کسکے
لیکن خطا بیچنے کی جرات نہجی بار کار ہوں (خوش آمدید) بے پیل تو بات کرتے ہیں ناصر ملک صاحب کی کہانی مسافری، جج پوچھ کر اے پڑ
حزینہ بے چاری کیوتڑ کی جڑ کی کوئی کچھ جھوٹے یاد دہانی میں بارہا میں ڈاکٹر سجاد احمد صاحب کی سو دیاں بہت اچھی کی سکھوں کے بھی رخ
بے لگتا ہے، اختتام کے قریب ہے، لیکن خدا ماسفر کو بھی سے دشمنان مرتد کیجیے کہ محفل مشروح حسن نورالامان، جسر عمران کو سدھاتیل
اللہ بھی کے اشعار زیست کے کجبار ہے اپنی اسی مثال آپ تھے آشوب وہا کا دوسرا اور آخری حصہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ فیملی کہانیاں اچھا تاثر نہیں
تھیال سے دعا ہے کہ ہمارے سامہی مران حیدر بلوچ کے شفاغے کا مطالعہ فرمائے اور سٹپس کو مزید تری دے۔ (آمین)

توصیف احمد، بھان کائی، ہر کاجی سے محفل کی زینت ہے ہیں۔ تاریخ کا شمار 16 تاریخ کو لاہور کے ایک تہرہ سردی کو چھوڑ کر سید نے محفل پہنچ گئے لیکن کیا..... آپ نے خواتین کو نام و نشان نہیں تھا۔ بہر حال..... یوموں کے ساتھ خطوط کا مطالعہ شروع کیا۔ طاہرہ یاسمین کے خواب پر بھی رازے کا ایک اہم فرحت بخش ہوا کے جوئے کے ساتھ مل گیا۔ کیونکہ 28 دوستوں کی محفل میں صرف طاہرہ یاسمین نے مجھے دیکھا تھا۔ طاہرہ یاسمین نے یہ بھی کہا کہ اس صبح میں سید نے بھائی صاحبہ ہالہ ایمان کی بھی بھانڈی کو لے کر تہہ قریب مشکل ہو جائے گا کہنے سے لوگوں کے لیے اس کی سب سے آگے آ کر ارادہ ماریہ فاقہ کو ٹیوشن پڑھانے کا کہیں گے۔ سارہ جی آپ نے، جہاں چھینٹی ہوئی آٹھ چھوٹی چھوٹی کاکڑ کیا تھا۔ لہجے..... اس تہہ

آپ نے اپنی سانگرہ کی تفصیلی تاریخ تو لکھی لیکن یہ نہیں لکھا کہ کون کی ویں سانگرہ ہے۔ کہیں آپ تصویر اُٹھانے کی داذی تو ہیں جس کو آکر لہری لے کر 500 صدیاں گزر رہی ہیں۔ افسانہ خوان توحیدی صاحب اللہ تعالیٰ آپ کے بھانجے کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آئین) حافظ محمد رفان سرگودھا، کیا آپ حافظ محمد اجمل کو جانتے ہیں؟ ہاں میں مصید آپ نے اپنے نام کے ساتھ راج گنڈا کیس چھوڑ دیا۔ حالانکہ آپ بچ بچ کے راج میں کیونکہ نفل ابراہن کے تقریباً ہر دوست کے تیسرے میں آپ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس بات پر خاص میں عادل شاہ کا سامنا ہوا۔ واقعی شعل بیانی اور عاجزی طبیعت میں استحصال ہوتو بہت سی مشکلات شروع ہونے سے قبل ہی مل جواتی ہیں۔ مثلاً ہر میں عینینہ یکم اور دوسری اچھی خاصی مانگ پر بیگ صاحب نے بانی بھیم دیاورا اور طوم افسانہ جو کسی ماہر شری رشا کا طرح حسرت کی کہری کمانی سے نکلا۔ باہر کیا اور ثابت ہو گیا کہ سودیو تانیکہ یا سورو ہے جس سے ہر مسلمان کو بچنا چاہیے۔ ظاہر غافل میں کی تشناہ میں ڈی ایس بی ہر فرازا کی مہارت نے یاسم کے شوہر ناصر کی جان لی۔ لی۔ کنزوں میں صفحہ 51 پر ماہا ایمان نے کچھ پختہ چٹانے کی خوش گہمی کی جگہ بیکل شروخ میں اور دس افسانہ اور ظاہر ہا کہیں کا انتخاب نہ درست تھا۔“ (اب تو آپ خوش ہوں!)

[illegible]

✽ احسان سحر زبانی خیلانوالہ، امانوالی سے تعلق رکھتے ہیں۔ سال کا تیسرا شمارہ 6 فروری کو نفاذ میں نیا۔ چینی سے کیا گیا..... ہاتھ کو کد کر کے
 سارا مڑا ہوا ہو گیا..... بے رونق چہرے والے میں منقب نازک ہاتھ کاٹل پر جلوہ گر تھی۔ سجدہ بخاری..... آخر کمال کو بے چاریوں پر رحم آیا۔ گہا کیا۔ مارا کہ ہوا یک صدی کے
 لیے..... خوشبو کی طرح سحر اسامبرہ اچھا لگا..... قیصر بھائی اونٹ کی انسلٹ مت کر دیجئے..... وہاں لوگ سے تو خوبصورت ہے، خاص کر اس کے ہونٹ..... جھجھج جاوے
 بہت شکریہ..... پلوئو کے قطرے جہاں لوں حید پر کسی کی جان بچاتے اور منت میں خوش ہوئے نظر آئے..... اے میرے میں تو اپنا بھی نظر نہیں آتا..... قدرت اللہ
 نفاذی اور ڈاکٹر صاحب کی محبت کوئی..... ہوائی دوستوں کے سحر سے دور جو ایک آؤٹ ہونے ان سے کڑا کرش ہے کہ نگہ رو بھائی کی کہانیوں کا آغاز
 ڈاکٹر صاحب کی وارث سے کیا..... ہوا، شاہ، ہوتے اچھا لگا کرش کی ایک اور اور جگہ پڑ کر..... لیکن اب دور بیت ہو گئے ہیں..... سناؤں پر منتقل تھے
 پڑ کر ڈاکٹر صاحب سے کڑا کرش ہے کہ محبت کے حوالے سے تم کبھی..... ایم اے راجت بھی آتے ہیں کمال کی ہوتے ہیں بہت خوبصورت کر آپ کے
 ابتدائی بول دل خوش کرتے ہیں، خوشبو میں ڈھلے ہوئے دل میں اتر جاتے ہیں..... مشکل، اچھی اور سچ جادری سے بیلز لیا لائن..... سنوڈری کو کہے گا سس..... چہا
 ہے..... کم نصیب میں کشف میرے اس دفعہ مختلف انداز میں حاضر ہوئے..... مارنے نے وفاقی ہے تو فی دھما کر ایک اچھا موقع چھوڑ دیا..... دفن..... وسیلہ راج
 میں پر کسی دفعہ پڑا..... ہے لیکن ہر دفعہ مختلف انداز میں لکھا گیا ہے..... آخری صفحات پر ابراہیم اقبال صاحب آئے اور چھوٹے عجیب و غریب موضوع اور عجیب و غریب
 کہانی شاعری کا کردار تو ہر اسرار ہر ساتھ اس کے پاس اتنی بڑی دولت تھی ان کی بات لگی..... کافی کچھ پر دے میں چلا گیا..... ٹرس کا ہر اسرار کردار کافی زیادہ جرت

ہوڈاکٹر جعفر علی، ملتان سے لکھتے ہیں، "سپتس پچھلے دن سال سے میرا ہنسدیہ باہتمام ہے جبکہ اس کی عمر چالیس سے اوپر ہے۔ مرزا امجد بیگ کے تھے، ہنگول اور مسافر جب تک نہ پڑھوں، نہیں آتا۔ محی الدین نواب، احمد اقبال، کاشف زبیر، انج اقبال اور طاہر جاوید فاضل میرے ہنسدیہ مصنف ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ سپتس کی جوائی کے تھے بھی کہیں سے مل جائیں۔ چالیس بیالیس سال بہت ہوئے ہیں۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ پرانی قسط اور ادوار مکمل کر لیا جائے؟ آپ دوبارہ چھپنا شروع کریں تاکہ مجھ جیسے نئے پندرہ سال پرانے قارئین بھی ان شاہکاروں سے لطف اندوز ہو سکیں" (آپ کا خط مہمان نے اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دیا۔ اس بارے میں کاہلیگا ہے قارئین امر اصرار کرتے رہے ہیں جس کا تذکرہ مضاف کیا جاتا رہا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ وہ اس بارے میں اب کیا کہتے ہیں)



ہوئی کہانی پڑھ کر اور ایک تک حیران بیٹھا ہوں کہ کیا حقیقی زندگی میں بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ ولی کامل ایمان افراد سلسلہ جسے پڑھتے ہی خوشگوار بات اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔ شعر سب اچھے لگے مجموعی طور پر سہنس اچھا لگا بلکہ بہت ہی اچھا۔“

✽ ظفر علی، حیدرآباد سے تیسرا دور کر رہے ہیں، ”راج کا شمار میرے ہاتھ میں ہے۔ سب سے پہلے تو میں نے مسافر پر ہی جس کا بڑا انتظار تھا پھر دوسری کہانیاں۔ نامرکب نے بڑا ہی شاعرانہ کردار تخلیق کیا ہے۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ شیرے اور خلیہ میڈم کا ساتھ بہت دلچسپ۔ شکل و کلی کا بھی کیا ہے۔ تک ولیٹ کی کہانی اس دفعہ بہت اچھی ہے۔ آخری کہانی بھی بہت اچھی ہے۔ امید ہے کہ آنسو دہی کی طرح سے ابھی کہانیاں کا مجموعہ شائع ہوتا رہے گا۔ مسافر میں نامرکب صاحب نے میڈم خلیہ سے شیرے کو شوہر بنوادیا اور ایک عورت کا اس انداز میں شوہر تسلیم کرنا بہت ہی اہم ہے کہ وہ جس دنیا کی عورت ہے اس میں جھوٹ پرانا کوئی مایوسی بات نہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ اس کی ولی کا آواز ہے اور لکھنے والے کا خیال۔“

✽ ساحرہ راجا، ہمدان، ہمدان سے تیسرا دور کر رہے ہیں، ”سلسلہ دو تین ماہ خط ایک لکھ لکھ کر آپ سے شکوہ کروں گی تو آپ ڈاک سسٹم کو لازم دین گے سو میں ایسا کون نہیں کہوں گی۔ اتنی دور اور مشکل سے خط نام پر ہی پوسٹ کروا جاتا ہے لیکن پھر بھی بلکہ لکھ لکھ میں ہوتا ہوا آنسو دہی آنسو دہی نہ لکھنے کے بارے میں ہی سوچتا ہے (ارے ایسا غلطی سے بھی مت سوچو گا) اب خط لکھنے کی دودھ نہیں ہیں۔ اس لیے راج کا سہنس آنے سے پہلے ہی میں خط پوسٹ کر دیا ہوں۔ سب سے پہلے تو عمران حیدر بلوچ کی محنت کے بارے میں پوچھنا چاہوں گی کہ اب وہ کیسے ہیں؟ عمران حیدر صاحب جلدی سے محنت یا بوب کو مکمل کر دیتے ہیں۔ دوسرا میں نے کچھ سے پہلے پھر تحریریں بنام پر اساریت نثار شاد اور چالاک بھگوانی کی تھیں لیکن نثار شاد وہ شاعر وہ ہیں نہ یہ پتلا کراں کے ساتھ کیا جانتی؟ (کی لیال ان کا نمبر نہیں آتا..... وقت آئے پر پڑ لیا جائے گا) اگر وہ ناقابل اشاعت ہیں تو انہیں ضائع کرنے کے بجائے واپس ارسال کر دیں۔ جواب ضرور دیجئے گا۔“

✽ حسنین ہاشمی، سینٹرل جنرل گورنمنٹ سے تیسرا دور کر رہے ہیں۔ ”میں تقریباً چار ماہ سے کوشش کر رہا ہوں، خط لکھوں یا نہیں لکھوں وہ شائع کریں یا نہ کریں۔ پھر میں نے دل سے پوچھا۔ دل نے کہا حسنین ہاشمی خط لکھنا مشکل بہت اچھے ہیں ہمارے لیڈر کو بھڑکی ہی جگہ ضرور دیں گے۔ پہلی دفعہ میں نے سہنس پڑھا پھر جب تک ہم پڑھنے لکھیں دل تو اڑھیں آتا۔ ہم بتاتے ہیں گورنمنٹ میں دوسال بیت گئے ہیں۔ 302 کا کیس عدالت میں زیر سماعت ہے ہم بے گناہ ہیں۔ جج صاحب تقریباً 5 ماہ سے غائب ہیں۔ دیکھا صاحبان آئے روز پتلا کرتے رہتے ہیں۔ اللہ کرے کہ ہم ایک ماہ بے گناہ اور جیل میں آئیں انہیں پتال چال جائے کہ پتلا نہیں چلے گا۔ میرے کیس کا جلدی میرے ماموں کا بیٹا ہے اس کے بھائی مل گئے ہیں۔ آپ آج سب میں بیٹھیں ہیں پتھنیک لوگ کرا رہے ہیں، دعا کرنا اللہ کرے جلدی میں صبح جائے۔ جنرل ایک دفعہ گرفتار ہے ہمارا دعا ہے کہ کوئی انسان نہ لے جنرل میں انسان کی ذمہ داری۔ مال باپ کا کیس ہی بیٹا ہوں۔ میں اس دنیا میں نہیں ہے دعا کرنا اللہ تعالیٰ کی کوکت میں اپنی مقام عطا فرمائے، دعا کرنا وہ جلدی جلدی میں آج بھی مل گئے ہیں۔ سہنس سب سے پہلے پھر شمع دہی میں انجمن تارکاز کا شعر بہت اچھا لگا۔ اس کے بعد سارا صاحب کا شعر بھی نہیں تھا۔ حد ہے بخاری کی بات ہی چھوڑ دو۔ مسافر اور شکل ہر بات ہی خوب صورت تھی۔ چالانہ پتلا زراؤ کی کوشش ابھی مل گئی۔ وارث ابھی زیر مطالعہ ہے۔ محفل یاروں میں جب دیکھا سحر یہ بخاری کو صدارت کی کرسی پر بٹھوئے پوسٹ رضا لگائی صاحب یاد آئے۔ ساتھ میں بیٹھے باامدور تین تار صاحب بھی کسارے ہیں۔ یہی آپ کو بہت بہت مبارک۔ ماہا ایمان آپ کا تیسرا دور کر رہا ہے۔ آپ کے تیسرے میں شیریں رحمان اور شیخ رشیدی جملہ نظر آتی ہے۔ آپ تیسرا دور کو اختیار یا دہی کرتی ہو۔ اگر برا لگا ہو تو فخر دے فیصلہ پڑ لکھنا کیونکہ وہ شرف آ رہی ہے۔ حافظ شاد صاحب بہت اچھے قاری ہیں لیکن وہ کوشش کر رہے ہیں مرزا غالب، ڈاکٹر طاہر القادری اسلام آباد دھرنا صاحب بن رہے ہیں۔ کچھ لوگ بہن بھائی کے رشتے سے کتراتے کیوں ہیں۔ بہن بننا پتلا نہیں کرتے۔ شاید بہن کی ذولی اٹھانے سے سڑتے ہوں یا ماموں بھنے سے کتراتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صلہ میر، برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ سہنس کو دل دینی اور رات چمکی تری عطا فرمائے۔“

✽ حافظ شاد عمران، سینٹرل جنرل گورنمنٹ سے تیسرا دور کر رہے ہیں۔ ”سب معمول ڈانچٹ 22 فردی کو چاند کی طرح چمکنا ہوا جنرل کی کال کھریوں میں آچکا تو خوشی کی انتہا ہی نہ رہی۔ محفل پر نظر پڑی تو حیدر پشاور میں بھی نظر آئی۔ جس کی پریشانی بتاتی تھی کہ ہمارے ملک کی صورت حال دن بدن بگڑتی جا رہی ہے۔ انفرس ملک اس وقت اپنے نازک ترین دور سے گزر رہا ہے۔ اللہ اس کو ہمیشہ سلامت رکھے (آمین) انٹرنیشنل میں جن ایمانیہ مسلمانوں کو ان کا گزرا ہوا سہنس کی دور یاد دلایا اور پھر پتلا کرنے کی کوشش کی۔ 23 مارچ 1940 کو اردو پاکستان تاریخ کا ایک اہم دن ہے تمام پاکستانیوں کو پوچھنا اردو مبارک ہو۔ جب محفل یاروں میں پہنچے تو حیدر ان کے کوشش سے پہلے ہی سحر یہ بخاری نے صدارت کو کراں کی کرسی صدارت پر خود قبضہ کر لیا (ڈیر ساری مبارک) اس دفعہ سحر یہی نے ماہا ایمان کو خوب لٹا دیا۔ جس پر اے فیصلہ بہت ہی خوش نظر آ رہے ہوں گے۔ طاہرہ یا سہنس شرکے کا خط شائع ہونے کی صورت میں آپ کی پریشانی ختم ہوگی۔ سرگودھا جنرل والو، سناؤ سے ہو آپ؟ حافظہ قان صاحب اللہ آپ کی تمام پریشانیوں دور فرمائے۔ عقوداؤں کا طہار اس دفعہ رحمان ملک بچنے بیٹھے نظر آئے (تھو ہولا کوئی) سب سے پہلے اپنی پند یہ کہانی مسافر پر پہنچے گی کیا بات ہے مسافر کی۔ کہانی بہت ہی بلند جا رہی ہے۔ اب تو میڈم خلیہ نے شہر یا راکو کیلئے ہی اپنے سخن پر گاؤں بھی دے دیے۔ شہر یا راکو جنہوں کے نتیجے میں جس جگہ ہے اس کے بعد شکل و کلی پڑی۔ کہانی بہت ہی پور جا رہی ہے۔ اس میں سوائے زمانی روزش کے کچھ بھی نہ تھا۔ ڈاکٹر ساجد احمد کے گم سے لگی ہوئی وارث، تاریخی کہانی بہت ہی پند آتی ہے۔ طاہرہ یا دہی کی نشا دہن کہانی بھی۔ منجھا ہوا فرد شک کی چوری میں لوگوں کی چالانہ یا سائے آئیں۔ ولی کامل نے ایمان کا تیسرا دور محفل شمع دہی میں طالب حسنین اور جنرل چھٹے کے شعر بہت ہی پند آئے۔ اس کے علاوہ باقی تمام اشعار بھی بہت اچھے تھے۔“

✽ عاصم اقبال، حیدرآباد، ڈسٹرکٹ جنرل، ہمدان سے تیسرا دور کر رہے ہیں، ”اس ماہ کا سہنس بڑی کوشش سے 22 تاریخ کو جنرل میں انجمن ہوا اور اسے دیکھ کے دل خوش ہو گیا۔ محفل پر دھندلے ہاتھ لگائے گالوں پر رکھ کر کرسی گھری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سحر یہ بخاری کو بہت بہت مبارک باد اس کی زیادہ دیر تک نہیں رہی خیال ہے۔ بیٹھے اور اورد بھی صاحب کی شکل بہت ہی جیت جا رہی ہے اس میں ہم قیدیوں کو بہت کچھ کہتے کہتا ہے۔ نامرکب کی مسافر تو میں



مسافر ہی ہوتی جا رہی ہے۔ نامرکب صاحب اس میں کچھ تکبہ کیا ہیں۔ باقی کہانیاں میں چالانہ، شمس انجمن کا مطالعہ کر دلوں کہانیاں کا اپنا اپنا مزہ تھا بس انکی کہانیاں سہنس کی روٹی ہیں اور ہمارا جنرل میں وقت بھی اچھا گزرتا ہے۔ ہمارا دوست عمران حیدر بلوچ جو سناٹا سموت کا قیدی ہے ہمارے ساتھ سزا کاٹ رہا ہے، دعا کریں کہ اس موڈی باری سے اللہ پاک اس کو نجات دیں۔ باقی بی بی طاہرہ، حبیب احمد اور ہمارا قیدی بھائی حافظ شاد عمران جو گورنمنٹ جنرل میں ہے ان کے تیسرے بہت اچھے تھے۔ سارا راجی شاد عمران، ملک قیسر رحمان اور طاہرہ یا سہنس کے اشعار دل کو لگے۔“

✽ قیسر رحمان، ڈسٹرکٹ جنرل، ہمدان سے تیسرا دور کر رہے ہیں، ”اس ماہ کا شمار 20 فردی کو کیل کیا۔ جون اگل کا انٹرنیٹ سرری دیکھا جو کوئی ننذا کیسا بتا رہے تھے۔ بہر حال ہمارے ملک کے حالات اللہ رب العزت بتائیں کب بہتر کرے گا۔ بتائیں ہمارے ملک کو کسی کی نظر کی اور ہمارے عمران کب کوئی لائوٹل اختیار کریں گے کہ ایڈورڈا دکا واقعہ پیش نہ آئے۔ اس دفعہ کرسی صدارت پر بہنیں سحر یہ بخاری کو براہمن یا پتھنیک کیوں کی ولی خواہش بھی پوری ہوئی۔ بھائی قیسر اگل کچھ دعاؤں میں یاد رکھنے کا شعر ہے۔ بیما حبیب احمد (کرک) ساگر ایڈوائس میں مبارک، باقی فخر نہ کریں محنت پر برا اثر ڈالنا ہے۔ بھائی حافظ شاد عمران سینٹرل جنرل گورنمنٹ اللہ کے کرم سے میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ سب بھائیوں کے لیے بھی دعا گو ہوں اور بیما عمران حیدر رخت پیار ہے اس کے کردارے خراب ہوئے ہیں اس لیے بھی وہ جنرل کے اسپتال اور بھی باہر کے اسپتال میں ہوتا ہے۔ باقی مارے فاروق نے ایک تیسرے دو شکار کیے کر لے؟ بھائی قیسر خراج کو کرسی کر لیا آپ نے سہنس کی ایڈوائس بلکہ کروانی ہے جو ہر ماہ کی 15 تاریخ کو ہی آپ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ بیما رمضان پاشا آپ کی تلاش کہاں تک پہنچی؟ بہنیں طاہرہ مگر آپ نے پوچھا کوئی لڑکی کو بھائی کیوں نہیں بتاتی۔ میں بتا دوں۔ پراگھی تھیں ایسا نہ ہو برابر براتنا جائیں؟ اور مال ساگر ماہی سے ایڈوائس میں مبارک۔ برابر ہاتھوں آپ کا تجزیہ دل کو لکھتے ہے کچھ بھی تو سچیں کہ بہنیں بھائی کا رشتہ تکلف ہوتا ہے۔ برابر حافظ محمد عرفان اللہ رب العزت آپ کے مسائل اور پریشانیوں کو دور فرمائے۔ ہمارے لائق کوئی حکم ہو تو ضرور بتائیں اگر آپ کے لیے کچھ کرنا تو ذی غری ہوگی۔ احمد خان تو حیدر آپ کے بھائی کا پڑا کر دیکھو، اللہ ان کو جنت الفردوس میں اپنی مقام عطا فرمائے۔ سیدی الدین اشفاق صاحب! درست فرمایا آپ نے اگر ہم دوٹ کا استعمال اور اس کے حق دار کا جج انتخاب کریں تو بہت کچھ بدل سکتا ہے۔ سب سے پہلے شکل و کلی پڑی، اسی میں لی کوئی کے بعد جج عادل کوئی پڑھما کر کنٹرول کے ہونے کے بعد پھر شیخ حامد کے زندہ ہونے کا پتلا ہے۔ اسواری راہر جا رہی ہے۔ مسافر اپنی رفتار سے مسافت کے کرسی ہے۔ میڈم اور شہر یار کی مگر جو ان اپنی جا رہی ہیں۔ بہر حال پھر دھندلے فائنڈ فائنڈ لگتی ہیں۔ طاہرہ یا دہی کی نشا دہن ایک ایسی اسواری تھی، سرخرا سے غلطی میں شام کے شوہر کا گل ہوا کرسی کی محنت رنگ لائی۔ باقی کہانیاں میں ایما اے راحت کی قید ہم حالات اور آخری صفحات پر احمد اقبال کی زندگی نام ہے مفرد کہانیاں ہیں۔ بہنیں تصویر لیکن اور ماہا ایمان کی کی شہت سے محسوس ہوئی، بیما جلدی اپنے ہونے کا احساس دلا میں۔“

✽ ماہا ایمان، حافظہ آباد سے پہلی آ رہی ہیں، ”راج 2013 کا سہنس سرائی کی آخری برسی پاش کے دوران 24 تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق کو داہیں بائیں ہر طرف سے جا لیا ہے لیکن پتھنیک خاص نظر نہیں آیا۔ اگر ڈاکٹر اگل تھوڑے بہت گھاس، پودے اور پھول بونے سرورق پر تعمیر دیتے تو دعوتان پوسٹ اور جاوید بلوچ کا کچھ بھلا ہوتا۔ خیر سلسلہ یاروں میں داخل ہوئے ہیں جہاں انھوں کی عمر طرعتوں کی پختا رہنمائی کے چھوٹا صنف نازک کو دعوتار کی کوار اور سابق سرورق کی کوئی کوئین کی نگاہوں کا خیر نشان کو گھاس کیے ہوئے ہے۔ ادارے میں آپ کے قیمتی الفاظ سے مستفید ہونے کا موقع ملتا ہے اب کے ساتھ ساتھ خوش خبری بھی ملو جو جس۔ آج کل سیاسی درخیز حرات نظر درج ہے۔ سیاست دانوں کی اپنی ہاتھوں میں عوام کی نام نہاد ہمدی کے اہل احمد رہے ہیں۔ سب سے پہلے سحر یہ بخاری کا شعر ہے کہ آپ نے اگل کر حسیناؤں کو مزہ خرمنندہ ہونے سے بچایا اور ڈیٹم رت کا قیام باری کے مخالفوں پر چھایا جائے لاچار ہیں جس میں ہاتھوں میں کرم آئی تو کچھ لیتا اور اس دن دنیا میں شرم کا آخری دن ہوگا۔ رمضان پاشا بھائی میاں میں شادی کے لٹروں کی بات کر رہی تھی مگر جاوید بلوچ اللہ کا بیٹا بیٹا دماغ پالیا ہے، مفت مشورہ ہے کہ نہ دینی ہوئی چنگاریوں کو ہوا سے دور نہ شعلہ بننے پریشانی کوئی مزید یہ کہانی چھوٹی محدود سوچ کی حکایت بھی ڈراما کیا کر۔ طاہرہ مگر ڈیر آپ کے لیے دعا ہے خیر کیا کھلے خیر بھی ادا کیے جا سکتے ہیں۔ فرمائے آپ سے رابطہ ہے ہو سکتا ہے۔ ہاتھوں سحر صاحب اللہ شہر اکھڑا کھڑا تین نمکا ہے میرا۔ میں جو ہوں میرے سب اپنے اور میرے جانتے ہیں اور کسی کی مجھے پر نہیں۔ مجریم قیسر اقبال کچھ آپ کو داہنے کے علاج کی اشد ضرورت ہے جو کچھ بات سے بھی غلط مطلب نکالتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہماری قابلیت اور شرم نشان قلم کی چاک بدلتی ہے قدرت اللہ صاحب کو سزا کر سوا کر دیا ہے سو وہ یہاں مقابلہ کرنے کے بجائے تحقیق و تجویز میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ سارا اور طاہرہ یا سہنس کے بے لاگ تیسرے وقت کی ضرورت تھی۔ ویسے ہاتھوں میں حسنین کے شہر نہیں بنوں کا کھڑا مشورہ ہے وہ ہرائی کرنا بھی..... ظفر کی ایک خوب راز افشا آپ نے بڑی اسپیل ہے آپ کی۔ قیسر عباس تو رکھا ہے تو کسی کے۔ اصل کا کافی لی لال تو آپ محفل کی سب سے استفادہ فرماتے۔ ملک قیسر رحمان صاحب ہم نے تو اپنے صحت کی سب جلا دی اب آپ کی باری ہے۔ خوش چمنی چمنی کی سافر کے بارے میں آپ کے خیالات سے میں متفق ہوں۔ جہوں کی دنیا میں رہنے والے بڑے سونے دھن ہو کر کرتے ہیں فہرست دیکھ کر اندازہ ہوا۔ سب سے پہلے ماہر زرا صاحب کے حالات کا سبقت لیا، منجھا ہوا ایک اچھوتی تحریر کی کہانی میں بدھنم کی اور مسافر پرستی کی دوستی بھی نہیں رہی کوئی انسانیت کے رشتے نہ تھا تو ایڈورڈا کی دوسری کی ساگری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس ماہ مسافر میں کوئی خاص چیز نہیں ہوئی ہوئی سوائے شہر یار کے گاؤں کی گلیوں میں گھومنے کے ایڈز میں مصروف چمنی گئے۔ شکل و کلی میں صنف کا ڈرامہ گھر پر ہے کہانی پر گرفت خاصی مضبوط ہے۔ مختصر جیروں میں محفل صاحب کی تحریر نہ دیکھو جو بہت خوب صورت تھیں۔ محفل صاحب کا شمار اول کے قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ انسانی معاشرت کے مسائل اور ان کی تشبیہ کیوں پر محفل صاحب کی خوب نظر ہے۔ میرے موصوف فیورٹ کا درجہ پانے والے کاشف زہج کا انتخاب ملک نصیب کے عمو کی تانے بانے بنے گئے تھے۔ مسز ڈال اور مسز پائشر کے اراہوں پر خوب اوس پڑی ہے جان کر کہ ان سے تمام سو سے روئی سائے کی کرسی کرتے ہوئے جلا ڈالے۔ زندگی کی رحمتا ہوں سے لوگوں کو دیکھ کر نے والے یہ متعدد جو ہوا ڈاکڑوں کی روداد حیات زندگی نام ہے از احمد اقبال لا جواب تحریر بھی۔ دولت چاہے وقت کی ہو یا زر کی زیادتی ایک خود پسندانہ کا احساس بڑی کی باری میں جہاں کر کے تہائی کی اذیت میں دھکیل دیتی ہے۔ یہی آخری حیرت کا حاصل مطالعہ تھا۔“

✽ سحر یہ بخاری، محفل میں چلی آ رہی ہیں، ”پیاری بھئی احمد آپ کی محنت اور وصلہ افزائی کا بہت بہت شکر ہے۔ بدلے موسم کے ساتھ



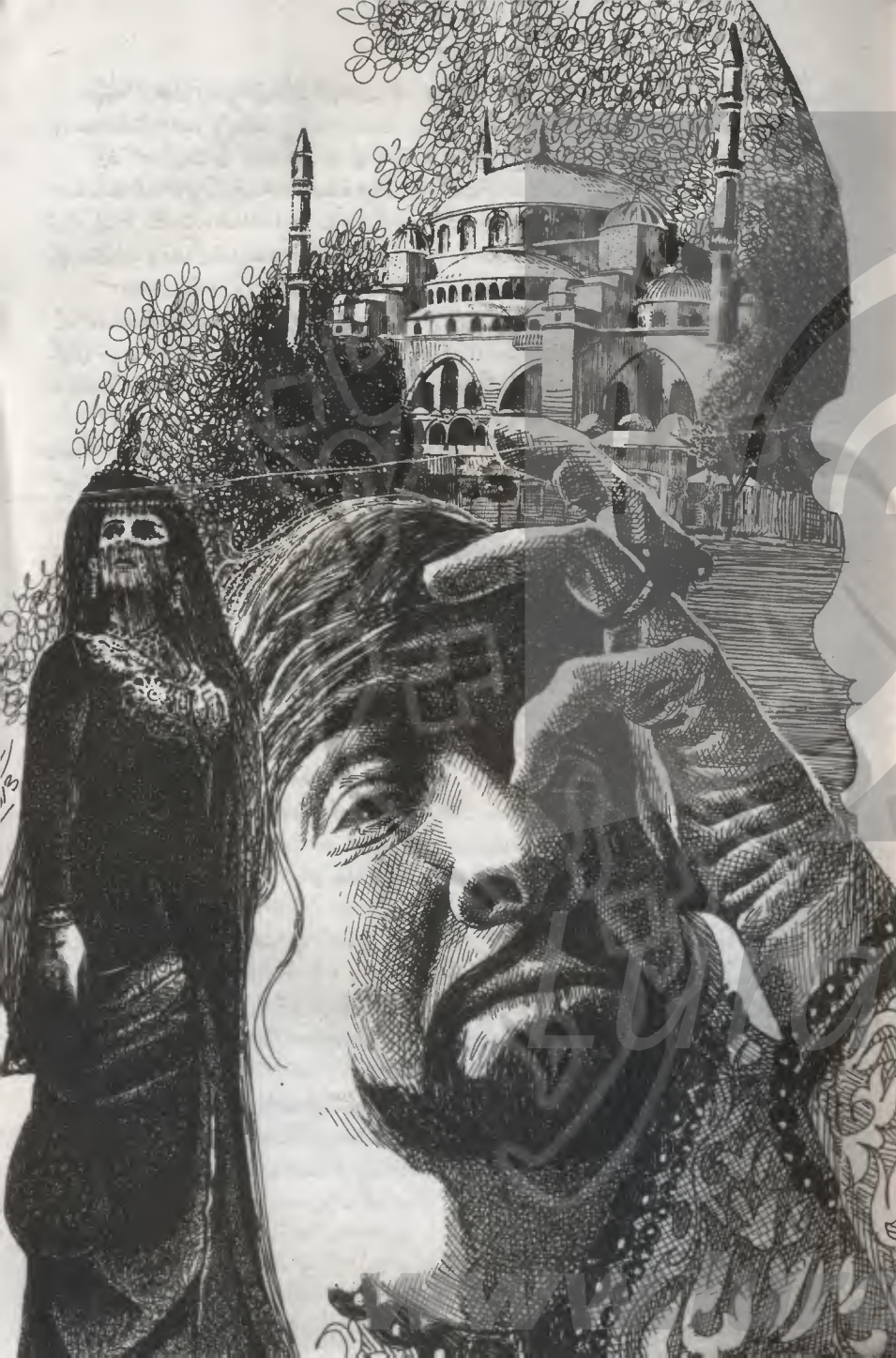
ہی حکومت کی رخصتی بھی مل میں آجایا جاتی ہے۔ بہار کی آمد پر جب پھول، رنگ اور خوشبو میں بھی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ سردوق کی قبول صورت
دو تیرہ اداں صورت لیے ماحول کو بھی اداس بنادیتی ہے۔ انتہائی میں جون اعلیٰ عالم دواش میں مسلمانوں کے شاندار باضی کا ذکر کرتے ہوئے اس
بات پر زور دے رہی ہے کہ اگر کے ہوتا ہے تو علم کو اختیار بنانا ہے جہات کو نہیں۔ ابتداء میں 23 مارچ یوم پاکستان کے حوالے سے تھا ایک اہم
کی اس خواب کی پیادگی گئی۔ بانی انکیشن کی آمد اور ملک سونامی، سیاستدانوں کی چالاکیاں کو ہم خوب سمجھے ہیں لیکن اس بار ہم دھوکا کھانے والے
نے یہ عوام ہیں..... بھر کرے دھوکا نہ کھا میں! وہ اس بار صدارت ہمارے سے ملی آفت بہت شکر ہے کہ نوید احمد کی مجلس خلیفہ پوسٹ کیا تھا اور
اب آپ اب اپنی رائے بدل لیجیے۔ قیصر اقبال آپ کے مندر سے اوہ..... سواری میرا مطلب انٹ کے مندر سے مجازی ہی کی خوشبو کیوں آنے کی اور یہ اپنے
کی قدرت اللہ کی رائے سے پورا پورا اتفاق.....؟ ظاہر و یا یقیناً وزیر آپ کی طرح ہمیں بھی اعزاز نہیں ہوتا تھا کہ سردوق کی حسینہ رو رہی ہے یا
بل بیودیلوج میں بھی آپ کو کبھی بھاننے کی پیش کش کری رہی تھی کہ جس شک کی پیاد پر آپ نے انتظار داڑھا کھڑا کر دیا۔ ظاہر مگر آپ تو خوش شاخ آپ ناپ کا پورا کا
مل ہو گیا؟ تاہیں سعید آپ کی مراد یقین نہیں آئے گی کہ آپ کے لیے ایک وظیفہ بتادی ہوں، مع شمام اپنے گھر کی قیمت براؤنجی آواز سے دیے دعا مانگا
نیک پر دانے کی موت ہو ڈیا یا میری، علم دین کی شمع کو جو کچھ سے محبت یارب اس پر گل کریں بھرا رکھیں۔ رمضان باشا تاریخ ایسے ہی نکلی جاتی
حققت پیش آئے ہوتے ہیں۔ اب سجاد احمد آپ کی انگریزیت کے لیے تاریخی کہانی کو فنی کہانی تو بنانے سے رہے۔ مقصود اس، قدرت اللہ بھائی کی
لوڈن جولینی انیسویں صدی کی شانسی کے بعد سال کرتے ہیں یعنی ہوش کے پہاڑ بن جاتے ہیں۔ آخر میں بھجوں کے سفیر نظیر عباس یارب آپ کی مغیر موجودگی
پیش کی ممکن کر رہی ہے۔ فیاض بر میں دلائل کے انسپرٹ مرزا امجد علیجہ نے پراسرار دل کے کسی میں کیا نہایت باریک اور عام سے نقطے پر اپنی
پیادہ درمی اور ہمیشہ کی طرح اپنے نگاہ مول کر کھانسی کے کھنڈے کے کھانے کے آخری صفحات پر اجماع لیا کا بادشاہ اکظم اس بار پنا جاندا نہایت
کی نام ہے، ایک تخلیق عام معاشرتی موضوع پر مشتمل ایک معمولی کوچی کی حامل کہانی تھی۔ سکول میں سیٹھ صاحب کی پراسرار موت کا معاملہ چونکا ہے
بات ہے نیلی کا پھر سے چلاک لگانے والاوں میں شیخ جی کا تعاقب نہیں سکول مسافر سے آگے نکلی دکھائی دے رہی ہے۔ مسافر میں شہر یارب پر دے رہے
ان الفاظ اس کا کارباری ہونا اور غیر میثالیہ کے مسلسل انکیشن میں رہتا چکوز یادہ می ماخذ ایمری شامل ہیں کردی گئی؟ سب سے دلچسپ متن شہر یارب کا
تجدلیل کر کے شہر کا کافرا۔ غرب سے درآمد کماہیوں میں سب سے بہترین اور دلچسپ ترین رہی۔ ”کم نصیب“ ایل ڈائل اور مارتن
ہیں۔ مرن چوری ہی کی ایک اور خوش پر مشتمل زبردست کہانی تھی۔ قدیم حیات ایم اے راحت کی بڑے نام کے ساتھ عام کی کہانی ثابت ہوئی۔ ظاہر
کی کتاب زمینی نشا نے نہ رنگ۔ تاریخی کہانی زبرعتا حد ہے۔ محفل اشعار میں چندہ چندہ اشعار بہت زبردست تھے۔“

✽ **مسرؤب ظلال کی محفل میں آمد ہوئی ہے** فرماتے ہیں ”ایک محفل وقف کے بعد حاضر محفل ہوں۔ امید ہے کہ محفل کہا جائے گا (آپ کا خیال درست ہے) محفل میں شرکت نہ کر کے کئی نئی وجوہات تھیں مجھ پر ہی قرار دے جایا کرتے تھے وضاحت کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ مارچ کا سہنس پڑتا ہوں، درحیوں اور موسم کی خیر خواہیوں کی وجہ سے محفل سے لے کر مقابلا ہوا، تاہم طبعی ختم ہو گیا۔ سہنس کی تپاری میں حصہ لینے والے کھم کاروں، مراسلا نگاروں اور دیگر لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لیے میرے کارفرما تو ادھر کا رہی جاوے۔ محفل کے 6 ستاروں کو دیکھ کر نشان حیدر کا گھاں ہوا جو فرست میں جنگ رہے تھے۔ جون ایلیا بلکہ کوسب معمول ادا معوں کے شہر میں اپنے بچنے پایا۔ سہرے بخاری صاحبہ کو محفل میں داخل بنے دیکھا، محفل بدور، تاہم ان کے کھم کی لکڑا ہٹ کا خوف ان کے سن کو مزید بڑھا گیا۔ مسافر چونکہ میرے علاقے کی کہانی ہے اس لیے سب سے پہلے پڑھتا ہوں۔ قی کرنا ہے یا نیک پران تمام جہلوں کا معاہدہ کرنا جن کا ذکر کمرہ بار بار ہے لیکن ان الجان اتنی فرست نہیں رہی۔ پھر وہ بھی کئی داری قابل رنگ اور موت حسب مزاج رہی اور قریب لکے ہوا مہاراجہ واپسی، بہن تک چنگ چکا ہے۔ محفل کی کہانی شکاری کے دلدار سندھ کی طرح لگتی ہے تاہم اس میں حقیقت سسین کا کشن۔ چمکنے میں نہیں آیا۔ زندگی نامے کی شاہی کی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور ان کے مزاج کی جدی کے بعد کفارے کے تمام حالات قابل رنگ بھی مگر ہر جرم کی تلافی کا پاپاٹ ہوئی ہے اور نہ انعاموں کی مسکے ہے کہ اپنا مہاراجہ صاف کر لیں، پھر عامر کی شاہی سے سرہار چھٹا محفل میں حاضر رہے اس سے تاش کی اتنی تھانیں کیسے کہہ سق؟ جبکہ اس کے اور اس کے مزاج میں ہمیشہ تضاد ہی رہا؟ فن کی سر گیری کرتے مرنے بھی چھوڑ کر اور دلایا معاہدہ کر لیں۔ ولی کال ہے نہعت اللہ ولی کے حالات زندگی پر محفل تحریر کی۔ جہاں ان کے تقویٰ کا بیان ہوا وہی ان کے اساتذہ کی کا دنیا دار ہوا اور انہیں بھی کچھ نہ سنا فحسوں یا ک محسوس ہوا۔ ہرگز کئی چھری تک دیوث کا حسب روایت دلچپ کا نام نہ رہا جس میں انہوں نے اپنے ترقی کے مطابق خدائی خدمت گاہ کی بھی کر دکھائی۔ شہر اجنبی الیہ کے ساتھ جارج کا رویہ شیک بھی گھر اس کہانی میں ورق ورق چھوٹا ہے ولی کی کہانی کوئی بات بھی نہ تھی۔ محفل شروع میں شرف خان احمد خان کا انتخاب پسند آیا۔ اول دوم اور سوم اشعار کا انتخاب غالباً خود امدادی کے درسیے ہوا جسے چاہا اور وہی دیدہ ویدی لکری سے ان گھوں میں دخول چھوٹنے والی کہانی تھی۔ ولی کے ڈائریکٹ نمبر میں ہر شخص ہی کا دانا کڑا تھا۔ نشانہ سر حال اور حالات۔ وہی کہانی اور دست کا نشانہ۔ تحریر کی۔ مزاجا جبکہ کا نشانہ از عجب صورت دوا دی۔ ایک دوا میں قدورے مختلف ہیں ایک ایک کہ انہوں نے سنا (تذقیہ تنیم) کے سن و شب صورتی کا بیان ذرا لے دیا اور دوسرے پوری اسٹوری میں دوا کی نظر رساں استعمال نہیں کیا اور ترقی کے لیے بات بھی بالکل جوتی ہے کہ ان کا صاحب انسان دوستی میں ان کو مشکلات میں جھٹکتے بھی ہیں اور پھر کچھ بھی آتی ہے۔ سر ادا مہاراجہ پوری نام اور قلم۔ قلم صاحب مومن اور اس دن ڈول کی ڈول کے ڈول کا بھی دونوں کو کھلنے والے ہنسنے کے واقعی دل خوش کر دیا۔ دونوں کو ڈول کے محفل اپنے غفارت کی حد تک دیکھی تھی۔ قیہ مگر حیات ابتداء سے استہلاک کرتے، پاس، دکھ اور ملال کی کہانی تھی۔ اگر یہیوں کہ سہنس مارچ 2013ء کی سب سے مکمل اور موثر کہانی بھی کہی تو بے جا نہ ہوگا۔ ادارت، ہماری تاریخ میں ہماری شرمندگی کے لیے نہ زیادہ اور قدر کے لیے غالباً کم صفحات ہیں۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

مقصود اہل حق کا ہونا ہے۔ قصور و بارے فارق و چمن۔ چوہدری احمد خان، راولپنڈی۔ احمد خان توحیدی، الطوارق ایشیائی، کراچی۔ انجم ساحلی، لاہور۔ رانا
 وید، تحصیل علی پور۔ اسل کاظمی، آزاد کشمیر، ہر ظاہر الدین بیگ، میرپور خاص۔ حبیب احمد، کرک۔ ❄





پس پردہ

ڈاکٹر ساجد امجد

تاریخ سے ثابت ہوا کہ عہد گزشتہ میں کچھ لوگوں کو حکمرانی کا شوق تھا اور کچھ کو اقتدار کا نشہ... لہذا ان دونوں عوامل نے الگ الگ انداز میں صفحہ قرطاس پران کے عہد کو اتارا... اور یہ بھی حقیقت ہے کہ چاہت اقتدار کی ہو یا محبوب کی... کشمکش ہمیشہ کسی نہ کسی شاخسانہ کو جنم دیتی ہے... یہ اور بات کہ حصولِ لاپبی کے درمیانی عرصے میں بے شمار واقعات تاریخ کو کئی رخ پر پھیلا دیتے ہیں۔ ماضی کے گوشوں میں ایسا ہی ایک مثلث خیزران... اور مامون و امین کا بھی پوشیدہ ہے... جس پر جب بھی روشنی ڈالی گئی تاریخ نے ایک اور ہی انداز میں اپنے پنکھ پھیلا دیے۔ خیزران کی امور سلطنت میں بے جا مداخلت نے مامون و امین کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا کر دی جس کا انجام بھائی کے لہو پر ہوا... پس ثابت ہوا، حکمرانی کا شوق ہوا اقتدار کا نشہ ایسی خونیں داستانیں تو ان کے تعاقب میں ہمیشہ سرگرداں رہتی ہیں۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

پہلے قصر طلائع کی دیواریں سوگ میں ڈوبیں پھر سارے بغداد میں صف باغ بچھ گئی۔
خلیفہ منصور فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے جاتے ہوئے راستے میں انتقال کر گیا تھا۔ علاؤ فقہانے جو راستے میں شریک سفر تھے جنازہ اٹھایا اور اسے لے کر مکہ مکرمہ پہنچے۔ وہیں نماز پڑھائی گئی اور اسے سپرد خاک کر دیا گیا۔
منصور کا وزیر ریح بن یونس حاضر تھا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ خبر کے بغداد پہنچنے سے پیشتر ہی محمد بن منصور، مہدی کے حق میں بیعت لے لی جائے تاکہ کسی ممکنہ بغاوت کا اندیشہ جاتا رہے۔

منصور کی وصیت کے مطابق پہلے مہدی کے حق میں بیعت خلافت لی گئی اور پھر یہ بیعت لی گئی کہ مہدی کے بعد منصور کا بیٹا جلعاد بن موسیٰ تخت خلافت پر براجمان ہوگا۔ منصور اپنی زندگی ہی میں یہ فیصلہ کر چکا تھا۔
بیعت لینے کے بعد ایک خبر رساں کو مہدی کے پاس روانہ کر دیا کہ وہ اس حادثے کی خبر پہنچا دے اور یہ اطلاع بھی دے دے کہ اسے خلیفہ بنایا گیا ہے اور یحییٰ بن موسیٰ کو ولی مہدی کے منصب پر فائز کر دیا گیا ہے۔

اس قافلے کو بخیر حج کے بعد عراق واپس آنا تھا۔ خبر رساں نے قصر طلائع میں قدم رکھا اور یہ خبر پہنچائی تو سب سے زیادہ دکھ ہارون رشید کو ہوا جس کی عمر اس وقت تیرہ سال تھی۔ منصور اسے بہت چاہتا تھا اور اس کے بارے میں ایسی باتیں کہتا تھا جو اس کی خلافت کی پیش گوئی کی حیثیت رکھتی تھیں۔

منصور کے انتقال کی خبر سن کر ”خیزران“ کے دل میں جذبہ مسرت نے سراٹھایا تھا۔ ان تمام عزائم اور سازشوں کی تکمیل کا وقت آ گیا تھا جو وہ اب تک اپنے ذہن و دل میں تیار کرتی رہی تھی۔

پہلی خوشی تو یہی تھی کہ اس کا شوہر اب خلیفہ بغداد ہوگا۔ یہی وہ دروازہ تھا جس میں داخل ہو کر وہ اپنے تمام مقاصد پورے کر سکتی تھی۔

مہدی نے اپنی خلافت کی بیعت لینے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔ مصافحہ سے کرخ کی طرف فوراً روانہ ہوا جہاں ”قصر خلد“ واقع تھا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی خیزران سوچنے بیٹھ گئی کہ پہلے کس منصوبے کو عملی جامہ پہنائے گی۔ مہدی، قصر خلد کے بڑے ہال میں داخل ہوا جو اس موقع کے لیے خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ سپہ سالار، افسران فوج اور اعیان حکومت صف بستہ موجود تھے۔

مہدی اس مجمع سے گزرتا ہوا باپ کے تخت پر جا بیٹھا۔ حاضرین نام بہ نام نکارے جانے لگے۔ جس کا نام نکارا جاتا وہ صف سے باہر نکلتا اور خلیفہ کی دست پوسی کرتا اور بیعت خلافت لیتا۔ ساتھ ہی ساتھ موسیٰ بن یحییٰ کی ولی عہدی کی بیعت بھی لی جا رہی تھی۔
مہدی وہ خوش قسمت تھا کہ جب خلافت پر متمکن ہوا تو راستے میں کوئی پتھر نہ تھا۔ نہ کوئی شورشی نہ بغاوت۔ کسی دقت کے بغیر وہ یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ ان آسائوں نے اس کے مزاج میں نرمی اور کھل پیدا کر دی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اس نے اپنی خلافت کا آغاز جملہ علوی قیدیوں کو پروانہ رہائی عطا کر کے کیا۔

خیزران قصر طلائع میں پرسکون تھی اور آنے والے وقت کے لیے منصوبہ سازی کر رہی تھی۔ حکام، عمال اور افسران پر بے دریغ مال لٹا رہی تھی تاکہ آنے والے وقت میں اس کی ہمواری کر سکیں۔ منصور کا فولادی پنجہ خاندان سے ہٹ گیا تھا جو معاملات حکومت میں کسی طرح بھی عورتوں کا عمل دخل پسند نہیں کرتا تھا اور خاص طور پر مہدی کی اس کمزوری سے تو بہت نالاں تھا جو اپنی بیوی خیزران کی بات ہر معاملے میں اپنی رکھتا تھا اور جو نہایت بے لوث سے شوہر کے اعمال و افعال میں مداخلت کرتی رہتی تھی۔
اب خیزران آزاد تھی۔

اس نے جب چاروں کونٹ مضبوط کر لیے تو قصر طلائع سے قصر خلد میں منتقل ہو گئی۔ مہدی پہلے ہی زن مریدی کی زندگی گزار رہا تھا، خیزران نے خاتون اول ہوتے ہی اس پر اپنی گرفت مزید مضبوط کر لی۔ مجال نہیں تھی کہ مہدی اس کا حکم مان لے سکتا۔

خیزران کی اعلیٰ خاندان سے تعلق نہیں رکھتی تھی۔ وہ ایک مملوکہ باندی تھی جسے منصور نے خرید کر مہدی کے حوالے کر دیا تھا۔ خیزران کے آنے سے پہلے مہدی کی شادی اس کی عم زاد وریطہ سے ہو چکی تھی لیکن خیزران کے آنے کے بعد وریطہ اس کی نظروں سے اتر گئی۔ وریطہ کو حسن و جمال سے بہرہ وافر نہیں ملا تھا۔ اس کے برعکس وہ بیماری جسم والی تھی۔ اعلیٰ خاندان سے تھی اس لیے وہ چھل فریب بھی نہیں جانتی تھی جو عوامی باندیوں کے حصے میں آتے ہیں۔ وریطہ چاہتی تھی لوگ خود اس کی قدر و منزلت کریں۔ وہ ان عورتوں اور ان کے خاندان والوں کو مینہ نہیں لگاتی تھی جو اس کے شوہر کی بارگاہ میں دخل رکھتی تھیں۔ اس کے برعکس خیزران کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ

چھوٹے بڑے سب کی دلجوئی کرتی تھی۔ کسی پر اپنی فوقیت اور بزرگی نہیں جتاتی تھی۔ فیاض بھی تھی لہذا سب کی ضرورتیں بھی پوری کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے سب کی محبت جیت لی اور ہر زبان پر اس کی تعریف رہنے لگی۔ وریطہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتی تھی لہذا راستے سے ہٹ گئی۔ خیزران کے لیے میدان خالی ہو گیا۔ اس فتح نے اس کے حوصلے بلند کر دیے۔ وہ شوہر پر حاوی ہو گئی۔ جو چاہتی اس سے منوالیتی۔

اقتدار میں آتے ہی اسے اپنا خاندان یاد آیا۔ جس وقت منصور نے اسے خرید لیا تو خیزران نے اسے یہ بتایا تھا کہ وہ دنیا میں اکیلی ہے اور اس کا کوئی نہیں جبکہ اس کے سب سے زیادہ یمن کی رہنے والی تھی۔ اس کا خاندان ابھی تک وہاں آباد تھا۔ جب تک منصور زندہ تھا وہ یہ حوصلہ نہیں کر سکتی تھی کہ انہیں بلائے لیکن اب مہدی خلیفہ ہو گیا تھا اور وہ خیزران سے جتنا دہتا تھا خیزران کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ وہ اپنے خاندان و انوں کو بغداد میں آباد کرادے۔

مہدی جھکا ہار اور بارے آ کر بیٹھا ہی تھا کہ خیزران نے ذکر جمیل دیا۔
”میں یہاں پیش کر رہی ہوں۔ تم خلیفہ بنے پھرتے ہو اور میرے ماں باپ، بھائی، بہن یمن میں قاتلے کر رہے ہیں۔ تلف ہے تمہاری خلافت پر۔“
”تمہارے خاندان والے؟ کیا بات کر رہی ہو؟ تم تو یہ کہتی رہی ہو کہ تمہارا کوئی نہیں۔“
”میں جو بھی کہتی رہی ہوں مگر جواب کہہ رہی ہوں وہ سنو اور اس پر عمل کرو۔“
”بغداد صرف میرا نہیں، میں اپنے امرا سے مشورہ کروں گا۔“
”کیا ضرورت ہے مشورہ کرنے کی۔ تم میری خواہش کا احترام کرنا سیکھو۔“
”میں انکار تو نہیں کر رہا ہوں۔“
”میں تو جب سے تمہارے گھر میں آئی ہوں ایک لمحہ خوش کا نہیں دیکھا۔ خاکروب کہیں کے۔“ اس نے کہا اور روتے ہوئے اس کی قبا سے لٹک گئی۔

مہدی نے بڑے پیادہ سے اسے الگ کیا اور خواب گاہ سے نکل گیا۔ ظاہر ہے وہ اس وقت غصے میں تھا۔ وہ کہتا تو کس سے کہتا خود ہی سے کہنے لگا، بتاؤ تو مجھے خاکروب کہتی ہے۔ میں خاکروب ہوں اور یہ۔ اسے تو خود خریدا گیا تھا۔ نہ جانے اس کے ماں باپ کون ہوں کیسے

ہوں۔ کچھ دیر غلام گردش میں ٹھہرا ہا اور سوچتا رہا۔ بغداد کی اتنی آبادی ہے اگر چند نفوس اور آجائیں تو کیا حرج ہے۔ خیزران کا حسین چہرہ نظروں کے سامنے گھوم گیا۔
کمرے میں واپس آیا تو اس کا غصہ اتر چکا تھا۔ خیزران ابھی تک منہ پھلائے بیٹھی تھی۔
”کہاں ہیں تمہارے خاندان والے۔ میں بلاؤں بھی تو کہاں سے بلاؤں؟“
”چھوڑیں کیا کریں گے بلارکے۔ کیا خیر مرکب ہی گئے ہوں۔ میں نے تو ایک بات یوں ہی کہہ دی تھی۔“
”تم خفا مت ہوا کرو۔ میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری کروں گا مگر کچھ بتاؤ تو سہی۔“
”یمن ہی میں تھے۔ اب کا مجھے کیا پتا۔ پتا ہوتا تو خود جا کر نہ بلاتا آپ سے کیوں کہتی۔“
”اچھا اچھا۔ میں ہی کچھ کرتا ہوں۔“
”ایک بات اور آپ کو بتانی تھی۔“
”وہ بھی بتا دو۔“
”کل ایک عورت میرے پاس آئی تھی۔ غربت کے لباس میں لپٹی ہوئی۔ پریشان حال۔ میں تو اسے پہچانتی بھی نہیں تھی میرے پاس جو باغی خواتین بیٹھی تھیں۔ انہوں نے پہچان کر مجھے بتایا کہ یہ عورت مزمنہ ہے آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کی بیوی۔ یہ خواتین اس کو برا بھلا کہنے لگیں اور اسے نکل جانے کو کہا۔ مجھے اس کا یہ حال دیکھا نہیں گیا۔ میں نے کیزوں سے کہہ کر اس کے لیے ایک کمرہ آراستہ کیا اور اسے وہاں ٹھہرا دیا۔ میں نے آپ کی اجازت کے بغیر یہ کام کیا ہے۔“
”خیزران، تمہاری انہی خوبیوں نے تو مجھے خرید لیا ہے۔ اگر تم اسے منظر ہاتھیں تو میں تم سے بھی بات نہ کرتا۔“
”بات تو خیر پھر بھی تم کرتے۔“ خیزران نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔
”خیال رکھنا وہ عورت ہمیشہ یہاں رہے۔ اموی ہمارے دشمن ہیں لیکن مردوت کا تقاضا ہی تھا جو تم نے کیا۔“
مہدی نے وعدہ کر لیا تھا لہذا اس کی تکمیل کے لیے اس نے حاکم یمن کے نام خط لکھا کہ وہ خاندان خیزران کے افراد کو تلاش کر کے بغداد بھیج دے۔ حاکم یمن نے ان لوگوں کی تلاش شروع کر دی۔ ایک مقام پر ان کا سراغ لگا۔ یہ خاندان نہایت عسرت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ خیزران کا بھائی انکور کے ایک باغ میں رکھوائی کا کام کر رہا تھا۔ یہ گھر اناس کی معمولی آمدنی سے زندگی کے دن بسر کر رہا

وہ معاملے کو یہاں تک لے آئی تھی لیکن اب مہدی ڈر رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ مفتیان کرام کیا فیصلہ دیتے ہیں۔ اگر فیصلہ عیسیٰ کے حق میں ہو جاتا تو وہ اسے بدل نہیں سکتا تھا اور اگر فیصلہ اس کے خلاف جاتا تو عابیوں کی مخالفت ضروری تھی جو عیسیٰ کو مہدی کے بیٹوں سے بہتر جانتے تھے۔ صغیر سنی کی وجہ سے ان کا کوئی کارنامہ دنیا کے سامنے نہیں آیا تھا۔ منصور نے بھی اپنے بیٹے مہدی کے حق میں بھی عیسیٰ کو دست بردار کرا لیا تھا لیکن وہ منصور تھا۔ اٹھنے والی مخالفت کی آغوشی کارخ موڑ سکتا تھا۔ مہدی خود کو کمزور محسوس کر رہا تھا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر خیزران سے بات کی۔ ”خیزران، تم امور سلطنت سے واقف نہیں۔ مجھے ایسا قدم اٹھانے پر مجبور نہ کرو جو فساد کا سبب بنے۔“ ”اب کون سی نئی بات ہو گئی جو تم بچے پھرتے ہو۔“ ”عیسیٰ نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ فقہا سے فتویٰ لے کر دیکھ لیا جائے۔ اگر فتویٰ اس کے حق میں گیا تو میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔“

”امیر المومنین! جہاں تلوار کام نہیں آتی وہاں دماغ کام کر دکھاتا ہے۔ میں وہ چال چلوں گی کہ فتویٰ آپ کے حق میں آئے گا۔“ ”یہ تم کہیں کہہ سکتی ہو؟“ ”آپ دیکھتے جائیں۔“

خیزران نے ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا۔ اس دعوت میں دوسرے اکابرین کے ساتھ ساتھ چند ایسے علما و فقہاء کو بھی مدعو کیا جن کے بارے میں اس نے معلومات حاصل کر لی تھیں کہ وہ اس کی پیشکش کو قبول کر سکتے ہیں۔ مقصود صرف فقہاء کو بلانا تھا۔ دوسرے لوگوں کو تو محض اس لیے بلایا تھا کہ یہ شک نہ ہو کہ صرف فقہاء کو کیوں بلایا گیا ہے۔

عمال حکومت خیزران کی دریا دلی اور فیاضی کے معترف تھے۔ مہدی اور عمال حکومت کے درمیان وہ وسیلہ بنی ہوئی تھی۔ انہیں جو کام مہدی سے کروانا ہوتے تھے وہ خیزران کے ذریعے ہی نکل سکتے تھے لہذا اس کی دعوت کو کوئی بھی نہیں ٹھکراسکتا تھا۔ فرض اس کی نظروں میں اچھا بننا چاہتا تھا۔ اس کی دعوت پر بلیک کہتے ہوئے سب حاضر ہوئے۔ فقہاء میں سے کوئی نہیں تھا جو نہ آیا ہو۔

خیزران نے اس دعوت کا ایسا اہتمام کیا تھا کہ مدتوں لوگ اس کی مثال دیا کرتے تھے۔

جب دعوت اختتام کو پہنچی تو اس نے فقہاء کو اپنے حضور

ہونے لگیں۔ ایسی باتیں کہیں جھجکتی ہیں۔ عیسیٰ بن موسیٰ کے کان میں بھی ان باتوں کی بیگ پڑ گئی۔ جو چیز اسے منصور کے ہاتھوں ملی تھی مہدی کے ہاتھوں پہنچ جائے۔ یہ اسے گوارا نہ ہوا۔ اس نے بھی ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے۔ اس نے اپنے حمایتیوں اور مددگاروں کو جمع کرنا شروع کر دیا۔

مہدی نے یہی بہتر سمجھا کہ عیسیٰ کی مکمل تیاری سے پہلے ہی اپنے ارادے کا کھلے بندوں اعلان کر دے تاکہ رد عمل کا اندازہ ہو جائے۔ اس نے عیسیٰ کو خط لکھا کہ وہ اس کے بیٹے کے حق میں ولی عہدی سے دستبرداری کا اعلان کر دے۔ ظاہر ہے وہ یہ بات کیوں ماننے لگا تھا۔ اس نے بھی وضاحت سے لکھ بھیجا۔

”جو چیز مجھے امیر المومنین ابو جعفر منصور سے ملی تھی وہ آپ کو نہیں لوٹا سکتا۔ آپ سخت غلطی کر رہیں۔ آپ کے اس اقدام سے فتنہ و فساد پھیلے گا۔ آپ اس امر پر مجھے مجبور نہ کریں۔“

اس جواب نے جلتی پرتیل کا کام کیا۔ مہدی نے اس کو نہایت سخت جواب دیا۔ ”اگر تم نے میری بات نہ مانی اور ولی عہدی سے دستبردانہ ہوئے کہ میں موسیٰ کی ولی عہدی پر بیعت لے سکوں تو یاد رکھو کہ تمہارے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو مجرموں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے اور اگر تم نے میری بات مان لی تو پھر میں تمہیں بڑا اچھا معاوضہ دوں گا اور مالا مال کر دوں گا۔“

اس نے اس دھمکی کی بھی پروا نہ کی۔ مہدی نے اسے بغداد حاضر ہونے کا حکم دیا۔

”تم بغداد آکر مجھ سے ملو۔ ممکن ہے درمیان کی کوئی راہ نکل آئے۔“

عیسیٰ بن موسیٰ کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ یہ ظاہر اس کا امکان نہیں تھا کہ مہدی کے مرنے تک وہ زندہ رہے گا۔ کوئی حادثہ پیش آ جاتا تو الگ بات تھی۔ اس لیے اس نے یہی بہتر سمجھا کہ جنگ و جدل کی نوبت آنے سے پہلے وہ بغداد جا کر خلیفہ سے مل لے۔ وہ خراساں سے بغداد چلا آیا اور مہدی سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی ولی عہدی کا معاملہ فقہاء کے سامنے رکھیں۔ اگر وہ یہ فتویٰ دے دیتے ہیں کہ میں مسلمانوں کی یہ امانت تمہیں واپس دے سکتا ہوں تو میں دست بردار ہو جاؤں گا۔

خیزران کی شخصیت قصر خلافت کے تمام داخلی امور پر حاوی تھی اور ہر چیز پر غالب تھی۔ مہدی کے عزم و ارادے پر بھی اسی کا تسلط تھا۔

اس کا چچا زاد بھائی عیسیٰ بن موسیٰ تخت پر بیٹھے جبکہ اس کے اپنے دو بیٹے تھے موسیٰ اور ہارون۔ یہ ابھی چھوٹے تھے لیکن کبھی تو انہیں بڑا ہونا تھا۔ عیسیٰ بن موسیٰ کو ولی عہد مقرر کر دیا گیا تھا۔ مہدی کی بیعت کے ساتھ ہی اس سے بھی بیعت لی گئی تھی۔ اب اسے کوئی ایسی چال چلتی تھی کہ عیسیٰ بن موسیٰ کا کٹنا درمیان سے ہٹ جائے۔ عیسیٰ بن موسیٰ کو ولی عہدی سے محروم کر دیا جائے اور اس کے بجائے اپنے بیٹے کو یہ منصب دیا جائے۔

خیزران نہایت ذہین اور دور اندیش خاتون تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جو ہرے چلتی تھی اپنے وقت پر اور نہایت احتیاط کے ساتھ چلتی تھی۔ رکاوٹ صرف یہ تھی کہ اس کے دونوں بیٹے ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے لیکن وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ جس طرح بھی ہو اس شکی کو پار لگائے گی۔ سب سے پہلے تو مہدی کو آباہ کرنا تھا۔ وہ اس کی مٹھی میں تھا لیکن پھر یہ بات تو کرنی تھی اور جب اس نے مہدی کے کان میں یہ بات ڈالی تو وہ یوں اچھل گیا جیسے بچہ نے ڈنک مار دیا ہو۔

”خیزران، تمہیں معلوم بھی ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ ابا حضور کے زمانے میں بھی عیسیٰ بن موسیٰ کے ساتھ زبانی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ خاموش ہو گیا تھا مگر اب حالات دوسرے ہیں۔ تمام امرا کے سامنے اسے ولی عہد مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے گواہ موجود ہیں۔ سلطنت میں بدگلی ہو جائے گی۔“ ”خالد برکی اور یحییٰ بن خالد جیسے جتنے میرے ساتھ ہیں۔“

”ہمارے بچے ابھی سن رشد کو بھی نہیں پہنچے ہیں۔“ ”آپ نیت تو کریں۔ آغا تو کریں۔ کیا خبر اس میں کتنا وقت لگ جائے۔“

وہ کئی دن برابر مہدی کو رشاد کو بھی نہیں پہنچتے ہیں۔ ”اس عورت کا اس پر اتنا اثر تھا کہ بالآخر وہ اسے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو گئی۔“

مہدی نے فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے ہر قیمت پر ولی عہدی کا مسئلہ خیزران کی مرضی کے مطابق طے کرے گا۔

ہاں میں ہاں ملانے والے رجال دولت بہت سے تھے۔ انہوں نے بھی مہدی کو یاد کر دیا کہ اگر انہیں موسیٰ (مہدی کا بڑا بیٹا) کے سن رشد تک پہنچنے سے پہلے مہدی کا انتقال ہو گیا تو پھر خلافت اس گھرانے سے نکل جائے گی۔ اندر ہی اندر پھڑکی پکنے لگی۔ سرگوشیوں میں باتیں

تھا۔ حاکم یمن کے سپاہی سراخ لگاتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے۔ اس رکھوالے کا نام عطر عریف تھا۔

”تم کسی خیزران نام کی لڑکی کو جانتے ہو؟“ سپاہیوں نے پوچھا۔

”آپ لوگ کس خیزران کی بات کر رہے ہیں؟“ ”جس کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ تمہاری بہن ہے۔“ ”اگر اس نے ایسا دیا تو کوئی کام کیا ہے تو ہم اسے نہیں جانتے۔“

”جانتے بھی ہو وہ خلیفہ بغداد کی بیوی بن گئی ہے۔“ ”اگر ایسا ہے تو وہ ہماری بہن ہے جسے غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہم نے بیچ ڈالا تھا۔ اب وہ یقیناً ہم سے بدلہ لینے کے لیے ہمیں ڈھونڈ رہی ہوگی۔“

”بدلہ لینے کے لیے نہیں تمہیں اپنے پاس ٹھہرانے کے لیے بغداد بلا رہی ہے۔“ ”اگر یہ فریب نہیں ہے تو ہم لوگ بغداد جانے کے لیے تیار ہیں۔“

”تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟“ ”میری ماں، ثانی اور دو بہنیں ہیں سلسل اور انشاء“ ”کل ہم پھر آئیں گے۔ تم سب کو تیار رکھنا۔“ اس کا رد اس کی روانگی کی اطلاع مہدی کو کر دی گئی تھی۔ خیزران نے ان کے لیے ”مدینۃ السلام“ میں ایک شاندار محل ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیا اور ان کے استقبال کے لیے تیاریاں کرنے لگی۔

یہ لوگ اس حویلی میں اترے تو خیزران نے اپنے دونوں بیٹوں موسیٰ اور ہارون کے ساتھ استقبال کیا۔ خیزران کی ماں کی آنکھیں پٹی ہوئی تھیں۔ محل کی ایک ایک چیز کو نندیوں کی طرح دیکھ رہی تھی۔ یہاں وہ چیزیں تھیں جن کا استعمال بھی اسے نہیں آتا تھا۔ اتنے دن بعد بیٹی کی شکل دیکھنے کو ملی تھی لیکن بیٹی سے ملنے کے بجائے پورے محل میں دوڑتی پھر رہی تھی۔ یہی حال دوسری خواتین کا بھی تھا۔ ”خیزران، جیسے تیری قسمت ملے گی ہے اپنی بہنوں کے لیے بھی ایسے ہی رشتے تلاش کر۔“

”دیکھتی جاؤ اماں، میں کرتی کیا ہوں۔“ ان لوگوں کے آجانے سے گھریلو سیاست میں خیزران کے ہاتھ اور بھی مضبوط ہو گئے۔ اس کے علاوہ خالد برکی اور یحییٰ بن خالد کے خاندان سے اس کے جو مراسم تھے وہ اس کے ہر عزم کی تکمیل کے لیے کافی تھے۔ خیزران کو یہ گوارا نہیں تھا کہ مہدی کی وفات کے بعد

طلب کیا۔ پہلے ان سے ان کی ضروریات پوچھیں اور انہیں پورا کرنے کا وعدہ کیا اور پھر ولی عہدی کا مسئلہ ان کے سامنے رکھ دیا۔

ان میں سے بہت کم تھے جنہوں نے اس کے خطاب کو ناپسند کیا۔ باقی سب نے خوف یا لالچ سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور وعدہ کر لیا کہ عیسیٰ کی دست برداری کے لیے کوشاں رہیں گے۔

خیزران ان اپنے عہد کی سب سے مالدار عورت تھی۔ جو اہرات، زیورات، ہم وزر، جانکاد، جاگیر کوئی کن چیز تھی جو اس کے پاس نہیں تھی۔ غربت کا زامہ نہ دیکھا تھا اس لیے دولت کی قدر کرنا جانتی تھی لیکن خاص مواقع پر وہ جس فیاضی کا مظاہرہ کرتی تھی وہ بھی دیدنی تھا۔

اس دعوت میں بھی اس نے مضامین بھر بھر کر لیا۔ اس کی دولت اور تعلقات نے اثر دکھایا۔ بعض فقہاء نے فتویٰ دے دیا کہ عیسیٰ بن موسیٰ ولی عہدی کی امانت مہدی کو واپس لوٹا سکتا ہے۔ اس میں شریعت مانع نہیں بلکہ اس سے توفیقوں کا منہ بند ہوگا۔

یہ فتویٰ آتے ہی مدینۃ السلام کی مسجد میں مہدی نے بغداد کے اکابر و امرا کو طلب کیا تاکہ ان سے بیعت لی جائے۔ اس اجتماع میں مہدی کے بڑے بیٹے موسیٰ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی گئی اور اس کا لقب ”ہادی“ قرار پایا۔ اس تقریب میں ہارون بھی شریک تھا اور اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

خیزران پر تو جیسے شادی مرگ طاری ہو گئی تھی۔ یہ خبر ہی ایسی تھی۔ ایک طرف اس کا بیٹا ولی عہد بن گیا دوسری طرف اپنی سون، مہدی کی پہلی بیوی ریطہ سے اس نے بھرپور انتقام لے لیا تھا۔ بیٹا تو ریطہ کا بھی تھا جس کا نام علی بن ریطہ تھا۔ اپنی خاندانی بیوی کے بیٹے کو چھوڑ کر مہدی نے خیزران کے بیٹے موسیٰ کو ولی عہد مقرر کیا تھا اور ہادی کے لقب سے نوازا تھا۔ اس کے مرتبے میں ایک جاک ایسا اضافہ ہو گیا تھا کہ علی بن ریطہ اس کی گردن بھی نہیں بچھ سکتا تھا۔

ریطہ نے اس چوٹ کو محسوس تو کیا تھا لیکن یہ سوچ کر اس نے صبر کر لیا تھا کہ مہدی کے بعد موسیٰ کی بادشاہت میں بھی اسی کی ناموری ہے۔ اقتدار اس کے گھر ہی میں رہے گا۔ ایک خلعت خوردہ عورت اور کیا سوچ سکتی ہے البتہ اس کا دکھ وہ بھی فراموش نہ کر سکی کہ موسیٰ کی ماں ہونے کی حیثیت سے اقتدار کے ایوانوں میں جو مرتبہ خیزران کو حاصل رہے گا ریطہ اس سے محروم ہی رہے گی۔

مہدی کی نوازشوں کی اسے پروا نہیں تھی۔ وہ تو پہلے بھی اسے حاصل نہیں تھیں۔

جس طرح خوشی اور رنج کا موسم گھر میں ساتھ ساتھ چل رہا تھا اسی طرح بغداد کی گلیوں میں بھی یہ چرے دھوپ چھاؤں کا منظر پیش کر رہے تھے۔

یہ پہلا موقع تھا جب جرے کام لے کر ولی عہدی چھینی گئی تھی۔ ایک کا حق دوسرے کو دیا گیا تھا جبکہ موسیٰ کی عمر ابھی بہ مشکل سولہ سال ہوئی تھی۔ اس نے کوئی کارنامہ بھی سر انجام نہیں دیا تھا۔ عوام اس کی صلاحیتوں سے واقف نہیں تھے۔ پھر یہ سب کو معلوم تھا کہ موسیٰ کی ماں کو بازار سے خرید لیا گیا تھا۔ وہ ایک جاریہ (باندی) تھی اور موسیٰ کی پیدائش کے ایک سال بعد مہدی نے اس سے شادی کی تھی۔ ہارون رشید شادی کے بعد پیدا ہوا تھا اس لیے اس کا تو کوئی مقام تھا بھی لیکن موسیٰ! یہ باتیں ابھی ہو رہی تھیں کہ مہدی نے بیعت توڑنے کی ہم ڈال دی ہے جو ایک خطرناک اقدام ہے۔

یہ چرے گلیوں، بازاروں تک محدود نہیں رہے۔ امرا کے محلات میں پچھ اور بی باتیں ہو رہی تھیں۔ ان میں ناراضی نہیں بلکہ برہمی تھی۔ شاید وہ اندیشے درست ثابت ہو رہے تھے جس کا اظہار مہدی پہلے ہی کر چکا تھا اور خیزران کو باور کرایا تھا کہ اس اقدام سے فساد پیلے گا۔ ان برہم ہونے والوں میں خاندان بنو ہاشم پیش پیش تھا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو خود مہدی کے مقابلے میں خلافت کا زیادہ سزاوار سمجھتے تھے۔ پھر یہ کیسے برداشت کر لیتے کہ ولی عہدی کا منصب بھی اسی خاندان میں رہے اور وہ بھی ایک طفل صغیر کے حق میں۔

بنو ہاشم کے ایک گھر میں چند افراد جمع تھے اور موسیٰ کی بیعت موضوع بحث بنی ہوئی تھی۔ سب کے سب سخت غصے میں تھے۔ یہ سب کے سب ان شجاع افراد کے پوتے اور نواسے تھے جنہوں نے امویوں کا زور توڑ کر عباسی پرچم کو سر بلند کیا تھا اور اس وقت انہی کارناموں اور حالات کے نشیب و فراز کا ذکر کر کے دل کا بخارا تار رہے تھے۔

”محمد بن علی بن عبد اللہ اس لیے میدان میں نہیں آئے تھے کہ حکومت ان کے خاندان اور ان کے بیٹوں میں منتقل ہوئی رہے بلکہ ان کا مقصد تو یہ تھا کہ بنو عباس میں جو شخص سب سے زیادہ موزوں اور مناسب ہو اسے منصب پر فائز کر دیا جائے۔ بنو عباس کو یہ اعزاز بھی صرف اسی لیے دیا گیا تھا کہ بنو عباس کے خلاف یہ لوگ اسی جذبے کے تحت شریک ہوئے تھے۔ اس لیے نہیں کہ سلطنت ان کے خاندان میں تقسیم ہوئی رہے۔“

نے مہدی کے اقدام کی مخالفت کی تھی لیکن جب عیسیٰ بن موسیٰ خود ہی دست بردار ہو گیا تو انہوں نے بھی ہادی کی ولی عہدی پر بیعت کر لی۔

”اس کا مطلب ہے کہ اگر ہم کوئی تحریک لے کر چلیں گے تو ان فوجی افسران کو شامل ہوتے دیر نہیں لگے گی۔“ سب نے عہد کیا کہ وہ آج سے اس مہم کا آغاز کر دیں گے۔

دوسری طرف مہدی اور اس کے گھرانے کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ ان سازشوں سے بے خبر خوش تھے کہ نہایت سکون اور خاموشی سے خلافت کا تقاضے طے ہو گیا۔

مہدی نے بھی شکر خداوندی ادا کرنے کے لیے رنج کا ارادہ کیا۔ بغداد سے مکہ مکرمہ تک نہیں اور تالاب کھودے جانے لگے تاکہ سفر میں گرمی کی شدت کو کم کیا جاسکے۔ اپنا نائب ہادی کو مقرر کر کے بغداد میں چھوڑا۔ ایک مجلس قائم کر دی جس کا کام یہ تھا کہ حسب ضرورت حکومت کو چلائے اور ہادی کو مشورے دیتے رہیں۔

اس سفر میں ہارون رشید بھی اس کے ہمراہ تھا۔ مہدی اس سفر سے واپس آیا تو ابتری کے حالات دیکھے۔ ہادی بدتر مجلس مشاورت نے حالات کو بگڑنے نہیں دیا تھا لیکن کئی علاقوں میں بغاوت کے آثار تھے۔ مہدی نے حالات کی درستی کے لیے خالد برکی اور اس کے بیٹے یحییٰ کو اپنے حضور طلب کر لیا، خالد برکی اس وقت موصل کا والی تھا اور یحییٰ کے پاس آذر بایجان کی گورنری تھی۔

یحییٰ کا مہدی کے خاندان اور خصوصاً خیزران اور ہارون سے گہرا تعلق اس طرح تھا کہ ہارون کی پیدائش کے وقت خیزران کسی وجہ سے اپنا دودھ اسے نہیں پلا سکی تھی تو یحییٰ کی بیویوں میں سے دو نے اسے دودھ پلایا تھا۔ اب جو یہ خاندان بغداد میں آیا تو برکی خاتون اور خیزران کے مابین دوستی اور خلوص کا رشتہ دوبارہ بحال ہو گیا۔

خیزران کی سفارش پر مہدی نے یحییٰ کو اپنے بیٹے ہارون کا وزیر اور پرچہ نویس اور اس کی جاگیر کا منتظم بنا دیا۔ یحییٰ فہم و فراست اور تدبیر میں یکساں تھا۔ گفتگو کا ماہر اور تلوار کا دشمن تھا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ تاریخ آئندہ چل کر یحییٰ سے کیا کام لینے والی ہے۔

ہارون کی تربیت یحییٰ برکی کر رہا تھا اور موسیٰ کے ساتھ مہدی نے وہی طرز اختیار کیا جو اس کے باپ منصور نے

”ہمارے بڑوں کی بھی غلطی ہے کہ عباسی خلافت قائم کی اور عبد اللہ بن محمد کو خلافت پر متمکن کیا جو اتنا ظالم تھا کہ اس کا لقب ہی (سفاح) پڑ گیا تھا۔“ وہاں بیٹھے ہوئے ایک دوسرے شخص نے کہا۔

”میرے بھائی اس وقت لوگ اس لیے خاموش ہو گئے تھے کہ حکومت کی جڑیں مضبوط نہیں ہوئی تھیں لیکن جب سفاح نے حکومت اپنے بھائی ابو جعفر منصور کی طرف منتقل کر دی تو ہنگامہ ہوا تھا۔“

”آپ اسی ہنگامے کی بات کر رہے ہیں جس میں بغاوت ہوئی تھی۔ عبد اللہ بن عباس جس کے بانی تھے۔ جن کے پوتے اس وقت بھی یہاں موجود ہیں۔“

”جی ہاں۔ منصور نے انہیں قتل کر دیا تھا۔“

”یہ بغاوت اس وقت بھی فرو نہیں ہوئی تھی، دب ضرور گئی تھی اور وہ بھی اس لیے کہ حکومت منصور کے فولادی پنجے میں تھی۔ کسی کو سر اٹھانے کی جرأت نہیں تھی۔ یہ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ منصور نے بیس سال تک خلافت کی مخالفت کی آگ تقریباً سرد پڑ گئی۔ ممکن ہے یہ چنگاریاں بھی سرد پڑ جائیں لیکن اس نے خلافت اپنے بیٹے کے ہاتھ میں دے دی جبکہ عیسیٰ بن موسیٰ اس کے زیادہ مستحق تھے۔“

”اب تو موقع تھا۔ خلافت مہدی جیسے کمزور کے ہاتھ آگئی تھی لیکن عیسیٰ بن موسیٰ اس کا مقابلہ بھی نہ کر سکے مالِ دولوت لے کر وفہ جا کر گوشہ نشین ہو گئے۔ بلکہ میں نے تو دو شعر بھی ان کے لیے کہہ رکھے ہیں۔“

ابو موسیٰ نے موت کو ناگوار جانا حالانکہ اس کی موت باعث شرف و کرم تھی۔

اس نے جامہ سلطنت اتار دیا جو ابھی پرانا نہیں ہوا تھا۔

اور اس نے پہنا کیا۔

”سوال یہ ہے کہ ہمیں اب کیا کرنا چاہیے۔ اگر تلواریں مہدی کا علاج کر سکتی ہیں تو تلواریں بھی۔“

”میرے بچو، یہ نادانی مت کرو۔“ ایک بزرگ نے دخل دیا۔ ”پہلے ہم رائے عامہ کو ہموار کریں گے۔ میں کئی عباسی امیدواران خلافت کو جانتا ہوں جنہیں یہ امر ناگوار گزر رہا ہے۔ وہ خاموش ضرور ہو گئے ہیں لیکن چنگاریاں ان کے دلوں میں بھڑک رہی ہیں۔ انہیں بھڑکاتے رہو اور شعلہ بننے کا انتظار کرو۔“

”مجھے تو یہ تک معلوم ہے کہ فوج کے بعض افسران

رہا تو میں اسے انگلیوں پر چٹا سکتا ہوں۔
 یحییٰ جیسا ذہین اور بہادر شخص صرف ایک لڑکے
 (ہارون) کی خدمت پر قانع کیسے رہ سکتا تھا اور خاص طور پر
 اس صورت میں کہ ایان بن صدقہ مستقبل کے خلیفہ کا وزیر
 اور پورے مشرقی علاقہ سلطنت کا گورنر بنا رہے۔

اس کی بیویوں نے بھی یہی رائے دی کہ اس وقت
 خیزران کی مدد کی جائے اور اسے اعتماد میں لے کر آئندہ کے
 لیے راہ ہموار کی جائے۔ یحییٰ کے ہاتھ ایسا کارگر تھیار لگ
 گیا تھا جس کا کوئی ٹوڑ نہیں تھا۔

یحییٰ نے ایک مرتبہ پھر ملکہ خیزران سے ملاقات کی
 اور اسے یقین دلایا کہ دم چلنے والا لشکر کی کان اس کا بیٹا ہارون ہی
 کرے گا۔ اس سے یہ گزارش بھی کی کہ وہ بھی مہدی کو ہموار
 کرتی رہے۔

یحییٰ نے بڑی ہوشیاری سے اس مہم کا آغاز کر دیا۔
 خلافت کے حاشیہ نشینوں اور خلیفہ کے مقررین بارگاہ سے
 ملاقاتیں کر کے روم کی مہم کے لیے ہارون کا نام پیش کرتا
 رہا۔ ان میں سے ہر ایک کو صرف یہ اعتراض تھا کہ ہارون
 شخص سولہ سال کا ہے۔ یحییٰ اس اعتراض کا جواب یہ دیتا رہا
 کہ ہارون کو میدان جنگ میں تو اتارنا نہیں ہے۔ وہ تو محض
 ایک مشیل ہوگا، خلیفہ کا نمائندہ ہوگا۔ آل برک کے دلاور
 اس کے ساتھ ہوں گے۔ خالد برک اور یحییٰ بن یونس جیسے
 جنگ جو ہمراہ ہوں گے۔ یہ جنگ تو ہارون کی تربیت کے
 لیے محض ایک تماشائی ہوگی۔

”آپ لوگ جانتے ہیں ہارون نے میرے ہاتھوں
 پرورش پائی ہے۔ میں اس کی تربیت کرتا رہا ہوں۔ میں
 چاہتا ہوں اسے جنگ کا عملی تجربہ بھی ہو جائے۔“

یہ بات آگے بڑھی تو مہدی تک بھی پہنچی۔ یحییٰ نے
 اس سے بھی یہی کہا کہ یہ شرف اگر ہارون کو مل گیا تو آل
 برک بڑے ذوق سے اس جنگ میں حصہ لیں گے۔ میری
 تین بیویاں ہیں۔ ان کے الگ الگ قبیلے ہیں اور وہ تینوں
 ہارون کو بیٹوں کی طرح چاہتی ہیں۔ ان کی رضائی ماں
 ہیں۔ ان کے قبیلوں کے دلاور ہارون کا ساتھ دیں گے۔
 ہارون کی تربیت کے لیے ایک اچھا موقع بھی ہے۔

”یحییٰ تو جانتا ہے کہ ہارون کم سن ہے، اپنی ماں کا
 لاڈلا ہے اور پھر اس کی شادی بھی ابھی نہیں ہوئی۔ جنگوں
 میں سب کچھ ہوتا ہے۔ اگر اس کی جان کو زیاں پہنچا تو اس
 کی ماں مجھے زندہ نہیں رہنے دے گی۔“
 ”آپ نے بجا فرمایا۔ اس کے لیے ملکہ عالیہ سے

تھی اور عیسیٰ بن موسیٰ کو ولی عہدی۔ یہاں تو ایک نیام میں دو
 ٹکڑوں والا معاملہ ہوگا اور پھر ہارون ابھی پورے سولہ کا
 بھی نہیں ہوا۔“

”کیا میری طرح آپ کو یہ خوشی نہیں ہوگی کہ ہارون
 کو ولی عہد دوم بنادیا جائے۔“

یحییٰ سے پہلے اس کی بیوی زینب بنت منیر یول
 تھی۔ ”ہارون کے ولی عہد بننے کی جتنی خوشی آپ کو ہوگی اتنی
 ہی مجھے ہوگی کیونکہ وہ میرا بھی بیٹا ہے۔ اب اس میں کیا
 رکاوٹیں ہیں یہ تو یحییٰ جانیں۔“

”جب تم بھی یہی چاہتی ہو تو اپنے میاں سے کیوں
 نہیں کہیں۔ وہ تمہاری خوشی پوری کریں۔“

”یہ کب انکار کر رہے ہیں۔ ہم سب مل کر خلیفہ پر
 دباؤ ڈالیں گے۔“

”مجھے ایک بات کان میں ڈالنی تھی۔ کوئی ترکیب
 سوچو کہ ہمارے اور تمہارے خاندان میں یکاگرت کا رشتہ
 مزید مضبوط ہو جائے۔“

خیزران نے ایک قسم کا لالچ دیا اور اٹھ گئی۔
 خیزران جو چاہتی تھی یحییٰ نے اس پر غور کرنا شروع
 کیا کہ اگر ہارون کو ولی عہد بنادیا جاتا ہے تو خود اسے کیا
 فائدے پہنچ سکتے ہیں۔ اپنے فائدے کا سوچتے ہوئے سب

سے پہلے اسے ایان بن صدقہ کا خیال آیا۔
 جس وقت مہدی نے موسیٰ ہادی کو ولی عہد مقرر کیا تھا
 تو ایان بن صدقہ کو ہادی کا وزیر مقرر کیا تھا اور ہارون کی
 وزارت یحییٰ بن خالد کو سونپی تھی۔ ان دونوں وزیروں میں
 بہت جلد چشمک شروع ہو گئی۔ دونوں میں بغض و عداوت کا
 دور شروع ہو گیا۔

ایان بن صدقہ چالیس چلنے میں نہایت ماہر تھا اور پھر
 ولی عہد کا وزیر تھا۔ یحییٰ کو دھڑکا کرتا تھا کہ وہ کسی وقت بھی
 اسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اب خیزران کی صورت میں اسے
 ایک ہتھیار ہاتھ آ رہا تھا۔ اگر ہارون کو کسی طرح ولی عہد دوم
 بنادیا جائے تو وہ ہمیشہ اس کی احسان مند رہے گی۔ اس کے
 ذریعے مہدی سے ہر کام نکلوا جاسکتا ہے یہاں تک کہ ایان
 بن صدقہ کو بھی راستے سے ہٹا جاسکتا ہے۔

اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر موسیٰ ہادی کے بعد جانشین کا
 مسئلہ آیا تو ممکن ہے بڑا ہونے کے سبب رابطہ کے بیٹے کو ولی
 عہد بنادیا جائے۔ اگر ہارون کو اسی وقت ولی عہد بنادیا جاتا
 ہے اور کل کلاں کو وہ خلیفہ بن جاتا ہے تو اس کی نوازشیں
 میرے خاندان پر نہیں کی اور اگر اس وقت تک میں زندہ

تھا کہ دروازے کھول دیے جائیں۔ کسی روک ٹوک کے بغیر
 پاکیاں اندر پہنچ سکیں۔ یحییٰ بذات خود اور اس کی بیویوں
 بیویاں استقبال کے لیے موجود تھیں۔

”کنیزوں کو مشرقی ایوان کی طرف بھیج دیا گیا۔
 خیزران کو یحییٰ کی بیویاں مشرقی ایوان کی طرف لے گئیں
 جہاں ایک کشادہ ہال تھا۔ جب تمام خواتین بیٹھ چکیں تو یحییٰ
 نے اپنا جس دور کرنے کے لیے گفتگو کا آغاز کیا۔“

”ملکہ عالیہ، میری عقل نے یہ تو مجھے باور کرایا ہے کہ
 آپ کا قدم رنجہ ہونا کسی خاص بات کی طرف دلالت کرتا ہے
 لیکن وہ بات کیا ہو سکتی ہے یہ جاننے کے لیے بے قرار ہوں۔“

”کیوں یحییٰ، کیا ہم یونہی تمہاری بیویوں سے ملنے
 اور خاص طور پر تمہاری بیوی زینب سے ملنے نہیں آسکتے؟
 زینب تو ہمارے بیٹے ہارون کی رضائی ماں ہیں۔ انہوں
 نے ہمارے بیٹے کو دو دھ پلا کر تندرست دیا تو انکیا ہے۔“

”ملکہ عالیہ، یہ ہمارا نہیں آپ ہی کا گھر ہے۔ ہمیں جو
 کچھ ملا ہے آپ ہی سے ملا ہے۔ میں تو صرف اس لیے فکر مند
 تھا کہ سلطنت کے ہزار کھیرے ہوتے ہیں۔ اس خادم کے
 لیے شاید کوئی کام نکل آیا ہو۔“

”شاید ایسا بھی ہو۔ خیزران نے شکفتگی سے کہا۔
 ”دیکھ کیجئے، بندہ کوش بر آواز ہے۔“

”یحییٰ ہمیں معلوم ہے ہارون کو ہم کتنا چاہتے ہیں۔“
 ”یہ بات بتانے کی نہیں۔“ یحییٰ نے کہا۔ ”اور یہ بھی
 ہے کہ موسیٰ بھی آپ ہی کا بیٹا ہے۔“

”اس کی نافرمانی اور خود سری بھی آپ کے علم میں
 ہوگی۔“

”ملکہ عالیہ ابھی بچپن ہے اور پھر اپنا اپنا مزاج
 ہوتا ہے۔“

”ہم اس کی شکایت آپ سے نہیں کر رہے ہیں
 ہارون کی حمایت کے لیے آئے ہیں۔“

”میں کچھ سمجھانیں۔“
 ”ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہارون کو ہادی کا ولی عہد مقرر
 کر دیا جائے تاکہ ہادی کے بعد سلطنت رابطہ کے بیٹے کی
 طرف منتقل نہ ہو جائے۔“

”آپ کیا جانتی ہیں یہ اتنی آسان بات ہے۔ ایک
 سلطنت میں دو ولی عہد۔ لوگ اسے قبول کر لیں گے؟“
 ”کیا اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا۔ مہدی اور عیسیٰ بن
 موسیٰ کے سلسلے میں بھی یہی ہوا تھا۔“

”وہ دوسرا معاملہ تھا۔ خلیفہ مہدی کو خلافت عطا ہوئی

اسے ولی عہد بنانے کے بعد دروازہ کھلا تھا یعنی یہ کہ ولی عہد کو
 سلطنت کی ذمہ داریاں سونپی جائیں تاکہ کامیابی اور
 ناکامی ہر دو صورتوں میں وہ تجربے کی راہ سے گزرے۔
 رجال دولت کا قرب بھی اسے حاصل رہے۔

وہ نئے ولی عہد کو تربیت کی منزلوں سے گزار رہا تھا
 لیکن ایک خفیہ ہاتھ ایسا بھی تھا جو کسی پردہ ایک نیا مکمل
 شروع کرنے والا تھا۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ یہ خبر سماعتوں کے
 دروازے سے ٹھٹھکنا لگی کہ خلیفہ مہدی ملک روم پر
 چڑھائی کرنے والا ہے۔

یہ خبر افواہوں تک محدود رہتی لیکن جب خلیفہ نے
 خراسان، شام اور شمالی عراق میں فراہم بھیجے کہ جلد از جلد
 سپاہیوں اور افسروں کی جتنی تعداد مہیا ہو سکے مرکز خلافت
 میں روانہ کر دی جائے اور ان فراہم کے جواب میں لشکر
 کے لشکر آنے اور بیرون بغداد پڑاؤ کرنے لگے تو ان
 افواہوں میں جان پڑ گئی۔ سب کو یقین آ گیا کہ یہ خبر نہیں
 واقعہ ہے۔

اس خبر پر یقین آنے کے بعد یہ چہ میگوئیاں ہونے لگی
 تھیں کہ اس لشکر جراری قیادت کون کرے گا؟ یقیناً یہ عہدہ
 ولی عہد موسیٰ ہادی کو دیا جائے گا جس نے ابھی تک میدان
 جنگ میں قدم نہیں رکھا۔ ضروری ہے کہ یہ تجربہ بھی اسے
 حاصل ہو جائے۔

۵۵۵

پاکی تیار تھی۔ دو کنیزیں خیزران کے ساتھ تھیں۔ یہ
 ایسی باوقاف تھیں کہ سینے میں خیزران کا راز کسی
 پر ظاہر نہ کریں۔ پاکی کے ساتھ چلنے والوں کے سوا کسی کو
 معلوم نہیں تھا کہ وہ یحییٰ بن خالد کے دولت کدے کی طرف
 روانہ ہو رہی ہے۔ یحییٰ کے گھر جانا کوئی ایسی بات نہیں تھی
 جسے چھپایا جاتا لیکن اس وقت وہ جس مہم پر جاری تھی اس کا
 تقاضا یہی تھا کہ احتیاط سے کام لیا جائے یا اس کے دل کا چور
 تھا جو اسے ضرورت سے زیادہ محتاط رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔
 پاکی کا رخ باب الشام کی طرف ہوا تو پاکی میں سوار
 کنیزوں نے اپنے دوپٹے درست کیے اور سنبھل کر بیٹھ
 گئیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یحییٰ بن خالد کا کل بس قریب
 ہی ہے۔

یحییٰ کو شاید پہلے ہی خبر کر دی گئی تھی کہ مہمان آنے
 والے ہیں۔ انہیں ہرگز نہ روکا جائے۔ پھر سے داروں میں
 سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ پاکی میں کون سوار ہے لیکن حکم یہی

مذہب کی طرف حایا جاسکتا تھا۔ وہ ہارون سے چند مہینے چھوٹی تھی یعنی ہم عمر ہی تھی۔

بچپن میں ایک ساتھ کھیلے تھے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی پسندیدگی کوئی اور رخ اختیار کرتی گئی۔ قربت نے محبت کا احساس پیدا کر دیا۔ راز و نیاز کی منزلیں طے ہونے لگیں۔ پہلے اشعار کا تبادلہ ہوا پھر زبانی سلام و پیام ہونے لگے۔ زبیدہ میں فطری جھجک ضرور تھی لیکن بچپن سے ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے شرم دھیانے پر سمیٹ لیے تھے۔ دونوں کھٹنوں باتیں کرتے رہتے تھے۔

یہ عشق آخر جنون میں تبدیل ہو گیا۔ ہارون کو اسے دیکھے بغیر چین نہ آتا تھا۔ زبیدہ بھی اس کے جذبے سے نادانف نہیں تھی لیکن اسے ڈرتا تھا کہ خیزران ان دونوں کو ایک نہیں ہونے دے گی۔

”ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم تم سے شادی کریں گے۔“
”ہمارے فیصلہ کر لینے سے کیا ہوتا ہے ہارون۔“

”ہمارے بڑے بھی انکار کیوں کریں گے؟“
”وہ یقیناً یہ چاہیں گے کہ شہزادے کے لیے کسی شہزادی کا انتخاب کریں۔ میں ایک بیٹیم لڑکی انہیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہوں۔“

”تم میری عم زاد بھی تو ہو۔ یہ اعزاز کسی غیر شہزادی کو حاصل نہیں ہوگا۔“

”لوگ تو اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔“
”اسی لیے تو میں اپنا فائدہ دیکھ رہا ہوں۔“ ہارون نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھنساتے ہوئے کہا۔

”آپ کا بھلا کیا فائدہ؟“
”زبیدہ کیا تم میرے لیے مجسم فائدہ نہیں؟ تم کہو تو میں بخین چچا سے بات کروں۔ وہ اسی حضور سے بات کر لیں گے۔“

”خبردار! ایسا ہرگز نہ کرنا۔ اگر بات کرنی ہے تو اسی حضور سے خود بات کیجیے۔ بخینی بن خالد آپ کی بات سن ضرور لیں گے لیکن اپنی بیویوں سے بھی ضرور کہیں گے اور پھر بات بہت دور تک جائے گی۔ دنیا پر یہ ظاہر نہیں ہوتا چاہیے کہ ہماری شادی پسند کی شادی ہے۔“

”اگر اسی حضور نے انکار کر دیا؟“
”وہ انکار نہیں کرے گی۔“
”تمہیں اتنا یقین کیوں ہے۔“

”باتوں باتوں میں وہ آپ کا ذکر چھیڑ دیتی ہیں اور پھر میرے چہرے کا رنگ دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا ہے۔ اگر وہ مجھے ناپسند کرتیں تو مجھے یہاں سے

اس فتح کو کس انداز میں پیش کرنا ہے اس کا انتظام بھی بخینی نے کر رکھا تھا۔ فتح کے پھرے اڑا تا ہارون رشید بغداد کے نواح میں پہنچا تو باشندگان بغداد اپنے خلیفہ اور اس کے ندیموں اور منصب داروں اور امرا کے ساتھ مجاہدوں کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکل آئے۔

ہارون اس شان سے شہر میں داخل ہوا کہ اس کے ساتھ درمیں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی جو رضا کارانہ طور پر اس کے ساتھ چلے آئے تھے۔ جزیرہ اور مال غنیمت کا ایک اہل تھا۔ فرزند امیر المومنین کے خیرے بلند ہو رہے تھے۔

شہر کے تمام دروازوں پر چراغاں کیا گیا۔ یہ رات جشن مسرت کے طور پر منائی جا رہی تھی۔ قصر خلافت کی تو شان ہی دوسری تھی۔ خیزران مبارکبادوں کے جھوم میں گھری ہوئی تھی۔

بخینی کی اسکیم کامیاب رہی تھی۔ بغداد سے واپس آتے ہی خلیفہ نے ایک فرمان صادر کر کے سلطنت کے پورے غری علاقے کا اسے والی بنادیا۔ اس علاقے میں شمالی افریقہ، مصر، شام، آرمینیا اور آذربائیجان شامل تھے اور بخینی اس کا وزیر اعظم اور ناظم امور اور کاتب بن گیا۔ بخینی جیسے زیرک آدمی کو اسنے اختیارات کا مل جانا تمام مسائل کا حل تھا۔

اب ایک بھائی مشرق میں دوسرا مغرب میں تھا۔

ہارون رشید کے ایام طفولیت میں اس کا چچا جعفر اکبر دو بچوں کو چھوڑ کر انتقال کر گیا تھا۔ بیٹے کا نام بخینی جعفر تھا اور بخینی کا نام امتہ العزیز تھا (بخینی امتہ العزیز بعد میں زبیدہ کہلائی)

جعفر اکبر کی وفات کے بعد اس خاندان کی کفالت خلیفہ منصور نے اپنے ذمے لے لی۔ امتہ العزیز خوب صورت، نازک اندام اور لمبے بالوں والی لڑکی تھی۔ اس کی نزاکت اور رنگ روپ کو دیکھ کر منصور اسے ”زبیدہ“ کہنے لگا بخینی بھن۔ بعد میں بخینی اس کا نام پڑ گیا۔

وہ دس سال کی ہوئی تو منصور بھی انتقال کر گیا۔ اب زبیدہ کی پرورش مہدی نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مہدی نے اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ اس کی پرورش شہزادیوں کی طرح ہو رہی تھی۔ وہ خود بھی ایسی ذہین ثابت ہوئی کہ جو پڑھایا درکھا۔ تاریخ و ادب پر اس کی گہری نظر تھی۔

خلیفہ اس سے مخاطب ہوا۔

”میں نے اپنے اہل دولت میں سے ہر ایک پر اس نیت سے نظر ڈالی کہ کسی ایسے معتمد شخص کو منتخب کروں جسے ہارون کے ساتھ طور کاتب اور ناظم الامور بھیج سکوں۔ اسے بخینی اتیر کے سوا کوئی نظر نہ آیا۔ تجھے میں اس لیے ترجیح دیتا ہوں کہ تو نے اسے پالا اور اس کی تربیت میں حصہ لیا ہے لہذا یہ ذمے داریاں میں تجھے سونپتا ہوں۔ میں تجھے ایک لاکھ درہم دیتا ہوں جو زوارہ کے طور پر تیرے کام آئیں گے۔ دیکھ میرے حسن ظن کو قائم رکھنا۔“

بخینی نے سر تسلیم خم کیا۔
یہ یقیناً خیزران کی کارگزاری تھی۔
مہدی بہ نفس نفیس اس لشکر کے ساتھ مومل تک گیا۔
یہاں ایک مرتبہ پھر اس نے سرداران لشکر کو جمع کیا۔

”ہارون کا خاص طور پر خیال رکھنا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ خطرات سے کھیلنے میں بہت زیادہ بے پردا ہے۔“

ہارون سے مخاطب ہوا۔ ”خبردار! خالد بن برمک اور ربیع بن یونس جیسے اصحاب دہائے کے مشورے کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھانا۔“ مہدی پادشحت کی طرف لوٹ آیا اور لشکر نے ہارون کی نگرانی میں بلادروم کی طرف کوچ کیا۔ یہ لشکر آگے بڑھتے ہوئے ایک رومی شہر کے قریب پہنچا جس کا نام سالو تھا۔ ہارون کا لشکر غلیم دیکھ کر قلعہ والوں کو مقابلے کی تاب نہ ہوئی اور قلعے کے چھانک بند کر لیے۔ ہارون نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور قلعہ سر کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ یہ محاصرہ چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے باوجود طویل کھینچتا رہا۔ یہاں تک کہ اہل قلعہ عاجز آ گئے۔ قلعے میں پانی کی کمی نے انہیں مسلح پر مجبور کر دیا اور چند شرائط پر ہتھیار ڈال دیے۔

ہارون نے یہ شرائط مان کر انہیں امان دے دی اور باشندگان کے ساتھ نہایت حسن سلوک کے ساتھ پیش آیا۔ بخینی اور چند دوسرے برمک سرداروں نے ہارون کو مشورہ دیا کہ بغداد واپس چلا جائے۔ مہدی نے اس سے کہہ دیا تھا کہ سرداروں کے مشورے پر عمل کرے۔ ہارون نے ان کی بات مان لی اور حسب ضرورت سپاہ و ہاں چھوڑ کر بغداد کی طرف چل دیا۔

بخینی نے واپسی کا مشورہ کیوں دیا اور ایک ہی قلعہ کی فتح پر انکشاف کیوں کر لیا؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا لیکن جو عمر راز تھے وہ سمجھتے تھے۔

بخینی کا مقصد صرف ہارون کی شان و شوکت میں اضافہ کرنا تھا۔ ایک فتح سے یہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اب اگلی

اجازت ضروری ہے۔ آپ ان سے بات کر لیں۔ اگر وہ اجازت نہیں دیتیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں اپنی رائے واپس لے لوں گا۔“

بخینی نے بھی کہا تو مہدی، خیزران سے ضرور پوچھتا۔ اس کے مشورے کے بغیر وہ سلطنت کا کوئی کام ہی انجام دیتا تھا۔ اس نے خیزران سے مشورہ مانگا۔ خیزران نے بھی شد و مد کے ساتھ اسی خواہش کا اظہار کیا۔

”مردوں کے لیے جنگ ایسا بازار ہوتی ہے جہاں عزت کی موت اور شہرت و ناموری دونوں فروخت ہوتی ہیں۔ مجھے ہارون کی موت بھی قبول ہے اور شہرت و ناموری بھی۔ وہ جو لے کر لوٹے گا میرے لیے تحفہ ہوگا۔“

”مومن ولی عہد ہے وہ اسے اپنی حق تلفی سمجھے گا۔“
”وہ ولی عہد بن گیا ہے۔ کل کو خلیفہ بھی بنے گا۔ اس کے لیے ہزار مواخ ہیں۔“ مہدی اس کی طرف سے بھی مطمئن ہو گیا۔

بخینی نے ایک مرتبہ بھر ملاقات کی۔ یہ ملاقات خیزران کے بلاوے پر ہوئی۔

”میں نے تم سے ہارون کی ذیلی عہدی طلب کی تھی۔ تم نے مہدی کے کان میں صرف لشکر کی سرداری کی بات ڈالی۔“

”ملکہ عالیہ، میں جو کر رہا ہوں مجھے کرنے دیجیے۔ ہتھیلی پر برسوں نہیں جتی۔ پودا ایک دن میں درخت نہیں بن جاتا۔ پاؤں اٹھاتے ہی منزل میں مل جاتی۔ میں تو ابھی صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہارون دنیا کی نظروں میں فاتح بن جائے۔ اس کی شان و شوکت میں اضافہ ہو۔ اس کے کارنامے زبان زد عام ہوں۔ یہ بخینی منزل ہے اگلی منزل کا انتظار کیجیے۔“

مہدی نے اب پوری طرح ارادہ کر لیا تھا کہ وہ شرف سیادت ہارون کو بخینے۔

لشکر کی روانگی میں چند روز باقی رہ گئے تھے کہ مہدی نے چند سربراہان و لوگوں کو جمع کیا تاکہ وہ کسی ایسے شخص کا لشکر کی سیادت کے لیے انتخاب کر لیں جو اس اہم ذمے داری سے عہدہ برآ ہو سکے اور اپنی طرف سے ہارون کا نام پیش کیا۔

کس کی جرأت تھی کہ مطلق العنانی کے اس دور میں خلیفہ کو غلط کہتا۔ دے بے نظروں میں کچھ اعتراضات ہوئے بھی تو خلیفہ نے انہیں رد کر دیا۔ اس نام پر اتفاق ہو جانے کے بعد خلیفہ نے بخینی کو اپنے قریب بلایا۔ جب وہ قریب آ گیا تو

نبی

اسلام میں نبی کی اہمیت
حضرت محمد ﷺ نے فرمایا۔☆ عورت کے لیے یہ بہت ہی مبارک ہے کہ
اس کی پہلی اولاد بڑی ہو۔☆ جس شخص کے بیٹیاں ہوں اس کو برامت
سمجھو اس لیے کہ میں بھی نبی کا باپ ہوں۔

☆ بیٹیاں ماں باپ کا سکون ہوتی ہیں۔

☆ بیٹیوں کو پھولوں کی مانند رکھو کیونکہ یہ

پرائی ہیں۔

☆ جب اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے تو زمین پر نبی

پیدا کرتا ہے۔

مرسلہ: طیب شاہین، منڈی بہا الدین

سیاسی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

ابھی ہارون اس شر خوشگوار کا حظ اٹھانے میں
مشغول تھا کہ سیاست نے نیک اور مہرہ اس کے سامنے رکھ
دیا۔ قصر خلافت کی پس پردہ سازشوں نے ایک مرتبہ پھر
اسے آگے کر دیا۔ابھی بغداد جشن مسرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ بلا دروم کی
سرحد سے خبر آئی کہ ایک فوجی سردار عبدالکبیر از خود اپنا چھوٹا
سا لشکر لے کر دشمن سے جنگ کرنے پہنچ گئے۔ لشکر کی تعداد
تین ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ روم کے بطریق نے انہیں یہ
آسانی کھلت دے دی اور تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ان میں سے چند زندہ بچ کر بغداد آگئے تھے اور وہی
یہ خبر لے کر آئے تھے۔ مہدی کو عبدالکبیر کی خود سری پر غصہ
آیا اور اسے فوراً گرفتار کر کے بغداد بلا لیا اور قید کر دیا۔
عبدالکبیر کی اس حرکت سے مسلمانوں کی سخت توہین
ہوئی تھی۔ مہدی کھست کے اس داغ کو دھو ڈالنا چاہتا تھا
چنانچہ اس نے ایک لشکر گراں تیار کرنے کا حکم دیا۔ایک مرتبہ پھر یہ سوال اٹھا کہ اس لشکر کی سیادت کسے
سونپی جائے۔ ہارون کا سوال اس موقع پر خارج از بحث
تھا۔ اس کی نئی بیٹی شادی ہوئی تھی۔ پھر یہ کہ اس مرتبہ مہدی
نے اعلان کر دیا تھا کہ اسلامی لشکر بلا دروم میں جہاں تک
بڑھتا ہے بڑھتا جائے۔ یہ ایسا عظیم الشان معرکہ تھا کہ 19
سال کے ہارون رشید کو مہدی کی خطرے میں نہیں ڈال
سکتا تھا لیکن قصر خلافت کی سیاست کی کافر مانیوں کا تقاضا
یہی تھا کہ اس مرتبہ بھی ہارون کو یہ فخر عطا کیا جائے۔یہ سیاست بھی کامیاب ہوئی۔ خیزران کا داؤ اس
مرتبہ بھی چل گیا۔ یعنی منزل کے قریب پہنچنے کے لیے بے
تاب تھا۔ہارون اپنا لشکر لے کر حدود سلطنت سے باہر نکلا۔
ایک مرتبہ پھر ایسا داؤ بیچنے نے موسیٰ بن مہدی کو پیچھے
دھکیل کر ہارون کو آگے کر دیا تھا۔یہ معلوم ہوتا تھا جیسے ہارون کو فتح یاب ہو کر جلد سے
جلد زبیدہ کے پاس لوٹنے کی جلدی ہو۔ جو شہر جو علاقہ
سامنے آیا اسے لپکتا ہوا دشمن کے اصل لشکر کے سامنے آکر
کھڑا ہو گیا۔طریقین میں گھمسان کا رن پڑا۔ یروانی کئی دن جاری
رہی اور بالآخر درمیوں کا سپہ سالار مارا گیا۔ رومی بھاگ
کھڑے ہوئے۔

ہارون ابواب قسطنطنیہ کی طرف بڑھا۔ اس نے قسم

”یہ آپ خود اس سے دریافت کر لیجئے گا۔“

”اگر اس سے تمہاری شادی کر دی جائے؟“

”یہ آپ پر منحصر ہے۔“

”اگر ہم انکار کر دیں؟“

”پھر میں یہ جسارت کروں گا کہ کہیں شادی نہ

کروں۔“

”تو پھر خوش ہو جاؤ۔ ہم تمہاری شادی زبیدہ سے

ضرور کریں گے۔“

”ہارون آپ کا احسان مندر ہے گا۔“

”زبیدہ ہمیں بھی بہت اچھی لگتی ہے۔“

شادی سے مہینوں پہلے بغداد کی گلیوں کو دھن کی طرح
سجا دیا گیا۔ اس جشن مسرت کے لیے خیزران نے اپنی
آمدنی کا ایک بڑا حصہ الگ کر دیا۔ یہ اس رقم کے علاوہ تھا جو
مہدی کے خزانہ حارہ سے اس موقع پر خرچ کیا جاتا تھا۔مہدی نے سرپرست کی حیثیت سے ساز و سامان،
جواہرات، زیورات، تاج و کلاہ زریں، سونے چاندی کے
برتن، نادر خوشبویات اور بیش بہا ملبوسات اس کثرت سے
دیے کہ اب تک کسی عورت کو نہ ملے ہوں گے۔اس تقریب میں شرکت کے لیے آفاق و اطراف سے
لوگ آئے تھے۔ مہدی نے دل کھول کر ان سب کو تحائف
دیے۔ دینار چاندی کے ڈبے میں، وہم سونے کے ڈبے
میں، عنبر، مشک اور عطریات شیشے کے ڈبے میں رکھ کر لوگوں
میں تقسیم کیے۔ قیمتی خلعت اور پارچہ جات عطا کیے۔ہر خاتون کو دینار سے بھری ایک تھیلی اور درہم سے
بھری ایک ہسانی اور خوشبویات سے بھرا ہوا ایک چاندی کا
ڈبہ عطا کیا اور نہایت قیمتی جوڑا دیا۔

اس شان کی مثال تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔

محمد بن سلیمان عباسی (خلیفہ مہدی کا داماد) نے اپنے
محل پر ایسا چراغ افشاں کیا کہ زمین پر سونے کی بڑی نظر آتی تھی۔
یہی وہ محل تھا جسے دلہا دھن کے رات گزارنے کے لیے
خصوص کیا گیا تھا۔کہا جاتا ہے اس رات خیزران نے زبیدہ کو ایک ایسا
جوڑا عطا کیا جس پر جواہر اور موتی لگے ہوئے تھے۔ یہ اتنا
بھاری تھا کہ اسے چمکن کر نازک اندام زبیدہ کے لیے
چلنا مشکل تھا۔ آخر اسے بدل کر دوسرا جوڑا پہنایا گیا۔سب سے زیادہ خوشی کا مظاہرہ آل برک کر رہے
تھے۔ انہوں نے دل کھول کر خوشی منائی اور جود و سخا کا
غیر معمولی مظاہرہ کیا۔ اس شادی کے بعد وہ حسب موقعکہیں اور بھیج دیتیں یا پابند پاں عائد کرتیں۔ مجھے تو یوں لگتا
ہے جیسے وہ میری حوصلہ افزائی کر رہی ہوں۔ ان کی مادرانہ
نوازشات روز بروز بدستی جاری ہیں۔“
”بس تو پھر کیا ہے، میں اسی حضور سے بات کر لیتا
ہوں۔“ہارون یہ باتیں کر رہی رہا تھا کہ زبیدہ کی نسوانی حس
نے اچانک شور مچایا۔”ہارون، ہم نے کچھ محسوس کیا؟“
”کیا؟“”ابھی ہمارے بہت قریب کوئی تھا۔ میں نے قدموں
کی آواز خود سنی ہے جیسے کوئی تیزی سے واپس پلٹا ہو۔“
”تمہارا وہم ہوگا۔ محل کے جس حصے میں ہم بیٹھے ہیں
وہاں کون آ سکتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے کوئی ہماری نگرانی کر رہا ہو۔“

”ہم کوئی مجرم نہیں ہیں جو ہماری کوئی نگرانی کر رہا ہوگا۔“
”اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ان کی دائمی نگرانی ہو رہی تھی۔ ایک کیز تھی جو چھپ
کر ان کی باتیں سن رہی تھی اور اب خیزران کے سامنے
کھڑی تھی۔ خیزران تک یہ تمام باتیں پہنچ گئیں۔خیزران کو اندازہ تھا کہ ہارون زبیدہ سے محبت کرتا ہے۔
وہ بہت دن سے غور کر رہی تھی کہ زبیدہ کو بھونپنا گھڑلانے میں
کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اس میں ایک فائدہ کا پہلو یہ تھا کہ بنو
ہاشم کی تائید و اعانت اسے حاصل ہو سکتی تھی کیونکہ زبیدہ نجیب
الطریقین ہاشمیہ تھی۔ آل برک کی تائید و اعانت حاصل کرنے کا
موقع بھی مل سکتا تھا۔ آل برک پہلے ہی ہارون کے قریب تھے۔
زبیدہ سے شادی کی صورت میں یہ معاونت اور بھی بڑھ سکتی تھی
اور ہارون کو آگے بڑھانے میں مدد مل سکتی تھی۔اس سے پہلے کہ ہارون کوئی ذکر چھیڑتا خیزران نے
خود اسے ٹھوٹا۔

”زبیدہ تمہیں کیسی لگتی ہے؟“

”ابا حضور نے اس کی پرورش شہزادیوں کی طرح کی
ہے۔ وہ تمام ہنر اسے سکھائے ہیں جو شہزادیوں کے حسب
حال ہوتے ہیں۔“

”ہم اس کی شکل صورت کی بات کر رہے ہیں۔“

”دادا حضور نے اسے زبیدہ کا لقب دیا تھا۔“

”کیا تم اس سے محبت کرتے ہو؟“

”کیسے کہہ دوں کہ نہیں؟“

”اور زبیدہ؟“

سب کچھ کر گزرتا جا ہے۔“

ایک باپ کی حیثیت سے وہ موٹی ہادی اور پارون رشید کو مساوی سمجھتا تھا۔ وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ہادی کو خواہ مخواہ اس کے حق سے کیوں محروم کر دیا جائے جبکہ وہ بہادر بھی تھا اور سختی بھی۔ تیغ زن بھی تھا اور صرف کلن بھی۔

سیاسی اعتبار سے بھی یہ اچھا فیصلہ نہ ہوتا۔ اسے خود اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ کسی زمانے میں اسے یہ غلط خبر ملی تھی کہ اس کا باپ منصور اسے ولی عہدی سے محروم کر کے یہ منصب اس کے چھوٹے بھائی جعفر اصغر کو دینا چاہتا ہے تو اس نے باپ کا کالجا نہیں کیا تھا اور باپ سے کہہ دیا تھا۔

”خدا کی قسم! اگر آپ نے ایسا کیا تو میں اسے قتل کر کے رہوں گا۔“

منصور نے جواب دیا تھا۔ ”تمہیں غلط خبر ملی ہے۔ ہم جعفر سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ اسے تمہارا نشانہ نہیں بننے دیں گے۔“ اگر یہ خبر غلط نہ ہوتی تو میں واقعی اپنے بھائی کو قتل کر چکا ہوتا۔ کیا یہ تاریخ پھر تو نہیں دہرائی جا رہی ہے اور پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ لوگ اسے کس نظر سے دیکھیں گے۔

وہ درست سمت میں سوچ رہا تھا لیکن خیزران اور امرائے بنو عباس کا ایسا دباؤ تھا کہ اس کی قوت مزاحمت جواب دے گئی۔

اس نے اس سازش کے سرکردہ لوگوں کو بلایا اور ان سے کہا۔

”مسلمانوں سے موٹی ہادی کی بیعت لی جا چکی ہے۔ اس کا انتزاع اسی صورت ممکن ہے کہ وہ خود اس سے دست بردار ہو۔“

”اگر آپ فرمائیں گے تو ولی عہد ہرگز سرتابی نہیں کریں گے۔“ لوگوں نے کہا۔

”آپ لوگ پہلے اس کے پاس جائیں اور اسے قائل کریں۔ اگر وہ مان گیا تو پھر میں فرمان جاری کر دوں گا۔“

ان لوگوں میں سے بعض جرجان پہنچے اور ہادی کے سامنے پوری بات رکھ دی۔ وہ ولی عہدی کیسے چھوڑ دیتا۔ لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ تیار نہیں ہوا اور برہم ہو گیا عالم طیش میں مہدی کو بھی خست ست کہہ دیا۔

یہ لوگ واپس چلے آئے۔ یہ ظاہرنا کام لوٹے تھے لیکن اتنا ضرور کر آئے تھے کہ ہادی کے دل میں باپ کے لیے نفرت پیدا ہوئی۔ مہدی سے ملاقات کر کے آخری کیل بھی ٹھوک دی۔ اس کی برہمی کے بارے میں

رکھتے تھے یا جنہیں اس کے ہاتھوں گزند پہنچی تھی ہادی کے حلقے میں آ گئے۔ کئی سرداران فوج بھی اس کی ٹوٹی میں آ گئے۔ وہ لوگ بھی اس کے پاس چلے آئے جو بجلی برقی کے خلاف تھے۔

یہی حال مہدی کے کل کا بھی تھا۔ یہاں بھی دو پارٹیاں کام کر رہی تھیں۔ ایک پارٹی موٹی ہادی کی پشت پناہ تھی دوسری ہارون کے حق میں تھی۔ ہارون کا پلڑا اس لیے بھاری تھا کہ اس کے ساتھ خیزران بھی اور اب زبیدہ بھی آ گئی تھی۔ زبیدہ کو ابھی سیاست کی سمجھ نہیں تھی لیکن اتنا شعور تو تھا کہ معاملہ اس کے شیر کا ہے۔ وہ ہادی کو نقصان پہنچانے میں شریک نہیں ہو سکتی تھی لیکن اپنے شوہر کے دفاع میں تو جوش و خروش دکھا سکتی تھی۔

خیزران کا تیر نشانہ پر لگا تھا۔ زبیدہ کی وجہ سے امرائے بیت ہاشمی بھی خیزران اور ہارون کی حمایت کر رہے تھے۔ ان خائفوں کو ابھارنے اور رنگ دینے کے لیے یحییٰ موجود تھا۔ اسے اس سیاست میں خفیہ ہاتھ کہا جاسکتا تھا۔ اس خفیہ ہاتھ کو فوراً حرکت میں آنے کا موقع مل گیا۔

جرجان سے خلیفہ کے پاس خبریں پہنچنے لگیں کہ کوہستانی علاقے میں زبردست بغاوت ہوئی ہے۔ پھر یہ خبر آئی کہ یہ بغاوت طبرستان تک پہنچ گئی ہے۔

مہدی نے بغاوت فرد کرنے کے لیے لشکر تیار کرنا شروع کر دیا۔ ایک مرتبہ پھر سیاست کا مسئلہ سامنے آیا۔ سازشیں کام کر رہی تھیں۔ مہدی کو شورو دیا گیا کہ سیاست کا شرف ہادی کو دیا جائے تاکہ ہارون کو۔ مہدی کے سامنے یہ دلیل پیش کی گئی۔

”وہ چونکہ شرقی حصے کا گورنر ہے اس لیے یہ فتنہ داری اسی کو سونپی جائے۔“

کوہستانی علاقہ دشوار گزار راستوں پر مشتمل تھا۔ باغیوں کو چل دینا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ ایک سال سے کچھ اوپر کی مدت گزری اور جنگ ختم نہیں ہوئی۔ محاذ جنگ گرم تھا۔ بغداد موٹی ہادی اور اس کے اعوان و انصار سے تقریباً خالی ہو چکا تھا کہ سازشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سازشوں کا مقصد یہ تھا کہ ہادی کو ولی عہدی سے معزول کر دیا جائے اور پہلا ولی عہد ہارون کو بنا دیا جائے۔ جب پہلے پہلے مہدی کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ اسے حیرت اس لیے ہوئی تھی کہ اس مرتبہ یہ تجویز امرائے بنو عباس کی طرف سے آئی تھی۔ یعنی ان سازشیوں کا رہنما تھا اور کہہ چکا تھا۔ ”حصول مقصد کے لیے

بھائیوں میں جنگ ہوگی؟ یہ سوچ کر ہی وہ کانپ گیا۔ ایک مرتبہ پھر اس کا ارادہ متزلزل ہو گیا، اس نے خیزران کو اپنے خواب سے آگاہ کیا اور نتائج بتائے لیکن خیزران کچھ سننے کو تیار نہیں تھی۔ وہ بڑے بڑے موٹی کی نافرمانی سے خوش نہیں تھی۔ ہارون کو بہت عزت پر گھٹی تھی۔ وہ وہاب سے بھی سوچنے لگی تھی کہ صرف ولی عہدی نہیں ممکن ہو تو موٹی سے پہلے ہارون کو خلیفہ بننے میں مدد دے گی۔ یعنی بن خالد کی پوری مدد اسے حاصل تھی۔ وہ دراصل اپنی خیر خواہی جتا کر اور اپنی خواہشیں کا اثر ڈال کر خیزران کے ذریعے اپنے اقتدار اور سطوت کا راستہ صاف کر رہا تھا۔

باپ کے اس ارادے کی بھنگ ہادی کے کانوں میں بھی پڑ گئی تھی۔ کسی نے اسے مہدی کے خواب سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے اور بھڑکانے والے ندیم اور مصاحبین یہاں بھی کم نہیں تھے۔ وہ باپ کے غضب کا سامنا کرتے ہوئے تو ڈرتا تھا لیکن ماں سے تو اچھل سکتا تھا۔ اس نے خیزران پر پابندی لگانے کی کوشش کی کہ وہ یحییٰ اور اس کے گھر کی خواہشیں سے نہ ملا کرے لیکن وہ یہ بھول گیا تھا کہ خیزران لگتی بااثر ہے۔ یہ اذتو اس وقت کھلا جب اس کے اپنے مقرب لوگ بھی خیزران کے کن گاتے نظر آئے۔

ماں کے دل میں اس کی طرف سے مزید میل آ گیا۔ موٹی کو فی الحال چب ہونا پڑا لیکن ہارون کو وہ اپنے لیے مستقل خطرہ سمجھنے لگا تھا۔ اب دونوں بھائیوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے شکوک و شبہات کے سوا کچھ نہ تھا۔

مہدی سب کچھ جانتے ہوئے بھی خیزران کی بتائی ہوئی راہ پر چل پڑا۔ آخر ایک تقریب میں امرائے بنو ہاشم اور امرائے دولت کی موجودگی میں مہدی نے اعلان کر دیا کہ دوسرا ولی عہد ہارون ہوگا۔

ہارون کی شہرت عوام میں اتنی ہو چکی تھی کہ اس بیعت پر خوشی کا اظہار کیا گیا لیکن قوم کا فہمیدہ طبقہ فکر مند تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بیعت دونوں بھائیوں میں نفرت و عداوت کا سبب بنے گی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مملکت کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی۔ ایک مملکت میں دو بادشاہ لڑے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔

اس کا مظاہرہ ابھی سے ہونے لگا تھا۔ موٹی نے اپنے مستقبل کی حفاظت کے لیے امرائے بنو عباس کی ایک بڑی تعداد اپنے گرد جمع کر لی۔ عبدالملک بن صالح، یعنی بن موٹی، عباس بن محمد وغیرہ جو بھی مہدی سے پر خاش

استقبال کیا۔ خیزران محل کی کھڑکیوں سے ہارون کی پذیرائی کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب ہارون کو ولی عہد دوم بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میرے دونوں بیٹے خلافت کے مستحق ہوں گے۔ بس اب یہ اعلان باقی رہ گیا تھا کہ یحییٰ بن خالد آگے بڑھے اور ہارون کو ولی عہد دوم بنانے کی تجویز پیش کرے۔

دوسرے روز خلیفہ مہدی نے مختصر غلہ میں جلوس کیا اور دربار عام منعقد کیا۔ اسی دربار میں اس نے ہارون کو خلعت فاخرہ پہنایا اور ہارون کو ”رشید“ کا لقب دے کر ہارون رشید بنا دیا۔ اس دن کے بعد سے وہ اسی نام سے پکارا جانے لگا۔

خیزران کو اب کہاں ممبر ہونے والا تھا۔ ہارون کی شان و شوکت اور یحییٰ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر اس نے ہارون کی ولی عہد دوم ہونے کی تجویز مہدی کے سامنے رکھ دی۔

یہ ایک پرخطر تجویز تھی مہدی اس پر کبھی تیار نہ ہوتا لیکن تجویز پیش کرنے والی خیزران تھی۔ خیزران کی ضد کے سامنے سر تسلیم خم کرنا کوئی پہلی بات نہیں تھی۔ خیزران کے بہکاوے میں آ کر کئی بڑی بڑی غلطیاں کر چکا تھا لیکن شاید اس سے بڑی غلطی اب تک اس نے کی ہو نہیں سکتی جو وہ اب کرنے جا رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس غلطی سے آئندہ کیا پیش آ سکتا ہے۔

اس نے خیزران سے وعدہ کر لیا تھا لیکن وہ رات بھر نہ سو سکا۔ وہ اس اعلان کے بعد کے نتائج پر غور کرتا رہا۔ وہ امکانات بار بار اس کے ذہن میں آ رہے تھے جو دو بھائیوں کو یک وقت ولی عہد بنانے کے بعد آئندہ پیش آ سکتے تھے۔ صبح قریب بھی کسی اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں درخت کی دو شاخیں ہیں۔ ایک اس نے موٹی (ہادی) کے سامنے ڈال دی دوسری ہارون کے سامنے۔ موٹی کی شاخ پر چند پتیاں نکل آئیں جبکہ ہارون کی شاخ عمل طور پر سرسبز ہو گئی۔ آنکھ مٹلتی ہی اس نے تعبیر دینے والوں کو بلایا۔ انہوں نے اسے بتایا کہ موٹی کی مدت خلافت مختصر ہوگی جبکہ ہارون کی مدت تک بادشاہت کرے گا۔

اس سے آگے وہ کچھ نہ بتا سکے کہ موٹی کی مدت خلافت کم کیوں ہوگی۔ اسے کیا حادثہ پیش آئے گا کہ خلافت ہارون کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ کیا دونوں

اس نے کوششیں شروع کر دیں کہ کسی طرح ماں سے صلہ ہو جائے۔ اس نے اپنی طرف سے کوئی ایسا موقع نہیں آنے دیا جو خیران کی برہمی اور عتاب کا سبب بنے۔ اس کی خدمت میں تحائف بھی بھیجتا رہا لیکن کچھ دن کے وقفے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ خیران پرانی روش پر لوٹ آئی ہے۔ معاملات حکومت میں دخل اندازی کر رہی ہے۔ سفارش اور زور سے حاجت مندوں کی مدد کر رہی ہے۔ اس کی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ذرا اس کی غلط سفارشوں پر بھی عمل کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ ان لوگوں سے مکمل جوں بڑھ رہی ہے جنہیں ہادی اپنے لیے خطرہ سمجھتا تھا خصوصاً خاندان برک سے اس کا تعلق اور زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔

جب وہ بہت مجبور ہو گیا تو ایک روز اس نے خیران سے ملاقات کی اور اس کے طور طریقوں پر اسے ٹوکا۔ ”میں چاہتا ہوں آپ حرم تک محدود رہیں۔ حرم کے باہر جو امور ہیں ان میں دخل اندازی نہ فرمائیں۔ عورتوں کو زیبا نہیں کہ معاملات حکومت میں دخل دیں۔ میں آپ کی اطاعت کروں گا لیکن اس حالت میں نہیں جو طریقہ اب آپ نے اپنایا ہوا ہے۔“

”تو خلیفہ بننے ہی مجھ پر حکم جاری کرنے لگا۔“

”میں تو صرف گزارش کر رہا ہوں اور وہ بھی صرف اس لیے کہ آپ کی دخل اندازی سے مملکت کے کام بگڑتے ہیں۔“

”میں اسی لیے ہارون کو عزیز رکھتی ہوں کہ وہ میرے کاموں میں دخل نہیں ہوتا۔“

”میں بھی دخل اندازی نہیں کر رہا ہوں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے لیے آسانیاں فراہم کریں۔“

”میں نے تمہیں برداشت کر لیا ہے بس یہی بہت ہے۔“ خیران نے کہا اور عالم پیش میں دامن جھٹک کر کھڑی ہوئی ہادی واپس چلا گیا۔

ہادی اپنی ماں پر مکمل نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کی دانش نے فیصلہ دے دیا تھا کہ تمام سازشوں کا منبع اس کی ماں کی ذات سے ورنہ کس کی اتنی ہمت ہو۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ خیران کی حوصلہ شکنی کرتا رہے گا۔

دوسری طرف خیران پر ہادی کی نصیحت کا مطلق اثر نہیں ہوا تھا بلکہ اور زیادہ شدت کے ساتھ حکومت کے معاملات میں دخل ہونے لگی۔ اس جیسی ذہین عورت اس وقت مصلحت سے کام نہ لے سکی۔ اس کے غصے نے ٹھیل بگاڑ

ہارون بھئی کی کوئی بات نہیں مانتا تھا۔ اس نے اسی رائے پر عمل کیا اور مہدی کو ایک قریبی قریبے میں دفن کر دیا۔ تدفین کے بعد ان تمام لوگوں کو جو ساتھ آئے تھے جمع کیا اور ان سے موٹی ہادی کی خلاف ورزی پر بیعت لی۔ اس کے بعد لشکر کو روانہ کیا اور پیچھے خود بخود ہادی طرف روانہ ہو گیا۔ خیران دو صدیوں سے ایک ساتھ گزر رہی تھی۔ ایک تو اس کا شوہر دنیا سے رخصت ہو گیا تھا دوسرے یہ کہ بازی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اس نے تمام چالیں اس لیے چلی تھیں کہ موٹی ہادی ولی عہدی سے دست بردار ہو جائے نہ کہ یہ وہ خلیفہ بن گیا تھا۔ اسے یقیناً یہ فکر بھی ستا رہی ہوگی کہ کہیں سازشوں کا پردہ چاک نہ ہو جائے۔ اس نے گہرا کر بھئی کو طلب کیا۔

ہوا کا رخ تبدیل ہو گیا تھا۔ اب سیاہ سفید کا مالک موٹی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ موٹی کا پرداز ان حکومت کا خیران سے مکمل جوں پسند نہیں کرتا۔ اس وقت اس کی خفگی مول لینا دانش مندی نہیں۔ وہ خیران سے ملاقات میں لیت و تل سے کام لیتا رہا۔

مہدی کی وفات کے اٹھارہ دن بعد خلیفہ موٹی ہادی پای تخت بغداد میں وارد ہو گیا۔ امرائے شہر سرداروں قوم اور عساکرین حکومت نے شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔

ان لوگوں میں سب سے پیش پیش بھئی بن خالد برکی تھا۔ اس نے ہادی کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اس کی ناز مندی اور اطاعت کا مظاہرہ کیا جیسے اس سے پہلے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

”بدلتا ہے رنگ آسمان کہے کیسے“

بھئی کی حکمت عملی رنگ لائی۔ ہادی نے جب اس کا یہ عالم دیکھا اور اسے بعد میں بھی معلوم ہوا کہ خیران کی طبی کے باوجود یہ وہاں نہیں گیا تو اس کا دل صاف ہو گیا۔ اس نے بھی مصلحت سے کام لیا۔ کوئی باز پرس نہیں کی اور اسے سابقہ عہدے پر بحال رکھا۔

بھئی بہ دستور ہارون کے معاملات و انتظامات سرانجام دیتا رہا۔

ہادی کو معلوم تھا کہ اب تک جو نشیب و فراز آتے رہے اس میں خیران کا اہم کردار رہا ہے لیکن اب وہ اس کے لیے قابلِ رحم بھی نہیں کہ اس کا شوہر اس سے جدا ہو گیا تھا۔ یہ توقع بھی تھی کہ اب وہ سبق سیکھ جائے گی۔ امور مملکت میں دخل اندازی کے بجائے خاموشی سے شوہر کا سوگ منائے گی۔

اطلاع ہادی کو فوراً مل گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ اپنے حق سے محروم ہو کر رہے گا۔

جب مہدی نہروان کے قریب ایک مقام ماسیندان پر پہنچا تو یہاں پڑاؤ کرنے کا حکم دیا۔ صحت بہت اچھی تھی، بیماری قریب ہو کر بھی نہیں گزری تھی کہ ناگہانی موت کا شکار ہو گیا۔

سازشوں نے اپنا رنگ دکھا دیا۔

تاریخ نے یہاں عجیب رنگ دکھا دیا ہے۔ اس کی موت ایک معاہدے کی۔ کہیں لکھا گیا ہرن کے شکار کے دوران گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ کہیں لکھا گیا کہ ہر آلودہ مرد کھانے سے مرے گا۔ کسی نے یہ سب بتایا کہ ہر آلودہ حلو کھایا تھا۔ اس کے ارد گرد اتنے حاشیہ نشین موجود تھے کہ کسی کو بھی صحیح سبب معلوم نہ ہو سکا۔

شاید اصل بات یہ تھی کہ لوگوں نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ بات اس لیے پوشیدہ رکھی کہ مجرم کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ ولی عہد مملکت موٹی ہادی تھا۔ ایک مورخ نے بہر حال اس راز سے پردہ اٹھانے کی جرات کی۔

”خلیفہ مہدی نے جب یہ فیصلہ کیا کہ ولی عہد اول موٹی ہادی کے بجائے ہارون رشید کو بنا دیا جائے تو ہادی اسے برداشت نہ کر سکا۔ اس نے بعض باندیوں کو اپنے باپ کے خلاف آمادہ عمل کیا جنہوں نے چوری چھپے اسے زہر دے کر ہلاک کر ڈالا۔“

ہارون رشید کو ولی عہد اول بنانے کی سازش یا کوشش اس وقت تک کام ہوئی جب منزل بالکل قریب آگئی تھی۔

بھئی بن خالد اور اس کے سامنے اس حادثہ کا نگاہ سے کانپ اٹھے اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب کوئی مزاحمت نہ کی جائے۔ حالات جو رخ اختیار کر رہے ہیں اختیار کرنے دو۔ کوئی مزاحمت کی تو کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

مہدی کی وفات کے بعد ہارون رشید جو مہدی کے ساتھ نہروان آیا تھا۔ بھئی بن خالد کے پاس آیا۔

”اگر امیر المومنین کی وفات کا علم فوج کو ہو گیا تو کوئی نیا بگام نہ اٹھ کھڑا ہو۔ میرا خیال ہے فوج کو واپس جانے کا حکم دیا جائے اور ہم بعد میں نقش لے کر بغداد جائیں، آپ کی کیا رائے ہے؟“

”میری تو یہ رائے نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ خلیفہ کو یہیں دفن کر دیا جائے۔ پوشیدہ طور پر انکساری اور عصا ہادی کو بھیج دیجیے۔ اس کے بعد فوج کو واپس جانے کا حکم دیجیے۔ پھر کوئی چوں چرائیں کرے گا۔“

کچھ نہیں بتایا بلکہ اسے مشورہ دیا کہ آپ اسے خط لکھ کر بغداد بلا لیں۔ اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ انکار نہیں کرے گا۔ بس وہ یہ چاہتا ہے کہ یہ بات آپ اس سے کہیں شاید اسے ہم پر اعتبار نہ ہو۔

مہدی نے یہ انتظار بھی نہیں کیا کہ جنگ ختم ہونے کا انتظار کرے۔ اس نے ہادی کو خط لکھ کر بغداد طلب کیا۔ ہادی نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ نامہ بر کے سامنے باپ کا خط چھاڑ کر پھینک دیا اور نامہ بر کو مار پھینک کر باہر نکال دیا اور بغداد میں اپنے ہوا خواہوں کو لکھ بھیجا کہ حالات پر نظر رکھیں اور مجھے برابر اطلاع دیتے رہیں۔

مہدی کو جب معلوم ہوا کہ ہادی نے یہ حرکت کی ہے تو غصہ نہ تو بہت آیا لیکن بیٹے کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے باز رہا کیونکہ اسے احساس تھا کہ ہادی کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ ابھی غصے میں ہے غصہ اترتے ہی ٹھیک ہو جائے گا۔

سازشی عناصر خوش ہو رہے تھے کہ انہوں نے باپ بیٹے کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ مہدی ضرور ہادی کے خلاف لشکر کشی کرے گا۔

جب انہوں نے دیکھا کہ مہدی کسی کارروائی کا ارادہ نہیں کر رہا ہے تو انہوں نے خیران کو اسکا باپ۔

”اگر امیر المومنین نے کوئی کارروائی نہیں کی تو ہادی کی ہمت دراز ہو جائے گی۔ اگر امیر المومنین اپنی ذلت پی گئے ہیں تو آپ ہی کچھ کیجیے۔“

”آپ مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟“

”آپ ہادی کے خلاف علم مخالفت بلند کریں اور اپنے شوہر کی تذلیل کا بدلہ لینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوں ورنہ ہارون ہمیشہ کے لیے خلافت سے محروم کر دیا جائے گا۔“

ہارون کی محبت نے اسے اتنا اندھا کر دیا تھا کہ وہ ہادی سے بدلہ لینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مہدی نے جب بگڑتا ہوا رنگ دیکھا تو اسے اپنے باپ منصور کا کہا یاد آیا۔

”خبردار! اپنے معاملات میں عورتوں کو دخل انداز مت ہونے دینا لیکن مجھے اندیشہ ہے تم ایسا ضرور کر دو گے۔“

اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

سازشیوں کا اصرار تھا کہ مہدی خود جرجان جائے جہاں ہادی قیام پذیر تھا۔ مہدی اتنا مغلوب ہو چکا تھا کہ اس نے یہ رائے بھی مان لی۔ مہدی نے اپنے خاص خاص آدمیوں کو ساتھ لیا اور جرجان کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی

دیا۔ اس کی مداخلت سے سرکاری کام چوہٹ ہو کر رہ گئے۔
تمام سازشی لوگ وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس
سے الگ ہو گئے تھے۔ خیزران جھجلاہٹ سے بے حواس
ہو رہی تھی۔

ایک دن خلیفہ کی محافظ جماعت کا سردار عبداللہ بن
مالک اپنا کوئی کام لے کر خیزران کے پاس آیا۔ کام یقیناً
ایسا ہوگا جو وہ خلیفہ کے سامنے نہیں رکھ سکتا تھا۔ خیزران نے
اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کا یہ کام کر دے گی اور اس کے
باوجود کہ ہادی نے اسے دخل اندازی کے لیے منع کر دیا تھا
وہ اس کے پاس پہنچ گئی اور اصرار کیا کہ وہ یہ کام کرے۔
ہادی نے انکار کر دیا۔

”میں انکار نہیں کر سکتی۔ یہ کام نہیں کرنا پڑے گا۔“

”میں یہ کام ہرگز نہیں کروں گا۔“

”میرے کہنے سے بھی نہیں؟“

”ہرگز نہیں۔“

”میری لاج رکھ لو۔ میں عبداللہ بن مالک سے وعدہ
کر چکی ہوں۔“

”آپ نے وعدہ کیوں کیا۔ سلطنت کے کام میرے
ہیں آپ کے نہیں۔“

”خدا کی قسم! اب میں تجھ سے کسی کام کے لیے نہیں
کہوں گی۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں بلکہ مجھی میں چاہتا بھی
ہوں۔“

خیزران کے غصے کا یہ عالم تھا کہ اس کا پورا بدن متحرق
کانپ رہا تھا۔

ہادی نے اسے پھر مخاطب کیا۔

”اگر آئندہ مجھے معلوم ہوا کہ میرا کوئی سردار فوج یا
حاکم یا مصاحب آپ کے دروازے پر پہنچا ہے تو میں اس کا
سر قلم کر دوں گا۔ آخر آپ کے دروازے پر ان لوگوں کی
بھیڑ کیوں جمع رہتی ہے۔ کیا آپ کے پاس کرنے کو کچھ
نہیں۔ اگر کچھ کرنے کو نہیں ہے تو قرآن کی تلاوت ہی کر لیا
کریں۔ گوشہ عافیت میں بیٹھ کر چپ چاپ وقت
گزاریں۔“

یہ اتنی سخت باتیں تھیں کہ وہ اس کے پاس اور زیادہ
نہیں بیٹھ سکی تھی۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئی لیکن حال یہ تھا کہ پاؤں
رکھتی کہیں بھی پڑتا نہیں تھا۔ اسے شدت سے اپنی بے عزتی
کا احساس ہو رہا تھا۔

خیزران کے چلے جانے کے بعد ہادی نے

سردار ان فوج کو طلب کیا اور ان سے پوچھا۔

”کون زیادہ بچ رہے ہیں یا تم؟“

”امیر المومنین۔“ سب نے جواب دیا۔

”کیا تم میں سے کوئی کو مارا کرے گا کہ لوگ اس کی

ماں کے بارے میں یس چرچا کریں۔“

”نہیں امیر المومنین۔ کون اس بات کو گوارا کرے

گا۔“ سب لوگوں نے کہا۔

”پھر کیا بات ہے کہ لوگ میری ماں کے دروازے

پر پہنچتے ہیں اور پھر اس کی باتوں اور کاموں کے بارے میں

کہتے پھرتے ہیں۔“

بس وہ یہاں تک پہنچا تھا کہ سب سمجھ گئے کہ وہ کیا کہنا

چاہتا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے۔ سب نے عہد کیا کہ وہ اپنے

کاموں کے لیے خیزران کے دروازے پر دستک نہیں دیا

کریں گے۔

خیزران کو اس کی اس کارگزاری کا علم ہوا تو سخت

صدے سے دوچار ہوئی۔ اس نے بھی قسم کھائی کہ وہ اب

ہادی سے کسی کام کے لیے نہیں کہے گی۔

لوگوں نے بھی ہادی کے خوف سے اس سے کنارہ کشی

کر لی۔

خیزران کا دیدہ بے لگوں پر سے ختم ہو گیا تھا اور اس کا

فستے دار وہ ہادی کو جھکتی تھی اور اسے اس کی نافرمانی تصور

کر تی تھی۔

وہ بے بس ہو کر خاموش ہو گئی تھی لیکن بیٹے کی طرف

سے عداوت کے جذبات برابر ترقی کر رہے تھے۔ ہادی کا

حال بھی مختلف نہیں تھا۔ اس نے بھی ماں کی طرف سے بالکل

منہ موڑ لیا تھا۔ ابھی کسی آدمی کو بھیج کر اس کی خیریت

دریافت کر لیتا تھا لیکن ایسے بالکل ترک تعلق تھا۔

ہارون رشید بھی بھائی کے عتاب اور خفگی کا شکار تھا۔

اس نے ہارون رشید کو معطل نہیں کیا۔ غریبھے کی گورنری

اب بھی اس کے پاس تھی لیکن علاوہ معطل ہو گیا تھا۔ اس کی

نقل و حرکت اور سرگرمیوں کی سخت نگرانی کی جا رہی تھی۔ وہ

کسی طرح بھی آزاد اور خود مختار نہیں رہا تھا۔ بنی کا بھی اس

نے قافیہ نگاہ کر رکھا تھا۔

ہادی کے دل میں خیزران اور ہارون کے لیے نفرت

کے سوا کچھ نہ تھا اور ہارون خوف میں مبتلا تھا کہ ابتدائی

مہینوں میں یہ حال ہے تو آگے چل کر زندگی کی رنج و اختیار

کرے گی۔

خیزران کی چالاکی نے اپنی طاقت کے دھم میں

بھٹا۔ انعام و اکرام سے نوازا۔ طرح طرح سے اسے رام کرنے کی کوشش کی لیکن بھٹی کی روش میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ایک دن بھٹی قصر خلد آیا ہوا تھا۔ وہ ہارون رشید سے ملاقات کے بعد واپس جا رہا تھا کہ ہادی کے حمایتی سرداران فوج نے اسے گھیر لیا۔

یہ سب ہادی کے حکم سے ہو رہا تھا۔ اسے گرفتار کر کے ایک تنگ و تاریک کونہ میں مقید کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہادی نے حکم دیا کہ ہارون کی سواری کے ساتھ جلوس اور خدم ختم نہ ہوا کریں حالانکہ اب تک ہر ولی عہد کے ساتھ یہ ہوتا آیا تھا۔

اب حال یہ ہو گیا تھا کہ خلیفہ کے خوف سے لوگوں نے ہارون کو سلام تک کرنا چھوڑ دیا۔ ہارون اپنی بے عزتی کی شکایت خیزران سے کر سکتا تھا اور وہ اس وقت بے بس تھی۔ بھٹی قید کر دیا گیا تھا۔ دوسرے سازشچی ہادی کے خوف سے خاموش ہو گئے تھے۔

کچھ عرصہ اسی طرح گزر گیا تو کسی نے ہادی کو مشورہ دیا کہ بھٹی کو رہا کر کے اس پر باؤ ڈالا جائے۔ ہادی اس سفارش پر غور کرتا رہا پھر اس نے اپنے کچھ آدمیوں کو بھٹی کے پاس قید خانے میں بھیجا۔ شاید وہ راہ زاست پر آ گیا ہو۔

ان لوگوں نے بھٹی سے ملاقات کی۔ بھٹی نے ان سے بات کرنے سے انکار کر دیا اور اصرار کیا کہ وہ جو کچھ کہے گا تنہائی میں صرف ہادی سے کہے گا۔

اس کا یہ پیغام ہادی تک پہنچا دیا گیا۔ ہادی اس ملاقات پر تیار ہو گیا۔

”وہ کیا بات ہے جو تو مجھ سے کہنا چاہتا ہے۔“

”آپ مجھے قصور وار سمجھتے ہیں لیکن میں تو جو کچھ کر رہا ہوں مملکت کی بھلائی کے لیے کر رہا ہوں۔“

”تو مجھ سے میرے بھائی کو لانے کے بعد بھی کہتا ہے کہ اس میں مملکت کی بھلائی ہے۔“

”میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لوگ راضی خوشی جعفر بن ہادی کی ولی عہدی تسلیم نہیں کریں گے جبکہ وہ صرف آٹھ سال کا بچہ ہے۔ کیا لوگ اسے اپنی نماز کا امام اور حج کا امیر بنائیں گے؟“

”شاید نہیں۔“ بھٹی بات ہادی کی زبان پر آ گئی۔

”کیا آپ اس سے بھی انکار کریں گے کہ آپ کے خاندان کے اور دوسرے لوگ بھی اس عہدے کے

اعلان کر دیا کہ وہ اپنے بیٹے جعفر کی ولی عہدی پر عنقریب بیعت لے گا۔

ہادی کے اس فیصلے نے اس کی فوج اور حکام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ جن لوگوں کی بات نہیں مانی گئی تھی وہ اس وقت تو خاموش ہو گئے لیکن انہوں نے آپس میں مل کر فیصلہ کر لیا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

اندرون پھر پھیلنے لگی۔

ہارون رشید سے خاموشی سے کہہ دیا گیا کہ وہ ہرگز دست برداری پر تیار نہ ہو۔

ہادی نے پوری تیاری کر لی۔ وہ اب تک قصر خلد میں والدہ خیزران کے ساتھ ہی مقیم تھا لیکن اب اس نے یہ سکونت ترک کر کے ”قصر ابیض“ کو قصر خلافت کا درجہ دے دیا۔

اس کی منتقلی کے بعد قصر خلد کے دروازے بھٹی پر کھل گئے۔ اس کے دونوں بیٹے فضل اور جعفر بھی آزادانہ گھومتے تھے۔

قصر خلد کا سازش گروہ ایک لمحے کے لیے بھی ہارون رشید کو تنہا نہیں چھوڑ رہا تھا کہ کہیں وہ ہادی سے اتفاق کر کے ولی عہدی سے دست برداری پر اتفاق نہ کر لے۔

ہارون ان دونوں طرف کی پابندیوں سے اکتا گیا۔ ایک طرف ہادی تھا جس نے اس پر طرح طرح کی پابندیاں لگا رکھی تھیں دوسری طرف یہ سازش گروہ اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ایک دن اس نے تنگ آ کر بھٹی سے صاف صاف کہہ دیا۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے حق سے دست بردار ہو جاؤں تاکہ اس مصیبت سے چمکنا نہ پڑے۔“

”خبردار! ایسا ہرگز مت کرنا۔“ بھٹی نے اسے سرزنش کی۔

بھٹی نے اسے قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی اور امید دلانی کہ وہ کچھ دن صبر کرے خلافت کا پھل اس کی جھولی میں گرنے ہی والا ہے۔ ہارون رشید پھر مطمئن ہو گیا۔

ہادی چاہتا تھا کہ ہارون پابندیوں سے تنگ آ کر ولی عہدی سے دست بردار ہو جائے لیکن اسے یہ بھی اطلاعات مسلسل مل رہی تھیں کہ بھٹی ہر بار اس کے ارادے کو تبدیل کر دیتا ہے اور اسے امیدیں دلاتا رہتا ہے۔ ہارون رشید اس کے ہاتھوں میں کھ پٹی بنا ہوا ہے۔

اس نے بھٹی کو اپنے حضور طلب کیا۔ قربت کا شرف

بادر کرایا جا رہا تھا کہ یہی وہ شخص تھا جو ہارون کو ولی عہد بنانے کی ہم پلار ہوا تھا۔

ہادی مخالفین کی جن آندھیوں میں گھرا ہوا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ ان نشانیوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دے جو اس کی تباہی کا باعث بنی تھیں یا بن سکتی تھیں۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ ہارون سے ولی عہدی چھین لے گا تاکہ سازشوں کا خاتمہ ہو۔

اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہادی نے سرداران فوج، حکام، وزراء اور عوام کو جمع کیا اور دل کی بات زبان پر لے آئی۔

”میں ہمیشہ مملکت کی بہتری کے لیے سوچتا رہا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہارون رشید کو ولی عہدی سے محروم کر کے اپنے بیٹے جعفر کو ولی عہد مقرر کروں کیونکہ اگر میرے بعد خلافت کی باگ ڈور ہارون کے پاس چلی گئی تو ہارون کے پردے میں بھٹی بن خالد اور میری والدہ بکرا نی کر یں گی اور سلطنت کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔“

ہادی کی زبان سے یہ تجویز ادا ہوئی تھی کہ خوشامدیوں نے واہ واہ کا شور بلند کر دیا۔ اس کے فیصلے کی توثیق و تعریف کی جانے لگی۔

توثیق کرنے والے معمولی لوگ نہیں تھے۔ ان میں بڑی بڑی شخصیتیں شامل تھیں۔ ان میں یزید بن زید شیبانی بھی تھا جس نے دو مرتبہ روم پر چڑھائی کرنے والی فوج کی سپہ سالاری کی تھی۔

مخالفت میں بھی آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ لوگ بھی معمولی نہیں تھے۔ سب سے بلند شخصیت تو فضل بن ریحی کی تھی جو ہادی کا حاجب تھا۔

مخالفوں کے اعتراضات وہی تھے جو اس سے پہلے اس وقت سامنے آئے تھے جب ہادی سے ولی عہدی چھینی جا رہی تھی۔

”امیر المومنین! آپ تاریخ کو پھر اپنی طرف لے جا رہے ہیں۔ آپ کے صاحبزادے کی عمر صرف آٹھ سال ہے۔“

”ہارون اپنی ولی عہدی سے کبھی دست بردار نہیں ہوگا۔“

”فتنہ و فساد برپا ہوگا جو سلطنت کے لیے کسی طرح مناسب نہیں۔“

اعتراضات ہوتے رہے لیکن ہادی فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے حمایت کرنے والوں کی رائے کا احترام کیا اور

آکر مہدی کے ہاتھوں نفرتوں کا جو بیج پودا تھا وہ پودا اب جڑ پکڑنے لگا تھا۔ بدگمانیاں کیا رنگ دکھا رہی تھیں اس کا اندازہ ہارون اور موئی کے درمیان ایک ملاقات سے ہو سکتا ہے۔

ہارون، بھائی سے ملاقات کے لیے آیا تو روم کے مطابق اس کے ہاتھ کو بوسہ دے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

”ہارون، وہ خواب کیلے تھا۔ وہی شاخ سرسبز والا خواب۔“ ہادی نے اسے وہ خواب یاد دلایا جو بھی مہدی نے دیکھا تھا۔ ”تم خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو۔ اس چیز کے آرزو مند ہو جس سے تم بہت دور ہو۔ تمہاری یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں۔ خواب میں تو یہ تھا کہ تمہاری مدت خلافت عرصہ دراز تک رہے گی۔ کہاں گئی وہ خلافت۔ کیا اب بھی تمہیں امید ہے کہ تم خلیفہ بنو گے؟“

”اے موئی! اگر آپ نے جبر کیا تو خواری ہوں گے۔ اگر تو واضح کا پرتاؤ کیا سر بلند ہو جائیں گے۔ اگر ظلم کیا تو خود بھی ہدف بنیں گے۔ اگر امر خلافت میرے ہاتھ آیا تو آپ کی اولاد کو اپنی اولاد سے برتر سمجھوں گا اور ان کی بیویوں کو اپنی لڑکیاں سمجھوں گا۔“

موئی اس کے جذبے سے خوش ہو گیا اور اسے اپنے قریب آنے کو کہا۔ ہارون اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

”ابھی میرے بھائی کے ساتھ ایک لاکھ دینار کروڑ اور اسے خزانہ عامرہ تک لے جاؤ۔ وہاں جو کچھ یہ پسند کرے اسے لینے دو۔“ موئی نے اپنے وزیر سے کہا۔

اس واقعے کے بعد دونوں کی بدگمانیاں کچھ دور ہو گئیں۔ ممکن ہے دونوں کے دل صاف ہو جائے لیکن وقفہ قلیل نے سازشوں کو پھر دراز کر دیا۔ ہارون کو یہ باور کرایا گیا کہ ہادی کی تم پر نوازشیں صرف اس لیے ہیں کہ تم خاموش ہو کر بیٹھ رہو۔ تمہارا وہی حال ہونے والا ہے جو عیسیٰ بن موئی کا ہوا۔ آل یربک کی خواتین خیزران کے کان ہادی کی طرف سے بھر رہی تھیں تاکہ ماں بیٹوں کے درمیان عداوت کی دیوار بلند ہوتی رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مایوس ہو کر ہارون رشید کی طرف سے بالکل ہی غافل ہو جائے۔ اگر ہارون کو اقتدار نہیں ملا تو انہیں عیش کیسے ملے گا۔

کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو پچھلی سازشوں میں شریک رہے تھے اور اب ہوا کا رخ دیکھ کر ہادی کے بھی خواہوں میں شامل ہو گئے تھے اور اب اسے ماضی قریب کی تلخیاں یاد دلانے کی بجائے خلاف اس کا رہے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ بھٹی کو ہدف تنقید بنایا جائے تاکہ وہ مسئلے مصیبت ہو۔ یہ

آرزو مند ہیں۔ اس حالت میں آپ اپنے باپ کے بیٹے کو محروم کیے دے رہے ہیں۔ اگر آپ نے ایک مرتبہ لوگوں کو عہد شکنی پر آمادہ کر دیا تو پھر یہ کام آئندہ بھی ہوگا۔

میری رائے یہ ہے کہ اپنے بھائی کو فی الحال اس کے منصب پر باقی رہنے دیجیے۔ جب ابو جعفر بڑا ہو جائے گا میں خود اسے لے کر رشید کے پاس جاؤں گا۔ وہ یقیناً از خود دست بردار ہو جائے گا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لے گا۔

یعنی کے جوش خطابت نے ہادی کو محروم کر دیا تھا۔ وہ سر جھکائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

”بھئی! تو نے سچ کہا۔ خدا کی قسم! تو نے میرے سامنے وہ باتیں رکھی ہیں جن کی طرف ابھی تک میرا ذہن منتقل نہیں ہوا تھا۔ اب میں ہارون سے ولی عہدی کی دست برداری کی بات نہیں کروں گا۔“

ہادی نے بھئی کو ربا کرنے کا حکم دے دیا۔

ہادی کے وہ حاشیہ نشیں جو بھئی کے خلاف تھے اس خوشگوار فضا کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے ہادی کو اسکا تا شروع کر دیا۔ انہوں نے ایسی باتیں کیں جو رشید اور بھئی کے خلاف جانی تھیں۔ ان کی دلیل یہ تھی۔

”ہم ایسے شخص کو اپنا خلیفہ بنانے پر کس طرح آمادہ ہو سکتے ہیں جو دوسرے شخص کے ہاتھ کا کھلونا بننا ہو۔“

دوسرے شخص سے ان کی مراد بھئی بن خالد بنی تھا۔

”بھئی کی نیت یہ ہے کہ وہ آپ کو راستے سے ہٹا کر رشید کو خلافت پر متمکن کر دے اور خود وزارت پر قابض ہو جائے۔ یہ کام اس کے لیے یوں آسان ہو گیا ہے کہ آپ کی والدہ بھئی کا پورا پورا ساتھ دے رہی ہیں۔“

ہادی یہ باتیں سن کر پریشان ہو گیا۔

”آپ لوگ مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔“

”اس وقت ہارون آپ کے قبضہ اقتدار میں ہے۔ اس پر جبر کریں اور یہ عہدہ اس سے چھین لیں۔ اگر اس کے حامیوں نے مزاحمت کی تو ہماری کٹواریں آپ کے اقتدار کے لیے حاضر ہیں۔“

ہادی کا ذہن ایک مرتبہ پھر دوسرے پہلو پر سوچنے لگا۔ اس نے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہارون سے ملاقات کی اور اس پر زور ڈالا کہ وہ ولی عہدی سے دست بردار ہونے کا اعلان کر دے لیکن رشید نے یہ بات نہیں مانی۔

ہادی نے اپنے خواص کے سامنے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ جبراً ہارون رشید کو ولی عہدی سے محروم کر دے گا اور جعفر کی ولی عہدی پر لوگوں سے بیعت لے گا۔

یہ خبر جیسے ہی خیزران تک پہنچی اسے ہارون کی جان کی فکر ہوئی۔ ہارون کی طرح اپنے حق سے محروم ہونے کے لیے تیار نہیں تھا اور ہادی اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ وہ تو اب اس نتیجے پر پہنچنے لگی تھی کہ ہارون اپنے بھائی کی بات مان لے اور اپنی جان بچالے۔ اس نے اپنی ایک کیز کو بھئی کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا۔

”میرے بچے ہارون پر رحم کر دو۔ کہیں تمہاری ضد اس کی جان نہ لے لے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو کہ وہ اپنے بھائی ہادی کا مطالبہ پورا کر دے کیونکہ ہارون کی زندگی مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔“

بھئی نے اس پیغام کو سنا اور کیز سے کہا۔

”واپس جا اور ان سے کہہ دے کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں میرے اہل و عیال اس واقعے سے پہلے نکل ہو جائیں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں ہارون اور آپ کی بہتری کے لیے کر رہا ہوں۔ آپ خاموشی سے دیکھتی جائیں کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ ہارون کا دست بردار نہ ہونا ہی اس کے حق میں ہے۔“

خیزران کو برابر ایسی خبریں مل رہی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہارون کی جان کو خطرہ ہے لیکن بھئی کی تسلیاں بھی اس کے سامنے تھیں۔ وہ فکر مند ہی لیکن خاموش بیٹھی رہی۔

اس پیغام کے بعد بھئی یہ سمجھنے لگا تھا کہ خیزران کے اعصاب جواب دینے لگے ہیں۔ ہادی بھی آخر اس کا پیٹا ہی تو ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی محبت بھی کبھی کبھی اس پر غالب آجائی ہو۔ اگر وہ ہاتھ اٹھا لیتی تو بھئی کا کامیاب ہونا مشکل تھا۔ خیزران کی غیر موجودگی میں اس کی حیثیت کیا رہ جاتی۔

اس نے سوچا کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ خیزران کے دل میں اگر ہادی کے لیے تھوڑی سی بھی جگہ ہے تو وہ بھی ختم ہو جائے۔ نفرت عداوت میں تبدیل ہو جائے۔ خیزران خود کہے کہ بھئی امیر ہے بچے کو اور مجھے ہادی سے بچاؤ۔ اس کے بعد میں ہادی کے خلاف جو بھی قدم اٹھاؤں گا خیزران نہ صرف خاموش رہے گی بلکہ میری حوصلہ افزائی بھی کرے گی۔

خیزران کا مزاج ایسا ہے کہ اگر ایک مرتبہ جگہ جاتے تو وہ بڑے سے بڑا اقدام کر سکتی ہے حتیٰ کہ اپنے تخت جگہ کو موت کے سپرد کرنے میں بھی تکلف سے کام نہیں لے گی۔ اس نے سوچا، اگر میں کسی طرح خیزران کو یہ باور کرا دوں کہ مہدی کو زہر دینے والا ہادی ہی تھا تو پھر خیزران کے دل میں اس کے لیے کوئی گناہ نہیں رہے گی لیکن اس سے پہلے مجھے کچھ اور بھی کرنا ہوگا۔

امیر المومنین کی ہمت اور بڑھ جائے گی۔“

”یہ مجھے معلوم ہے اس راز کو کس وقت ظاہر ہونا چاہیے۔“

چند روز کے وقفے کے بعد بھئی بن خالد نے خیزران سے ملاقات کی اور چاولوں کا ذکر خود ہی اس نے چھیڑ دیا۔

”ملکہ عالیہ! مجھے یہ سن کر سخت افسوس ہوا ہے کہ ہادی نے آپ کی بھی جان لینے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ آپ کی قسمت اچھی تھی۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ بھئی مرتبہ اس نے کس کی جان لی تھی؟“

”میں یہ بات کبھی آپ کے گوش گزار نہ کرتا لیکن اب ضروری ہو گیا ہے کہ میں آپ کو خبردار کروں۔ کیا آپ نے بھی امیر المومنین مہدی کی ناگہانی موت پر غور کیا ہے؟“

”موت تو سب کو آتی ہے۔“

”معاملہ اتنا سیدھا نہیں۔ امیر المومنین بیمار نہیں تھے کہ بیماری موت کا بہانہ بن جاتی۔ انہیں زہر دیا گیا تھا اور زہر دینے والا آپ کا بیٹا ہادی تھا۔ جو اپنے باپ کو مار سکتا ہے وہ آپ کو کیوں نہیں۔ میں اس لیے خاموش رہا تھا کہ

مرنے والا تو مر گیا اب مزید خون بہے گا۔ میں تو آپ کو کبھی مشورہ دوں گا کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو۔“

”بھئی، اب اس لڑکے کا زندہ رہنا ہم سب کے لیے خطرہ ہے۔“

”ابھی اس اقدام پر نہ سوچیں۔ میں کوئی درمیان کا راستہ نکالوں گا۔“

”میں ہارون کو خلیفہ دیکھنا چاہتی ہوں اور بس۔“

”یہی ہوگا۔ بس آپ دیکھتی جائیں۔“

بھئی نے بڑی ترکیب سے خیزران کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اس کا بیٹا اسے زہر دے کر ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ اب اگر ہادی کو کبھی زہر دے دیا جاتا تو خیزران کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

غالباً ہادی کو کبھی زہر خوردانی کے اس واقعے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے اس کی وضاحت کے لیے بھئی کو طلب کیا۔

”میں چاہتا ہوں کہ میرے اور میرے بھائی کے مابین نفرت پھیلانے کا عمل بند کر دو۔ کیا تم میرے خلاف فساد انگیزی نہیں کرتے رہے ہو؟“

”میں تو صرف وہ کام کر رہا ہوں جو خلیفہ مہدی نے میرے سپرد کیا تھا۔ آپ نے بھی اس کی تجدید کی تھی۔ میں

اس نے اپنی اسکیم پر عمل کرنے کے لیے کس کی دو باندیوں کو دروغ بھاری اور انہیں انعام کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ ان میں سے ایک باندی ایک خوان چاولوں سے بھرا ہوا خیزران کے پاس لائی۔ یہ دراصل بھئی نے اس کے حوالے کیا تھا لیکن اس باندی نے خیزران سے یہ کہا کہ امیر المومنین نے پلاؤ بھیجا ہے۔ یہ بھی کھلوا بھیجا ہے کہ اگر آپ اس میں سے ٹھوڑا سا کچھ لیں گی تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے۔

خیزران خوش ہو گئی کہ ہادی کے دل سے اس کی ناراضی جاتی رہی ہے۔ اس نے خوان پوش اٹھایا اور چھٹنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

اب دوسری باندی کو اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ اس نے فوراً ہاتھ پکڑ لیا۔

”ملکہ عالیہ! ذرا اٹھ رہے۔ میری ایک بات سن لیجیے۔ اتنے دن بعد جو یہ نوازش ہوئی ہے تو ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس میں کوئی ایسی چیز ہے جو آپ کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔“

”کیا کچھ ہے۔ میرے بیٹے نے کیا مجھے مارنے کے لیے اس میں زہر ملا دیا ہوگا؟“

”احتیاطیاب کیا حرج ہے۔“

اس باندی نے ایک کتا منگوا لیا اور تھوڑے سے چاول اس کے آگے ڈال دیے۔ کتے نے جیسے ہی چاولوں پر منہ مارا اور چاول اس کے معدے میں اترے وہ زمین پر گر کر ترپنے لگا اور تھوڑی دیر میں ٹھنڈا ہو گیا۔

”دیکھا آپ نے؟“

”میں دیکھ چکی رہی ہوں اور کچھ بھی گئی ہوں۔ تخت و تاج کی حرص کسی کو اتنا گرا سکتی ہے یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“

خیزران نے کہا اور خواب گاہ میں چلی گئی۔

اس کے سننے میں ایک طوفان تھا۔ ہادی میری اولاد ہے اور اس نے یہ حرکت کی۔ اسے دنیا کا کیا خدا کا خوف بھی نہیں ہوا۔ جب وہ مجھے مارنے کی کوشش کر سکتا ہے تو ہارون کس شمار میں ہے۔ وہ تڑپ کر بستر سے اٹھ گئی۔ وہ اس وقت غصے میں نہیں صدمے میں تھی اس لیے اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ اس نے دونوں باندیوں کو اپنے حضور طلب کیا۔

”یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو کہ ہادی نے میرے ساتھ کیا حرکت کی ہے۔“

”ملکہ عالیہ، اس راز کو تو اٹھا ہونا چاہیے ورنہ

WWW.LIBRARYTECH.COM

سپینس ڈائجسٹ

اپریل 2013

43

سپینس ڈائجسٹ

اپریل 2013

نے تو آپ کے حکم کی تعمیل کی تھی۔“

”میری والدہ کو زہر شدہ کھانا بھیجے گا حکم بھی میں نے نہیں دیا تھا۔“

”مجھ تک بھی اس واقعے کی اطلاع پہنچی ہے لیکن مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ یہ کھانا آپ کی طرف سے آیا تھا۔“

”وہ تو خیر میں تحقیق کر لوں گا۔“

اسی دن دونوں کینزس مردہ پائی گئیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ انہیں کس نے قتل کرادیے۔ ان کی موت کی تصدیق ضرور ہوتی لیکن اسی دوران ہادی علویوں کی شورش اور بغاوت کے استحصال میں لگ گیا جو حجاز میں برپا ہوئی تھی اور بالآخر اس بغاوت کے سرغنہ کے قتل پر ختم ہوئی۔

اس بغاوت کے فرو ہونے کے بعد ہادی نے پھر ہارون کو مجبور کرنا شروع کیا کہ ازخود ولی عہدی سے دستبردار ہو جائے۔

رشید اتنا مجبور ہو گیا کہ ایک مرتبہ پھر وہ بیٹکی کے پاس آیا۔

”اب معاملہ میری برداشت سے باہر ہو چکا ہے۔ اب آپ درمیان سے ہٹ جائیں۔ میں بھائی کی بات مان کر ولی عہدی سے دست بردار ہوئے جاتا ہوں۔“

”ایسا نہ کرنا۔“

”اب میری یہاں کیا عزت رہ گئی ہے۔“

”تم ہادی سے اجازت لے کر شکار پر چلے جاؤ۔ جب یہاں سے ہٹ جاؤ گے تو بہت سے معاملات خود بخود رفع ہو جائیں گے۔“

بیٹکی کچھ اور بھی سوچ چکا تھا لہذا اس نے یہ بھی کہا۔

”یاد رکھو ہادی کا زمانہ بہت ٹھوڑا رہ گیا ہے۔“

رشید نے اس کی بات مان تو لی لیکن اس نے ہادی سے اجازت لینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اجازت لیے بغیر شکار پر روانہ ہو گیا۔

ہادی کو جب معلوم ہوا کہ وہ شکار کے لیے روانہ ہوا ہے تو اسے تشویش ہوئی۔ پس پردہ کوئی سازش نظر آئی۔ چالیس دن گزر گئے اور ہارون رشید واپس نہ آیا۔ ہادی نے اسے خط لکھا کہ فوراً واپس آجائے لیکن ہارون پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

بیٹکی اسے برابر خبردار کر رہا تھا کہ وہ ٹال منول سے کام لیتا رہے۔

ہادی کا پیمانہ مہر لبریز ہو رہا تھا۔ اس نے بیٹکی کو طلب

کیا۔ آج اس کا انداز ہی دوسرا تھا۔

”میں سمجھ رہا ہوں کہ تم نے اسے شکار پر کیوں بھیجا ہے۔ اس لیے کہ میں اسے مجبور نہ کر سکوں۔ تم چاہتے ہو کہ ہارون خلیفہ بن جائے اور تم وزارت کے پردے میں حکومت کرو۔ میں تمہاری یہ آرزو بھی پوری نہ ہونے دوں گا

اس سے پہلے ہی میں تمہیں قہر کے کنارے پہنچا دوں گا۔“

بیٹکی کو ایک ایسی تنگ کوشری میں قید کر دیا گیا جہاں پاؤں پھیلانا ممکن نہیں تھا۔ بس وہ پاؤں سیٹھے بیٹھا رہ سکتا تھا۔ اس حالت میں اگر زیادہ دن گزر جاتے تو اس کا مرجانا لازمی تھا۔ آخر ہادی کا ایک وزیر بیٹکی کے کام آیا اور اس نے سفارش کر کے اسے دوسرے قید خانے میں بھجوا دیا۔

بیٹکی کو قید کرنے کے بعد ہادی نے عہدکوار اعیان کو طلب کیا اور ان سے ہارون کی سبکدوشی کے بارے میں مشورہ کیا۔

رفقا نے مشورہ دیا۔ ”جعفر اس وقت تک ولی عہد نہیں بنائے جاسکتے جب تک ہارون رشید اپنے حق سے دستبردار نہ ہونے کا اعلان نہ کر دیں۔“

”یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ بتاؤ۔“

”ایک راستہ یہ ہے کہ جو لوگ ہارون کے حق میں بیعت کر چکے ہیں وہ اپنی بیعت توڑ دیں۔“

”بعض نے یہ بھی کہا۔“

”ہارون کو معزول کیا جاسکتا ہے اور جعفر کے لیے بیعت لی جاسکتی ہے۔“

ہادی نے چٹکی رائے کو اہمیت دی کہ محفوظ راستہ یہی تھا۔ ایک لشکر روانہ کیا کہ جزیرہ مصر اور مغرب میں اگر کوئی بیعت سے انکار کرے تو اس کی سرکوبی کرنے میں تامل نہ کرے۔ اگر علاج ناکوار ہے تو تلووار چلائے۔ سالار فوج محمد بن فروخ نے سامان سفر تیار کیا اور لشکر کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہو گیا۔

بیٹکی بن خالد قید ہو چکا تھا۔ ہارون کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ بغداد میں کیا ہو رہا ہے۔ اسے یہ تشویش ضرور تھی کہ بیٹکی کا کوئی پیغام کیوں نہیں پہنچا۔ اسی لیے وہ شکار سے واپس آ گیا۔

وہ خیزران سے ملا تو اس کی آنکھیں کل گئیں۔ اسی کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ بیٹکی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ایک لشکر شام کی طرف گیا ہے جو فتح بیعت کے لیے جبر و زور سے کام لے گا۔

ہارون نے ضروری سمجھا کہ وہ ہادی سے ملے۔ وہ رصاف کی طرف چل دیا جہاں ہادی اپنے محل ”قصر بیض“ میں مقیم تھا۔

راستے میں اس نے دیکھا کہ لوگ کچھ بدل گئے ہیں۔ جو اسے دیکھتا ہے منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔ لوگ خوفزدہ ہیں یا مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ وہ یہی سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اس کا گزر ایک ہل پر سے ہوا۔ اسی وقت جعفر بن موی کی سواری اس طرف سے گزری۔ اس سواری کے ساتھ فوج کا ایک افسر بھی تھا۔

جب اس فوجی افسر نے ہارون کو دیکھا تو چیخ کر کہا۔ ”وہیں ٹھہرے رہو۔ دیکھئے نہیں ولی عہدی کی سواری گزر رہی ہے۔“

وہ چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ جب جعفر کی سواری گزری تو ہارون نے ہل پار کیا۔

ہارون کی اس سے پہلے ایسی توہین نہیں ہوئی تھی۔ وہ جب بھائی کے پاس پہنچا تو سخت غصے میں تھا۔ ممکن ہے مصالحت کے لیے آیا ہو لیکن اب معاملہ دوسرا تھا۔

”ولی عہد میں ہوں اور ولی عہدی کے نعرے دوسروں کے لیے بلند ہو رہے ہیں۔“ ہارون نے کہا اور ہل سے گزرتے ہوئے اس وقت کا پورا ادا قہر سنایا۔

”اسی لیے تو کہتا ہوں ہوا کا رخ پہچان لو۔ شکار کے بہانے کب تک مجھ سے بھاگتے رہو گے۔“

”ولی عہد میں ہوں تا وقتیکہ میں خود اس سے دست بردار نہ ہو جاؤں۔“

”تو ہو جاؤ دستبردار۔ میں تمہیں اتنا مال و زردوں کا کہ زندگی بھر عیش کرو گے۔ میرا بھائی ہونے کی عزت پھر بھی تمہیں حاصل رہے گی۔“

”جو حق میرے باپ نے مجھے دیا ہے، میں اسے نہیں لوٹا سکتا۔“

”اس کا نتیجہ جانتے ہو؟“

”نتیجہ کچھ بھی ہو۔“

”میں تمہیں قید کر سکتا ہوں۔“

”اس کے بعد میں تمہیں اپنے قول پر قائم رہوں گا۔“

ہادی نے اسے قید کر دیا۔ اسے ایک گھر میں رکھا گیا اور اس کی نگرانی پر ایش نامی ایک شخص کو مامور کر دیا۔ اسے کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔

ہارون کا بارہری دنیا سے کوئی رابطہ نہیں رہ گیا تھا۔ قید کی یہی عہد ہوئی ہے لہذا ہادی یہی سمجھ رہا تھا کہ

چند دن اکیلے گھر میں رہ کر وہ میری بات مان لے گا۔ ہادی بھی سمجھی اس سے ملنے چاہی جاتا تھا اور ہر مرتبہ اپنا مطالبہ دہراتا تھا لیکن رشید اپنی جگہ اٹل تھا۔

اس طرف سے واپس ہونے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ بیٹکی جب تک ہے ہارون کی طرح دست برداری پر تیار نہیں ہوگا اسے قتل کر دیا جائے۔ جب ہارون کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کا حمایتی اس دنیا میں نہیں رہا تو وہ ہارمان لے گا۔ دیگر سازش کرنے والے بھی دیک کر بیٹھ جائیں گے۔

اس نے چند بھروسے کے آدمیوں کو اپنے پاس بلا لیا تاکہ بیٹکی بن خالد کو قتل کر دینے کے بارے میں مشورہ کرے۔ یہ لوگ اپنی اپنی رائے دیتے رہے۔ کئی گھنٹوں بعد بھی مجلس کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ اچانک ہادی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کسی کام کا عذر کر کے محل کی طرف روانہ ہوا۔

”آپ لوگ صلاح مشورہ جاری رکھیں۔“

ہادی واپس نہیں آیا بلکہ یہ اطلاع آئی کہ وہ دلیل ہو گیا ہے اور بستر پر ہے لہذا مجلس برخاست کی جائے۔ ان لوگوں میں ابراہیم حرکانی بھی تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کی سفارش پر ہادی نے بیٹکی کو تنگ قید خانے سے دوسری جیل میں منتقل کیا تھا۔ اس پر ہادی بہت بھروسہ کرتا تھا لیکن ہادی کی بد قسمتی کہ یہ بیٹکی کے ساتھ سازش میں شریک تھا۔ ہادی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ مجلس میں بیٹھا ہوا ابراہیم حرکانی اس کے خلاف کسی سازش میں شریک ہوگا۔

ابراہیم حرکانی مجلس سے نکل کر سیدھا اس قید خانے کی طرف گیا جہاں بیٹکی قید تھا۔

”میں ہادی کا ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔ مجھے بیٹکی سے ملنے دو۔“

پہرے داروں نے اسے جانے دیا۔

بیٹکی نے بھاری قفل کھلنے کی آواز سنی۔ وہ سنہل کر بیٹھ گیا کہ دیکھو کون آیا ہے اور کیا پیغام لایا ہے۔ ابراہیم تہ خانے کی بھاری سیڑھیاں اتر کر وہاں پہنچ گیا جہاں بیٹکی بیٹھا ہوا تھا۔

”ابراہیم تم! تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اگر ہادی کو معلوم ہو گیا کہ تم مجھ سے ملنے آئے تھے تو تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔“

”اب بات خطرہ کی حدود سے نکل گئی ہے بیٹکی۔ میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ ہادی نے تمہارے قتل کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے ایک مجلس بھی طلب کی

ہوئی۔“

”ابراہیم تم! تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اگر ہادی کو معلوم ہو گیا کہ تم مجھ سے ملنے آئے تھے تو تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔“

”اب بات خطرہ کی حدود سے نکل گئی ہے بیٹکی۔ میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ ہادی نے تمہارے قتل کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے ایک مجلس بھی طلب کی

ہوئی۔“

تھی۔ میں بھی وہاں شریک تھا۔ وہیں سے چلا آ رہا ہوں۔“

”کیا فیصلہ ہوا؟“

”تمہاری قسمت اچھی تھی کہ ہادی مجلس سے اٹھ کر چلا گیا۔ بعد میں خبر آئی کہ وہ علیل ہے۔ کسی فیصلے پر پہنچے بغیر مجلس کا خاتمہ ہو گیا۔“

”تم اگر میرے قتل کے فیصلے کو کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دو تو پھر ہادی تم سے یا کسی سے یہ نہیں کہے گا کہ مجھ کے قتل کی تدبیر سوچو۔“

”یہ فیصلہ فی الحال تو ملتوی ہی سمجھو۔ میں تو تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ سوچ سکتے ہو تو کچھ سوچو۔“

”باہر کھڑے پہرے داروں میں ایک فیصل ہے۔ جاتے وقت اس سے مل لیتا۔ تمہیں پیغام رسانی میں آسانی ہوگی ورنہ بار بار تمہارا یہاں آنا ٹھیک نہیں۔ ہو سکتا ہے ہادی کے جاسوس بھی یہاں ہوں۔“

ابراہیم سیزھیاں چڑھ کر اُدیا۔ قید خانے سے باہر نکلا تو ایک شخص اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

”میرا نام فیصل ہے۔ میں آپ سے کہاں مل سکتا ہوں۔“

ابراہیم کو تعجب ہوا کہ اس شخص کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں اس سے ملنے کا خواہاں ہوں لیکن یہ وقت تعجب کا نہیں تھا۔ ابراہیم شہر سے باہر ایک محل تعمیر کر رہا تھا جس کا جائزہ لینے وہ روز وہاں جایا کرتا تھا۔ اس نے فیصل کو بتا دیا کہ وہ شام کے وقت وہاں آ سکتا ہے۔

”اگر میں وہاں نہ بھی ہوا تو میرا کوئی آدمی مجھے بلا لے گا۔ اگر مجھے تمہاری ضرورت پڑی تو میں اپنا کوئی آدمی تمہارے پاس بھیج دوں گا۔“

دوسرے دن وہ سارے لوگ پھر جمع ہوئے جو یحییٰ کے قتل کے سلسلے میں مشورے کے لیے بلائے گئے تھے۔ مشورے پھر جاری ہو گئے۔ وہ تمام لوگ جو ہارون کی معزولی کے بارے میں خلیفہ کے ہم رائے تھے بعد تھے کہ یحییٰ کو قتل کر دیا جائے۔

”دیکھو بھائیو! ہارون ابھی تک قانونی طور پر ولی عہد ہے۔ خلیفہ علیل ہیں۔ اگر اس علالت میں ان کا انتقال ہو گیا تو وزیر یحییٰ بنے گا اور ہمیں ایک ایک کر کے قتل کر ڈالے گا لہذا ہمیں یحییٰ کو قتل کرنے میں جلدی کرنی چاہیے۔“

ابراہیم حرکانی کو یحییٰ کا پیغام مل چکا تھا کہ قتل کا فیصلہ جب تک ہو سکتا ہو، مال مول کا شکار رکھو۔ اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”یہ ضروری تو نہیں کہ خلیفہ کا انتقال ہی ہو جائے۔

ہمیں تو اس کی تندرستی کی دعا کرنی چاہیے۔ اگر وہ تندرست ہو گیا اور یحییٰ کے قتل کے بارے میں اس کی رائے بدل گئی تو وہ یہ سوال ضرور کرے گا کہ اس سے پوچھتے بغیر ہم نے یحییٰ کو قتل کیوں کیا۔ سوچو اس وقت ہم کیا جواب دیں گے۔ کیا خلیفہ کے عتاب کا شکار نہیں بنیں گے۔“

دیگر کئی لوگوں نے بھی ابراہیم کی رائے سے اتفاق کیا۔ ان میں وہ لوگ یقیناً شامل تھے جو یحییٰ کے لیے جاسوسی اور جبری کرتے رہے تھے۔

یحییٰ نے یہ اہتمام کیا تھا کہ ایک جاسوس کو دوسرے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہ اہتمام اس لیے کیا گیا تھا کہ راز کھل نہ جائے۔

جب مخالفت کی آوازیں بھی بلند ہوئیں تو طے پایا کہ جب تک صورت حال واضح نہ ہو جائے قتل یحییٰ کو معرض التوا میں رکھا جائے۔

اسی شام فیصل نے ابراہیم سے نو عمر محل میں ملاقات کی اور یحییٰ کا پیغام پہنچایا۔

”قصر خلد میں خالصہ نام کی ایک جاریہ (باندی) ہے۔ آپ ملکہ عالیہ خیزران سے ملیں اور اس جاریہ کو پیغام پہنچا دیں کہ وہ اپنی بہن کو جو قصر انبیس میں خلیفہ کی تیمارداری کے لیے موجود ہے پیغام پہنچا دے کہ اب وقت آ گیا ہے۔“

”کس چیز کا وقت آ گیا ہے۔“

”مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔“

ابراہیم قصر خلد گیا اور یحییٰ کا پیغام خیزران تک پہنچا دیا۔

اگلے دن خیزران نے جیل میں یحییٰ کو پیغام پہنچا دیا۔

”وہ شخص اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔ وہ قطعاً ہلاک ہو جائے گا۔ تم ضروری اقدامات کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

یحییٰ نے خیزران کے دل میں اتنی بدگمانیاں پیدا کر دی تھیں کہ وہ بیٹے کی ہلاکت کے لیے بھی خوشی خوشی تیار ہو گئی۔ پہلے تو اسے اپنی جان کی فکر تھی اب رشید کی جان بھی خطرے میں تھی۔ اس نے دو جاہیں بچانے کے لیے ایک جاہ قربان کر دی۔

پیغام ملتے ہی یحییٰ نے اپنے بیٹے فضل کو پیغام بھیجا کہ برسی کا میوں کو جمع کر دو اور رشید کی طرف سے تمام محال کو فرمان جاری کریں کہ وہ فوراً لوگوں سے اس کے لیے بیعت کریں اور اپنی ذمہ داریاں بدستور سرانجام دیتے رہیں۔ فضل نے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور کاتبوں سے

فرمان لکھوا لیا۔

سازشیں اپنا کام کر رہی تھیں۔ خالصہ نے اپنی بہن کو پیغام پہنچا دیا تھا۔ وہ خلیفہ ہادی کی تیمارداری پر متعین تھی۔ پیغام ملتے ہی وہ موقع کی تاک میں لگ گئی۔ یہ موقع اسے جلد ہی مل گیا جب ہادی گہری نیند سو گیا۔ اس باندی نے جو ہاتھ بیروں کی نہایت مضبوطی سے اس کے بازو پکڑا دیوں کی طرح سخت تھے۔ نہایت فریب اندام اور با وزن تھی، خلوت سے فائدہ اٹھالیا۔ ایک تکیہ ہادی کے منہ پر رکھا اور اس پر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے ہانک کو پکڑ لیا۔ ہادی مرد تھا۔ جری بھی تھا اور طاقتور بھی۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلائے لیکن اس باندی کو اپنے اوپر سے ہٹا نہ سکا۔ کچھ دیر ترپا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ اس کے اوپر سے اٹھی اور اچھی طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد کہ وہ مر چکا ہے اس کے کمر کی ٹکنیں درست کیں اور شور مچا دیا کہ خلیفہ کا انتقال ہو گیا ہے۔

موسیٰ ہادی کی وفات کا اعلان کر دیا گیا۔

خیزران نے ایک پیام کے ذریعے یحییٰ کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ اطلاع پہنچانے والے نے اسے جیل سے رہا کیا اور وفات کی خبر سنائی۔

یحییٰ قید خانے سے نکلا اور سیدھا قصر انبیس پہنچا جہاں ہادی کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ ابھی تک کوئی حکومتی کارندہ وہاں نہیں پہنچا تھا۔ کچھ دیر بعد بعض سالاران فوج اور ابراہیم حرکانی پہنچ گئے۔ یحییٰ انہیں لے کر اس مکان پر پہنچا جہاں ہارون کو نظر بند کیا گیا تھا۔

ہارون اس وقت سو رہا تھا۔ نصف شب گزر چکی تھی۔ ہارون گہری نیند میں تھا۔ یحییٰ نے اسے بیدار کیا۔

”امیر المومنین! خواب راحت سے بیدار ہو جائیے۔“

ہارون بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور امیر المومنین کہنے پر یحییٰ کی سرزنش کی۔

”آپ نے مجھے امیر المومنین کہہ کر پکارا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اگر یہ بات ہادی تک پہنچ گئی تو آپ کا اور میرا کیا حشر ہوگا۔“

”ہادی کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”کیا؟“ اس کی نیند اڑ گئی۔ ”یہ مذاق ہے یا آپ کسی سازش کا شکار ہوئے ہیں؟“

”نہ یہ مذاق ہے نہ میں سازش کا شکار ہوا ہوں۔ میں خود اس کی لاش دیکھ کر آ رہا ہوں۔ میں آزاد ہوں یہ پہلا ثبوت ہے اور ہادی کی اکثریتی میرے پاس ہے یہ دوسرا ثبوت ہے۔ تخت آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ دروازے پر

پر قبضہ کر لیا۔ البتہ مہر بردار کا منصب ایسا تھا جس پر ایک ایسا شخص فائز تھا جو منصور کے زمانے سے چلا آ رہا تھا اور یحییٰ کی طرف سے بھیجے گئے ہر کاغذ پر مہر نہیں لگاتا تھا بلکہ کسی فرمان پر ذرا بھی شک ہوتا تو ٹال مول سے کام لیتا تھا۔ بالآخر کوئی ایسی چال چلی کہ یہ عہدہ بھی اس سے لے لیا۔ اب وہ خود مختار تھا۔ رشید اور خیزران کے علم میں لائے بغیر فرمان جاری کر لگا۔

یحییٰ نے اب ان لوگوں کو ٹھکانے لگانے کی سوچی جو اس کے مخالف تھے، جنہوں نے ہادی کا ساتھ دیا تھا یا بیعت کرنے میں تامل سے کام لیا تھا۔ یہ لوگ نہ صرف تعداد میں بہت زیادہ تھے بلکہ با اثر بھی تھے۔ سب سے اہم شخص فضل بن زبیع تھا۔ یہ شخص یحییٰ کا جانی دشمن تھا اور ہادی کو اس کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ خیزران بھی اس سے پر خاش رکھتی تھی لیکن زبیدہ اس کے حق میں تھی۔

اب حکومت کی کنون میں زبیدہ کا بھی حصہ تھا۔ وہ امور مملکت میں دخل نہیں دیتی تھی لیکن ہارون کی جیتی بیوی تھی۔ اب اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا بھی ضروری ہو گیا تھا لہذا زبیدہ کے کہنے سے رشید نے اسے مقرب بارگاہ بنانے کا ارادہ کیا۔ زبیدہ بھی اس کے حق میں تھی لیکن

یہی حال خود رشید کا تھا۔ اس نے سارا بار یحییٰ کے کندھوں پر ڈال دیا تھا۔ خیزران موجودگی جو اسے خطرات سے بچا سکتی تھی۔ اس نے لگام مال کے ہاتھوں میں دے دی تھی اور خود اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ رشید کا سارا وقت شاعروں کی مجالس اور نغمہ و سرور کی محافل میں بسر ہو رہا تھا۔

یحییٰ کو اور کیا چاہیے تھا۔ وہ کیوں چاہتا کہ رشید امور مملکت کی طرف متوجہ ہو بلکہ اس نے تو اپنے بیٹوں فضل اور جعفر کو اس کا ندیم خاص بنا دیا کہ اگر بھی وہ راہ راست پر آتا بھی چاہے تو نہ آ سکے۔ یہ دونوں قصر خلد کے مستقل مکین بن گئے۔ ہارون رشید کے پیچھے سارے کی طرح لگے رہتے۔ اپنے بھائی محمد بن خالد کو واجب بنا دیا تا کہ وہ مجلس کا انتظام کرے اور لوگ ہارون کی خدمت میں حاضر ہوں تو وہ وہاں موجود رہے۔

اب ہارون پوری طرح یحییٰ کے شکنجے میں تھا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ ہر طرف یحییٰ کے آدی موجود ہیں اور کیوں نہیں؟

یحییٰ کو پورا موقع مل رہا تھا کہ وہ اپنی من مانی کرتا رہے۔ اس نے آہستہ آہستہ حکومت کے تمام شعبوں

اس کی سواری قصر خلد پہنچی۔ نماز جمعہ کا وقت آیا رشید قصر خلد سے جامع مسجد میں پہنچا۔ ہارون نے خود امامت کی اور اس کے بعد جن مسجد میں بیٹھ گیا۔ یہاں وہ لوگ بیعت کے لیے پیش ہوئے جو قصر اسینی میں حاضر نہ ہو سکے تھے۔

دوسرے دن ہارون رشید نے محل میں دربار عام منعقد کیا۔ یحییٰ بن خالد کو منصب وزارت سونپا اور مہر وزارت عطا کی۔

”اپنی ذمہ داری کا حلقہ آپ کی گردن میں ڈالتا ہوں آپ جو حکم چاہے نافذ کیجیے۔ میں آپ کے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کروں گا۔“

شعرا نے قصا ندیش کیے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ سورج اندھا ہوا تھا لیکن جب ہارون نے حکومت ہاتھ میں لی تو اس کا نور ہر طرف پھیل گیا

ہارون کے رخ روشن سے دنیا نے جمال حاصل کیا ہارون والی ہے اور یحییٰ اس کا وزیر۔

۰۰۰

یحییٰ نے وزارت حاصل ہوتے ہی گرد و پیش پر نظر ڈالی تو میدان صاف تھا۔ تمام سیاسی حریف منظر نامے سے غائب ہو چکے تھے۔ کچھ مر گئے تھے، کچھ مار دیے گئے، کچھ جیل میں تھے۔ کوئی نہیں تھا جو اس کے اثر و نفوذ میں مزاحم ہو سکے۔ ایک خیزران بھی جس سے بچنے کا کوئی طریقہ اس کے پاس نہیں تھا۔

خیزران اب بھی قدیم روش پر قائم تھی۔ امور مملکت میں اسی طرح دخل انداز ہو رہی تھی۔ یحییٰ نے غور کیا تو سپر انداز ہونے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے خیزران کی ابھی ضرورت بھی تھی تا کہ قصر خلافت سے اٹھنے والی لہروں سے مقابلہ کرنے کے لیے خیزران کی پشت پناہی اسے حاصل رہے۔

خیزران کو خوش کرنے کے لیے وہ ہر کام میں اس سے مشورہ کرنے لگا۔ خیزران کو مزید رام کرنے کے لیے اس نے تحائف کا سلسلہ دراز کر دیا۔ بھی کوئی گاؤں نذر کر دیتا بھی کوئی بارغ پیش کرتا۔ اتنی عنایات کے بعد خیزران اس سے کیوں پوچھتی کہ وہ خود کتنا کار بار ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے خاموش مددگار بنے ہوئے تھے۔

ہوں۔ میں ان اذیتوں کو بھولا نہیں ہوں جو اب تک مجھ پر گزری ہیں۔ بل پر سے گزرتے ہوئے ابو عاصمہ نے جس حقارت سے مجھے ڈانٹا تھا اور اسلام ایرش نے قید کے زمانے میں جو تکلیفیں مجھے پہنچائی ہیں انہیں میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ ابراہیم حرکانی کی وہ بدگامی بھی مجھے یاد ہے جو اس نے ہادی کے سامنے مجھ سے کی تھی۔ میں ان سب کے سر قلم کراؤں گا۔“

یحییٰ بن خالد کے لیے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ ہارون کو اس اقدام سے باز رکھتا لیکن اسے یہ خوف ہوا کہ نہیں یہ لوگ مرتے وقت اس سازش کا بھانڈا نہ پھوڑ دیں جو اس نے ”رشید“ کو برسر اقتدار لانے کے لیے کی تھی۔ اس سازش سے رشید بے خبر تھا۔ خاص طور پر ابراہیم حرکانی کا قتل وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

اس نے سفارش کی۔ ”ابو عاصمہ تو بے شک ناقابل معافی مجرم ہے لیکن سلامہ مجبور تھا۔ وہ حکم کی اطاعت کر رہا تھا۔ ابراہیم حرکانی کی طرف سے آپ دل صاف کر لیں۔ وہ ہمارا مخالف بھی نہیں تھا۔ اس نے کسی مصلحت کے تحت کچھ کہا ہو گا۔“

اس سے زیادہ وہ سفارش نہیں کر سکتا تھا۔ ہارون نے ابو عاصمہ کا سر قلم کرا دیا۔ سلامہ اور ابراہیم کو جیل میں ڈال دیا (یہ دونوں بعد میں یحییٰ کی سفارش سے رہا کر دیے گئے تھے)

۰۰۰

سابق خلیفہ ہادی کی وفات کی خبر بغداد پہنچی تو گویا اتنی اچانک تھی کہ لوگوں کو صدمے سے زیادہ حیرت ہوئی۔ اس اشغال میں کوئی سازش بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ لوگ اتنے خوفزدہ تھے کہ محل کر بات کرتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ ایک دوسرے سے سرگوشی میں سوال جواب کرتے پھر رہے تھے۔ فضا مسموم ہو گئی تھی لیکن ہارون رشید کی سواری کی خبر پہنچی تو سب استقبال کو نکل آئے۔ سڑکوں پر ہجوم ہو گیا۔ عورتیں بچوں اور کھڑکیوں پر نئے خلیفہ کو دیکھنے کے لیے آئیں۔

جب ہارون کی سواری پل کے قریب پہنچی تو منظر دیدنی تھا۔ ہارون بوجہ اس کی معزز شخصیتوں کے درمیان کھرا ہوا نظر آیا۔ وہ سیاہ لباس زیب تن کیے جو اہر دارو سے کی نکو اور لٹکاے مبارک ہادوں کا جواب زیر لب تبسم سے دیتا چلا آ رہا تھا۔ پشت پر افسران فوج، فقہاء، علما اور منصب داروں کی قطاریں تھیں۔

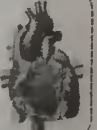
اگر دیکھتے ہوئے دانت اکھاڑ دیئے کا نا اعلیٰ علاج ہے تو دیکھتے ہوئے سر آنکھ کان اور ناک کے بارے میں کیا خیال ہے

گردہ، مٹانہ، پستہ کی پتھریلوں، ہرسم کی گلیٹیوں، رسولیوں، بوا سیر، موتیا، ہرنیا اینڈے سائٹس، ٹانسلز اور پراسٹیٹ کے آپریشن کی ضرورت نہیں

مردوں میں چھاتیوں کا بڑھنا، زنانہ دمرانہ بانچھ پن، عورتوں کے چہرے پر بال، بالوں کا گرنا، قبل از وقت سفید ہونا چھائیاں زدہ چہرہ، ایام کی بے قاعدگی، خون کی نالیوں کا بند ہونا، اعضاء کا سن ہونا، ریڑھ کے مہرہوں کا بے قاعدہ ہونا، بچے کا مٹی کھانا، بستر پر پیشاب کانگل جانا، قد کا چھوٹا رہ جانا، اندر گدھ اور گدھ، جوڑوں کے درد پیدا ہونے کی گونگا بھرا، آنکھ کا ٹیسرہا پن قابل علاج ہیں

شوگر، دم، بلڈ پریشر، شیزوفرنیا، آسٹوٹیزم قابل علاج ہیں۔ ہپاٹائٹس، ڈائلائیز سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

فرید ہومیوپیتھک 11 جون 2013ء
ہومیوپیتھک سائنسز کا مکمل کلینک اینڈ ریسرچ سنٹر 5 مارچ 2013ء
دی، آئی پی صراف مارکیٹ، چوک صادق آباد، راولپنڈی
dr.niazakmal@gmail.com 0323-5193267



خیزران آڑے آگئی۔

زبیدہ کی حمایت سے فضل کو بہر حال اتنا فائدہ پہنچ گیا کہ اس کی جان بچ گئی اور عرصہ دراز تک حکومت کے ایوانوں سے دور رہنے پر مجبور ہو گیا۔

ان سیاسی اور انتظامی امور کے ساتھ ساتھ دوسری اصلاحات بھی کی جارہی تھیں۔ نئے نئے قلعے بنائے گئے۔ چھاندیاں تعمیر ہوئیں۔

اسی طرح ہارون رشید نے اپنی خلافت کے چار سال گزار دیے کہ 789ء میں اس کے اطمینان کی کشتی ڈاؤن ڈول ہوئی۔

خیزران کا انتقال ہو گیا۔

سوگ تو ہارون منارا ہوا تھا کہ خیزران اس کی ماں تھی لیکن فکر مند بن گئی تھا۔ اس کے لیے اس سے مشکل وقت کون سا ہو سکتا تھا۔ خیزران کے اٹھ جانے سے مخالفین کے دروازے کھل گئے تھے۔ ان لوگوں کو روکنے والا کوئی نہیں تھا جو بجلی کے حریف تھے۔ وہ بڑی آسانی سے داخل ہو سکتے تھے اور رشید کے کان بھر سکتے تھے۔

جب خیزران کی تدفین عمل میں آئی تو تدفین کے بعد رشید ایک قریبی حویلی میں چلا گیا جو اس کی استراحت کے لیے تیار کی گئی تھی۔

لوگ ایک ایک کر کے آ رہے تھے اور تعزیت پیش کر رہے تھے۔ ان تعزیت کرنے والوں میں فضل بن ربیع بھی تھا۔ جب وہ تعزیت کر چکا تو ہارون نے اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

”اے فضیل! جس روز سے مجھے منصب خلافت ملا ہے میں تجھے مقرب بنانے اور مرتبہ خاص تک پہنچانے پر غور کر رہا ہوں۔ خدا میری والدہ پر رحم کرے وہ مجھے روکنی رہیں۔ میرے پاس اطاعت کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اب میں آزاد ہوں۔ تم جعفر بن یحییٰ برکی سے انگشتی لے لو۔“

اس غیر متوقع اعلان پر یحییٰ برکی ششدر رہ گیا۔ وہ تصویر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ رشید اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام کر سکتا ہے اور وہ بھی اس کے بیٹے کو معزول کر کے اس کے دشمن کو اعزاز دینے کا اقدام۔

یہ واقعہ ستر سال کے اس تجربہ کار بوڑھے کی آنکھیں کھول دینے کے لیے بہت تھا۔

رشید پر بھی یہی مرتبہ باکشاف ہوا تھا کہ وہ خلیفہ ہے۔ قصر خلد پر اب زبیدہ قابض تھی۔ وہ نہ تو مال

و متاع جمع کرنے کی شوقین تھی اور نہ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کی ماہر۔۔۔۔۔

یحییٰ اس سے وہ کام نہیں لے سکتا تھا جو خیزران سے لیتا رہا تھا۔ اب اسے جو کچھ کرنا تھا اپنے ہل بوتے پر کرنا تھا۔ سب سے پہلے تو اسے یہ دیکھنا تھا کہ اب اس کی حیثیت میں کوئی فرق آیا ہے یا نہیں۔ یہ جانچنے کے لیے وہ اذن باریابی کے بغیر جیسا کہ اس کا قاعدہ تھا رشید کی مجلس میں پہنچ گیا اور سلام کیا۔ رشید نے سلام کا جواب دے تو دیا لیکن سرد مہری صاف ظاہر تھی جب یحییٰ بیٹھ چکا تو ہارون رشید ایک شخص کی طرف متوجہ ہوا۔

”مگر تم اپنی مجلس میں بیٹھے ہو تو کیا کوئی شخص اجازت لیے بغیر اندر آ سکتا ہے؟“

”نہیں امیر المومنین! ایسا تو نہیں ہو سکتا۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”گو یا ہم اتنے گزرے ہیں کہ لوگ اجازت لیے بغیر جب چاہیں ہماری مجلس میں آجائیں۔“ اتنے واضح اشارے کے بعد یحییٰ نے سمجھتا کہ بات اسی کی، کی جارہی ہے۔ اس نے وضاحت کی۔

”یا امیر المومنین! اگر یہ غلطی ہے تو مجھ سے پہلی مرتبہ سرزد نہیں ہوئی ہے۔ امیر المومنین نے مجھے ہمیشہ دوسروں سے بلند و ممتاز رکھا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب تک امیر المومنین جس بات کو پسند کرتے اور خوشی سے گوارا کرتے چلے آئے تھے اب اسے ناپسند فرمانے لگے ہیں۔ مجھے اس میں کیا عذر ہو سکتا ہے کہ میں اس طبقہ ثالث میں شامل ہو جاؤں جو اہل اذن میں شمار ہوتے ہیں۔“

ایک مرتبہ یحییٰ رشید کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دور سے دیکھا کہ سوچ میں گم بیٹھا ہے۔ یہ مناسب نہ معلوم ہوا کہ اس کے غور و فکر میں چل انداز ہو۔ اٹنے پاؤں واپس آ گیا رشید کی نگاہ اس پر پڑی۔ اس نے خادم کو حکم دیا۔

”جاؤ یحییٰ کے پاس جاؤ اور اسے کہنا کہ میں تجھے مہتمم گردانتا ہے جو دبے پاؤں آیا اور واپس چلا گیا۔“

یحییٰ نے اس خادم سے کہا۔

”امیر المومنین سے کہنا جب وقت آجاتا ہے تو موت بہانے پیدا کر لیتی ہے ورنہ خدا جانتا ہے کہ میں تو صرف اس لیے واپس آ گیا تھا کہ حکومت میں قتل ہونا نہیں چاہتا تھا۔“

ان بے درپے واقعات نے یحییٰ کو ہوشیار کر دیا۔ اب وہ سمجھنے لگا تھا کہ رشید اس سے بچھا چڑھنا چاہتا ہے۔ اب اسے اپنا سیاسی رخ تبدیل کرنے کی ضرورت تھی۔

پس پردہ

گیا۔ جب آدمی رات گزری تو اپنے معتد خاص کو طلب کیا۔ ”جو حکم میں تجھے دوں گا کیا تو اس کی تعمیل کرے گا؟“ ”امیر المومنین! اگر آپ حکم دیں کہ اپنی کھوار اپنے پیٹ میں اتار لوں تو میں دیر نہیں لگاؤں گا۔“

”تو ابھی جاؤ رشید بن یحییٰ کا کتا ہوا سر میرے پاس لے کر واپس آ۔“

مسرور یہ حکم سن کر کانپ اٹھا لیکن حکم تو بجالانا تھا۔ اس نے ایک دستہ سیاہ ساتھ لی اور جعفر کے خیمے میں پہنچ گیا۔ محفل ناؤ نوش مگر محرم تھی۔ دف نچ رہا تھا۔ معنی فخر سرائے۔

”تم بلا اجازت اندر کیسے آئے؟“ جعفر چیخا۔

”آپ ذرا میرے ساتھ تہائی میں چلیے۔“ جعفر خاموش سے اٹھ گیا۔ مسرور اسے ایک جگہ لے گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور قتل کی تیاری کرنے لگا۔

”مسرور یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ جعفر نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اپنے آقا کے حکم کی تعمیل۔“

”مسرور، کیا تم نہیں جانتے امیر المومنین مجھ سے طرح طرح کے مذاق کرتے ہیں۔ یہ حکم بھی انہوں نے مذاق میں دیا ہوگا۔“

”وہ تم سے مذاق کرتے ہوں گے مجھ سے نہیں کرتے۔“

”اچھا تو تم امیر المومنین کے پاس واپس جاؤ اور کہو تم نے مجھے قتل کر دیا ہے۔ اگر وہ اظہار ندامت کریں تو مجھے معاف کر دینا۔ سمجھ لینا کہ یہ مذاق تھا۔“

مسرور نے اس کو اچھی طرح رسیوں سے جکڑ دیا اور رشید کے پاس واپس آیا۔

”یا امیر المومنین! آپ نے جو حکم دیا تھا اس کی تعمیل ہو گئی ہے۔“

”جلدی کر اور اس کا کتا ہوا سر لا۔“

مسرور جعفر کے پاس پہنچا اور اس کا سر کاٹ لیا۔

اس کے بعد ہر ایک کے ملازموں، خادموں، غلاموں اور جتنے لوگ اعوان و انصار میں سے تھے سب کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔

یحییٰ برکی کے لیے حکم ہوا کہ اسے گھر میں قید کر دیا جائے لیکن اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتی جائے۔ سلالہ ایرش کو اس کی نگرانی پر مامور کیا۔

وہ خاموش ہو گیا تھا لیکن اپنے بیٹوں کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔ فضل بن یحییٰ اور جعفر اب ایسی سازشوں میں شریک ہو گئے تھے جن کا رخ رشید کے خلاف تھا۔ رشید کے بیٹوں امین اور مامون کی ولی عہدی کے مسئلے پر انہوں نے زبیدہ سے مل کر رشید کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ رشید مامون کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا جبکہ فضل بن یحییٰ نے خراسان میں امین کے حق میں بیعت لینا شروع کر دی۔

یحییٰ اپنے بیٹوں کو سمجھا تا رہتا تھا اور بالآخر اس نے ایک دن جعفر سے کہہ دیا۔

”خدا کی قسم خاندان برا مکہ اگر برباد ہوگا تو صرف تیری غلط کاریوں اور برائیوں کے باعث۔“

ایک مرتبہ اس نے جعفر کو لکھا۔

”میں نے تجھے تیرے حال پر چھوڑ دیا ہے تاکہ زمانہ خود تجھ سے ہمت لے۔ اگرچہ مجھے اندیشہ ہے کہ تو اپنے خاندان کے لیے پیام موت ثابت ہوگا۔“

یحییٰ کے بڑھاپے نے اسے کم حوصلہ کر دیا تھا۔ اب اس کے بس میں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ خود اپنے لڑکوں تک پر اس کا زور نہیں تھا۔ اس بات سے بھی واقف نہیں تھا کہ رشید ان لڑکوں کی سازشوں اور کارروائیوں سے کتنا چوکنا ہو چکا ہے لیکن حالات کا رخ دیکھ کر اندازہ کر سکتا تھا کہ نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔

زمانہ اسی طرح گزرتا رہا اور رشید فخر رہا کہ موقع ملے اور اور کر گزرے۔ بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ برا مکہ کا خاتمہ کر دے گا۔

ایک اندرونی کنکاش تھی جو رشید اور آل برک کے درمیان جاری تھی اور روز بروز خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس کے چرچے اب عوام کی زبان پر بھی آ گئے تھے حالانکہ وہ آل برک کے افراد کے ساتھ ظاہری طور پر تعلقات قائم رکھے ہوئے تھا۔

جعفر برکی سے اس کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے جا رہے تھے۔

رشید اپنے منصوبے کو تیزی کے ساتھ کامیاب بنانے میں منہمک تھا۔

۵۵۵

رشید نے سارا دن جعفر اور دوسرے مہما جوں کے ساتھ شکار کر لیا۔ کسی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ وہ جعفر سے کتنا خفا ہے۔

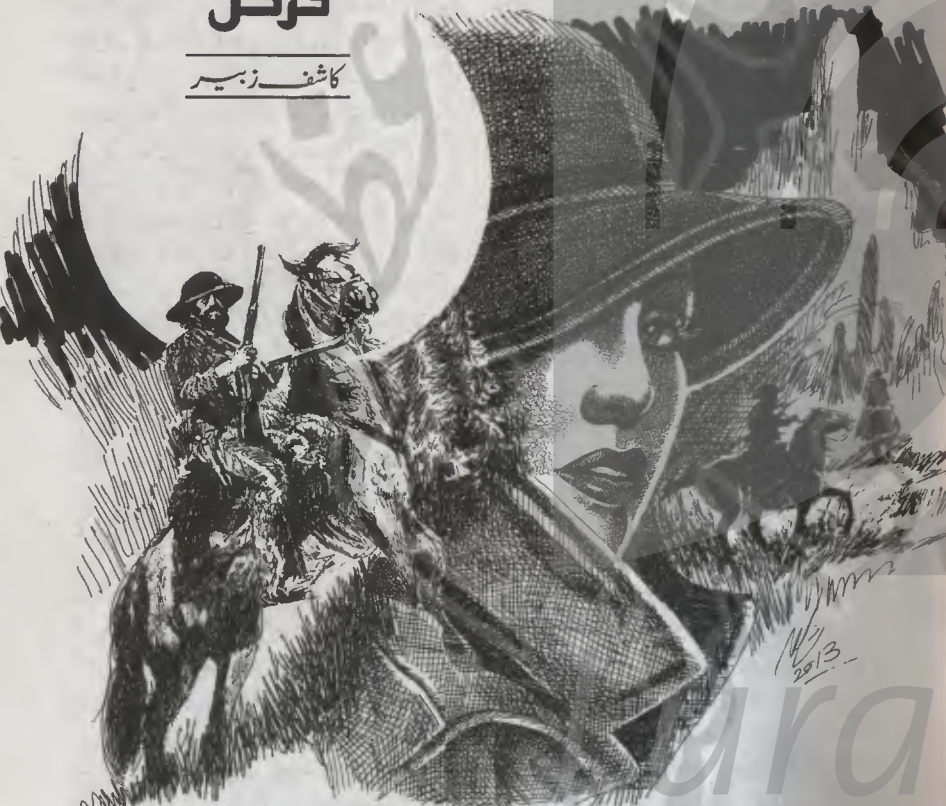
شکار سے واپس آ کر صحن اتارنے کے لیے لیٹ

بعض ذمہ داریوں کا قرض کسی پریوں عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے عوض اسے اتارنا چاہے تو بھی ادا نہ ہو پائے۔ وہ بھی سانسوں کے نذرانے دے رہا تھا مگر مسلسل اس دلدل میں دھنستا جا رہا تھا جس کی نہ گہرائی کا پتا تھا نہ گہرائی کا مگر... ایک روز اس ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا اور وہ چوناممکن تھا، ممکن ہو گیا۔

مغرب سے درآمدہ جرائم کی دنیا کا مختلف انداز

قرض

کاشف زبیر



رنگ، کھڑے نقش اور سڈول بدن اس کے باپ کی طرف سے تھا جو انگریز نسل سے تھا۔ کلارک ہاروی کا باپ لندن سے آکر کیس اس میں آباد ہوا تھا۔ وہ سپاہی تھا اس لیے اس نے یہاں بھی سپاہی پیشہ برقرار رکھا مگر فوج کے بجائے پولیس فورس کو ترجیح دی اور شرف بن گیا۔ البتہ کلارک نے کسی قدر مختلف پیشہ اختیار کیا تھا۔ اس نے کوریئر مینی کھول لی اور

رینانے رائفل شانے سے نکالی اور سانس روک کر فائر کیا۔ سوگند دور رکھی بیڑ کی خالی بوتل دھا کے سے بھر گئی۔ یہ آج کے دن اس کا پیاس میں سے چالیسواں کامیاب شاٹ تھا۔ رینانے کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی مگر دیکھنے میں وہ پچیس برس کی لگتی تھیں۔ اس کے سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں ماں کی طرف سے جو کونسلر اسٹینش تھیں۔ جبکہ اس کا گلابی

رشید اب تک بچنی کے سحر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا لیکن ایک ہی جھٹکے میں یہ زنجیریں اس نے توڑ دیں۔ اس کی شخصیت پہلی مرتبہ بالکل خشک طور پر اپنے آب و رنگ کے ساتھ نمایاں ہوئی تھی۔ اب وہ سب کچھ کرنے میں آزاد تھا کسی میں دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔

جب کچھ عرصہ گزر گیا تو آل برک کی خواتین ملکہ زبیدہ کے پاس آئیں اور رو رو کر اپنی خدات کا ذکر کیا اور بچنی اور فضل بن بچنی کی دہائی دی۔ زبیدہ کا دل نرم پڑ گیا اور اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ رشید سے ان کے لیے سفارش کرے گی۔ وہ رشید کے پاس گئی بھی لیکن رشید نے صاف انکار کر دیا۔

اب زبیدہ نے ایک اور چال چلی۔ بچنی کی جانب سے اثر انگیز رقم لکھا جس میں رقم و گرم کی اہلی کی گئی تھی اور کچھ خواتین کو لے کر رشید کے پاس ایک مرتبہ پھر گئی۔ اپنے ساتھ کچھ باندیاں بھی لے کر گئی جنہوں نے رشید کے سامنے گیت گائے۔ ایسے گیت جن میں رشید کی فیاضی اور رحم دلی کے قصیدے تھے۔ رشید کے چہرے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ اسی وقت زبیدہ آگے بڑھی اور اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور بچنی کی طرف سے لکھا ہوا رقم اس کے سامنے ڈال دیا۔

رشید نے وہ رقم اٹھا لی۔ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر اس پر اپنا جواب لکھا اور زبیدہ کی طرف پھینک دیا۔ ”تمہارا لکھا اٹا بڑا ہے کہ رحم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

اس دن کے بعد سے زبیدہ نے خاموشی اختیار کر لی۔ بچنی کے بے خواہوں اور دوستوں کی کمی نہیں تھی لیکن اس واقعے کے بعد کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ ان میں سے کوئی رشید کے حضور بچنی کی سفارش کرتا۔ وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ بچنی جیل میں بیمار پڑا اور بالآخر وفات پا گیا۔

بغداد میں اٹھنے والی سازشوں کا یہ آخری مہرہ بھی منظر تار سے دور ہو گیا۔ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بچنی کی وفات کے صرف تین سال بعد ہی ہارون رشید بھی راہی ملک عدم ہوا۔

سلامہ ایرش اسی وقت بچنی کے پاس آیا اور اسے حکم دیا کہ وہ نظر بند ہے۔ یہاں سے قدم باہر نہ نکالے۔ بچنی نے پوچھا۔ ”جعفر پر کیا کڑی؟“ ایرش نے جواب دیا۔ ”وہ قتل کر دیا گیا۔“ ”اور جعفر کے دوسرے بھائیوں کا کیا حال ہے؟“ ”وہ جیل میں ہیں۔“

بچنی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”زمانہ اسی طرح گردش کرتا ہے۔ مجھے معلوم تھا جی ہوتا ہے لیکن میرے بیٹوں نے میری ایک نئی۔ ہائے میرا خاندان۔“ بغداد کے چوراہے پر جعفر بن بچنی برکی کی لاش لٹک رہی تھی۔ جب برآمدہ کے تمام مرد قتل ہو چکے یا گرفتار ہوئے اور انتظامات سے فراغت ہوئی تو رشید نے بچنی کے پاس پیغام بھیجا۔

”میں تم سے کوئی بدسلوکی روا رکھتا نہیں چاہتا۔ تمہاری رضا پر چھوڑتا ہوں کہ تم جہاں جانا چاہو رہو۔“ ”اگر آپ مجھ سے راضی ہیں تو مجھے مکہ مکرمہ بھیج دیں اور اگر راضی نہیں تو جہاں ہوں وہیں خشک ہوں۔“ بچنی نے جواب دیا۔

بچنی نے یہ سفارش بھی کی کہ جو برکی جیل میں ہیں انہیں رہا کر دیا جائے لیکن رشید جانتا تھا کہ انہیں جیل سے رہا کرونا خطرناک ہے۔

رشید نے پیغام بھیجا۔ ”تم اکیلے جہاں چاہو جا کر رہ سکتے ہو۔“ ”اس صورت میں میرے لیے پسندیدہ یہ ہے کہ میں اپنے بیٹوں فضل اور ادرموسیٰ کے ساتھ رہوں۔“

رشید نے اس کی بات مان لی اور اسے بیٹوں کے پاس ایک مقام پر منتقل کر دیا۔ رشید کے سامنے فضل اور جعفر کی ماں اور اپنی رضاعی ماں زینت بیڑ کا مقدمہ بھی پیش ہوا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔

اس کے لیے حکم صادر ہوا کہ وہ جب چاہے اور جتنے دن چاہے ان قیدیوں کے ساتھ بود و باش رکھ سکتی ہے۔ ایک لاکھ درہم اسے ضروریات پوری کرنے کے لیے بھیجے اور بہت سے بیٹیں قیمت کپڑوں کے تھان ارسال کیے۔

تاریخ طبری، ابن جریر طبری، تاریخ ابن کثیر، علامہ ابو الحسن، ہارون الرشیدہ
مترجم رئیس احمد جعفری، تاریخ اسلام، شاہ معین الدین ندوی

ماخذات

لوگوں کا قیمتی سامان ان کی قیمتی جگہوں پر پہنچانے لگا۔ اس کا کام چل نکلا اور اس نے ابھی خاصی دولت کمائی۔ ایریزونا اور نیو میکسیکو کی کانوں سے نکلنے والا سونا مغربی شہروں تک پہنچانے کا کام پُر خطر لیکن نفع بخش تھا۔

بیس سال کی عمر میں ریٹا باپ کے برنس میں شامل ہو گئی تھی۔ اس نے یہ طور گارڈ کام کا آغاز کیا۔ اگرچہ کلارک نے مخالفت کی تھی۔ وہ جانتا تھا اس کام میں کتنا خطرہ ہے۔ پندرہ سال میں کلارک کے ایک درجن سے زیادہ گارڈ ڈاکوؤں کا اپنے نشانہ بن چکے تھے لیکن انہوں نے ایک بار بھی ڈاکوؤں کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے نہیں دیا تھا۔ کلارک اپنے گارڈ کی تربیت خود کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سب سے زیادہ ڈاکے گارڈ خود پڑواتے ہیں۔ اس معاملے میں اس نے ایک ہی بار غلطی کی تھی اور وہ اس کی آخری غلطی ثابت ہوئی تھی جب اس نے وائن نامی ایک نوجوان کو گارڈ کے طور پر جاب دی اور وہ نیکیاس کے صحرا کے بخار کے نام سے مشہور ڈاکو جارج کا ساتھی نکلا تھا۔ جارج کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا اور کوئی اسے صورت سے بھی نہیں پہچانتا تھا کیونکہ جن لوگوں نے اس کا سامنا کیا تھا وہ اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ جارج یعنی گواہ چھوڑنے کا قائل نہیں تھا۔ اس کی سفاکی کے قفسے مشہور تھے۔ اس سفر میں کلارک بھی گیا تھا کیونکہ سونے کی بہت بڑی کھپ تھی جو نیو میکسیکو سے کیلیفورنیا بھیجی جارہی تھی اور بعد میں کلارک سمیت اس کے ایک درجن محافظوں کی لاشیں ایریزونا کے ویران صحرا میں پائی گئی تھیں سوائے وائن کے جو غائب تھا۔ پولیس کے مطابق یہ جارج کی کارروائی تھی۔

ریٹا ان دنوں بیمار تھی اور اسی وجہ سے اس سفر پر ساتھ نہیں جاسکتی تھی۔ البتہ اس نے وائن کو دیکھا تھا۔ وہ پچیس چھپیس برس کا سخت نفوش والا نوجوان تھا۔ کلارک نے کھپ جانے سے صرف ایک ہفتہ پہلے اسے ملازم رکھا تھا۔ ریٹا کے لیے باپ کی موت بہت بڑا سانحہ تھی۔ کیونکہ ماں اس وقت پہننے کی وبا کا شکار ہو گئی تھی جب ریٹا صرف دس سال کی تھی پھر اس کی پرورش کلارک نے کی تھی اور اسی وجہ سے وہ باپ سے بہت زیادہ قریب تھی۔ وہ اس سے متاثر تھی اور ریٹا نے باپ کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ کلارک راضی نہیں تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ ریٹا کی صورت پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہے تو مجبوراً وہ راضی ہو گیا اور پھر اس نے خود ریٹا کی تربیت کی۔ اس کی خواہش تھی کہ ریٹا شادی کرے اور اسے کئی نواسے اور بیویوں کا نانا بنا دے۔ مگر ریٹا نے جلد شادی سے انکار کر دیا تھا۔ وہ جن افراد سے ملی تھی ان میں سے کوئی اسے شریک حیات کی

حیثیت سے متاثر نہیں کر سکا تھا۔

پھر کلارک مارا گیا اور اس ناکامی نے کھپنی کی ساتھ کو بھی شدید متاثر کیا۔ ڈاکوئری یا ایک کروڑ ڈالرز مالیت کا سونا لے اڑے تھے۔ 1835ء میں ایک کروڑ ڈالرز بہت بڑی رقم تھی اور آنے والے کئی سالوں تک اس واردات کا چرچا ہوتا رہا تھا، جو کہیں بھی فروخت کے لیے مارکیٹ میں نہیں آیا تھا۔ کیونکہ مارکیٹ میں موجود سونے کی مقدار میں اضافہ دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ سونا ایوی گولڈ نامی فرم کا تھا جو ایریزونا اور نیو میکسیکو میں سونے کی سب سے بڑی خریدار تھی اور یہ سونا خرید کر زیادہ تر وفاقی حکومت کو فروخت کرتی تھی۔ بعد میں ایوی گولڈ کی جانب سے کلارک کی فرم پر چرچانے کا دعویٰ کیا گیا تھا مگر عدالت نے یہ دعویٰ خارج کر دیا۔ ریٹا نے کھپنی ختم کر دی۔ کلارک نے اس کے لیے اس فارم ہاؤس کے علاوہ بھی بہت کچھ چھوڑا تھا۔ وہ مزے سے رہ رہی تھی۔

باپ کے بعد بھی اس نے شادی کا نہیں سوچا تھا۔ وہ رائفل لے کر پاس رہی میننگ آئی، رائفل رکھ کر اس نے چائے والی سے اپنے لیے چائے نکالی۔ تقریباً دو ہیکٹر رقبے پر پھیلے فارم ہاؤس میں غلترے اور سیب کے درخت لگے تھے۔ سامنے والے حصے میں بڑا خوب صورت لان تھا اور لان کے پار دو منزلہ لکڑی اور پتھر سے بنا ہوا سفید مکان تھا۔ عقبی حصے میں اصطبل اور ایک چھوٹا ساموئی گھر تھا۔ فارم ہاؤس اور گھر کے کاموں کے لیے کلارک کے زمانے سے دو ملازم تھے۔ چیف گھر کی دیکھ بھال کرتا تھا باورچی بھی وہی تھا جبکہ نوجوان ماس اصطبل اور فارم ہاؤس دیکھتا تھا۔ ماس صرف چھ برس کا تھا جب کلارک نے اسے گود لیا تھا۔ اس کا باپ کلارک کا گارڈ تھا اور ایک ڈاکے میں مارا گیا۔ ماس کا اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ماس کی پرورش اور تربیت کلارک نے کی تھی مگر اس سے پہلے کہ ماس اپنے باپ کی جگہ لیتا کلارک مارا گیا اور کھپنی ختم ہو گئی۔ اب ماس ریٹا کے ساتھ تھا۔ وہ چاہتا تو اسے نہیں بھی ملازمت مل سکتی تھی مگر وہ ریٹا کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ ریٹا چائے پی رہی تھی کہ اس نے دور سے ایک بھیگی کو فارم کی طرف آتے دیکھا۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ اس جگہ اور بھی لوگوں کے فارم ہاؤس تھے، ممکن ہے آنے والا کسی اور سے ملے آیا ہو لیکن چند منٹ بعد بھی اسی کے فارم کے سامنے رکی۔ چیف مکان سے نکل کر گیا اور فوراً ہی وائن آ گیا۔ اس نے ریٹا کے سامنے ایک کاڈ رکھا۔ ”کوئی مشر واکر کرٹ ہے۔“

ریٹا ایوی گولڈ کا نام اور مولو گرام دیکھ کر چوکی۔ مگر یہ واضح نہیں تھا کہ واکر کرٹ کی فرم میں کیا حیثیت تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ پانچ سال بعد انہیں پھر کوئی خیال آیا ہے؟ اس نے چیف سے کہا۔ ”مشر کرٹ کا اندر بلا لیکن صرف مشر کرٹ کو۔“

واکر کرٹ تقریباً چالیس برس کا مضبوط جسمت کا خوش شکل مرد تھا۔ اس کے بال اور مونچھیں سنہری مائل بھورے رنگ کی مگر نقاست سے ترش ہوئی تھیں۔ اس نے موسم کی مناسبت سے اور کوٹ پہن رکھا تھا مگر کمر سے بندھا ہوا لٹرا اور اس میں رکھا اعشاریہ چالیس کا ریو اور صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر گولڈ اور چاندی کی پالش کی گئی تھی اور یہ خاصا قیمتی ریو اور تھا۔ واکر کا لباس اعلیٰ درجے کا اور سرخ چڑے سے بنے جوئے شاندار تھے۔ اس نے اپنا ہیٹ اتارا اور اپنا تعارف کرایا۔ ”واکر کرٹ، مس ہاروی۔“

”کس لیے آئے ہو؟“ ریٹا نے سرد لہجے میں پوچھا، اس نے اسے بیٹھنے کی پیشکش نہیں کی تھی۔ ”میں ایک جاب لے کر آیا ہوں۔“

”میں کام چھوڑ چکی ہوں۔ کھپنی بہت پہلے فروخت کر دی تھی۔“

واکر نے سر ہلایا۔ ”میں جانتا ہوں۔۔۔ میں ایوی گولڈ میں سیکورٹی چیف ہوں۔ ہم اس سونے کی بازیابی چاہتے ہیں جو ہاروی کو زیر کھو چکی ہے۔“

”ہاروی کو زیر ختم ہو چکی ہے۔“ ریٹا کا لہجہ مزید سرد ہو گیا، اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔

”میں جانتا ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”کیا میں بیٹھ سکتا ہوں۔ میں کچھ وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔“

ریٹا نے سوچا اور پھر اس کے خود بخود خال نرم پڑ گئے۔ ”ٹھیک ہے مگر جو کہنا ہے جلدی کہو۔“

واکر سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے اس سونے کی بازیابی کے لیے ایک منصوبہ بنایا ہے کیونکہ ایوی گولڈ نے اس کی بازیابی پر نصف سونا انعام میں دینے کا فیصلہ کیا ہے اور اب اس سونے کی مالیت تیرہ ملین ڈالرز ہو چکی ہے۔“

ریٹا حیران ہوئی تھی۔ ”سازھے چیلین ڈالرز کا انعام۔“

”بالکل۔“ واکر اس کی دلچسپی محسوس کر کے بولا۔ ”وہ سونا کہیں موجود ہے اور ہم اسے حاصل کر سکتے ہیں۔“

”تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ پانچ سال ایک بڑی مدت ہے اور ممکن ہے اس دوران میں تمہوڑا تھوڑا کر کے اس سونے کو فروخت کر دیا گیا ہو۔ سونا یورپ بھی بھیجا جاسکتا ہے

جہاں اس کی زیادہ قیمت مل سکتی ہے۔“

”نہیں، وہ سونا نہیں ہے۔“ واکر نے محسوس لہجے میں کہا۔ ”ہمارے پاس یقینی معلومات ہیں۔ اس سونے کے پیچھے جارج کا کردہ دوا فرام میں بٹ گیا اور لڑائی میں جارج شدید زخمی ہوا جبکہ اس کے بیشتر ساتھی مارے گئے تھے۔ جارج جان بچا کر میکسیکو بھاگ گیا۔ اس کی غیر موجودگی میں دوسرا گروہ اس کے نام سے کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ سونا جہاں چھپایا گیا تھا اس جگہ سے صرف جارج واقف تھا یا اس کے مارے جانے والے ساتھی واقف تھے۔ جارج نے میکسیکو میں اپنی طاقت دوبارہ جمع کی اور سنا ہے وہ وائن آچکا ہے۔ لازمی بات ہے وہ اس سونے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔“

ریٹا سوچ میں پڑ گئی۔ واکر کرٹ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ کلارک کے مارے جانے کے بعد ریٹا نے بھی کچھ جاسوس باز کر کے جارج کے پیچھے لگائے تھے اور اس کے پاس بھی کچھ ایسی ہی معلومات آئی تھیں مگر اس نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ خبرموں کے بارے میں آنے والی اکثر معلومات افواہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ ”ممکن ہے جارج سونا نکال چکا ہو؟“

”نہیں، اس کا مخالف گروہ زیادہ طاقتور ہے اور جب تک وہ اس پر حاوی نہیں آجاتا سونا نکالنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ مخالف گروہ اتنا ضرور جانتا ہے کہ سونا کس علاقے میں ہے اور وہ اس علاقے کی نگرانی کر رہا ہے۔“

”سونا کس علاقے میں ہے؟“

واکر نے اپنے اوپر کوٹ سے ایک نقشہ نکال کر میز پر پھیلا دیا اور ایریزونا کے پہاڑی علاقے گرنڈ لینین (عظیم کھائی) پر انگلی رکھی۔ ”یہ فلیگ اسٹاف کہلاتا ہے، کسی زمانے میں یہاں فوجی کیمپ ہوا کرتا تھا جب ریڈ انڈین قبائل طاقتور تھے؟ مگر اب یہاں کچھ نہیں ہے۔“

ریٹا نے نقشہ غور سے دیکھا۔ ”یہ نہایت دشوار گزار علاقہ ہے۔ یہاں پوری فوج چھپائی جاسکتی ہے۔ بعض جگہیں تو ایسی ہیں جہاں کسی کی رسائی بھی نہیں ہو سکتی ہے۔“

”تم نے ٹھیک کہا۔“ واکر نے سر ہلایا اور نقشہ واپس رکھ لیا۔ ”یہ بات یقینی ہے کہ سونا اسی علاقے میں ہے۔ یہاں میلوں دور تک کوئی آبادی نہیں ہے اور نہ ہی عام گزرگاہ ہے۔“

”مگر کیلیفورنیا جانے والا روٹ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“

”یہ ڈاکے کے لیے مناسب ترین مقام تھا۔ جارج

کے گردہ نے سونا لوٹا اور فوراً ہی اسے چھپا بھی دیا۔ ایک بات جو منظر عام پر نہیں آئی وہ جارج کے گردہ کا جانی نقصان تھا۔ اس کے ایک درجن سے زیادہ ساسی مارے گئے تھے حالانکہ انہوں نے اچانک حملہ کیا تھا۔ بارے جانے والوں میں جارج کے اعتماد کے اور پرانے ساسی تھے۔ بغاوت سننے آنے والوں نے کئی اسی وجہ سے جارج کو پسپا ہونا پڑا مگر اس سے پہلے وہ سونا چھپا چکا تھا۔ بغاوت پر آمادہ گردہ نے جان بوجھ کر ڈاکے میں حصہ نہیں لیا اور جارج کو کامیابی کے باوجود بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ غالباً اسی سے اس نے اپنے ساتھیوں کی نیت بھانپ لی اور اس سے پہلے کہ وہ اس پر قابو پاتے وہ سونا لے کر فرار ہو گیا اور اسے چھپا دیا۔ اس کے بعد اس نے باغی گردہ کے خلاف کارروائی کی مگر خود اسے نقصان ہوا، اس کے رپے سبھی ساسی بھی مارے گئے اور وہ خود رنجی حالت میں میکینو فرار پر مجبور ہو گیا۔

”ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی۔“ رینا نے کہا۔ ”لیکن تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں تم میرا ساتھ دو، ہمیں نہ صرف سونا واپس حاصل کرنا ہے بلکہ جارج اور اس کے ساتھیوں کو سزا بھی دینی ہے۔“

”یہ بہت مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔“ رینا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”جس کام میں مقامی حکومتیں ناکام ہوئی ہوں وہ ہم کیسے کر سکتے ہیں۔ جارج کا باغی گردہ ہی کم طاقتور نہیں ہے جبکہ خود جارج بھی واپس آ گیا ہے۔“

”جارج کی واپسی ہمارے لیے نہیں بلکہ باغی گردہ کے لیے خطرہ ہے۔ ہم انتظار کریں گے کہ کب دونوں گروہوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور جب وہ آپس میں ٹکڑکڑور ہو جائیں گے تو ہم ان پر قابو پا سکتے ہیں۔“

”اچھا خیالی پلاؤ ہے۔“ رینا نے استہزاء انداز میں کہا۔ ”گو یا تم مفروضات کے سہارے سونا واپس لینے کا ارادہ رکھتے ہو۔“

”یہ مفروضہ نہیں ہے۔“ واکر کے لہجے میں ہلکا سا طیش آ گیا۔ ”مجھے یقین ہے میں کامیاب رہوں گا لیکن اس مقصد کے لیے میں ایک اچھی ٹیم جمع کر رہا ہوں۔ دیکھو انعام بہت بڑا ہے۔ تمہارے حصے میں جو آئے گا اس سے تم یہ ساری وادی خرید سکتی ہو۔“

”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ رینا بے نیازی سے بولی۔ ”میں اپنی زندگی سے خوش ہوں۔“

واکر کمرٹ باپس نظر آنے لگا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا اور گیٹ

کی طرف جانے کے لیے مڑا لیکن پھر رک کر بولا۔ ”کیا تم جانتی ہو کہ باغی گردہ کا سربراہ وائسن نامی نوجوان ہے۔“

رینا چونک گئی تھی۔ ”کیا... کیا کیا نام ہے؟“

مگر واکر کے بغیر گیٹ کی طرف بڑھتا رہا مجبوراً رینا اس کے پیچھے آئی اور سامنے آ کر اسے روک لیا۔ ”تمہارا مطلب ہے وہی وائسن اب باغی گردہ کا سرغنہ ہے جس نے پاپا کو دھوکا دیا تھا۔“

”بالکل وہی اس باغی گردہ کا سرغنہ ہے۔ اس نے صرف تمہارے پاپا کو نہیں جارج کو بھی دھوکا دیا تھا۔“

☆☆☆

رینا نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا، وائسن نامی یہ قصبہ چھوٹا سا تھا لیکن مشرق اور مغرب کو ملانے والی اہم ترین شاہراہ پر واقع تھا، اس لیے یہاں گہما گہما بھی رہتی تھی۔ یہاں کئی ہوٹل اور بارز تھے جہاں مسافروں کا جھوم رہتا تھا۔ وہ دونوں پہلے مارس کے ہمراہ یہاں آئی تھی۔ مارس اصطبل کے پاس ایک چھوٹے ہوٹل میں مقیم تھا۔ رینا کے ہوٹل کے سامنے ایک بڑا ہوٹل تھا اور واکر اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ وہاں رکا ہوا تھا جبکہ اس کے کچھ ساسی دوسرے ہوٹلوں میں تھے۔ رینا صرف وائسن کا اس کراس مہم کے لیے تیار ہوئی تھی۔ اس کے اندر برسوں سے دہلی چنگاری اس نام کو کون کر شعل بن گئی تھی۔ واکر اس کی رضامندی سے بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس نے ایوی گولڈ کے سابق سکیورٹی چیف شائن مور کو بھی اس مہم کے لیے راضی کر لیا تھا۔ شائن مور اس وقت ایوی گولڈ کے لیے کام کرتا تھا۔ جب کلارک کے قافلے پر آکاڑا تھا تو اس نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا تھا۔ شاید وہ اسی ناکامی کا الزام کرنے کے لیے واکر کمرٹ کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ واکر نے کوئی درجن بھر اعلیٰ درجے کے لڑاکے بھاری محاذ سے پر حاصل کیے تھے۔ اب وہ سب دن سلو میں مقیم تھے۔

دن سلو کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ کسی زمانے میں یہی قصبہ ایریزونا میں جارج کے آدمیوں کا گڑھ تھا۔ خود جارج زیادہ تر شمالی ٹیکساس میں میکسیکو کی سرحد کے ساتھ پھیلے صحرائیں رہتا تھا۔ یہ نہایت دشوار گزار پتھر یلا صحرا تھا۔ دن سلو یہاں سے کوئی چار سو میل دور تھا۔ سونے اور دوسری قیمتی چیزوں کی ترسیل ان ہی راستوں سے ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے جارج اور اس جیسے ذہیت گردہ یہاں سرگرم عمل تھے۔ یہاں کئی بارز اور جوئے خانے تھے جو

جرائم پیشہ افراد کا اڈا تھے۔ یہاں سے معلومات ملتی تھیں اور اپنے مطلب کے آدمی بھی ملتے تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ دن سلو اس فلیک اسٹاف سے زیادہ دور نہیں تھا اور سونا اسی علاقے میں پوشیدہ تھا۔

رینا نسوانی لباس میں تھی وہ کاؤ گرل بن کر دوسروں کو متوجہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اپنا انداز ایسا رکھا تھا جیسے کوئی حسین خاتون کسی اونچی آسامی کی تلاش میں ہے۔ انداز سے قطع نظر وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔ شام کے وقت وہ باہر نکلی اور ایک اعلیٰ درجے کے بار میں آئی۔ یہاں اسے شائن مور نظر آیا۔ وہ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا دھکیلے سے کھل کر رہا تھا۔ جن دنوں وہ باپ کے ساتھ کام کرتی تھی تو اس کی کئی بار شائن مور سے ملاقات ہوئی تھی۔ شائن مور تقریباً بیالیس سال کا متوسط قد و قامت کا آدمی تھا۔ چہرے کے تاثرات نرم تھے اور وہ کہیں سے سکیورٹی چیف نظر نہیں آتا تھا مگر کلارک اس کی تعریف کرتا تھا اور کلارک آسانی سے کسی کی تعریف نہیں کرتا تھا۔ رینا نے سر سے اشارہ کیا تو شائن یوں اس کی طرف آ گیا جیسے اس سے متاثر ہو رہا ہو۔ ویسے وہ جھج جھج اس سے متاثر تھا کیونکہ اس بار وہ ملا تو اس کا انداز ماضی سے مختلف تھا۔ اس نے جھک کر خوش اخلاقی سے کہا۔

”دام کیا میں تمہاری میزبانی کا شرف حاصل کر سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں؟“ وہ مسکرائی۔ شائن اس کے سامنے بیٹھ گیا اس نے ویز کوئٹری اور انجین لانے کو کہا پھر آہستہ سے بولا۔

”یہاں جارج کے دو آدمی نظر آئے ہیں مگر وہ بس دکھائی دے اور اس کے بعد غائب ہو گئے۔“

”کیسے پتا چلا کہ وہ جارج کے آدمی ہیں؟“

”واکر کے ساتھ ایک آدمی ہے وہ کسی زمانے میں ان لوگوں کو اسلحہ ملائی کرتا رہا ہے وہ تقریباً سب کو پہچانتا ہے۔“

”جارج اور اس کے آدمیوں کو جہنم میں ڈالو، مجھے وائسن اور اس کے آدمیوں کا بتاؤ۔“

”فی الحال ان میں سے کوئی نظر نہیں آیا۔ واکر کا خیال ہے وہ سب محتاط ہیں اور ایسی جگہوں پر جانے سے گریز کر رہے ہیں جہاں ایک دوسرے سے سامنا ہونے کا خطرہ ہو۔“

”تب جارج، وائسن گروپ کا صفایا کیسے کرے گا؟“

رینا نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ”اور جب وہ وائسن گروپ کا صفایا نہیں کرے گا تو سونا کب نکالے گا؟“

”واکر کا خیال ہے دونوں گروپ پہاڑوں میں ہیں اور وہیں شاید ایک دوسرے کو گھیرنے کے چکر میں بھی ہیں۔“

”تب ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ رینا نے پوچھا۔

”ہم انتظار کر رہے ہیں تصادم کا۔“ شائن نے کہا اور اس دوران میں ویز جام لے آیا۔ اس کے جانے کے بعد رینا بولی۔

”تمہیں یقین ہے کہ یہ تصادم ہوگا اور اگر ہوگا تو ہمیں اس کی خبر ہوگی؟“

”کیا مطلب؟“ شائن نے اپنا گلاس اٹھالیا۔

”مطلب یہ کہ مجھے یقین نہیں ہے کہ وائسن اور جارج میں تصادم کی نوبت آئے گی۔ اگر طاقت وائسن کے پاس ہے تو جارج اس کا کیا کاٹلے گا؟“

شائن مور نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

رینا نے شائن اچکائے۔ ”ٹھیک ہے بیٹھے رہو دن سلو میں اور بالآخر ہم ہمیں سے واپس چلے جائیں گے۔“

شائن کی آنکھوں میں تشویش نظر آنے لگی پھر اس نے رینا سے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟“

رینا نے تجویز پیش کی۔ ”تب ہی ہم کچھ کر سکیں گے۔“

واکر کمرٹ کے منصوبے کے مطابق انہیں وائسن رک کر جارج اور وائسن کے تصادم کا انتظار کرنا تھا اور اس کے بعد وہ حرکت میں آتے۔ مگر رینا کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ فلیک اسٹاف سے تقریباً پچاس کلومیٹر دور رہ کر وہ بھلا کیسے پتا چلائیں گے کہ دونوں گروہوں میں تصادم ہو گیا ہے اور اب ان کے حرکت کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ واکر نے اس بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی تھی۔ شائن بھی اس کے منصوبے سے مطمئن نہیں تھا مگر باس وہی تھا اور وہ اسی شرط پر انہیں ساتھ لایا تھا کہ وہ اس کے کہے پر عمل کریں گے۔ شائن نے انکار کیا۔ ”واکر نہیں مانے گا۔“

رینا نے بے دلی سے سر ہلایا۔ اصل میں اسے اپنا کردار کھل رہا تھا۔ وہ گھر میں بھی اس طرح کے نسوانی لباس کم پہنتی تھی۔ خاص طور سے ایسے بھاری بھر کم لباس سے اسے بہت الجھن ہوتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”واکر نے کچھ اور افراد بھی رکھے ہوئے ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہے؟“

شائن نے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے، اس نے ہمیں پوری بات نہیں بتائی ہے۔“

”یعنی ہم اس کے اشاروں پر ناپتے والے پیٹ ہیں۔“ رینا نے کچھ میں بولی۔ ”کیا میرے لیے اس قسم کا کاسٹیوم تجویز کرنا ضروری تھا؟“

”بہت ضروری تھا۔“ شائن نے مسکرا کر کہا۔ ”یہاں

مقامی عورتیں ہوتی ہیں یا پھر شکاری عورتیں۔ اس کے علاوہ تمہیں کوئی تیسری عورت دکھائی نہیں دے گی۔ اگر تم پتلون قمیص اور جیکٹ میں پستول اور رائفل کے ساتھ دکھائی دیتیں تو یہاں موجود ہر فرد تم میں دلچسپی لیتا لیکن اب وہی تمہاری طرف آئیں گے جن کی جیب اس کی اجازت دیتی ہوگی اور انہیں تم نہایت آرام سے ٹال سکتی ہو۔

”بعض لوگ اتنی آسانی سے ٹٹنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ ان کے لیے مجھے دوسرا حربہ استعمال کرنا پڑے گا۔“ رینا نے کہا اور گلاس بیچ کر کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں سے اپنے ہوش کے کمرے میں قید بھی اور آج بھر ہو کر باہر نکل بھی سکتا ہے مگر اب اسے دوبارہ کمرے میں قید ہونا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد میدان عمل میں آجائیں۔ دوسرے دن نسلو میں ایک معمولی سا ہنگامہ ہوا۔ ایک جوئے خانے میں پتے لگانے پر جھگڑا ہوا اور آپس میں فائرنگ میں تین جواری مارے گئے تھے۔ مارے جانے والوں کی لاشیں مقامی انتظامیہ کے کئی تھی مگر اگلی صبح والکر نے رینا اور شائن سے ملاقات کی، وہ پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”کل جوئے خانے میں جو تین لوگ مارے گئے تھے ان میں ایک میرا آدمی بھی تھا اور اس وقت اسے فلیک اسٹاف کے پہاڑوں میں ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ یہاں جوئے خانے میں موجود تھا۔“

رینا نے طنز کیا۔ ”ان لوگوں پر بھروسہ کر کے تم سونے کے حصول کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”اب مجھے خود جا کر دیکھنا ہوگا۔“ والکر نے کہا۔

”اور ہم؟“

”تم لوگ یہیں ٹھہرو گے، میں واپس آؤں گا۔“

والکر نے کہا۔

خطرے میں ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ شائن نے پوچھا۔

”وہ اس سے ہمارے بارے میں انگوٹھیں ہیں۔“ رینا نے کہا۔

”اس کے بعد وہ یہیں کارخ کریں گے۔“ شائن فکر مند ہو گیا تھا۔ والکر کی عدم موجودگی میں اسے ہی کرنا تھا۔ رینا نے خدشے کا اظہار کر دیا تھا لیکن فیصلہ اسے ہی کرنا تھا۔ شائن نے کہا۔ ”ہم صبح تک دیکھتے ہیں اگر والکر واپس نہیں آیا تو ہم فلیک اسٹاف کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔“

”لیکن شاہراہ والے راستے سے نہیں۔۔۔“

”پھر کون سے راستے سے جائیں گے؟“

”ایک راستہ مشرق کی طرف سے نکلتا ہے ہمیں پہلے فلیک اسٹاف کی طرف جانا ہوگا پھر ہم پلٹ کر اس راستے سے فلیک اسٹاف کی طرف بڑھیں گے۔“

شائن راضی ہو گیا۔ اگلی صبح تک والکر واپس نہیں آیا تھا اس لیے وہ نسلو سے روانہ ہو گئے۔ رینا نے اپنا لباس بدل لیا تھا، اب وہ پتلون قمیص میں بھی اسلحہ چھپانے کے لیے اس نے اوپر سے ادنیٰ شال لے لی تھی۔ رینا، شائن اور

مارس کے علاوہ نو افراد تھے۔ انہیں لے کر وہ مشرق کی طرف روانہ ہو گئے۔ رینا نو جوانی میں اس علاقے میں کلارک کے ساتھ سفر کرتی رہی تھی اور کلارک نے ہی اسے اس راستے کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ نہایت دشوار گزار تھا اور صرف گھوڑوں کی مدد سے سیر کیا جاسکتا تھا۔ یہ راستہ فلیک اسٹاف کے شمال میں گرینڈ لیئین کے پاس جا کر نکلتا تھا، درحقیقت یہ ایک نالہ تھا جو بارش کے پانی نے کاٹ کر بنایا تھا اور پہاڑوں میں گھومتا ہوا گرینڈ لیئین میں جا کر نکلتا تھا۔ بارش کے دنوں میں اس میں سفر کرنا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ اس لیے جو اس راستے سے واقف تھے وہ بھی اس میں سفر سے گریز کرتے تھے۔ مگر ان دنوں بارش کا موسم نہیں تھا اس لیے نالے میں سفر ممکن تھا۔ چند میل بعد وہ گھوم کر اس طرف آ گئے۔ شائن نالے کی گہرائی دیکھ کر حیران ہوا تھا، اس کے دونوں طرف بہت بلند پہاڑ تھے اور یہ سیدھے کھڑے تھے اس میں کہیں اوپر چڑھنے کا راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شائن مضطرب ہو گیا۔

”اس میں ہم بچسب سکتے ہیں۔ اگر کہیں کسی نے گھیرا تو اس سے نکلنے کا راستہ بھی نہیں ملے گا۔“

”میرے پاپا نے یہ راستہ دریافت کیا تھا اور ان کا کہنا ہے اس میں اوپر سے حملہ کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ نیچے

بے شمار چھپے ہوئے راستے ہیں۔“

”اس صورت میں دشمن باہر نکلنے کے راستے پر انتظار کرے گا اور ہم ساری عمر تو اس میں نہیں رہ سکتے۔“

”لیکن دشمن کو پتا کیسے چلے گا جبکہ اس پلان کا صرف مجھے اور تمہیں پتا ہے۔“ رینا نے کہا۔ ”مجھ پر اعتماد کرو اگر والکر دشمنوں کے ہاتھ لگ گیا ہے تو شاہراہ والا راستہ ہمارے لیے چندنا ثابت ہوتا، اس پر پھر نہایت آسان ہے۔“

شائن اور اس کے ساتھی اسے آہادہ نہیں تھے، مجبوراً اس نالے میں داخل ہوئے تھے۔ یہاں کہیں کہیں پانی کے تالاب کھڑے تھے اور سبزہ اکثر جھکیوں پر تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ زمینوں سے اس نالے میں زیادہ پانی نہیں آیا ورنہ نقشے کے مطابق یہ نالہ تقریباً ساٹھ کلومیٹر کے بعد جا کر فلیک اسٹاف پر نکلتا۔ یہ شاہراہ سے زیادہ طویل تھا مگر محفوظ بھی تھا۔ وہ گھوڑوں پر تھے اور معتدل رفتار سے سفر کر رہے تھے۔ دوپہر تک وہ فلیک اسٹاف کے پاس آ چکے تھے۔ شائن کے ساتھی اسی وقت باہر نکلتا چاہتے تھے لیکن شائن اور رینا نے انہیں روک دیا۔ ان کا خیال تھا کہ دائیں اور جارج کے گرد وہ اسی علاقے میں تھے اور دن میں وہ آسانی سے ان کی نظروں میں آجاتے اس لیے سورج غروب ہونے کے بعد نکلتا مناسب ہوگا۔ اب شائن کو ایک فکر اور ستا رہی تھی، اس نے رینا سے کہا۔

”فرض کرو والکر کو کسی وجہ سے دیر ہوئی ہو اور اب وہ واپس پہنچے گا تو ہمیں غائب پانے گا۔“

”یہ اس کا قصور ہے اور اس قسم کے معاملات میں مفروضات پر نہیں حالات پر فیصلے کیے جاتے ہیں۔“ رینا نے جواب دیا۔ وہ اپنی رائفل چیک کر رہی تھی۔ ”ویسے مجھے یقین ہے والکر کسی مشکل میں پڑ گیا ہے۔ اس کا آدمی جسے اس نے جاسوسی کے لیے فلیک اسٹاف بھیجا تھا نسلو میں جوئے خانے میں جا کر کھینٹے ہوئے جھڑے میں مارا گیا۔ اس کا مطلب ہے اس کے باقی آدمیوں کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ تھا۔ میرے خیال میں اسے اکیلے جانے کے بجائے سب کو ساتھ لے کر جانا چاہیے تھا۔“

”یہی خیال اب مجھے بھی آ رہا ہے۔“

”وہاں اور جارج دونوں بہت ہوشیار مجرم ہیں اور ان سے نمٹنا آسان نہیں ہے۔“ رینا بولی۔ ”مگر ہم ایسے ہلکے منصوبوں سے وہ قابو میں نہیں آسکتے۔“

شائن کو شاید اچھا نہیں لگا تھا کہ ایک عورت یوں مردوں پر تنقید کر رہی تھی، اس نے سر دھچ میں پوچھا۔

”تب تم کیوں ساتھ آئیں؟“

”مجھے وائسن سے اپنے باپ کا انتقام لینا ہے ورنہ مجھے سونے والے پکڑے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور مجھے اس کا یقین بھی نہیں ہے کہ سونا اب یہاں موجود ہے۔“ رینا نے جواب دیا۔

”صرف ایک آدمی کے ساتھ تم وائسن سے انتقام لے سکو گی؟“ شائن نے مارس کی طرف دیکھا جو اپنے اور رینا کے گھوڑے کی دیکھ بھال میں لگا ہوا تھا۔ ”تمہارا یہ ملازم لڑنے بھڑنے کا باہر نہیں ہے؟“

”رائفل چلا لیتا ہے۔“

شائن طنز بے انداز میں مسکرایا۔ ”رائفل چلا لیتا ہے اور اس کے بل پر تم وائسن جیسے سفاک ڈاکو سے ٹکرانے چلی ہو۔“

”تم لوگ بھی تو ساتھ ہو۔“

”ہم یہاں صرف سونے کے لیے آئے ہیں۔“

شائن نے صاف کوئی سے جواب دیا۔ ”ہمارا وائسن یا جارج سے ٹکرانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”لیکن میرا خیال ہے یہ ٹکراؤ لازمی ہوگا۔“ رینا بولی۔ ”سب سونے کے پیچھے پاگل ہو رہے ہیں اور کوئی دوسرے کو آسانی سے کامیاب ہونے نہیں دے گا۔“

رات ہونے پر وہ نالے سے باہر آئے تھے۔ باہر آنے کا راستہ آسان نہیں تھا خاص طور سے تاریکی میں لیکن وہ کسی نہ کسی طرح باہر نکل آئے۔ احتیاطاً انہوں نے گھوڑوں کے سموں پر کھال باندھ دی تھی تاکہ ٹاپوں کی آواز دور تک نہ جائے۔ یہ سارا علاقہ سخت پتھر سے بنا ہوا تھا اور اس پر گھوڑوں کی ٹاپیں دور تک سنائی دے سکتی تھیں۔ شائن نے ایک بلند چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہمیں وہاں جانا ہوگا، وہاں سے یہ سارا علاقہ صاف دکھائی دیتا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن اس چوٹی تک آنے جانے کا ایک ہی راستہ ہے۔ اگر دشمن نے ہمیں دیکھ لیا تو نہایت آسانی سے گھیر لے گا، ہمارے پاس نیچے آنے کا اور کوئی راستہ بھی نہیں ہوگا۔“

”وہاں ہم محفوظ ہوں گے۔“ شائن نے اصرار کیا۔ ”ہمیں اس وقت تک چھپ کر رہنا ہوگا جب تک وائسن اور جارج میں تصادم نہیں ہو جاتا۔“

”ہم لا محدود مدت تک یہاں نہیں رہ سکتے کیونکہ ہمارے پاس پانی نہیں ہوگا۔“ رینا نے توجہ دلائی تو شائن پریشان ہو گیا۔

”ہاں یہ تو سوچا نہیں تھا۔“

”بہتر ہوگا کہ ہم نالے کے ساتھ رہیں۔ ایک تو گھر سے جانے پر ہم اس سے فرار ہو سکتے ہیں دوسرے یہاں سے ہمیں پانی مل سکتا ہے۔“

پارٹی نالے کے ساتھ ایک بلند ٹیلے پر سٹ آئی تھی۔ یہاں سے آس پاس کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ وہ نالے سے دائیں طرف نکلے تھے۔ ولسلو سے آنے والا راستہ بھی اسی طرف سے گزرتا تھا۔ مغرب سے آنے والی شاہراہیں فلک اسٹاف کے راستے اس کھائی کو عبور کرتی تھیں۔ اس کے لیے پہلے کھائی میں اتنا پڑتا تھا اور بارش کے دنوں میں اسے عبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کھائی کا ایک حصہ پلند زمین کے دائیں طرف بھی تھا گویا ان کے دو طرف کھائی تھی اور وہ بلند ٹیلا جس پر وہ لوگ موجود تھے، ان کے درمیان میں تھا۔ یہ جگہ محفوظ تھی کیونکہ کوئی حملہ آور بہت لمبا چکر لگا کر ہی ان تک آ سکتا تھا اور وہ بھی بہت دور سے ان کی نظروں میں آ جاتا کیونکہ تین طرف کھائی تھی اور نیچے اترنے کا راستہ وہی تھا جہاں سے وہ آئے تھے۔ مگر رینا کے خیال میں یہ جگہ اتنی محفوظ نہیں تھی خاص طور سے جب یہاں سے باہر نکلنا ہوتا۔ راستہ ایک ہی تھا اور چند آدمی آرام سے ان کا راستہ روک سکتے تھے۔ رینا نے شائن سے بات کی لیکن فی الحال وہ یہاں سے نہیں اور جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

رینا گھوڑوں کے پاس آئی۔ ماس وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ جب رینا اس ہم پر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو چیف نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس کا کہنا تھا کہ واکر کرٹ بے شک اپنی گولڈ سے متعلق سہی لیکن اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ رینا کو اس پر آگے بند کر کے بھر دے نہیں کرنا چاہیے۔ جب رینا اپنے ارادے پر قائم رہی پھر چیف نے انجائی کی کہ وہ ماس کو ساتھ لے جائے۔ اس نے کہا۔ ”نادام، اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور آپ کے ساتھ جانے کے قابل نہیں ہوں لیکن ماس بہت اچھا محافظ ثابت ہوگا۔“

اس لیے وہ ماس کو ساتھ لے آئی۔ اس نے رینا کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ”نادام مجھے ان لوگوں کا انداز پسند نہیں ہے۔“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“

”نادام مجھے خطرہ بھی محسوس ہو رہا ہے۔ ہم بہت محدود جگہ پر ہیں۔ اگر دشمن نے ہماری موجودی بھانپ لی تو وہ ہمیں یہاں سے نکلنے نہیں دے گا۔ صرف دو آدمی ہمیں یہاں قید رکھنے کے لیے کافی ہوں گے۔“

رینا نے سر ہلایا۔ ”جی ہاں بات میں بھی محسوس کر رہی

ہوں مگر شائن اور اس کے ساتھی یہاں سے جانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔“

”جب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ یہ لوگ اس جگہ اتنے سکون سے بیٹھے ہیں۔ جبکہ یہاں آدمی زیادہ دیر چھپ نہیں سکتا۔ مجھے یقین ہے اب تک دائن اور جارج کی ہماری یہاں موجودگی کی اطلاع مل گئی ہوگی، اس سے پہلے کردہ ہمیں یہاں گھیریں ہم دونوں کو نکل جانا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے، تم آدمی رات کو گھوڑے تیار رکھنا۔“

رینا نے سر ہلایا۔ کم عمری سے قطع نظر ماس ایک پختہ کار اور بہت ذہین نوجوان تھا۔ کیونکہ اس کی پرورش ان کے گھر میں ہوئی تھی اس لیے رینا اسے چھوٹا بھائی سمجھتی تھی۔ رینا خود سوچ رہی تھی اتنے سارے لوگوں کے ساتھ ایک جگہ رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ وہ زیادہ دیر نہیں چھپ سکتے تھے۔ نصف رات سے پہلے ماس اپنے اور رینا کے گھوڑے کو پانی پلانے کے بہانے روانہ ہو گیا۔ پانی نیچے نالے میں تھا مگر وہ نالے میں نہیں گیا بلکہ ٹیلے کے ایک طرف رینا کا انتظار کر رہا تھا جیسے ہی رینا آئی وہ شامل مشرق کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک طویل چکر کاٹ کر وہ دائیں جنوب مغرب کی طرف آئے۔

اب وہ گرینڈ کینین کے سین اور پر تھے۔ ان کے اور شائن کے آدمیوں کے درمیان میں کھائی آگئی تھی۔ ماس نے صبح سے پہلے کچھ چٹانوں کے درمیان ایک محفوظ جگہ تلاش کر لی تھی۔ یہاں وہ سب کی نظروں سے چھپ کر رہ سکتے تھے اور سب سے بلند چٹان پر چڑھ کر آس پاس نظر بھی رکھ سکتے تھے۔ رینا نے اپنی ڈارک ریڈ جیکٹ اتار دی۔ یہ دور سے نظر آتی۔ اب وہ خاک کی چٹانوں اور اسی رنگ کی شرت میں تھی اور یہ چٹانوں میں زیادہ نمایاں نہیں تھی۔ رینا ڈاؤن چڑھی اور اس نے سب سے پہلے دور میں سے شائن اور اس کے آدمیوں کا ٹھکانا دیکھا۔ وہ اس جگہ سے تین کلومیٹر دور تھا مگر طاقتور دور میں سے دکھائی دے رہا تھا۔ آدمیوں کے چہرے صاف نہیں تھے مگر وہ شائن اور اس کے ساتھی تھے۔ ماس اس کے ساتھ ہی اوپر آگیا تھا اور وہ بھی دور میں سے آس پاس کا معائنہ کر رہا تھا۔ پھر ماس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”نادام اس طرف دیکھو۔“

رینا نے دور میں کھائی کو فوراً ہی اسے وہ چاہے گھوڑے سوار دکھائی دیے جو چٹانوں کی آڑ میں شائن کیپ کی طرف بڑھ رہے تھے، وہ سب مسلح تھے اور ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کوئی کارروائی کرنے جا رہے ہیں۔

صرف چار افراد کا دس افراد پر دھاوا بولنا کچھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ گھات لگا کر بے خبری میں انہیں نقصان پہنچا سکتے تھے لیکن اس طرح براہ راست حملہ ممکن نہیں تھا۔ شائن کے آدمی انہیں دور سے دیکھ لیتے۔ پھر وہ کچھ چٹانوں کے پاس پہنچ کر کر گئے، انہوں نے اپنے گھوڑے ایک طرف باندھ دیے۔ وہ پھیل کر چٹانوں پر چڑھ رہے تھے۔ باہر آنے کا راستہ بھی تھا۔ شائن اور اس کے آدمی جب اس جگہ سے نکلے کی کوشش کرتے تو ان کی زد میں آ جاتے اور وہ انہیں نہایت آسانی سے اپنا شکار بنا سکتے تھے۔ ماس نے رینا کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں نے کہا تھا نا۔

نادام۔ رینا دور میں سے شائن اور اس کے ساتھیوں کا معائنہ کر رہی تھی اور اس نے محسوس کیا کہ وہ وہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہے تھے، گھوڑے تیار کیے جا رہے تھے اور ان پر سامان باندھا جا رہا تھا۔ رینا تلجٹ میں نیچے اترنے لگی۔ اس نے ماس سے کہا۔ ”جلدی کرو، وہ نکل رہے ہیں اگر چٹانوں تک آگئے تو سب مارے جائیں گے۔“

رینا اور ماس نے سامان وہیں چھوڑا اور تلجٹ میں گھوڑوں پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ انہوں نے صرف اسلحہ ساتھ لیا تھا۔ چٹانوں سے کچھ پہلے انہوں نے گھوڑے بھی چھوڑ دیے اور پیدل آگے بڑھے۔ قریب کچھ کر ماس نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے وہ چاروں آدمیوں سے نشانے پر آ جاتے۔ وہ دونوں چٹان پر چڑھ گئے۔ واقعی یہاں سے وہ چاروں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے رائفلیں سنبھال لیں اور انتظار کرنے لگے۔ پھر شائن اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار آتے نظر آئے، ان کو دیکھتے ہی چاروں نے رائفلیں نکال لیں مگر اس سے پہلے کہ وہ انہیں استعمال کرتے رینا اور ماس کی رائفلوں نے شعلے اگلے اور ایک منٹ سے بھی پہلے وہ چاروں ڈھیر ہو گئے تھے۔ تین تو مارے گئے تھے صرف ایک زخمی ہونے کے بعد چٹان سے نیچے اتر گیا تھا۔ رینا نے نیچے آنے سے پہلے مخصوص انداز میں بیٹی بھائی تو شائن اور اس کے آدمی جو فائرنگ کی آواز سن کر کر گئے تھے، آگے آئے۔ شائن خود گھوڑا دوڑاتا اس کے پاس آگیا۔

”تم یہاں... ہم تمہاری تلاش میں نکلے تھے۔“

”مجھے معلوم تھا یہاں حملہ ہوگا اس لیے میں پہلے نکل آئی اور شاہجی ان کی جگہ سب کی لاشیں پڑی ہوئیں۔“

شائن کے ساتھی جلد ہی زخمی کو تلاش کر کے لے آئے۔ کوئی نے اس کے شانے کی ہڈی توڑ دی تھی اور وہ

تلکلیف سے نڈھال تھا مگر شائن نے ذرا دم کھائے بغیر اس کے زخمی شانے پر جوتے کی نوک رکھ دی اور غرا کر پوچھا۔

”کس نے بھیجا ہے تمہیں؟“

”اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ رینا نے کہا اور زخمی کے جوتے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ دیکھو اس پر ڈبیلو کا حرف بتا ہے۔ یہ یقیناً دائن کا آدمی ہے، اس سے دائن کا پتا چھو۔“

”داؤن کہاں ہے؟“

زخمی نے رونا کر اہٹا جا رہی رکھا لیکن اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ مر جائے گا مگر منہ سے کچھ نہیں کہہ گا۔ شائن نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ساتھ کر لیں۔ رینا شائن کو ایک طرف لائی۔ ”داؤن تک پہنچنے کا ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔ ان گھوڑوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور پھر ان کا تعاقب کیا جائے۔ امید ہے یہ اپنے ٹھکانے پر جائیں گے۔“

شائن کو یہ آئیڈیا پسند آیا بلکہ اس نے یہ کیا کہ مارے جانے والوں کی لاشیں اور زخمی کو بھی گھوڑے پر بندھوا دیا اور پھر انہیں ہچکایا تو گھوڑے ایک طرف روانہ ہو گئے اور وہ سب قافلے سے ان کا تعاقب کرنے لگے۔ شائن نے رینا سے پوچھا۔ ”تمہیں یقین ہے یہ دائن کے ٹھکانے پر جائیں گے؟“

”بالکل۔“

”فرض کرو ایسا ہی ہوا تب ہم کیا کریں گے؟“

”داؤن اور اس گروپ کا صفایا۔“ رینا نے کہا۔

”لیکن ہمارا مشن یہ نہیں ہے۔“

”تمہارا مشن...؟“ رینا نے طنز کیا۔ ”مگر میں سمجھدار سی سے کام نہ لیتی تو تمہارا مشن اب تک ختم ہو چکا ہوتا۔ دائن اور اس کے گروپ کا خاتمہ کیے بغیر ہم سونے تک نہیں پہنچ سکتے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن کیا جارج کا بھی مقصد نہیں ہو سکتا؟“

رینا چونکی۔ ”کیا مطلب؟“

”جارج چاہتا ہے کہ دائن کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس کے بعد وہ آرام سے سونا وہاں سے نکال لے گا جہاں اس نے چھپا رکھا ہے۔“

”فرض کرو ایسا ہی ہے تب بھی ہم کیا کر سکتے ہیں۔ دائن بھر صورت ہمارے راستے میں آئے گا۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے دائن سے نئے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔“

گھوڑے گرینڈ کینین کے مرکزی حصے کی طرف جا رہے

تھے۔ یہ نہایت دشوار گزار علاقہ تھا اور بعض جگہوں پر تو پہاڑوں کے ساتھ بس ایک تنگی سی پٹی ہوتی تھی گزرنے کے لیے۔ یہاں ذرا سا پاؤں پھسلتا تو آدمی ٹیکڑوں فٹ کی گہرائی میں جا کر رہتا۔ بچے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایسے مقامات پر وہ گھوڑے سے اتر کر اس کی لگام تھام کر چلتے تھے۔ لاشوں والے گھوڑے یہاں سے پتا نہیں کیسے گزر رہے تھے۔ شاید وہ اس کے عادی تھے۔ شام کے قریب وہ گریڈ کمین کے مرکزی حصے میں تھے۔ گھوڑے اب بھی ست رفتار سے چل رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کی منزل قریب آگئی ہو۔ رینانے کہا۔ ”میرے خیال ہے اب پیدل ان کا تعاقب کیا جائے۔“

”بہتر ہوگا انہیں روک لیا جائے اور ہم آگے بڑھیں تار بکی میں یہ کام مناسب نہیں ہوگا۔ اگر وائسن کا ٹھکانا آس پاس ہوا تو وہ اس علاقے سے بہتر واقف ہوں گے اور اس کا فائدہ اٹھا سکیں گے۔“

رینا کو اس کی بات درست لگی اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے لیکن رات کو ہمیں بہت ہوشیار رہنا پڑے گا۔“

لاشوں والے گھوڑے واپس بلا لیے گئے۔ چوتھا زخمی اس طرح سفر کرنے سے قریب المرگ ہو گیا تھا۔ شائن کے ایک آدمی سے اس کی حالت دیکھی نہیں گئی اور اس نے اس کا گلا دبا کر اسے مار دیا۔ رینا کو یہ اچھا نہیں لگا تھا مگر وہ کیا کرتی، وہ بھی دشمن تھا اور انہیں نہایت بے دردی سے قتل کرنے آیا۔ انہوں نے باری باری ساری رات جاگتے اور چوکنہا رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ شائن کے تین آدمی ایسی جگہوں سے پہرہ دے رہے تھے جہاں سے وہ دور تک نظر رکھ سکتے تھے۔ خود شائن بھی جاگ رہا تھا۔ انہوں نے کھانے اور کافی کے لیے آگ ایسی جگہ جلائی تھی جہاں وہ دور سے نظر نہیں آسکتی تھی۔ شائن کھانے کے بعد اپنی کافی لے کر رینا کے پاس آگیا۔ ”اکر کل ہم وائسن سے نمٹ لیتے ہیں تو کیا تم واپس چلی جاؤ گی؟“

رینانے محسوس کیا کہ اس واقعے کے بعد وہ اس سے مرعوب ہو چلا تھا اور ہر معاملے میں اس کی رائے جاننے کی کوشش کرتا تھا۔ رینانے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں سونے کے حصول میں تمہارا ساتھ دوں گی۔ والکر نے انعام میں سے مجھے چوتھا حصہ دینے کو کہا تھا۔“

”مجھے بھی چوتھا حصہ کہا ہے۔“ شائن بولا۔

”یعنی نصف وہ خود رکھ رہا ہے۔“ رینانے غور کیا۔ ”سوال یہ نہیں ہے کہ وہ نصف خود کیوں رکھ رہا ہے؟ سوال یہ ہے کہ وہ نصف ہمیں کیوں دے رہا ہے؟“

”یہ آدمی میں نے ہانڈ کیے ہیں۔“ شائن نے اپنے آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ سب قابل اعتماد اور ماہر لڑاکے ہیں میرے علاوہ کوئی اسے ایسے آدمی نہیں سیکھا کر سکتا تھا۔“

”ٹھیک ہے تمہاری شمولیت مجھ میں آتی ہے لیکن میں کیوں...؟“

شائن نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے تم نے ثابت کر دیا ہے کہ اس مہم کے لیے تم میرے ایک درجن آدمیوں سے زیادہ کارآمد ہو کیونکہ تم اس علاقے اور وائسن جیسے مجرموں کی فطرت اچھی طرح جانتی ہو۔“

رینا سوچ رہی تھی کہ وہ وائسن سے نمٹ لیتے ہیں تب سونے کی تلاش کیسے کی جائے گی کیونکہ مکمل پلان والکر کے پاس تھا اور وہ غائب تھا۔ یہ بات وائسن سے معلوم کی جا سکتی تھی کہ والکر کہاں تھا۔ اگر وہ وائسن کے ہاتھ نہیں آیا تھا تو لازمی بات تھی وہ خارج کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور دونوں صورتوں میں اس کا انجام ایک ہی ہوتا تھا۔ اگر والکر مارا جا چکا تھا تو سونے کے حصول کا منصوبہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ رینا کے خیال میں وہ پھر بھی خسارے میں نہیں رہے گی۔ وائسن کی موت اس کے لیے سب سے بڑا انعام ثابت ہو سکتی تھی مگر شائن کا کیا ہوگا؟ وہ تو سونے کی امید میں یہاں آیا تھا اور درجن بھر آدمی بھی ساتھ لایا تھا۔ رینانے ان کی طرف دیکھا۔

”انہیں کیا دیا جائے گا؟“

”دس ہزار ڈالر تو کسی۔“ شائن بولا۔ ”ایک ہزار بیٹنگی دیے ہیں اور نو ہزار کام ہونے کے بعد۔“

”تم نے دیے ہیں؟“

”نہیں والکر نے... اس مہم کے تمام اخراجات وہی برداشت کر رہا ہے۔“

”یہ یان گئے؟“ رینانے حیرت سے کہا۔ یہ مہم آسان نہیں تھی اور یہاں زندگی اور موت کا امکان آدھا آدھا تھا اور وہ صرف دس ہزار ڈالر کی خاطر یہ خطرہ مول لینے چلے آئے تھے۔ شائن اس کی سوچ بھانپ گیا یان نے کہا۔

”یہ پیشہ ور لڑاکے ہیں اور ان کا کام ہی رقم کے بدلے موت کا سامنا کرنا ہے۔“

رینا دیکھ رہی تھی کہ ان میں نظم و ضبط تھا اور وہ احکامات کی پوری طرح تعمیل کرتے تھے۔ صبح ہوتے ہی وہ سب تیار ہو گئے۔ رات سب نے ہی کسی قدر آرام کیا تھا۔ اس لیے اب حالات کا سامنا کرنے کے لیے تروتازہ تھے۔ لاشوں سے پوچھا شروع ہو گئی تھی۔ دوپہر تک وہ یقیناً بہت زیادہ بو بوجھ لگتی اس لیے انہوں نے روٹی ہونے

سے پہلے روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ گھوڑے آزاد کیے گئے تو وہ پہلے سے زیادہ تابی سے چلتے گئے۔ انہیں کھانے پینے کو نہیں دیا تھا۔ شائن کا خیال تھا کہ اس صورت میں وہ سیدھے اپنے ٹھکانے پر جا سکیں گے۔ سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد گھوڑے ایک چھوٹی سی وادی میں داخل ہوئے جس کی تہ میں کوئی چشمہ تھا کیونکہ ہاں درخت اور ہریالی دکھائی دے رہی تھی، اس کے آس پاس لکڑی کے بے نئی کین تھے۔ وہ اوپر ہی رک گئے۔ گھوڑے کینوں کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ اب وہ ہتھنہا رہے تھے اور اندر موجود افراد کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر میں کینوں سے لوگ برآمد ہونے لگے اور جب انہوں نے اپنے آدمیوں کی لاشیں دیکھیں تو چوکنہا ہو گئے۔ وہ ہتھنہا لینے دوڑے تھے مگر اس سے پہلے شائن اور اس کے آدمیوں نے اوپر سے فائر کھول دیا۔ تین تو راستے میں مارے گئے تھے اور دو زخمی ہو کر کینوں میں محسوس تھے جبکہ تین افراد بچ نکلے تھے۔ فوراً ہی کینوں کی طرف سے جوابی فائرنگ شروع ہو گئی۔

رینانے حملے میں حصہ نہیں لیا تھا اس کے بجائے وہ بھاگنے والوں اور کینوں میں موجود افراد کی تعداد کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پانچ افراد بچ گئے تھے اور اندر بھی کچھ لوگ موجود تھے۔ رینانے ہتھیاروں کی تعداد سے اندازہ لگا یا کہ وہ اب بھی ایک درجن سے زیادہ تھے۔ کینوں کی طرف سے تھاشا فائرنگ سے دھواں پھیلنا ہوا تھا اور اس کے پار کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ شائن اور اس کے آدمی محفوظ تھے۔ اب وہ نیچے جا کر وائسن اور اس کے آدمیوں کے خاتمے کی بات کر رہے تھے۔ رینانے مارس کو اشارہ کیا اور وہ پیچھے ہٹ آئے۔ رینانے مارس سے کہا۔ ”میں سوچ رہی نہیں سکتی تھی کہ وائسن دفاعی لحاظ سے اتنی کمزور جگہ کو اپنا ٹھکانا بناسکتا ہے۔“

”نادام، تمہارا مطلب ہے وہ یہاں موجود نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے وہ موجود ہو لیکن یہ اس کا مستقل ٹھکانا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔“

دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں، مورچہ زن ہونے کے بعد مخالف پارٹی کا مزید کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ رینا کی ہدایت پر مارس ایک بلند چٹان پر چڑھ گیا جہاں سے وہ آس پاس نظر کر سکتا تھا۔ شائن نے اس سے پوچھا۔ ”تم نے اپنے آدمی کو کہاں بھیجا ہے؟“

”میرا اندازہ ہے کہ وہ وائسن کا اصل ٹھکانا نہیں ہو سکتا اس کا اصل ٹھکانا انہیں اور ہے اور اگر وہ پاس ہی ہوتا تو

جلد یا دیر اس کی طرف سے رد عمل سامنے آئے گا۔ ہمیں اپنے اطراف سے بھی ہوشیار ہونا چاہیے۔“

شائن کے آدمیوں کے پاس مٹی کا تیل تھا۔ ایک لڑکا ایک ایسی جگہ گیا جہاں سے کین زیادہ دور نہیں تھے اور اس نے مٹی کے تیل سے بھری بوتل کے منہ پر کپڑا بٹھوڑ کر اسے آگ دکھائی اور پھر ایک کین پر پھینک دیا۔ بوتل ٹوٹی اور کین کی چھت پر آگ لگ گئی۔ اس دوران میں شائن کے آدمی وادی کے اوپر ہی حصے میں چاروں طرف پھیل رہے تھے تاکہ کوئی بچ کر جانے نہ پائے۔ چند اور بوتلیں بھینکنے سے تینوں کین آگ کی زد میں آ گئے تھے۔ ان میں دیکے لوگ جلد یا دیر وہاں سے نکلے پر مجبور ہو جاتے۔ رینا ایسی جگہ موجودگی جہاں سے وہ وادی اور مارس دونوں پر نظر رکھ سکتی تھی اچانک مارس نے ہاتھ سے اشارہ کرنا شروع کیا۔ رینانے شائن سے کہا۔ ”خطرہ! کچھ لوگ اس طرف آ رہے ہیں۔“

وہ بھاگ کر مارس کے پاس پہنچی تو اس نے چلا کر کہا۔ ”شال سے ایک درجن گھڑسوار آ رہے ہیں۔“

یہ سنتے ہی شائن کے آدمیوں میں افراتفری مچ گئی تھی۔ وہ آنے والوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک جگہ جمع ہونے لگے۔ مارس بلندی پر تھا اس لیے وہ دور سے نظر آ گئے۔ درندہ اچانک ان کے سر پر آ جاتے تو انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملتا۔ دو آدمیوں کو وادی پر چھوڑ کر باقی سب آنے والوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر آنے والے چالاک تھے وہ زیادہ نزدیک نہیں آئے اور ایک جگہ گھوڑوں سے اتر کر پیدل چٹانوں اور پتھروں کی آڑ میں آ گئے آنے لگے۔ رینانے اپنی رائفل سے سب سے آگے آنے والے کو اس وقت نشانہ بنایا، جب وہ ایک پتھر کی اوٹ سے نکلا۔ گولی نشانے پر لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ شائن نے داد دی۔ ”زبردست نشانہ۔“

”وہ ہوشیار ہیں۔“ رینانے رائفل لوڈ کرتے ہوئے کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کہو وادی والوں کی طرف سے ہوشیار رہیں اگر وہ اوپر آ گئے تو ہم دو طرف سے گھر جائیں گے۔“

”فکر مت کرو اس طرف میرے دو بہترین آدمی لگے ہیں وہ کسی کو اوپر آ نہیں دیں گے۔“

کینیں اب پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے اور ان میں موجود افراد نکل بھاگے تھے اور اب درختوں اور پتھروں کی آڑ میں اوپر فائرنگ کر رہے تھے۔ آنے والوں نے بھی پھیل کر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ ہر طرف گولیاں برس رہی تھیں۔ فاصلہ ہونے کی وجہ

سے دونوں فریق خاص نقصان سے بچے ہوئے تھے پھر بھی آدھے گھنٹے میں آنے والوں کے دو آدمی مارے جاتے تھے اور شائن کا بھی ایک آدمی زخمی ہوا تھا گوئی اس کے پیٹ کے پہلو سے گزر گئی تھی۔ خون بہا تھا مگر زخم جان لیوا نہیں تھا۔ وادی میں موجود افراد زیادہ نقصان میں رہے تھے کیونکہ ان کی پناہ گاہیں تباہ ہو چکی تھیں اور وہ نشانے پر تھے۔ شائن کے دو آدمیوں نے ایک گھنٹے میں مزید چار افراد کو مار گرایا تھا۔ اب تک دونوں طرف سے اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی کہ اچانک رینا کو خیال آیا، اس نے شائن سے کہا۔

”اپنے آدمیوں سے کہو اس طرح بے تحاشا فائرنگ نہ کریں ایسویٹین کم پڑ گیا تو وہ ہم پر حاوی آ جائیں گے۔“ شائن نے اپنے آدمیوں کو اب ہاتھ روک کر فائر کرنے کا حکم دیا۔ ”کیا خیال ہے یہ اس طرح ہمارا اسلحہ خالی کر رہے ہیں؟“

”ہو سکتا ہے۔“ نیچے والوں کے پاس خاصا ایسویٹین موجود ہو گا اور آنے والے بھی پوری طرح مسلح ہوں گے۔ میرا اندازہ ہے اب بھی ہمارے مقابلے پر ڈیڑھ درجن افراد ہیں۔ آنے والے رسد کے معاملے میں آزاد ہیں اور ہم اس جگہ قید ہو گئے ہیں جب تک دشمنوں کا صفایا نہیں کریں گے اس جگہ سے نہیں نکل سکتے۔“

”جب ہم کیا کریں؟“

رینا نے سوچ لیا تھا کہ انہیں کھلے مقابلے کے بجائے حکمت عملی سے کام لینا ہو گا۔ اس نے تین جگہوں کی نشان دہی کی اور شائن سے کہا۔ ”اپنے تین آدمیوں سے کہو خاموشی سے ان جگہوں تک پہنچ جائیں اور اپنی موجودگی ظاہر نہ کریں بلکہ میرے اشارے کے منتظر رہیں جب میں کہوں تب وہ حرکت میں آئیں۔“

شائن نے اپنے تین آدمیوں کو ان جگہوں پر جانے کا حکم دیا اور رینا سے کہا۔ ”تمہارے ذہن میں کیا ہے؟“

”ہم رفتہ رفتہ پسپائی اختیار کریں گے اور سمت کر ان چٹانوں کی طرف جائیں گے۔“ رینا نے پیچھے موجود چٹانوں کی طرف اشارہ کیا جہاں ان کے گھوڑے موجود تھے۔ ”لازمی بات ہے وہ آگے آئیں گے اور جب ہمارے آدمیوں کے نشانے پر آ جائیں گے تو وہ اچانک ان پر حملہ کریں گے اور اسی وقت ہم بھی گھوڑے پر سوار ہو کر حملہ کریں گے۔“

”یہ خطرناک نہیں ہوگا؟“ شائن نے تشویش سے کہا۔

”کامیابی کے لیے خطرہ تو مول لینا پڑے گا۔ اب

مجھے یقین ہے کہ یہ وائسن کا گر وہ ہے خود آ گیا ہے۔“

سورج بلند ہو رہا تھا اور چٹانیں تپنا شروع ہوئی تھیں لیکن اس سے زیادہ تپش وہاں موجود افراد کی رگوں میں تھی۔ خوریز معرکے کے احساس سے وہ سب مضطرب تھے۔ آنے والے ایک گھنٹے میں انہوں نے اپنی حکمت عملی پر کام کیا اور ہندرتک کمزوری ظاہر کرتے ہوئے وہ پسپا ہونے لگے۔ وادی پر موجود شائن کے دونوں آدمی بھی ان کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہے تھے لیکن ساتھ ہی وہ وادی والوں کو اپنی زد میں بھی رکھے ہوئے تھے۔ کینیوں کی آگ درختوں تک پھیل رہی تھی اور خشک جھاڑیاں اور گھاس بھی آگ پکڑ رہی تھی۔ شائن کے تین آدمی اپنے مورچوں میں جیسے بیٹھے تھے۔ رینا، شائن اور اس کے بقیہ آدمیوں نے سمٹ کر چٹانوں میں جگہ بنائی تھی۔ یہاں ان کے گھوڑے تھے۔ رینا نے اشارہ کیا تو سب گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی رینا نے مورچوں میں جیسے تینوں افراد کو اشارہ کیا کیونکہ وائسن کے آدمی خامے آگے آچکے تھے اور اب وہ ان کی زد پر تھے۔ اس لیے جب شائن کے آدمیوں نے اچانک ہی اپنے مورچوں سے ان پر فائرنگ کی تو وہ سنبھل نہیں سکے۔ کئی تو فوراً مارے گئے اور جب ان کی توجہ مورچوں کی طرف مٹی تو رینا، شائن اینڈ کمپنی نے نل کر ان پر حملہ کر دیا۔ آنے والے ایک گھنٹے میں شدید تصادم ہوا۔ وائسن اور اس کے ساتھی بری طرح پسپا ہوئے تھے۔ ان کی نصف نفری تو مورچہ بند افراد کا شکار ہوئی تھی۔ پھر رینا اور شائن کا حملہ فیصلہ کن ثابت ہوا۔ بچے ہوئے آدمی ایک چھوٹی سی چٹان کے ساتھ مورچہ بند ہو گئے تھے۔ ان کی تعداد تین سے زیادہ نہیں تھی، باقی مارے جاتے تھے۔ دوسری طرف وادی میں موجود افراد میں سے بھی کوئی زندہ نہیں بچا تھا، جھاڑیوں اور درختوں میں آگ لگنے کے بعد ان کے پاس چھپنے کو جگہیں بھی باقی نہیں رہی تھیں۔ اس معرکے میں شائن کے چار ساتھی بھی مارے گئے تھے اور دو زخمی تھے۔ مارس کو بھی ران پر زخم آیا تھا مگر اس کا کہنا تھا کہ زخم معمولی ہے اور وہ پوری طرح مستعد ہے۔ انہوں نے چھوٹی چٹان کو اس طرح سے گھیر لیا تھا کہ وہاں جیسے افراد کہیں نہیں جاسکتے تھے۔ رینا نے شائن سے کہا۔

”میرا خیال ہے وائسن ان میں سے کیونکہ اس کی لاش نظر نہیں آئی ہے، تم اسے مخاطب کرو۔ میرا ذکر مت کرنا ورنہ وہ آخر دم تک مقابلہ کرے گا۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔“ شائن نے آہستہ سے کہا۔ پھر

اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”واٹسن تم میری بات سن رہے ہو؟“
”ہاں سن رہا ہوں۔“ واٹسن کی غرائقی آواز آئی۔ ”تم لوگ کون ہو اور یہاں کیا کیوں آئے ہو؟“

شائن نے قہقہہ لگایا۔ ”اگر تم مجھ رہے ہو کہ ہم جارج کے ساتھی ہیں تو تم غلط ہی کا شکار ہو۔ اصل میں ہم جارج کے پیچھے آئے ہیں اور اس سے وہ سونا حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اس نے باغ سال پہلے لوٹا تھا۔“

”اگر تم جارج کے پیچھے آئے ہو تو یہاں کیا کر رہے تھے؟“ واٹسن نے پوچھا۔

”تمہارے آدمیوں نے بلاوجہ ہمارے کپ پر حملہ کیا جس کے جواب میں ہمیں یہ سب کرنا پڑا۔ اب تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ تمہارا ڈال کر سنانے آجاؤ۔“

”ہم تمہارا نہیں ڈالیں گے۔“ واٹسن نے پر عزم لہجے میں کہا۔ ”ہم مرتے دم تک مقابلہ کریں گے۔“

”تب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ شائن نے کہا۔ ”وہیے میں ضمانت دیتا ہوں اگر تم تمہارا ڈال دو تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا بلکہ قانون کے حوالے کر دیا جائے گا۔ تم اس سونے کو لوٹنے والوں میں شامل تھے۔“

واٹسن نے قہقہہ لگایا۔ ”تم نے مجھے یا گل سمجھا ہے جو میں جارج کے کیے کی سزا کاٹوں، عدالت مجھے مجھے پھانسی دے گی۔ نہیں، میں تمہارا نہیں ڈالوں گا۔ مجھے معلوم ہے تمہارے پاس بھی اب زیادہ لوگ نہیں ہیں۔ اگر تم نے ہمیں مارنے کی کوشش کی تو تم بھی نہیں بچو گے۔“

رینا کچھ سوچ رہی تھی، اس نے مارس کو اشارہ کیا اور وہ دونوں اس جگہ سے دور جانے لگے۔ رینا نے مارس کو دور لے جا کر کہا۔ ”اگر تم وہاں اس چٹان تک جا سکو تو وہاں سے یہ جگہ نشانے پر آسکتی ہے۔ اس طرح ان لوگوں کو باہر آنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔“

مارس نے دور دور چٹان دیکھی، وہاں تک جانے کے لیے اسے کھائی میں اتر کر بہت لمبا چکر کاٹنا پڑتا۔ مارس نے سر ہلایا۔ ”میں کر لوں گا۔“

”تمہارا زخم...“
”وہ ٹھیک ہے اب دیکھو خون بھی رک گیا ہے۔“
مارس نے اپنے زخم کی طرف اشارہ کیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ زنادیر میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا شائن نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے چٹان کے بارے میں بتایا۔
”وہ بہت دور ہے۔“

”مارس کا کہنا ہے کہ وہ وہاں تک پہنچ سکتا ہے۔“ رینا نے کہا۔ ”اگر وہ وہاں پہنچ گیا تو ان لوگوں کو نشانہ بنا سکتا ہے اور یہ تمہارا ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

”واٹسن کے لیے تمہارا کیا ارادہ ہے؟“
”میں اسے قانون کے حوالے کروں گی تاکہ یہ اپنے کیے کی سزا پائے۔“ رینا نے کہا لیکن ابھی اس کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ کیے بعد دیکرے کئی فائر ہوئے اور ان کے چاروں ساتھی زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ وہ بوکھلا گئے تھے کیونکہ فائر مخالف سمت سے ہوئے تھے۔ شائن کے زخمی آدمیوں نے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن دوبارہ فائر ہوئے اور اس بار وہ نشانہ بن گئے۔ رینا کا ہاتھ اپنی رائفل کی طرف بڑھا تھا کہ ایک بڑا ساحل آکر بیک وقت اس پر اور شائن پر گرا اور وہ اس میں الجھ کر گر پڑے۔ فوراً ہی دو افراد نمودار ہوئے اور انہوں نے رینا اور شائن کا اسلحہ چھین کر انہیں غیر مسلح کر دیا۔ یہ چھلاوے جیسے لوگ تھے۔ جب تک واٹسن اور اس کے آدمی ہوشیار ہوتے انہوں نے انہیں بھی نشانہ بنالیا۔ فائر کے ساتھ چٹان کے پیچھے سے چھین سٹائی دی گئیں۔

”یہ... یہ کون ہیں؟“ شائن نے بوکھلا کر کہا۔ چال میں وہ اور رینا ٹپکان ہو رہے تھے۔ اسی لمحے ایک آدمی سامنے آیا اور رینا کے منہ سے نکلا تھا۔

”واکر۔“
وہ واکر ہی تھا جو اپنے آدمیوں کو کہہ رہا تھا کہ ان تین کے سوا کوئی زندہ نہیں چٹنا چاہیے۔ تیسرے سے کیا مراد تھی اس کا پتا اس وقت چلا جب واکر کے آدمی واٹسن کو کھینچے ہوئے چٹان سے باہر لائے اور واکر کے سامنے ڈال دیا۔ وہ زندہ لیکن زخمی تھا۔

”یہ... واکر ہے۔“ شائن دم بہ خود تھا۔ زمین پر پڑے واٹسن نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پھر ہڈیانی انداز میں قہقہہ لگایا۔

”مجھے پہلے ہی پتا تھا تم لوگ بے وقوف بن رہے ہو۔“
”کیا مطلب؟“
”یہ واکر نہیں ہے... یہ جارج ہے، مہر کا بخار۔“
واکر یا جارج اس کی طرف آیا اور اچانک اسے گھونٹا مارا۔ واٹسن کا بازو جو پہلے ہی زخمی تھا اس ضرب نے اسے بے ہوش کر دیا۔ پھر اس نے رینا کی طرف دیکھا۔ وہ کانپتی آواز میں بولی۔ ”تم بچ جاؤ جارج ہو؟“

واکر اس کی طرف آیا اور ہیٹ اتار کر بولا۔ ”یہ

دست کہہ رہا ہے۔“

”میں نے اپنی زندگی میں اتنا بڑا دھوکا نہیں کھایا۔“
رینا بولی۔ ”اب تم کیا کر گئے؟ ہم سب کو مار دو گے؟“
”ہاں... لیکن اس سے پہلے تم سے کام لوں گا۔“

جارج نے کہا۔ ”میرے پاس زیادہ آدمی نہیں ہیں بس یہی چارہ لیکن ہیں۔“

جارج کے ساتھ چاروں میکینک عجیب سے حلے میں تھے۔ انہوں نے پاؤں پر پتلیوں پہن رکھی تھیں اور اوپر واسٹک نما شٹس اور سب سے اوپر مخصوص گول میکینک ہیٹ تھے۔ وہ صورت سے وحشی اور خوفناک لگ رہے تھے۔ ان کے پاس لمبی نال والے ریلوے تھے اور وہ ان کے استعمال کے ماہر تھے۔ مشکل سے دو منٹ میں انہوں نے آٹھ افراد کو مار ڈالا تھا۔ شائن کراہا۔ ”یہ تم نے اچھا نہیں کیا... ان کے بارے میں مجھ سے پوچھا جائے گا۔“

”فکر مت کرو۔“ جارج نے سر دھجے میں کہا۔ ”تم زندہ رہو گے تو کوئی تم سے جواب طلب کرے گا۔“ پھر اسے مارس کا خیال آیا اور اس نے رینا سے پوچھا۔ ”تمہارا ملازم مارس کہاں ہے؟“

”پتا نہیں شاید کسی چٹان کے پیچھے بے ہوش پڑا ہو۔“ رینا نے غلط بیانی سے کام لیا۔ ”وہ بے چارہ جنگ سے ڈرتا ہے۔“

جارج نے اپنی زبان میں اپنے آدمیوں سے کہا اور وہ شاید مارس کو تلاش کرنے لگے مگر مارس وہاں ہوتا تو انہیں ملتا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ سب گھوڑوں پر سوار وہاں سے جا رہے تھے۔ رینا اور شائن کے ہاتھ پشت سے باندھ دیے گئے تھے اور ان کے گھوڑوں کی لگا میں جارج کے آدمیوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ واٹسن ایک گھوڑے پر بندھی حالت میں بے ہوش پڑا تھا۔ جارج سب سے آگے تھا اور رینا اس کے پیچھے۔ اس نے چلا کر پوچھا۔ ”تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟“

”وہاں جہاں میں نے سونا چھپایا تھا۔“ جارج مڑے بغیر بولا۔ ”وہ جگہ زیادہ دور نہیں ہے، ہم شام سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔“

وہ گرینڈ ٹینکین کے شمالی حصے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہاں پہاڑ دور دور تھے۔ جیسے جیسے وہ ان تھوں کو عبور کر رہے تھے گرینڈ ٹینکین سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ اب پہاڑوں کا رنگ سرخ اور سرخی تھا۔ یہاں ہوا بہت تیز تھی اور جہاں جہاں مٹی جمع ہوئی تھی اس میں ٹیکٹس اگ آئے تھے۔ یہ بہت

بڑے ٹیکٹس تھے، کہیں کہیں تو تیس چالیس فٹ اونچے ٹیکٹس بھی تھے۔ پھر وہ چٹانوں کے بھول بھلیوں جیسے کنڈرات میں داخل ہوئے۔ لاکھوں سال سے ہواؤں نے ان چٹانوں کو کاٹ کر یہ شکل دیدی تھی۔ چٹانوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے کچھ دیر بعد وہ ایک مشروم نما چٹان کے نیچے رکے۔ یہاں موجود سامان بتا رہا تھا کہ جارج کا ٹھکانا نہیں تھا۔ انہیں ایک ہی جگہ بٹھا دیا گیا تھا مگر کھولا نہیں تھا۔ واٹسن ہوش میں آ گیا تھا۔ جارج کے آدمیوں نے مشعلیں جلائیں اور پھر رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئے۔ ان میں سے ایک گھوڑوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا اور ایک ان سے کچھ فاصلے پر مستعد موجود تھا۔ شائن نے آہستہ سے کہا۔

”یہ بہت بڑا اداکار ہے مجھے ذرہ برابر شبہ نہیں ہوا کہ اس کا تعلق ایوی کولڈ سے نہیں ہے، یہ اندر کی بہت ساری باتیں جانتا ہے۔“

”اس سے زیادہ کون جانے گا۔“ رینا نے کہا۔ ”اسی لیے تو اس نے کامیابی سے واٹسن کو ہماری کمپنی میں ملازمت دلوائی تھی۔“

”یہ ہمیں یہاں کیوں لایا ہے؟“
”یہ ہمیں سزا دینے لایا ہے۔“ واٹسن نے کہا۔

”سزا کیوں؟“
”میرے اور اس کی دشمنی تو ظاہر ہے۔“ واٹسن نے کہا اور پشت دیوار سے لگا کر بیٹھ گیا۔ ”شائن وہ شخص ہے جس نے جارج کی بہت بڑی رقم کی آخر ٹھکرادی تھی۔ وہ اس سے حفاظتی انتظامات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، وہی کام اس کے نائب نے خاصی کم قیمت میں کر دیا تھا۔“

”برون۔“ شائن نے دانت پیسے۔ ”غدار۔“
”مجھے اس چکر میں کیوں ڈالا؟“ رینا نے واٹسن کی طرف دیکھا۔

”یہ جس گولی سے زخمی ہوا تھا وہ کلارک نے چلائی تھی۔ آج تک کسی کی چلائی گولی جارج کو نہیں چھو سکی تھی۔ اس وقت اس نے یہ زخم چھپالیا تھا، اسے خوف تھا کہ اس کے زخمی ہونے پہلے سونا چھپایا تھا۔ جب تک ہم اسے گھیرتے یہ سونا چھپا چکا تھا۔ مقابلے میں اس کے ساتھی مارے گئے اور یہ فرار ہو گیا۔ یہ بھولا نہیں ہوگا کہ اسے کلارک نے گولی ماری تھی، وہ اب زندہ نہیں ہے اس لیے یہ انتظام نہیں لایا ہے۔“

جارج ان کے سامنے آ گیا، اس نے کہا۔ ”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کچھ دیر میں تم لوگ زمین سے سونا نکالو گے۔“

واٹسن نے زمین پر تھوکا۔ ”تم مجھ سے ایک انچ زمین نہیں کھدوا سکتے۔“

”اس صورت میں تمہیں اپنے ہاتھ سے مارنے کے بجائے تمہیں اندھا کر کے حکومت کے حوالے کر دوں گا اور تم جانتے ہو وہ تمہارے ساتھ کیا کرے گی۔“

یہ سزا اتنی خوفناک تھی کہ واٹسن کے ساتھ رینا بھی کانپ اٹھی تھی، اسے یقین آ گیا کہ جارج نہایت سفاک انسان ہے، کسی اور کے ذہن میں ایسی سزا نہیں آ سکتی تھی۔ واٹسن نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ”دوسری صورت میں.....؟“

”میں تمہیں ایک گولی مار کر اسی جگہ دفن کر دوں گا جہاں ابھی سونا دفن ہے۔“

”مجھے منظور ہے۔“ واٹسن نے ہلکتے خوردہ لہجے میں کہا۔ ”بس تو تیار ہو جاؤ۔“ جارج نے کہا اور اس کے اشارے پر گرمان میکسکین نے ان کی رسیاں کھول دی تھیں۔ وہ جارج اور دو مسخ نگرانوں کے ساتھ ایک جگہ آئے۔ یہاں چٹانوں کے درمیان ایک گول پیلا نما گڑھے میں ڈھیر ساری ریت تھی۔ چٹانوں کے رخنوں میں مشعلیں لگادی گئی تھیں، اس لیے روشنی تھی۔ جارج نے ان کی طرف دیکھا۔ ”یہ ریت ہٹاؤ، سونا اسی کے نیچے ہے۔“

انہیں پہلے مہیا کر دیے گئے تھے۔ ریت کھودنا نہیں تھی کیونکہ اس کا ایک ایک ذرہ الگ تھا، یہ صحرائی ریت کی طرح تھی البتہ اسے ہٹانا نہایت مشکل تھا۔ کیونکہ یہ پیالے نما جگہ تھی اور ریت ہٹانے پر واپس اس پیالے میں گر گئی تھی۔ اسے ہٹانے کا داحظ طریقہ یہ تھا کہ اسے اس جگہ سے دور پھینک دیا جائے اور یہ نہایت مشقت والا کام تھا۔ مگر انہیں کرنا ہی تھا۔ جارج کسی رعایت کے موذ میں نہیں تھا، اس نے رینا کے عورت ہونے اور واٹسن کے زخمی ہونے کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ وہ ریت اٹھا اٹھا کر اس جگہ سے دور پھینک رہے تھے۔ یہی سب سے مشقت والا کام تھا شائن نے جارج سے کہا۔ ”کوئی چیز دے دو جس میں ریت جمع کر کے دور پھینکیں۔ اس طرح تو بہت مشکل ہے کہ ایک ایک پیچلے جا کر پھینکیں۔“

جارج نے شانے اچکائے۔ ”تمہاری مرضی، کام جلدی ہوگا اور تمہارا کام بھی جلدی ہو جائے گا۔“

انہیں ایک بوری مہیا کر دی گئی اور وہ اس میں ریت بھر کر پھینکتے گئے۔ رفتہ رفتہ گڑھے سے ریت کم ہونے لگی اور پھر آخر میں ایک سوراخ نمودار ہوا۔ اس میں بھی ریت

بھری ہوئی تھی۔ سونا یقیناً اس کے اندر تھا۔ وہ اب اس میں سے ریت نکالنے لگے۔ اب وہ آخر والے حصے سے ریت نکال رہے تھے۔ واقعی یہ ایسی جگہ تھی جس طرف کسی کا دھیان بھی نہ جاتا کہ اس میں کوئی چیز چھپائی گئی ہے۔ صبح چار بجے تک وہ ٹھکانے سے چور ہو چکے تھے جب وہ سونے تک پہنچے۔ یہ لکڑی کی چھوٹی چھوٹی پیشیاں تھیں۔ ایوی گولڈ کی مہر اب تک ان پر لگی تھی۔ ہر پیشی میں تقریباً دس گرام سونا تھا اور وہاں ایسی پچاس کے قریب پیشیاں تھیں۔ ریت کے بعد وہ پیشیاں نکالنے لگے۔ رینا عورت ہونے کے باوجود ہمت سے کام لے رہی تھی۔ واٹسن کی حالت سب سے بری تھی۔ اگر جارج نے اسے خوفناک دمکی نہ دی ہوتی تو وہ اس مشقت پر موت کو ترجیح دیتا۔ صبح تک ساری پیشیاں نکل آئی تھیں۔ یہ پیشیاں گھوڑوں پر لادی جا رہی تھیں۔ جارج ان کے لیے خاص طور سے مضبوط چمڑے کے بس بوا کر لایا تھا۔ ہر بس میں پانچ پیشیاں رکھی جا رہی تھیں اور ہر گھوڑے پر دوئوں طرف ایک ایک بس لادا جا رہا تھا۔ جارج کے پاس پانچ مضبوط گھوڑے اسی مقصد کے لیے تھے۔ اس نے آخری چٹنی نکلنے پر برسر تلبے میں کہا۔

”میں تم کو اسی جگہ دفن کر کے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔ اس سونے سے میں میکسیکو میں بادشاہ جیسی زندگی گزاروں گا۔“

کام مکمل ہو گیا تھا اس لیے ان کا بھی آخری وقت آ گیا تھا۔ جارج نے اپنے آدمیوں کو بلارکھا۔ دو وہیں موجود تھے وہ باقی دو کو بلارکھا تھا مگر جب بلانے پر بھی وہ نہیں آئے تو اس کے چہرے پر تشویش نظر آنے لگی، اس نے اپنا پستول نکال لیا اور ایک میکسیکن سے کچھ کہا تو وہ اپنے ساتھیوں کو دیکھنے چلا گیا اور جب خاصی دیر تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تو جارج غضب ناک ہو گیا۔ اس نے دہاڑ کر ان تینوں سے کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے... کیا تمہارے اور ساتھی بھی ہیں؟“

”ہمارا اب کوئی ساتھی نہیں ہے۔“ شائن نے بد مزگی سے کہا۔ ”جو تھے تم انہیں مار چکے ہو۔“

”کوئی گڑبڑ ہے۔“ جارج نے کہا اور اپنے آخری آدمی کو بھی بھیج دیا اور پھر ان سے بولا۔ ”مگر یہ واپس نہیں آیا تو میں تمہیں مار دوں گا۔“

”تم نے ویسے بھی ہمیں مارنا ہے۔“ رینا بولی۔ ”ہمارے کیوں کر رہے ہو۔“

”تمہارا کوئی ہمدرد یہاں آ گیا ہے اور وہی میرے آدمیوں کو شکار کر رہا ہے۔“ جارج کہتے ہوئے دیوار سے

تک گیا اور بلند آواز سے بولا۔ ”تم کو کوئی بھی ہوسانے آ جاؤ ورنہ میں تین تک گن کر ان تینوں کو مار دوں گا۔“ کوئی مکمل سامنے نہیں آیا تو جارج بلند آواز سے گنتے لگا مگر ابھی اس نے دو تک ہی گنا تھا کہ اوپر سے وہی جال اس پر گر آوا جس کے آدمیوں نے رینا اور شائن کو پکڑنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ جارج اس میں الجھا اور زمین بوس ہو گیا۔ رینا کے منہ سے خوشی سے چیخ نکلی تھی۔ ”مارس۔“

پھر وہ تینوں وہاں سے بھاگے کیونکہ جارج نے جال میں سے ہی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ وہ دیوانہ وار فائر کر رہا تھا اور وہ اسی وجہ سے چیخ گئے ورنہ ایک آدھ ضرور مارا جاتا۔ جارج پاگل ہو گیا تھا اور جب اس کا پستول خالی ہو گیا تو وہ چیخ چیخ کر گالیاں دینے لگا۔ آخر اوپر سے ایک پتھر اس کے سر پر گر آیا اور اس کی مزاحمت جواب دے گئی۔ چند منٹ کے بعد وہ بندھا ہوا پڑا تھا۔ مارس، رینا کو بتا رہا تھا کہ اس نے کس طرح ان کا تعاقب کیا تھا اور پھر ایک ایک کر کے میکسکین پر قابو پایا۔ ان میں سے دوسرے تھے اور دوسری تھے۔ رینا آخر سے اسے دیکھ رہی تھی اور شائن بار بار اس کا شانہ ٹھیک رہا تھا۔ واٹسن کو پھر باندھ دیا گیا تھا اور اب وہ اپنے سابق پاس جارج کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔ واٹسن نے کہا۔ ”سنو، اصل قصور وار جارج ہے۔“

”بکومت۔“ رینا غرائی۔ ”میرے باپ کو کس نے دھوکا دیا تھا؟“

شائن بولا۔ ”اب تم دونوں قانون کا سامنا کرو گے۔“ جارج نے اپنی خفیہ شخصیت کا فائدہ اٹھا لیا تھا۔ اس نے میکسیکو میں رہ کر چند آدمی حاصل کیے اور پانچ سال بعد سونا لینے واپس آ گیا لیکن جہاں سونا چھپایا تھا وہیں واٹسن موجود تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے سونا نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ اب تک جارج کا نام استعمال کر رہا تھا اس لیے جارج مقامی جرائم پیشہ افراد کی مدد بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ بھلا صحرا کے بخار کا مقابلہ کون کرتا اس لیے جارج نے یہ منصوبہ بنایا۔ اس نے واکر کرٹ کے جعلی نام سے کارڈ چھپوائے اور خود کو ایوی گولڈ کا نمائندہ ظاہر کیا پھر اس نے شائن کی خدمات حاصل کیں، اسی کی مدد سے اسے قابل اعتماد لڑاکا مل سکتے تھے۔ رینا کو شامل کرنے کا مقصد اس کے اور شائن کے ہاتھوں واٹسن کے گروہ کا خاتمہ کرنا تھا۔ اسی لیے وہ ولسو سے بہانہ کر کے غائب ہو گیا۔ مارے جانے والے جوار یوں میں اس کا کوئی آدمی نہیں تھا، اس نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رینا، شائن کو مجبور کر دے

کی کہ وہ واٹسن کی تلاش میں چلے اور ایسا ہی ہوا۔ جارج اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا اس لیے وہ خاموشی سے شائن اینڈ اپنی اور واٹسن پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ بالآخر واٹسن کے گروہ نے پہلی کی اور جنگ چھڑ گئی۔ جب دونوں یارنیاں لڑ کر تباہ حال ہو گئیں تو جارج حرکت میں آیا اور نیچے کچھ لوگوں کا صفایا کر کے انہیں قید کر کے لے آیا۔ مگر بد قسمتی سے وہ مارس کو نظر انداز کر گیا تھا اور یہاں بھی رینا کی دور اندیشی کام آئی اگر وہ مارس کو روانہ نہ کرتی تو وہ بھی مارا جاتا اور پھر کون ان کی مدد کرتا۔

کچھ دیر آرام کے بعد انہوں نے کھانا پیا اور سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ جارج اور واٹسن کو ایک ہی گھوڑے پر اس طرح باندھ کر بٹھایا گیا تھا کہ وہ خود کو ایک دوسرے سے بھی الگ نہیں کر سکتے تھے۔ شام سے پہلے وہ سونے اور ان دونوں کے ساتھ ولسو کے شرف کے دفتر پہنچے تو پورے قصبے میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ لوگوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ صحرا کا بخار جارج اور اس کا نائب پکڑے گئے تھے اور ان کے گروہ کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اس سے زیادہ سنسنی ایوی گولڈ کے سونے کی بازیابی سے پھیلی تھی۔ شرف نے اپنی ساری نفری بلائی تھی اس سونے کی حفاظت کے لیے اور فوری طور پر اس کی اطلاع فوئس سمیج دی گئی تھی۔ دوسرے دن ایک فوجی دستے کی حفاظت میں اس سونے کو روانہ کیا گیا۔ مقامی انتظامیہ نے لاشیں اٹھوالی تھیں اور شائن اپنے ساتھیوں کی لاشیں لے کر روانہ ہو رہا تھا، وہ افسردہ تھا۔ رینا کو خیال آیا۔

”وہ داکٹر نے سونے کی بازیابی کے انعام کے بارے میں کہا تھا؟“

”وہ بھی جھوٹ تھا۔ ایوی گولڈ نے ایسے کسی انعام کا اعلان نہیں کیا اور اگر اس کی طرف سے کوئی انعام ملا تو اس کے حق داران درجن افراد کے اہل خانہ ہوں گے جنہوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔“

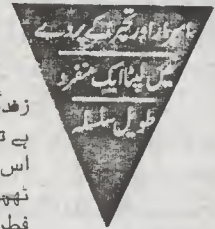
رینا نے سوچا اور ٹھنڈی سانس لی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو میرے لیے یہ بھی بہت ہے کہ میرے باپ کے قاتل پکڑے گئے ہیں۔“

”یہ کام نہٹ جائے پھر تم سے ملے آؤں گا۔“

رینا سمجھ رہی تھی کہ وہ اس سے کیوں ملنے آئے گا مگر اس نے انجان بن کر پوچھا۔ ”کیوں؟“

”جب میں آؤں گا تب ہی بتاؤں گا۔“ شائن نے کہا اور پھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔





زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو ستوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں پوش رہا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جراثیم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سنسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

***** گزشتہ اقساط کا خلاصہ *****

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیر سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ بھی بچنے نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جوڑ بھی تعلیم کے زور سے آراستہ تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرحمن نائی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحمن کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعا میں لیں، فرحمن سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی جگہ سٹی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحمن نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ قام دراز قد شخص پر تاب بھونک کر برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہوئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحمن کی نشاندہی والی قبر سے ایک نیولا جس میں شعلے کے گندے عمل والی جان لیوا سواں پتھر تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر نیو سے سواں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رخصت لینے جاتا ہے تو تب ایک ناپتا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ ناپتا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھو لاری کی سٹ جا تا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ ناپتا خود چھو لاری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ سٹی آنکھیں بند کیے استغراق میں تھیں۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلا تا ہے۔ ایک چنگی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے سر میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں ناپتا لیاقت حسین کو کھٹ تاکہ کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چنگی کا ذکر کسی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر ناپتا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چنگی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا تو ذہنی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس کسی میں رہتا تھا وہاں ایک دو منزل مکان میں آگ کے شعلے بھڑکے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریب عزیز و راجھی مایوسی کے عالم سے دو چار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سینہ خان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈائریکٹر ملازمت پر رکھ لیا جاتا ہے۔ سینہ خان اور ان کی اہلیہ راجیلہ بیگم سچے

کشکول

ان سے مل کر اپنی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے درد درکار دیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلہ حملہ کی تلافی پر فوج جاتے والے دشمنی حملہ آور کو ہوا کی تھوپیوں میں لے کر قتل عام کروا دیں۔ اپنے قاتل احمد اور فرکو ہدایت دس حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ہانگیر کے اجنبیوں کے گھوڑے کو گڑے کا مرنے والے۔ ایجنٹ کی بنیادی حیثیت کے جو اثر و رولڈ میں اسلام آباد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے ہاتھ پر کوئٹہ اور اورڈو کے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اس حملے کے دوران ڈومار مارا گیا جبکہ کوئٹہ کو لاشیں پائی اور دیگر بے لے اپنی تھوپیوں میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے تین اہم بھائیوں کی لاشیں بھی ملاوٹ میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی تھیں اور ان کو لے کر فون کر کے کسی ایجنسی کی دعوتی میز پر اس کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد تخت میں کے عالم میں اس کی آئی جی آغا خٹور سے جواب ملتی کرتا ہے اور اس میں لیاقت پر قاتلہ کے رد کے لیے شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگزیب پر مغزرت کر کے اسے کچھ دن کی سہلت طلب کرتا ہے اور تاکہ اس کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو شیخ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی نگرانی میں اضافہ کر دیتا ہے لیاقت حسین کو اپنی خوشی میں فرحمن کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پر تپ بھوشن اپنے کل کے ذریعے بھارتی موزک فون میں روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجیے کہ یہاں بھی لیاقت حسین سے بچا جاتی ہے۔ جبکہ شریا کے مشورے پر میڈم آغا خٹور کے دل میں اپنے خلیق کے جذبات کے تحت اس کے ساتھ ایک کامیابی کے لیے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین روشنی کو آدائی پر پرتی لیاقت حسین اپنے لیے سے معافی کا درخواست گزار اور اس کے ساتھ ایک کامیابی کے لیے۔ دوسری جانب افضل خان فرحمن کو حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اورنگزیب اس کی پاداش میں شہنشاہ پر الزام کر کے اسے ایک جگہ کے حوالے کر کے اگندہ یہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔ افضل خان اور شہنشاہ دوبارہ جگہ باس کی تھوپیوں میں ملے گئے۔ افضل خان، اسلام آباد کے زیر نگرانی جگہ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے چگا کو اس کے سر پرست اداہلی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ چگا کے نام سے جگہ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کول کے ساتھ شاہک رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب کوئٹہ کی ملاقات دشمنی قیدی سے کرانی تھی جہاں اس نے اسے ایک نیکم عرف و شنو کے طور پر شناخت کر لیا۔ لیاقت حسین گاؤں سے فرحمن کو واپس لے آیا، اس کی ماں نے اسے حفاظت کے لیے ایک قیدیوں پر ایک جگہ میڈم روٹی شیخ حامد کے انجام میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے بے چین تھی۔ شیخ حامد کے خلاف برسرِ پیکار کوششوں میں باسٹر مارٹن کا کردار اورنگزیب نے ادا کر رہا تھا جبکہ افضل خان معاملات میں سراج بھی لاطم تھا بلکہ اس کی غرضی بھی اس امر میں شامل ہے اسے انوائس اور شیخ حامد کے خلاف گھیرائے گئے تھے۔ ہوتا جاتا رہا جبکہ اس کا ذوق مختلف انجمنوں کا شکار تھا۔ شیخ حامد کے گھر پر انکس اور گویا کرچہ اس نے شہنشاہ اور اسلام آباد کو قہر کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکام کا سامنا ہوا۔ بالآخر جب باس نے نیلی کا پٹر میں فرار ہونے کی کوشش کی مگر سمندر پر ہوا گیا، البتہ نیلی نڈل نہ گئی۔ دوسری جانب دستور اور کوئٹہ کرل اشتہام کی گرفت سے فرار ہو گئے۔ اورنگزیب اور سراج آدلی کے تعاون سے مجرموں کے گرد جال بنانے لگے۔ لیاقت حسین اپنے والد کی شہرہ پر خوش قاتلہ امرای دوران ان پر قاتلہ حملہ ہو گیا حملہ کرانے والے کا کچھ تباہ چل سکا۔ لیاقت حسین کی ماں نے جو کہ خود بھی لیاقت کی طرح اورانی قوتوں کے زیر سایہ ہے کچھ بہت تعلیمات فرما سکتی ہیں لیکن مل معلومات حاصل نہ ہو سکتیں۔ اورنگزیب ہونڈہ پھانسنے پر تیار نہیں کہ شیخ حامد پر چکا ہے۔ حالانکہ اس کے اعزاز میں ایک تقریب میں اسے فوجی اعزاز بھی دیا گیا۔ میڈم روٹی کوئٹہ سے کنٹرینک بڑھاتا جاتی ہے۔ ایک غیر یقینی کی کہنیت ہے اسی دوران لوڈی میڈم نے ملے سے لیکن اس کے بعد اس کا حشیہ ڈال دیا جوتا جاتا ہے اور اس کے تانے بانے آگے کوئٹہ میں شیخ حامد کی باس سے لیے ہیں۔ میڈم روٹی کی آئی جی سے نکاح پر تیار ہو گئی اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ شیخ حامد کی موت پر احتجاج بہت زیادہ ہوئی تھی۔ اس پر اس روک گیا۔ شہر میں کی واداشی ایسا ہو جس میں جن کو ان کوئٹہ کی بہر استعمال کی گئی تھی۔ شیخ حامد کی موت پر احتجاج بہت زیادہ ہوئی تھی۔ اس پر اس کی موت پر مطمئن تھے جبکہ اورنگزیب اپنے موقف پر قائم تھا تاہم ایک غیر یقینی کی فضا میں شیخ حامد کی کوئی کو باوجود جوتہ چھاتی ہے کہ تباہ کر دیا گیا۔ شیخ حامد کی بچہ کول کو دوبارہ آکر لیا گیا اور اس کی ماں کو لے۔ دوسری جانب داخلہ بیگم کی جو کہ لیاقت حسین ڈرائیور کر رہا تھا، کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی اور اسی آئی جی اور میڈم روٹی کی غرضی کی تقریب منعقد کی گئی جس میں سراج اور اورنگزیب کے علاوہ شیخ عثمان کی بھی شرکت ہو گیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”آپ جانتے ہیں کہ اس مفتی کو آخری انجام تک پہنچانے سے پیشتر میں آپ سے کیا سوال کروں گی؟“

”میرا ذاتی مشورہ ہے کہ آپ کو کسی ایک شخص کے واسطے کے مقابلے میں اکثریت کی رائے کو قبول کر لینا چاہیے۔“

اورنگ زب نے غصہ کی سے کہا۔ ”یہی مناسب بھی ہوگا۔“

”یہ میرا بھی انفرادی معاملہ ہے اس لیے اگر میں آپ سے آٹھ سو کے بارے میں جاننے کی دوبارہ درخواست کروں تو۔۔۔؟“

”تو میں آپ کو ایک انتہائی قیمتی مشورہ بالکل مفت دوں گا۔“ سراج نے کچھ سوچ کر سنجیدگی سے کہا۔ ”میں آٹھ سو کے لیے جاننے کی خاطر لاقوت حسین سے رابطہ کرنا

ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ شیوخین کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد پر نگاہ سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر باخفا کا مقامی سرفراز اور لڑکھائے کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرات کا مجموعہ کی پشت پناہی کر کے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بنگ ناگیر" تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر کسی کی تحویل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اہمیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے خفیہ میں سرفراز میڈم رونی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم رونی نے بھی اندرونی طور پر شیخ حامد کے خفیہ میں خلیفہ بن کر افراد و مبالغوں اور سیام یاہم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سین انسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے کے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک خاص شیخ کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ خفیہ میں اندرونی طور پر میڈم رونی سے کچھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض پکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم رونی کو کوٹوا کر اس کی خراب اطلاق تصویر میں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی زینب کو بھی ان کو اتار کر پریکٹ لیاقت حسین کی ادائیگی کو ختم ہر موقع پر اس کے ڈرے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دانیوں میں افضل خان بھی زیرِ پا آجاتا ہے۔ شیخ نے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے قلیب پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ خفیہ میں گنپے پر ایک اور بڑے تاجہ دستہ علی آغا خان کی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض اور برابریوں اور نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ ایماندار کی علی علم احمد کے ریاکار ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا خانوہ راجہ آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر یک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کانٹے کی سمات نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سران سے جو کچھ خود کو بھیجنا چاہتا تھا اس کا موقع دینے کی خاطر کچھ فیس کے اسرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے خود فراموشی آتی جی علیہم احمد کو کہتا ہے کہ "سراج احمد کو دیکھنا شمس آفیسر ہے۔ ایک سبے ایس بی اورنگ ایس کے آگے جانے کے بعد اس کے ہاتھ اندر مضبوط ہوجاتے ہیں۔ چونکہ احمد زب کے بھی کچھ تعلقات اور فز سے اس لیے وہ اس کے ہاتھوں میں آتی ہے۔ اس بنا پر اس کی اطلاع شیخ حامد میں جاتی ہے۔ یہی دوران شیخ حامد کی بیوی صاحبہ جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آ چکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت اسی رائے میں آتی تھیں جو خیر بری فعل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی خیر کو لے جائے۔ سراج وہ خیر حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موہاں سے اس بات کا علم ہوجاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قبا کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو انوکھا کر لیتا ہے۔ انیشتر دائیں جس کے پاس صاحبہ کی اہم فائل بھی وہ سراج کو بھیجی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زہر خیزی ایس بی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پر بے وقافتے کو دیکھ سبت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی دنگی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہوجاتا ہے۔ شیخ احمد حالات سے دودھ اندر مضبوط بننے کی خاطر اپنی ہاتھوں سے قریب سے دوسری کوٹھڑیہ کر لیتا ہڈیاں آتش بنالیتا ہے۔ اسی کوٹھڑی کی ایکسی میں لیاقت حسین اور زینب بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی انوکھا کر لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم خیال (مزدور) لیاقت حسین کوکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پر تاب بھوش جو غلطی کا ہمارا تھا، اپنے نبیو دالے مل کی تاکا کی بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اسی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتی مگر بھیجی وہ بآز نے کو تارکین ہوتا۔ دوسرا میڈم رونی سین انسٹار کے پاس ورڈ سے سیام یاہم اور جہانگیر عرف چنگ کوٹھڑی حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چارچ پا ہوجاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کول سے شادی کر کے اس کو پیش خانے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو درپے دوپٹے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس بی اورنگ زیب قلیب قانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث ہا کر لودھی کو کھٹل کر دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم رونی کے ایجنٹ جاب احمد شیخ حامد کے اہم ترین آدمی "بنگ ناگیر" کو گھیر کر کتے کے گھاٹ اندر دیتے ہیں۔ سراج احمد لیاقت حسین کی ادائیگی قوتوں کا مزاحمت خود تارکے چکا تھا، بھگتوں کے لیے شیوخین احمد (جوراج) کلاس ٹیلو بھی رد چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ اب اورنگ زیب اورنگ ادائیگی حسین بل کر لیاقت کو گھیرنے کے لیے پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر عرف چنگ اپنے سابق پردی اور پولیس کے ریاکار ڈیڈ کا تشکیل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے کچھ کامیابی جبری سزا بھگتے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فریج کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ سیام یاہم کو سین انسٹار کی بھیجے جگہ پاس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خان کو فون پر مدعو ملتی ہے جسے اس کا کلا کار اسرین لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق سیرج خاں کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ لگا دی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اپنا ک گاڑی کار چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ایسا دیکر تاجہ سبت موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بدقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی دنگی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مودی میرے سے ڈرے اپنے محفوظ کر لی گئی تھی۔ لیاقت حسین زینب کے شے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاڈ بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب چنگ اور اپنے سرفراز امداد علی کے اس پیچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے۔ امداد علی اسے لی اعلیٰ میر کی تلقین کرتا ہے۔ شیخ اور افضل خان کے قلیب سے خفیہ میں کوٹوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چارچ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو قتل سنا تا ہے اورنگ زیب طران کو گرفتار کر کے قتل ہو چکا ہے۔ نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ چنگ کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کی ہے کہ کہنے پر کئی تھی۔ جیکر سراج کی بیوی الماس کے انوکھا کوٹھڑی کا شہر بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تھپتھپا کر دیتا ہے۔ ایس بی اورنگ زیب اپنے شیخ شیخ حامد کے خلاف گھیرا ٹنگ کرتی ہے، خفیہ کے انوکھا دارا میاں علی سلے کی ایک کوٹھی میں اورنگ زیب سے خفیہ میں لے کر اسے احتوا میں لیاقت حسین اور ان کا ساتھ دیتے پراش ہوئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے ایک لیاقت حسین کے سبب انوکھا کر لیا۔ اسی دوران شیخ حامد کی پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے آتی ہے جہاں ایس بی اورنگ زیب نے اس کارروائی کو ڈھکی کی واردات دا رنگ دے کر پورٹ بنالیتا ہے۔ گاڈ سے زینب نے فون پر اطلاع دی کہ کشاہ پری کے ڈرے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری مدد کی ہوئی ہے، لیاقت حسین جمان کی کیتھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہذا اس نے

بڑی خوب صورتی سے موضوع بدل دیا۔
”ابھی تک ان کے بارے میں مجھے کے اکثر افسران بھی کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکے ہیں۔“
”کوئی سبب بھی ضرور ہوگا.....؟“

”جی ہاں.....“ ڈی آئی جی نے پہلو بدل کر کہا۔
”ہماری اطلاع کے مطابق پہلے وہ ایکٹو (Active) آفیسران کی فہرست میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے لیکن چار سال قبل ہیوی کے فوت ہوجانے کے بعد ان کی زندگی میں ایسا انقلاب آیا جس کے بعد انہیں ملازمت سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ سنا ہے خاندان میں بھی قریب کے ایسے رشتے دار نہیں تھے جو ان کا غم بانٹ سکتے۔ اس لیے وہ ایک سال کی رخصت کے کریر یون ملک چلے گئے تھے۔ وہاں سے وہ بار بار چھٹیاں بڑھواتے رہے اور اب طویل عرصے کے بعد جب سے آئے ہیں وہ کئی بار ملازمت سے استعفیٰ کی درخواست دے چکے ہیں لیکن ان کے سابقہ ریکارڈ کے پیش نظر ابھی تک ان کی درخواست منظور نہیں ہوئی۔“ ڈی آئی جی نے بات جاری رکھی۔ ”یہاں وہ پہلی بار تبادلہ ہونے کے بعد آئے ہیں۔ یہ ظاہر پہلی کانفرنس میں بھی موصوف نے تمام افسران کو ایکٹورہ کرکام کرنے کو کہا ہے لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اب وہ ملازمت سے اکتا چکے ہیں۔ ان کے استعفیٰ کی درخواست اب بھی حکومت کے زیر غور ہے۔ واقف کاروں کا بھی یہی خیال ہے کہ ان میں اب وہ پہلی جیسی بات نہیں رہی۔“

”آکٹوپس کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے.....؟“
میڈم نے پھر دلی زبان میں کریدنے کی کوشش کی۔
”فی الحال انہوں نے محل کر اس موضوع پر بھی کوئی بات نہیں کی۔“ ڈی آئی جی نے انہیں سے اورنگ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ملٹری انٹیلی جنس کے ذمے داروں کا بھی ایک ہی خیال ہے کہ چٹان سے کی جانے والی فائرنگ کی زد میں آکر دونوں ہلاک ہو گئے، پھر ان کی لاشیں سمندر کی تہ میں جا کر گوشت خور چھلیوں کا شکار ہو گئی۔“

”جن وارداتوں میں آکٹوپس کی شہید ہل رہی ہے ان کو کیا نام دیں گے آپ؟“
”یہ سب عوام میں دہشت پھیلانے کا ایک بھونڈا حربہ..... میرا خیال ہے کہ یہ شیخ حامد کے پاتو مدعا شوں کا ڈھونڈ ہے۔“
”انگوٹھی کی رسم ادا ہونے کے بعد اس وقت آکٹوپس

کا ذکر بھی نامناسب ہے۔“ راجیل بیگم نے روٹی سے کہا۔
”میرا ذاتی خیال ہے کہ اب کوئی تاریخ بھی طے ہوجانے تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”میں آپ کے اس مبارک خیال کی بھرپور تائید کروں گا۔“ اورنگ زیب نے بھی میڈم کو اسانے کی کوشش کی۔
”میڈم سے اس سلسلے میں میری بات ہو چکی ہے۔“
تھریا نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ نیک کام بھی بہت جلد ہوجائے گا۔ تاریخ کے بارے میں بھی کوئی اعلان دو ایک دن میں کر دیا جائے گا۔“

”آپ اس سلسلے میں کیا کہنا پسند کریں گے؟“
الماس نے ڈی آئی جی کو خوشی سے مخاطب کیا۔
”میں آپ لوگوں کے رحم و کرم پر ہوں۔ میڈم کا جو فیصلہ بھی ہوگا وہ مجھے قبول ہوگا۔“ ڈی آئی جی نے اپنی تابعداری اور انکساری سے یہ جملے ادا کیے کہ سب ہی مسکرا دیے پھر..... کافی کے دور کے بعد جب محفل پرخواست ہوئی تو روٹی نہ جاتے ہوئے اورنگ زیب کے قریب سے گزرتے وقت مسکرا کر شکوہ کیا۔

”الماس کے رشتے سے میرا بھی کچھ حق بنتا ہے آپ پر لیکن اس وقت آپ نے افسری کا تختی کا زیادہ خیال رکھا۔“
”بات نمک کی آگئی تھی۔“ اورنگ زیب نے برجستہ جواب دیا۔ ”آپ کے ہاں دعوت ہوگی تو گھٹنا آپ ہی کی طرف جھکے گا۔“

”آپ کا گھر ہے جب چاہیں تشریف لے آئیں لیکن ایک بات میری بھی سن لیں۔ جب تک آپ غیر جانبدار ہو کر آکٹوپس کے بارے میں زبان نہیں کھولیں گے۔ آپ کے ڈی آئی جی کی دال بھی نہیں ملے گی۔“
میڈم نے آخری جملہ بڑی مدہم آواز میں ادا کیا پھر سب سے اجازت طلب کی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد ڈی آئی جی نے بھی سیٹھ عثمان کو رخصت کرتے وقت بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا پھر راجیل بیگم سے کہا۔ ”آپ نے جس اپنایت سے میڈم کو انگوٹھی پہنانے میں پہل کی تھی اسے میں بھی فراموش نہیں کروں گا۔“

واپسی پر بھی اورنگ زیب، سراج اور الماس کے ساتھ تھا لیکن کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ الماس نے اسے چھینرنے کی خاطر پوچھا۔ ”میڈم نے جاتے جاتے کیا کہہ دیا جو آپ اس قدر سنجیدہ نظر آ رہے ہیں؟“
”میں اپنے کارڈز قبل از وقت شکر نے کا عادی نہیں

ککشول

ہوں۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر جواب دیا پھر کسی خیال میں کم ہو گیا۔ سراج نے اس وقت اسے الماس کی موجودگی میں کریدنا مناسب بھی نہیں سمجھا۔

ماربل کے ایکسپورٹ کے کام کی وجہ سے لیاقت حسین کی دفتری مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ آفس کے علاوہ اسے اکثر باہر کے کاموں کی نگرانی بھی کرنی پڑتی تھی۔ پہلے گودام سے مال اٹھا کر شپنگ کمپنی تک پہنچانے کا کام کسی اور کے ذمے تھا لیکن اب یہ کام بھی لیاقت حسین خود کرنے لگا تھا۔ سیٹھ عثمان کے مشورے پر اس نے ایک لوڈنگ پک اپ بھی خرید لی تھی۔ شپنگ کمپنی تک مال پہنچانے کا مشورہ بھی اسے سیٹھ عثمان ہی نے دیا تھا۔ پہلے یہ کام جو جنس کرتا تھا اس کے بارے میں بھی رپورٹ ملتی تھی کہ وہ بڑس کے راز بھی دوسروں کے ہاتھ فروخت کرتا تھا۔ اس بات کا علم بھی اس وقت ہوا جب ”ماربل ایکسپورٹرز“ کے نام سے اس شے کو طوطہ کیا گیا تھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی اس ملازم نے اچانک ملازمت بھی چھوڑ دی تھی، بعد کی اطلاعات کے مطابق اس نے ماربل کا کام کرنے والی ایک اور فرم میں ملازمت اختیار کر لی تھی جس کا مال بھی سرفراز خان کے بچائے کی اور کے ذریعے خریدنا تھا تھا۔

بہر حال، اب گودام سے مال اٹھانے اور شپنگ کمپنی تک پہنچانے کا سارا کام لیاقت حسین خود دیکھ رہا تھا۔ اس کی ایمانداری سے دوسرے عملے کے افراد بھی واقف تھے اس لیے وہ بھی محتاط ہو گئے تھے۔
اس وقت دوپہر کے دو بجے کا عمل تھا جب لیاقت حسین..... مال کی دوسری کھپ بھی شپنگ کمپنی تک پہنچانے کے بعد واپس آ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں حاصل ہونے والے منافع کے سلسلے میں بہت سی باتیں گردش کر رہی تھیں سیٹھ عثمان کے احسانات اس پر بے حساب تھے، براہ راست بیرونی منڈیوں سے کاروبار کا مشورہ بھی انہوں نے سرفراز خان کو دیا تھا، یہ بھی محبت کا ثبوت تھا۔ ان کے پاس عملے کی کمی بھی نہیں تھی، وہ چاہتے تو خود بھی کئی طریقے اختیار کر کے اس کام کو براہ راست بھی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے نہ صرف سرفراز خان کو نیک مشورہ دیا تھا بلکہ دفتر کی جگہ اور تجربہ کار عملہ بھی فراہم کر دیا تھا۔ سرفراز خان نے منافع میں آدھے کی شرط رکھی تھی جسے سیٹھ عثمان نے وقتی طور پر قبول کر لیا تھا لیکن سرفراز خان کے جانے کے بعد انہوں نے لیاقت حسین پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ صرف اپنے سابقہ

کاروبار کی حد تک منافع لیں گے، باقی سب لیاقت حسین براہ راست اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرنا ہوگا۔
لیاقت حسین نے کبھی سیٹھ عثمان کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی اس لیے وہ خاموش ہو گیا لیکن اس وقت وہ اسی پہلو پر غور کر رہا تھا کہ کوئی ایسی صورت نکالے کہ سیٹھ عثمان کو کل کاروبار کا نصف لینے پر آمادہ کر سکے۔ وہ ان ہی خیالوں میں مستغرق تھا جب اچانک اس کی نظر اپنے ہاتھ کی اس انگوٹھی پر پڑی جو اس کی ماں نے تعویذ کم ہوجانے کے بعد جڑے ہوئے جیسے کچی رنگ کا تھیں اس وقت کسی سرخ رنگ کے انگارے کے مانند دکھ رہا تھا۔ لیاقت حسین کے ذہن میں کسی آنے والے خطرے کا احساس ابھرا پھر غیر اختیاری طور پر اس نے اسٹیرنگ موڑا، لوڈنگ پک اپ اب ایک ویران سڑک پر آنے کے بعد فرانے بھر رہی تھی۔ لیاقت حسین کی نظریں یہ دستور انگوٹھی کے ٹکینے پر مرکوز تھیں جب ماں کی آواز کہیں دور سے اس کے کانوں میں گونجی۔
”ماں کا زندگی..... تیرا جان کا دشمن پھر تجھے نقصان پہنچانے کی خاطر گندلا کر رہا ہے۔“
”وہ کون ہے ماں؟“ لیاقت حسین کے ہونٹ آپ ہی آپ تھکر ہو گئے۔
”وہی پلید۔ جس کا خوب صورت تیرے تعویذ کے جال میں پھنس کر جہنم رسید ہو گیا تھا۔“
”وہ..... وہ اس وقت کہاں ہوگا.....؟“
”سب اوپر والے پر چھوڑ دے ماں کا جان..... جس نے اس کا عورت کو چٹ کر دیا وہی اس کو بھی غرق کرے گا۔“
لیاقت حسین کے پیروں کا دباؤ ایکسپریس لمبر پر بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ کوئی ٹیلی فون اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ انگوٹھی کی طرف سے نظر ہٹا کر اب وہ سنان سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کے ذہن پر ایک دھند سی طاری تھی، وہ کہاں جا رہا تھا؟ کیوں جا رہا تھا؟ اس کا علم اسے نہیں تھا جب ماں کی آواز پھر اس کے کانوں میں گونجی۔
”تو اس کا قریب مت جانا لیاقت..... وہ گندا بد ذات اس قابل بھی نہیں ہے کہ تو اس کو ہاتھ لگائے۔ دور سے انگوٹھی اس کے سامنے کر دینا، وہ سارا جینتر متز بھول جائے گا۔“
”ماں..... وہ کب تک ہمارا پیچھے لگا رہے گا..... کیا بڑے نانا کا طاقت اسے.....“

گچی کہانیوں آپ بیتیوں جنگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

سرگزشت

ماہنامہ

شمارہ اپریل 2013ء

کی جھلکیاں

فرزندِ فرشتہ

برصغیر میں اسی نے ظلم کا بازار گرم رکھا تھا

لاش کا اغوا

امریکی صدر کی لاش کے اغوا کی سنسنی خیز روداد

موت کے سانے

جنگل میں موت کا قصہ شروع ہو چکا تھا

تیرے جانے کے بعد

زندگی کی کٹی میں گلی آپ بیتی جسے آپ بھلا جائیں گے

لکھنؤ

طویل سرگزشت ”سراب“ قلمی دنیا کی قلمی

تاریخ ”قلمی الف لیله“ اور بہت سے سچے قصے

تاریخی واقعات آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

بس ایک بار پڑنے کی دیر ہے آپ خود

سرگزشت کے گردیدہ ہو جائیں گے

آج ہی نزدیکی ایک سوال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

زادہ بدلیا لیکن پر تاب بھوشن جہاں کھڑا تھا اب وہاں دور دور
تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ موقع باکر کل چکا تھا۔

”تو اس پنڈال کی بات میں آگیا لیاقت.....“ ماں
کی آواز ابھری۔ ”وہ پھر بچ کر نکل گیا لیکن اوپر والا کی
شاہد اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی..... اب..... اب تو
واپس چلا جائے۔“

لیاقت حسین مشینی انداز میں گھوم کر دوبارہ پک اپ میں
بیٹھ گیا..... واپس دفتر پہنچا تو سیٹھ عثمان اس کے منتظر تھے۔ وہ
ان کے کمرے میں گیا تو سیٹھ عثمان نے دریافت کیا۔

”تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی لیاقت حسین؟
تمہارے والد کا فون آیا تھا۔ میں نے تمہارے موبائل پر
کال بھی کیا لیکن تم نے وہ بھی اٹھ نہیں کیا؟“

”تجربہ ہے.....“ لیاقت حسین نے خود بھی حیرت
سے جواب دیا۔ ”میں تو ماربل شپنگ کمپنی پہنچا کر سیدھا
واپس آ رہا ہوں۔“

جواب میں سیٹھ عثمان نے اسے غور سے دیکھا، کچھ
دیر خاموش رہے پھر بڑی اہمیت سے بولے۔

”تم بیٹھو..... میں آپ ریئر سے کہتا ہوں کہ تمہارے
والد سے رابطہ قائم کرے۔“

لیاقت حسین خاموشی سے بیٹھ گیا..... اسے حیرت تھی کہ
سیٹھ عثمان نے اس سے دیر سے آنے کی بات کیوں کی تھی جبکہ
اس نے اپنے خیال کے مطابق کہیں دیر نہیں لگائی تھی.....

دوسری جانب سیٹھ عثمان بھی لیاقت حسین کے بیان
کی روشنی میں کچھ گزری ہوئی حیرت انگیز باتوں پر غور کر
رہے تھے۔

دونوں حسب معمول اس وقت بھی ہوٹل کے کمرے
میں تھے۔ دونوں کی نظریں ٹی وی پر متحرک ایک مزاحیہ فلم
پر مرکوز تھیں جب دشتو نے بیزاری کا اظہار کیا۔

”ہم کب تک اس طرح کمروں میں بند بیٹھے ان
مزاحیہ فلموں کو کچھ دیکھ کر بور ہو رہے رہیں گے۔“

”کہو تو کوئی رومانوی فلم لگ دوں؟“ لوچن نے چپے
ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن ایک شرط پر، تم کسی مخصوص منظر کو
دیکھ کر کلونٹ کی بے وفائی کا شکوہ نہیں کرو گے۔“

جواب میں دشتو نے لوچن کو ایسی نظروں سے دیکھا
جیسے کوئی خطرناک چیتا اپنے شکار کو روہنے کی خاطر آخری
جھلانگ لگانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ ایک لمحے وہ لوچن کو
گھورتا رہا پھر ہنسا کرتے ہوئے کہا۔

آج تو میرے ہاتھ سے نہیں بچے گا، ایسی کھاٹ کھڑی
کروں گا کہ تیرے اگلے پچھلے بھی یاد رکھیں گے۔“
”بڑا ناز ہے تجھے اپنی طاقت پر تو مردوں کی طرح غم
ٹھونک کر سامنے آجائے۔ کون کتنے پانی میں ہے آج اس کا
فیصلہ بھی ہو جائے۔“

جواب میں پر تاب بھوشن نے تہمت لگا کر کہا۔
”تیری زبان سے جو شہ کل رہے ہیں وہی تیری
پول بھی کھول رہے ہیں مورکھ آج..... تیری موت ہی تجھے
یہاں تک کھینٹ لائی ہے..... بے ہوا بی۔“

”بھوانی نہیں..... نانی کو یاد کر۔“ لیاقت حسین نے
مرکب کر کہا۔ ”گندی مٹی سے اٹھ کر سامنے آ..... دودھ کا
دودھ اور پانی کا پانی بھی ہو جائے گا۔“

پر تاب بھوشن کی پیشانی پر سلولٹس جال بننے لگیں، وہ
غضب ناک ہو کر کھڑا ہو گیا، شعلہ آتی نظروں سے لیاقت حسین
کو دیکھنے لگا لیکن اس نے منڈل سے باہر قدم نہیں نکالا۔

”تیری بچارن کا کیا انجام ہوا تھا پلید بچاری؟.....
یاد ہے کہ اتنی جلدی بھول گیا۔“ لیاقت حسین نے بے دستور
سپاٹ آواز میں کہا۔ ”اس دن بھی تیری بھوانی اور دیوی
دیوتا بھٹیں بھاگتے رہ گئے تھے..... آج بھی تیرا جادو نہیں
چلے گا کہیں ذات.....“

پر تاب بھوشن دیوی دیوتاؤں کی شان میں استعمال
کیے جانے والے جملے سن کر کھپکھپا۔ غصے میں کاہتا ہوا
منڈل سے باہر آ گیا، اس کی آنکھوں میں آگ کے بھڑکتے
شعلوں کا قص اور تیز ہو گیا..... ہونٹ بھر تیزی سے جنبش
کرنے لگے۔ شاید وہ کسی خطرناک منتر کا جاپ کر رہا تھا
جب لیاقت حسین کے کانوں میں پھر مائی کی آواز ابھری۔

”دیر مت کر لیاقت..... اگلی ہی اس پلید کے
سامنے کرو۔“

لیاقت حسین نے ماں کی بات پر عمل کیا تو پر تاب
بھوشن کے ہونٹوں کی جنبش ختم ہوئی، اس کی نظریں انگوٹھی کے
تکینے پر پڑیں تو اس کی آنکھوں سے خوف بھاگنے لگا۔ ایسا
محسوس ہوا تھا جیسے کسی غیر مرئی قوت نے اسے بے بس کر دیا
تھا۔ خاصی دیر وہ اسی کیفیت سے دوچار رہا پھر اس نے بڑی
مشکل سے اپنی توجہ تکینے کی طرف سے ہٹائیں ہوا بولا۔
”پلٹ کر بھی دیکھ لے مورکھ..... تیری موت تیرے
سر پر کھڑی ہے.....“

لیاقت حسین نے اس تیلے پر تیزی سے پلٹ کر دیکھا،
وہاں اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا، اس نے دوبارہ لگا ہوں گا

”تو یہ کر لیاقت..... تو یہ کر۔“ ماں کے لہجے میں
خوف کا عنصر بھی گل گیا۔ ”مارنے اور چلانے کا اختیار صرف
اوپر والا کو ہے۔ اس کا اشارے کے بغیر تو پھر بھی اپنی جگہ
سے نہیں ہٹ سکتا۔“

”پھر..... تو میرے لیے خدا سے دعا مانگ؟“
”پریشان مت ہو لیاقت..... ماں کی دعا تیرے
ساتھ ہے..... اوپر والا ہمارا پرکار ضرور سنے گا..... کب؟ یہ
اس کی مرضی کا بات ہے میری جان..... اس کا ہر کام میں کوئی
نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتا ہے..... فرعون کو بھی اسی نے ڈھیل
دے رکھا تھا پھر..... اس طرح غرق کیا کہ اس کے پلید جسم کو
مچھلیوں نے بھی نہیں کھایا..... وہ بھی نشانِ عبرت بن کر رہ
گیا۔ وہ غفور الرحیم اس گندے بچاری کو بھی ضرور مارے
گا۔ کب؟ اس کے لیے تجھے وقت کا انتظار کرنا ہوگا.....“

لیاقت حسین کے ذہن میں اس وقت سناٹوں کا راج
تھا۔ وہ جسمانی طور پر حاضر ہونے کے باوجود ذہنی طور پر
غیر حاضر ہی تھا۔ پک اپ کی رفتار بڑھتی گئی پھر..... وہ شہر
سے دور سمندر کے ایک ایسے اجاڑ اور غیر آباد حصے میں پہنچ کر
رک گئی جسے ہندو دشان کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

ہندوؤں کے مردے جہاں جلائے جاتے تھے اس
کے قریب ہی ایک ٹونا چھوٹا مندر بھی تھا۔ پک اپ اسی مندر
کے قریب جا کر رکی، لیاقت حسین اتر کر نیچے آ گیا پھر اس کی
نظروں میں پر تاب بھوشن بھی آ گیا جو اپنے ہاتھ سے بنائے
ہوئے منڈل کے درمیان آلتی پالتی مارے بیٹھا نہ جانے
کس منتر کے جاپ پڑھ رہا تھا۔ لیاقت حسین کی نظریں اسے
گھور رہی تھیں جب ماں کی آواز نے پھر اس کی رہنمائی کی۔

”لیاقت..... میرا بات فورے سن..... اس بد ذات اور
پلید بچاری کو لٹا کر اس کا بد بدانا بند کر دے..... اس کا گندا
عمل اگر پورا ہو گیا تو اچھا نہیں ہوگا..... اس حرام کے ختم نے جو
دائرہ کھینچ رکھا ہے اس کے اندر جانے کا غلط بھی نہیں کرنا۔“

لیاقت حسین نے ماں کی آواز سنی تو اس نے قریب
سے دو چار پتھر اٹھا کر پر تاب بھوشن کی طرف پھینکنے شروع
کر دیے، اسے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی، ایک پتھر
بچاری کے شانوں سے ٹکرایا تو اس نے بدک کر آنکھیں
کھول دیں، دھکتی ہوئی نظروں سے غضب ناک انداز میں
نظریں کھما کر لیاقت حسین کو دیکھا تو اس کے گندے ہونٹوں
پر ایک مکروہ مسکراہٹ ابھرائی۔

”تو..... تو آگیا مٹلے.....“ بچاری کے لہجے میں
گھمٹھ تھا۔ ”میں جانتا تھا کہ دیوی کی شکتی تجھے چلا لے گی۔“

خبردار! خوفناک اسٹرائیڈ

آپ کو وقت سے پہلے بڑھو حاد کو کھوکھلا کر رہے ہیں جو آج آپ کو مردانہ طاقت کا فوری رزلٹ دے رہا ہے۔ وہ خطرناک اسٹرائیڈ پر مشتمل ہے۔ جس کی خاص نشانی سر اور پنڈلیوں میں درد، جسم کا ٹوٹنا، چڑچڑاہٹ ہے اور ارتکاز۔ جبکہ دیرپا نقصانات میں سانس پھولنا، وقت سے پہلے بال سفید، چہرے کی پیلاہٹ، دل کی بے اعتدال دھڑکن بلڈ پریشر وغیرہ ہیں۔

ہمارے ادارے کا تیار کردہ

سپر نیچرل

بحالی جوانی کورس

کھانے اور لگانے کی سو فیصد خالص ترین قدرتی اجزاء پر مشتمل ادویات چند ہفتوں میں آپ کی کھوئی ہوئی جوانی ضرور لوٹا سکتی ہیں۔ 9 ہفتوں پر مشتمل کورس آپ کی قدرتی طاقت قدرتی انداز میں بحال کر کے آپ کی جان تیار کن اسٹرائیڈ پر مشتمل ادویات سے چھڑا دے گا بلکہ اس کے ضمنی اثرات بھی آپ کے جسم سے نکال چھینے گا۔

متعلقات کے سبب کمزوری میں بھی مفید ترین اور ٹوٹلڈ پشٹریس مریش بھی بے خوف و خطر مکمل اعتبار کے ساتھ استعمال کریں

نوٹ: نشینی حرارت لطیف اجزاء کی موت ہے اس لیے بغیر نشینی حرارت اور انسانی ہاتھوں سے حفظان صحت کے اصولوں کے تین مطابق تیار ہونے والے اس سو فیصد نباتاتی اور ہر قسم کے مصنوعی رنگ و خوشبو سے پاک کورس کی تیاری اور آرڈر کی تکمیل میں 1 سے 10 دن لگ سکتے ہیں۔

9 ہفتوں کا مکمل کورس 6,000 روپے..... نصف کورس 3,500 روپے

اس کے علاوہ دیگر سپر نیچرل کورسز اور اسٹرائیڈ سے متعلق شعور و آگہی کے کتابچے ادارے سے طلب کیا جاسکتا ہے

ضلعی برائے ادارہ "انسداد اسٹرائیڈ و رفع نباتات"

ریلیو اسٹیشن روڈ بہاولپور

بلیک لائن: 0300-5421702 (11am to 11pm)

”جانتا ہوں لیکن..... میں کسی کا پانڈ نہیں ہوں۔“
”ہاں..... آں! تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر یہ بھی نہ بھولو کہ بلٹری انٹیلی جنس والوں نے ہمیں کسی کے اشارے پر کسی اہم مقصد کے حصول کی خاطر فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔ وہ ہماری طرف سے بے خبر بھی نہیں ہوں گے۔“
”اس کے باوجود میں ان کی ناک کے نیچے سے گزر کر نکل گیا تھا۔ کام نمٹا کر ان ہی کی نظروں کے سامنے سے واپس بھی آ گیا۔“ دشمن کے لیے جس میں اعتماد جھک رہا تھا۔ ”تخت یا تختہ..... میں نے شروع سے اسی کہاوت پر عمل کیا ہے۔“
”اعتدال مردانگی کی نشانی ہے لیکن ابھی بھی اعتماد انسان کو دھوکا بھی دے جاتا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ دشمن نے پہلو بدل کر وضاحت چاہی۔
”ہوسکتا ہے کہ بلٹری یا پولیس کے کچھ لوگوں نے تمہیں جان بوجھ کر موقع دیا ہو..... اس طرح وہ تمہاری نقل و حرکت کو دیکھتا چاہتے ہوں۔“ لوچن نے پہلو بدل کر بے حد جھجک سے کہا۔ ”زندگی میں میرا واسطہ بھی بڑے بڑے سوراخوں سے پڑ چکا ہے مگر ایس پی اورنگ زیب!..... شطرنج کی بساط پر وہ بڑے ماہرانہ انداز میں مہروں کو استعمال کرتا ہے، کیا تم اس حقیقت سے انکار کر دو گے؟“
”نہیں.....“ دشمن نے صاف گوئی سے جواب دیا۔
”وہ مرد آدمی ہے۔ زبان کا دھنی بھی ہے، پولیس کی نفری میں ایسے جانناڑ آنے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں لیکن جب انسان موت کو تھیلی پر رکھے تو پھر اسے کسی بات کی چٹا بھی نہیں رہتی۔“

”تم جانو.....“ لوچن نے بے پروائی سے شانوں کو جھنجھکی دی۔ ”ہم ایک دوسرے کے پانڈ بھی نہیں ہیں۔ کیا اچھا ہے؟ کیا برا؟ اس کا فیصلہ بھی ہمیں خود کرنا ہے۔“
کچھ دیر دونوں کے درمیان ادھر ادھر کی بات ہوتی رہی پھر دشمن نے سنبھل کر پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے..... کیا وہ زندہ ہوگا؟“
لوچن نے چونک کر دشمن کو دیکھا۔ سرسراہٹے لہجے میں بولا۔ ”اگر زندہ ہو تو مجھے زیادہ خوش ہوگی۔ اس کی موتی گردن پر میرے دو ساتھیوں کی موت کا قرض بھی باقی ہے۔ ہم تینوں ایک ہی جہاز میں آئے تھے، ہماری واقفیت بھی جہاز کے سفر کے دوران ہی اتفاقاً ہو گئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے سے دوستی کا ہاتھ ملا تھا۔ وہ زندہ ہوا تو میں ان دونوں کی دوستی کا قرض بھی چمکتا کر دوں گا۔“
دشمن کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ اس کے موہاں پر

”ہم دونوں کے لیے موجودہ حالات میں یہی بہتر ہے کہ ہم جب تک ایک ساتھ ہیں..... دوستوں کی طرح رہیں۔ ہماری آپس کی کھینچا تانی دوسروں کے لیے فائدہ مند بھی ہو سکتی ہے۔“

”اگر یہ تمہارا خیال ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر ہم دونوں کون ہیں، ہمارا تعلق اور شارکن لوگوں میں ہوتا ہے، تمہیں بھی اس کا خیال رکھنا ہوگا۔ میں زبان پر تالے ڈالنے کا عادی بھی نہیں رہا۔“

”کلونٹ میری دھڑکنی رگ ہے دوست.....“ دشمن نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر عجیب انداز میں کہا۔ ”میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے لہو لہا کر دیا تھا، یہاں تک کہ وہ آخری ہنگی لے کر دم بھی تو ڈٹی۔ میں اس کے شریر کے ان کول اور سندر حصوں پر کرپان چلاتا رہا جن کو بھی میں بڑے پیار سے چوما کرتا تھا۔ وہ مرنے کے بعد بھی میری محبت ہے، اس لیے میں بتی کرتا ہوں کہ تم اس کا ذکر نہ پھینچو کرو۔ میں اندر سے تڑپ اٹھتا ہوں۔ بھرتے ہوئے دشمن کو بار بار کریدا جاتے تو وہ ناسور بن جاتے ہیں۔“
”تم کہتے ہو تو میں مان لیتا ہوں۔“ لوچن نے ٹی وی آف کر کے دشمن کی طرف دیکھا پھر موضوع بدل کر پوچھا۔
”کس کی کال تھی؟“

”کسی کا وہ دار اور پالتو کتا تھا۔“
”کیا خبر دے رہا تھا.....؟“ لوچن نے بھی سرسراہٹے لہجے میں دریافت کیا۔
”وہ..... وہ..... کہہ رہا تھا کہ کل ڈاگ ابھی مرانیں، زندہ ہے۔“ دشمن نے شجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں نے بھی جکی گولیاں نہیں چھیلیں۔ میں نے براہ راست بات کرنے کی شرط لگا دی ہے۔“

”اگر بات ہوگئی تو؟“ لوچن نے اسے مسکراتی مگر معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ”کیا تم دوبارہ اس کے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو جاؤ گے؟“
”ضروری نہیں ہے لیکن.....“ دشمن کسمسا کر بولا۔
”تم جانتے ہو کہ ہمارا پیشہ نیلام کی آخری بولی پر ختم ہوتا ہے۔ جدھر سے زیادہ مال اور بکوت کی آفر ہوگی، میں اسی کو قبول کروں گا۔ تمہارا کیا اصول ہے؟“

”میں جو سوداگر چکا ہوں اس کے ختم ہونے میں ابھی تقریباً دو مہینے باقی ہیں۔ تم جانتے ہو کہ میرا تعلق کس تنظیم سے ہے۔ ہمارے بڑے ننداری کی سزا صرف موت ہی تجویز کرتے ہیں۔“

”میں تم سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ کلونٹ کا ذکر کسی بھی انداز میں نہ پھینچو کرو..... آئندہ خیال رکھنا۔“
”جس کو تم نے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا، اب اس کے ذکر سے چڑتے کیوں ہو.....؟“ لوچن نے بھی جواب میں شجیدگی اختیار کر لی۔

”وہ میرا ذاتی معاملہ ہے لیکن تم.....“
”میرا نام لوچن ہے دشمن..... میں حکم سننے کا عادی نہیں ہوں۔“ لوچن نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ”مرنا اور مارنا میرا پیشہ ہے۔ یہ تم بھی جانتے ہو۔“

”تم مجھے پہنچ کر رہے ہو؟“ دشمن کے تہرہ بھی بدلنے لگے۔
”جو چاہے سمجھ لو.....“ لوچن نے شانے اچکا کر بولا۔
”میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔“

دشمن کی نگاہوں کی سرخی پھیلنے لگی تھی، جب اس کے موبائل پر سگنل موصول ہوا، اس نے ہونٹ چباتے ہوئے فون آن کر لیا پھر دوسری جانب سے جو کوڈ استعمال کیا گیا اسے سن کر اس نے لوچن کو دیکھا پھر اٹھ کر بالکونی میں چلا گیا۔ لوچن نے بھی دشمن کے اٹھتے ہی ٹی وی کی آواز کم کر دی۔ اس کی نظریں بہ دستور ٹی وی پر تھیں لیکن پوری توجہ بالکونی کی سمت تھی، دشمن کے چہرے پر ابھرنے والی کسی نا معلوم خوشی نے اسے پوری طرح چوکنا کر دیا تھا۔

”کس لیے فون کیا ہے؟“ دشمن کی مدھم آواز لوچن کے کانوں میں سنائی دی پھر ایک لمحے بعد اس نے بڑے جذباتی انداز میں کہا تھا۔ ”میں براہ راست اس سے بات کرنا پسند کروں گا..... ہاں تم اسے میری ضد ہی سمجھ لو..... میں جانتا ہوں لیکن پہلے کی بات اور بھی..... نہیں، بات پیٹھے کی نہیں، وقت کی نزاکت کی ہے..... ہو بھی سکتا ہے..... ٹھیک ہے، میں اس کا انتظار کروں گا۔“

دشمن دوبارہ کمرے میں آیا تو لوچن نے آواز کا والیوم بھی بڑھا دیا۔ بظاہر وہ ٹی وی پر متحرک تصویروں میں دلچسپی لیتا نظر آ رہا تھا لیکن اس کے ذہن میں دشمن کی جانب سے کہے جانے والے جملے گونج رہے تھے، وہ ان جملوں کو اپنے تجربے کی روشنی میں ڈی کوڈ کر رہا تھا۔

کلونٹ کے نام پر وہ جھلا گیا تھا، لوچن نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو اس کے تصور بدلنے لگے پھر..... اس کا دل کے آتے ہی اب وہ خامے خوش گوار سوڈ میں نظر آ رہا تھا..... یقیناً اسے دوسری جانب سے کوئی ایسی خبر ملی تھی جسے سن کر اس نے خلاف توقع کچلی بدل لی تھی۔ وہ خبر کیا تھی؟ لوچن اس بات پر غور کر رہا تھا جب دشمن نے اسے مخاطب کیا۔

پھر مکمل موصول ہوا۔ اس بار اس نے بالکونی کی سمت جانے کے بجائے لوچن کے برابر بیٹھے ہی بیٹھے موبائل آن کر لیا۔

”ہاں..... میں دشمنی بول رہا ہوں..... اس نے جو کہا وہ وعدہ نہیں تھا، براہ راست بات کرنے کی بات میں نے کبھی تھی..... ہاں، وہ بھی جانتا ہے کہ دشمن کس چیز یا کام سے..... یہی سمجھ لو..... انجام کی بات دوبارہ بھی مت کرنا، دشمن موت سے بھی نہیں ڈرا..... اس ہی سمجھو۔“

”کس کا فون تھا؟“ لوچن نے بات ختم ہونے کے بعد دشمن کو کرنا۔ ”کیا ایسی کی طرف سے کسی نے کال کیا تھا جو ہم سب کے لیے معما بن کر رہ گیا ہے؟“

”ہاں.....“ دشمن نے مختصر جواب دیا۔

”وہ کس بات کا اصرار کر رہے ہیں؟“

”ایک دو بندوں کو پھانسی کاٹنے کی بات کر رہے ہیں۔“

”کوئی آفر بھی ضروری ہوگی؟“

”ہاں..... جتنا مطالبہ میں کروں گا وہ اس سے انکار نہیں کریں گے۔“

”پھر..... تمہیں خطرہ کس بات کا ہے؟“

”بات خطرے کی نہیں میرے دوست، اصول کی ہے۔“ دشمن نے لمبی سانس لے کر صاف گوئی سے کہا۔ ”میں بلاوجہ کسی کے خون سے ہولی کھیلنے کو بھی پاپ ہی سمجھتا ہوں۔“

”اور اگر سربراہ سے تمہاری ڈائریکٹ بات ہو جائے تو.....؟“

”تب..... سوچنا پڑے گا؟“

”کیا تم اس سے بھی انکار کر دو گے؟“

”شاید نہیں.....“ دشمن نے کسمسا کر کہا۔ ”تم بھی جانتے ہو کہ انٹر پول کے شکاری کتنے ہر طرف میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں، بارڈر کراس کرنے کے بعد اس دیس میں اسی بگ باس نے میرا ہاتھ تھاما تھا۔ دشمن اس کی بات نہیں ٹال سکتا۔“

”تمہاری ایک بات میرے حلق کے نیچے نہیں اتر رہی۔“ لوچن نے دشمن کو بہت غور سے دیکھا۔ ”جب تم سامنے موجود ہو تو کیا انٹر پول کے شکاری کتنے تمہیں نہیں پہچان لیں گے؟“

”پہچان لیا ہوتا تو اب تک الیکٹرک چیز پر بٹھانے میں دیر بھی نہ کرتے۔“ دشمن نے متنی غیر اعزاز میں جواب دیا۔

”کیا بتانا چاہتے ہو.....؟“

”جو دشمن زندہ تھا اس کے اصل چہرے کو آخری بار اس کی کلونٹ ہی نے دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی کو نظر

نہیں آیا۔“

لوچن اس جواب کو سن کر بری طرح چونکا۔ اس کی تجربے کا نظریں دشمن کے چہرے پر منڈلا لگیں۔ اگر وہ اس وقت بھی میک اپ میں تھا تو کم از کم لوچن کا ذہن اسے قبول نہیں کر رہا تھا۔

دھدھ

اسے معلوم تھا کہ اس کی ممبرشپ کی معیاد ختم ہوئے دو ماہ سے اوپر ہو چکے تھے۔ بہر حال اسے کلب کی ریسٹنٹ ماریا تک جانے کی اجازت ملتی تھی۔ ماریا کسی سے فون پر بات کرنے میں مصروف تھی لیکن اس نے آنے والے کو ایسی ہی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

”فرمائیے۔“ اس نے فون کا ریسپورڈ کرنے کے بعد آنے والے کو مہذب انداز میں مخاطب کیا۔

”میری ممبرشپ دو ماہ پیشتر ختم ہو چکی ہے۔ میں اسے ری نو کرانے آیا ہوں۔“ آنے والے نے تنجید کی سے کہا پھر اپنا کارڈ نکال کر ماریا کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ماریا نے کارڈ پر نظر ڈالی تو ایک لمحے کو چنگی پھر مسکرا کر بولی۔

”آج کل کس کے لیے کام کر رہے ہو؟ بہت عرصے بعد نظر آئے ہو۔“

”مجھے اس وقت ماسٹر مجید سے ملنا ہے۔“ آنے والے نے بہ دستور تنجید کی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اگر وہ بدلائیں ہے تو اس وقت نہیں ہوگا۔“

”ممبرشپ کے بارے میں کیا چاہتے ہو؟“

”اسے بھی ری نو کر دو.....“ اس نے جیب سے ایک بڑا نوٹ نکال کر ماریا کے سامنے رکھ دیا۔ ”ہوسکتا ہے دوبارہ پھر بھی ادھر آنے کی ضرورت پڑے۔“

جتنی دیر ماریا ممبرشپ ری نو کرنے میں مصروف رہی، آنے والے کی نظریں وہاں موجود میزوں کے اطراف منڈلاتی رہیں پھر وہ ماریا کی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ماریا نے وہی پہلا سوال اس سے دوبارہ کیا تھا۔

”فی الحال کسی خاص گروپ کے لیے کام نہیں کر رہا۔“ اس نے کارڈ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

”مجھ سے چھپا رہے ہو؟“ ماریا نے بے تکلفی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اس وقت جو حلیہ بنا رکھا ہے، اسے کیا سمجھوں؟“

”میں نے ماسٹر مجید کے بارے میں دریافت کیا تھا.....؟“ ایک ممبر قریب آیا تو اس نے ماریا سے پھر ماسٹر

کشکول

مجید کے بارے میں دریافت کیا۔

”میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت بلیئرڈ روم میں ہوگا۔“

اس نے ماریا کو ایک نظر بھر کر دیکھا پھر قدم اٹھاتا بلیئرڈ روم کی طرف چلا گیا، ماریا کا اندازہ غلط نہیں تھا، ماسٹر مجید اس وقت وہیں لیٹا تھا، وہ تنہا نہیں تھا، اس کے ساتھ ایک خوب صورت ممبر بیٹھی تھی۔

نو وارد نے لڑکی کی موجودگی میں اسے مخاطب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ قریب ہی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ماسٹر مجید کے ساتھ بیٹھی لڑکی کچھ دیر بعد اٹھ کر قدم اٹھاتا اس کے قریب چلا گیا۔

”مجھے تم سے ایک ضروری بات معلوم کرنی ہے ماسٹر۔“ نو وارد نے غصے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”بگ باس کے گھر کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت کس نے کی ہے؟“

”تم.....“ ماسٹر مجید اس کی آواز سن کر بری طرح چونکا۔ ایک لمحے تک وہ اسے سرتاپا دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔

”تمہیں اچانک بگ باس کی عزت کا خیال کیسے آ گیا جبکہ بگ باس تو تمہیں دودھ کی پھی کی طرح نکال پھینکا تھا۔“

”خود وہ بھی غرق ہو گیا۔“ جواب مسکرا کر دیا گیا۔

”ہمارے کاروبار میں اونچ نیچ اس طرح ہوتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک بات تمہیں ضرور یاد ہوگی۔ تم بھی میرے حکم پر دم ہلانے کے عادی تھے۔“

”غائب اس پوزیشن میں نہیں ہو اس لیے.....“

ماسٹر مجید اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا، نو وارد کی گرفت اس کے ہائیں بازو پر کسی آہنی شکنے کی طرح جم چکی تھی۔ دوستانہ لہجے میں بولا۔

”مجھے صرف اتنا بتا دو کہ وہ کون تھا اور اس وقت کہاں لے گا؟ بلاوجہ مجھ سے الجھو کہ تو اس کلب میں دوبارہ منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑ دوں گا۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں جو کہتا ہوں اسے کر گزرنے سے دریغ نہیں کرتا۔“

”مم..... میں..... یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن.....“

ماسٹر مجید نے نو وارد کو..... جو افضل خان کے سوا کوئی اور نہیں تھا، دیکھتے ہوئے دم آواز میں جواب دیا۔ ”میں اس گھر کی عزت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن..... میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں جبر کو کچھ نہ کچھ علم ضرور ہوگا۔“

”جبر.....“ افضل خان نے ماسٹر مجید کے چہرے پر نظریں جم کر کہا۔

”میری اطلاع کے مطابق اسے اور اسلم ڈنکا کو اس وقت پولیس نے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا تھا جب وہ شہنم کو بل بانٹ کر ہضم کرنے کی سازش کر رہے تھے۔“

”تمہاری اطلاع غلط نہیں ہے۔ یہ بھی جانتے ہو گے کہ جبر و عورتوں کے معاملے میں کتنا بدینت آدمی ہے۔ جس ہانڈی میں کھاتا ہے اس میں چھید کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ پولیس نے اسے اور اسلم ڈنکا کو گرفتار کیا تھا، دونوں زخمی تھے اس لیے انہیں اسپتال میں رکھا گیا جہاں اسلم زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا تھا، اسی کی تدفین کے سلسلے میں پولیس کی توجہ ہوتی تو جبر و چھوٹتر ہو گیا۔ ہوسکتا ہے بگ باس کے غرق ہونے کی خبر سن کر اس نے کسی اور کے ساتھ مل کر اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہو..... یہ کام اس نے اکیلے کرنے کی حماقت نہیں کی ہوگی لیکن اب کسی رگڑے سے بچنے کی خاطر کہیں چوہے کے بل میں چھپا بیٹھا ہوگا۔“

”وہ چوہے کا بل کہاں ہوسکتا ہے؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر روپوش ہونے کے لیے بنگالی پاڑا سب سے محفوظ سمجھا جاتا ہے، وہاں کپے کپے مکالوں اور بھونپڑیوں کی تنگ گلیوں اور بھول بھلیوں میں پولیس بھی پھرا جاتی ہے لیکن تم اس لباس میں.....“

”اس کی فکر مت کرو۔ وہاں کے کچھ پیشہ ور کاروباری مجھے جانتے ہیں۔“ افضل خان نے پہلی بار مسکرا کر جواب دیا پھر وہ ریڈو کلب میں زیادہ دیر نہیں رکھا۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے اپنی گاڑی پکی آبادی کے ایک مکان کے قریب سے گزرنے والی سڑک پر پارک کی پھر وہاں سے وہ پیدل ہی دو چار سڑک کاٹ کر بنگالی پاڑے کی تنگ گلیوں میں داخل ہو گیا جہاں تنگ دھڑنگ بچے اچھل کود کرنے میں مصروف تھے، وہ قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا جب دو آدمی ایک موٹر سے نکل کر اچانک اس کے سامنے آ گئے۔

”کہاں جانا ہے صاحب؟“ ایک نے سرسراتے لہجے میں افضل خان کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے سوال کیا۔ دوسرا دو قدم پیچھے کھڑا افضل خان کو نگاہوں نگاہوں میں تول رہا تھا۔

”مجھے جبر کی تلاش ہے۔“

”ہم کسی جبر و برو کو نہیں جانتے۔“ دوسرے نے تیور بدل کر خشک لہجے میں جواب دیا۔ ”تم غلط جگہ آ گئے ہو صاحب۔“

دونوں جانے کے لیے پلٹے تھے لیکن پھر افضل خان نے اپنی آواز میں انہیں مخاطب کیا تو دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”معاف کرنا صاحب..... ہم نے آپ کو اس حلیے میں پہچانا نہیں تھا۔“ ایک نے معذرت کی۔

”جبرو سے کیا کام پڑ گیا آپ کو؟“ دوسرا بولا۔ ”دوروز پہلے پولیس کے کھوجی بھی اس کی تلاش میں ادھر آئے تھے۔“ وہ کہاں مل سکے گا؟“ افضل خان نے ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا تو دونوں ہی اس کو سوالیہ نظروں سے گھورنے لگے۔

”آپ کو جبرو سے ایسا کیا کام پڑ گیا جو ہم نہیں کر سکتے؟“ ایک نے مدغم لہجے میں کہا۔ ”آج کل بنگال سے ایک نئی کھپ آئی ہوئی ہے۔“

”مگر کس وقت فرصت سے آؤں گا.....“ افضل خان جانے کے لیے مڑا تو وہ دونوں پھر سامنے آ گئے۔

”جبرو کی تلاش آپ کو کس سلسلے میں ہے؟“ پستہ قد والے نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ”میں آپ بھی پولیس کی طرح اس پر کسی کے انوا اور قتل کا شبہ تو نہیں کر رہے؟“ افضل خان اس کے جملے کی ساخت پر چونکا۔

”تم نے یہ بات کیوں پوچھی.....؟“ اس نے پستہ قد والے کو حیرت سے دیکھا۔ ”تمہارا اشارہ کس واردات کی طرف ہے؟“

”ہمارا اشارہ اس بڑے مگر چمکی مادہ کی طرف ہے جو اٹھائی گئی۔ اس کی ماں کو وارداتیوں نے اوپر کا کٹکٹ بھی کٹا دیا تھا۔“

”تم کیا جانتے ہو اس سلسلے میں؟“ ایک بات یقین سے کہہ سکتے ہیں کم از کم جبرو اتنی اونچی اڑاؤں نہیں اڑ سکتا۔“

”پھر.....؟“

”اپنے دو ایک یار ادھر بھی مچھلیوں کا وہندا کرتے ہیں جدھر مگر چمک اور اس کا سا بھی ہوائی جرنے (نیلی کا پٹر) سے کودے تھے، فوج اور پولیس کے آدمی بھی دوروز تک سمندر کی تینک ان دونوں کو گھومتے رہے لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔“

”تمہارے آدمیوں کا کیا کہنا ہے؟“

”پولیس اور فوج والوں کی نظریں بچا کر وہ بھی گہرائی تک گئے تھے۔“ جواب سنجیدگی سے دیا گیا۔ ”ان کو پولیس سے انعام ملنے کے لالچ نے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا لیکن وہ بھی گوشت کی ایک بوٹی بھی نہیں تلاش کر سکے۔ ان کا یہی خیال ہے کہ جن دونوں نے چھلانگ لگائی تھی، وہ پانی کے اندر ہی اندر نہیں اڑن چھو ہو گئے ہوں گے..... مچھلیوں کا شکار ہوتے تو ہمیں نہ کہیں ایک آدھ ہڈی بوٹی بھی ضرور ملتی۔“

”ہمارا نام بیچ میں نہیں آتا چاہیے صاحب۔“ پستہ قد

والے نے پراسرار انداز میں کہا۔ ”کچھ دنوں پہلے جبرو کو کہیں سے لمبی رقم ملی تھی، اس روز اس نے نفی بھی زیادہ کیا تھا۔ نمبروں کی شراب کی چمچاتی بوتل خرید کر لایا تھا۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے ایک ہی بات کہی تھی کہ اس کا مرا ہوا حرا ہی باپ دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ اس کے ایک روز بعد پولیس نے اس کی تلاش میں چھاپا بھی مارا لیکن شاید اسے چھاپے کی اطلاع بھی پہلے سے مل گئی تھی جو بیچ کر صاف نکل گیا۔“

”اب وہ کہاں مل سکے گا۔“ افضل خان نے پوچھا۔ ”تمہیں اس کے ایک دو ٹھکانے تو ضرور معلوم ہوں گے؟“

”آپ فکر نہ کریں..... اپنا موبائل نمبر دے جائیں، ہم اسے کھوج کر آپ کو اس کی خبری کر دیں گے۔“

جواب میں افضل خان نے ایک کاغذ پر اپنا موبائل نمبر لکھ کر اسے دیا۔ ساتھ ہی ایک ایک بڑا نوٹ بھی دونوں کی مٹھیوں میں دبا دیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ سیدھا اپنے قلیق پر ہی آیا جہاں شبنم بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔

”کیا رہا.....؟ کچھ سراغ ملا؟“

”فی الحال یقین سے کچھ نہیں کیا جاسکتا مگر جو دو چار کلیوٹے ہیں وہ معتبر نہ ہونے کے باوجود یہی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ باس شاید غریب نہیں ہوں۔“

افضل خان نے تھکے تھکے انداز میں رک کر پوری روداد سنا دی تو شبنم نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

”کیا موجودہ حالات میں پولیس کے لیے ہمارا کام کرنا مناسب ہوگا؟“

”اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔“ اس نے شبنم کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”اور تک زیب اور سراج صاحب کے بارے میں بھی ایک بات میں اپنے تجویزوں کی روشنی میں بڑے یقین سے کہہ سکتا ہوں، وہ ہمیں ڈبل کر اس کرنے کی کوشش بھی نہ کریں گے۔“

”اور اگر وہ زندہ ہوا تو.....؟“

”اس نے ہم دونوں کو اپنا کام نکل جانے کے بعد نظروں سے گرا دیا تھا۔“ افضل خان نے بڑے زہریلے انداز میں مل کھا کر کہا۔ ”اگر وہ زندہ ہے تو ہمیں بھی اسے اپنی حیثیت کا احساس ضرور دلانا ہوگا۔ اس کے علاوہ فرار کا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔“

شبنم نے کوئی جواب نہیں دیا، بڑی گرم جوشی سے افضل خان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

دھم دھم

کشکول

لباس کی تراش خراش اور صورت شکل کے اعتبار سے وہ دونوں ہی مہذب نظر آ رہے تھے، جس گاڑی میں آئے تھے وہ بھی نئے ماڈل کی کرولا تھی۔ دونوں نے گاڑی سے اترنے میں بھی عجلت کا مظاہرہ کیا تھا پھر انہوں نے فرنیچر ہاؤس کے باہر نکلنے والے نیچر کے کوٹھانے میں ”شاہ جی پلیر.....“ میں فوری طور پر ایک بیڈروم سیٹ دکھا کر اسے دوسرا شخص اس ملازم کے قریب جاکر رکا جو دکان کا ایک دروازہ بند کرنے لگا تھا۔

”ادھر کچھ دنوں سے پولیس نے وقت کی باندی میں کچھ زیادہ ایمانداری دکھائی شروع کر دی ہے۔“ نیچر نے کہا۔ ”آپ صبح تشریف لے آئیں۔“

”پاس پڑوں کی کچھ دکانیں تو ابھی تک جگمگا رہی ہیں۔“ آنے والے نے سکرا کر سوال کیا۔ ”کیا ان پر پولیس کا زور نہیں چلتا؟“

”ان کا لین دین کھلا ہوا ہے جناب لیکن ہم بھتہ نہیں دیتے اس لیے وقت کی باندی بھی لازم ہے۔ آپ چاہیں تو کسی اور دکان سے اپنا مطلوبہ فرنیچر خرید لیں۔“

”میں دراصل کشمیری کام کا سیٹ دیکھنا ہے۔“ آنے والے نے قدرے عاجزی سے کہا۔ ”ایسا کرتے ہیں کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنا مطلوبہ فرنیچر دکان کے دروازے بند کر کے اندر ہی دیکھ لیتے ہیں، صبح ہماری وین آکر اسے اٹھا لے گی۔“

”قتی جلدی کیا ہے؟“ نیچر نے پوچھا۔ ”چٹ مٹتی پٹ بیاہ کا معاملہ درپیش آ گیا ہے محترم ورنہ ہم آپ کو زحمت بھی نہ دیتے۔“

”ٹھیک ہے.....“ نیچر اس کا جواب سن کر راضی ہو گیا۔ تینوں دکان کے اندر آ گئے، نیچر کے کہنے پر ملازم نے دروازے اندر سے بھڑو دیے پھر وہ بھی آنے والوں کو کاروباری انداز میں بیڈروم سیٹ دکھانے لگا۔

”آپ کیا دکان کے مالک ہیں؟“ فرنیچر دیکھنے والوں نے سوال کیا۔ ”جی نہیں..... مالک شام پانچ بجے چلے جاتے ہیں۔ میں نیچر ہوں۔“

”اوہ.....“ دوسرے نے کہا پھر مسکرا کر بولا۔ ”قیمت میں کمی پیش کی اختیار تو آپ کو بھی ہوگا؟“

”سوری جناب۔“ نیچر نے نمایاں طور پر نظر آنے والی اس خنکی کی سمت اشارہ کیا جو دکان کے درمیان میں

اسٹینڈ پر نظر آ رہی تھی۔ ”ہمارے ہاں ایک ہی دام ہوتے ہیں۔ گلسٹ پرائس، نو بار کیننگ۔“

”جہاں تک بیٹ صاحب ہوتے تو شاید وہ بھی ہمیں اتنا کھرا جواب نہ دیتے۔“ آنے والے ایک شخص نے تھلا کر کہا۔ ”آپ نیچر ہو کر سرخ جھنڈی دکھا رہے ہیں۔“

”آپ اگر مالک کے واقف کار ہیں تو فون پر ان سے بات کر لیں۔“ نیچر نے انکاری سے کام لیا۔ ”کی بیشی کا اختیار کم از کم مجھے نہیں ہے۔“

”لیکن ہم با اختیار لوگ ہیں میری جان۔“ ایک نے اچانک پستول نکال لیا، اگر چاہیں تو اپنی مرضی کے فرنیچر کے ساتھ تمہیں بھی اغوا کر مفت لے جاسکتے ہیں۔“

”م..... میں.....“ آپ لوگوں سے کوئی غلط بات بھی نہیں کی جو آپ گری دکھا رہے ہیں۔“ نیچر نے ہمت کر کے کہا۔

”زبان بند ہی رکھو میری جان۔“ پستول والے کا لہجہ اچانک سفاک ہو گیا۔ ”اپنے ملازم کو بھی سمجھا دو کہ وہ تمہارے ساتھ ایک طرف پالتو کتے کی طرح دم دبا کر کھڑا ہو جائے۔ ہمارے جانے سے پہلے تمہیں ہمارے اس وقت آنے کا اصل مقصد بھی معلوم ہو جائے گا۔“

نیچر کے جواب دینے سے پہلے ہی ملازم چکر اٹا ہوا اس کے قریب ہی فرش پر گر گیا تھا، دوسرے آدمی نے اس کو اچانک ہی ایسا پٹا پٹا تھ مارا تھا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ نیچر کے چہرے کے تاثرات یکلخت بدل گئے پھر بھی اس نے ہمت کر کے کہا۔ ”آپ..... یہ اچھا نہیں کر رہے..... جہاں تک بیٹ صاحب بھی اینٹ کا جواب.....“

پستول والے کا ہاتھ بھی برق رفتاری سے گھوم گیا، ضرب اتنی شدید تھی کہ نیچر بھی لڑکھڑا گیا۔

”ہم جانتے ہیں کہ تمہارے جہاں تک بیٹ کی اوقات کیا ہے۔“ دوسرے نے عقارت سے نیچر کو گھورا۔ ”دو نمبر کے اٹھائی گیرے جگا کا نام سن کر لوگ ضرور خوفزدہ ہوتے ہوں گے لیکن ہم جس کے آدمی ہیں وہ جگا کا بھی باپ ہے۔“

”وقت ضائع مت کرو.....“ پستول والے نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”بندیدہ فرنیچر کا مول تول جلدی کر لو۔“

اس کے بعد نیچر کی آنکھیں بھی پٹی کی پٹی رہ گئیں۔ دوسرے شخص نے بڑے سے تپے تلے انداز میں قیمتی فرنیچر کی توڑ پھوڑ شروع کر دی تھی، اس بات کا خیال بھی رکھا تھا کہ آواز برابر کی دکانوں تک نہ پہنچ سکے، نیچر اور ملازم دونوں سبے کھڑے تھے۔ جب فرنیچر کی مرمت کرنے والے نے

سر سراتے ہوئے لہجے میں اپنے ساتھی سے کہا۔

”اتنا لبا کھٹ راگ پالنے کے بجائے اگر کہو تو میں انہیں آگ دکھا دوں۔ جب تک دھواں پھیلے گا ہم دونوں نکل چلیں گے، صبح چکا کو راگھ کے ڈھیر کے ساتھ اپنے آدمیوں کی روست شدہ لاشیں ملیں گی تو اسے باس کی طاقت کا اندازہ بھی ہو جائے گا۔ پھر وہ بھی دم ہلانے کی غلطی نہیں کرے گا۔“

”نہیں.....“ پتول والے نے اپنے ساتھی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”باس نے جتنا حکم دیا ہے ہمیں صرف اسی حد تک کارروائی کرنی ہے۔ جگا کے لیے یہ پہلا سبق اگر کافی نہ ہو تو پھر جلاب دینا بھی ہمیں آتا ہے۔“

”ہم نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جناب۔“ ملازم گھٹکیا نے لگا۔ ”ہم دونوں پر رحم کریں۔“

”فیجر.....“ پتول والے نے فیجر کو خوفناک نظروں سے دیکھا، پتول تان کر سوال کیا۔ ”کیا تمہیں ہمارا حلیہ یاد رہے گا؟“

”کچھ نہ کچھ تو جھوٹ بولنا بھی پڑے گا۔“ فیجر نے بے بسی سے مردہ آواز میں کہا۔ ”مالک نے معاف کر دیا تو پولیس کے کارندے.... بھی ہمارا بخیا ادھیڑنے سے گریز نہیں کریں گے۔“

”پھر..... تم کیا پسند کرو گے؟“

”آپ ہم دونوں کے ہاتھ پیر باندھ کر ڈال دیں۔ اسی میں ہماری بچت ہے۔“

”کہو تو تم دونوں کی دو چار ہڈیاں بھی توڑ دیں۔ اسپتال میں بھی کچھ دنوں آرام کر لیتا۔“ پتول والے نے طنز کیا۔ ”تمہارے جہاں تکیر صاحب بھی کیا یاد کریں گے کہ ہم نے تمہیں زندہ چھوڑ کر ان پر کیا احسان کیا ہے۔“

فیجر کے علاوہ ملازم بھی خاموش رہا۔ جتنی دیر پتول والا ان پر رعب کاغٹھا رہا اتنی دیر میں دوسرے آدمی نے بیشتر قیمتی فرنیچر کو خاصا ناکارہ بنا ڈالا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے ساتھی کے قریب آکر بولا۔

”اب نکل چلو۔ جگا کے لیے فی الحال یہی سبق کافی ہوگا۔“

”ان دونوں کا کیا کرنا ہے؟“ پتول والے نے غرا کر کہا۔ ”ہمارے جانے کے بعد یہ نطفہ نہ تحقیق بھی شور مچانے سے باز نہیں آئیں گے۔“

”نن..... نہیں.....“ ملازم نے سہم کر ہاتھ جوڑ دیے۔

”ہم پر رحم کریں۔“

ریوالور والا کچھ دیر ان دونوں کو سفاک نظروں سے گھورتا رہا پھر اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنے ساتھی کی طرف بڑھا دیا۔ رومال سے کلور فورام کی تیز خوشبو پھوٹ رہی تھی، دوسرے ساتھی نے باری باری فیجر اور ملازم کی ناک پر رومال رکھ کر دبا دیا تو دونوں بے ہوش ہو گئے۔ اس کے بعد..... یہ ظاہر مہذب نظر آنے والوں نے بھی وہاں رکنے کی غلطی نہیں کی تھی۔

ماں کی موت کا غم لاحق ہونے کے باوجود وہ شیخ حامد کے اشاروں پر چلنے پر مجبور تھی، ملازمت کے دوران اس نے بہت قریب سے اس کی قوت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ خوب صورت لڑکیوں کا رسیا تھا لیکن اس نے بھی کنول کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر چاہتا تو اسے بھی روئنا اور مسل کر ملازمت سے برطرف کر دیتا۔ مگر باراس نے کنول کے خوب صورت خدا خال کو سراہا تھا، اس کے جسم کے نشیب و فراز کو بھی ٹھوٹا تھا لیکن ایک حد سے تجاوز کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ یہی ایک بات تھی جس وجہ سے اس نے شیخ حامد کے رشتے کو قبول کرنے میں دوڑ اندیشی کا ثبوت دیا تھا۔ انکار کی صورت میں وہ زبردستی بھی گھر سے اٹھو آ کر اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی قوت رکھتا تھا۔

اس کی ماں نے بھی اس رشتے کو قبول کرنے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا تھا۔ شادی کے بعد شیخ حامد نے اسے جو عزت اور کوٹھی بٹکے سے نوازا تھا وہ بھی اسے یاد تھا لیکن..... ماں کی دردناک موت کے بعد اس کے وجود کے اندر شیخ حامد کے خلاف نفرت اور انتقام کا جذبہ بڑی شدت سے سرا ہمارا ہوا تھا مگر..... وہ اس کے اشاروں پر چلنے پر بھی مجبور تھی۔ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھی جب وہ اس سے اپنی ماں کا انتقام لے سکے لیکن شیخ حامد پوری طرح محتاط رہنے کا عادی تھا۔

ان وقت بھی اپنے کمرے میں بیٹھی وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ دوسروں کی طرح وہ بھی اخباروں میں شائع ہونے والی خبریں پڑھ چکی تھی، سب ہی کی ایک رائے تھی کہ وہ بھلی کا پٹھر سے گرنے کے بعد سمندر کی نہ میں ڈوب چکا تھا۔ اس نے بھی اس پر صبر کر لیا تھا لیکن موجودہ حالات میں بھی ماں کی دردناک موت اسے سکون نہیں لینے دے رہی تھی۔

شیخ حامد نے اس کی ماں کی موت کا جو جواز پیش کیا تھا ممکن ہے وہ اس کے خیال سے درست ہو لیکن کنول کو ماں کی

کشکول

موت کا غم اندر ہی اندر ڈس رہا تھا۔ شیخ حامد نے اگر اسے اپنی اصلی آواز میں مخاطب نہ کیا ہوتا تو شاید وہ شناخت بھی نہ کر سکتی، اسے علم تھا کہ وہ میک اپ کے فن میں ماہر تھا۔ نہ ہوتا تو شاید پولیس اب تک اسے اس کے انجام تک پہنچا چکی ہوتی، اب بھی وہ سانسے آنے کے باوجود قانون کے گتھاپوں کی نظروں سے بہت دور تھا۔

دروازے پر قدموں کی آواز ابھری تو کنول نے چونک کر ادھر دیکھا، اس وقت شیخ حامد اس کے سامنے سفید ڈائمی میں موجود تھا، وہ دل پر برجر کے بستر سے نیچے آگئی۔ جاتی تھی کہ آنے والا اس مقصد سے آیا ہے لیکن ماں کی موت کے غم کی وجہ سے اس نے پیش قدمی نہیں کی۔ خاموش کھڑی اس چہرے کو کتنی رہی جس کی مکروہ اصلیت پر تقدس کا طبع بڑی مہارت سے چڑھا دیا گیا تھا۔ ”میں جانتا ہوں ڈارلنگ کہ وقت اور حالات نے تم کو میرا پہلو گرم کرنے پر مجبور کر دیا ہے ورنہ تمہارے اندر ماں کا انتقام لینے کی خواہش ضرور چل رہی ہوگی۔“

کنول نے کوئی جواب نہیں دیا..... اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

”گھبراؤ مت۔“ وہ کنول کے قریب آکر بولا۔ ”میرے تجربے نے مجھے تمہارے بارے میں دھوکا نہیں دیا تھا، تمہارے اندر مرد کے جذبات کو تسکین پہنچانے کی وہ خوبی موجود ہے جو کسی کو بھی دیوانہ کر سکتی ہے لیکن اب تم ماں کے غم کی وجہ سے اس صلاحیت کو کھوٹی جا رہی ہو۔“

”کیا کوئی لڑکی اپنی ماں کے غم کو آسانی سے.....“

”نفسوں باتیں مت کرو۔“ شیخ حامد نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”میرے لیے اب بھی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم وہ لڑکیوں سے بھی کس انداز میں لطف حاصل کیا جاتا ہے۔“

”میں.....“ کنول نے ہچکچا کر کہا۔ ”ہمارے درمیان اب بھی ایک مقدس رشتہ قائم ہے اس لیے.....“

”مث اب.....“ جواب بڑی سختی سے دیا گیا۔ ”میں آج اس رشتے کو بھی ختم کر رہا ہوں۔“ اس نے جیب سے نکاح نامہ نکال کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں پھینک دیا۔

بڑے زہریلے انداز میں بولا۔ ”اب تم میری بیوی نہیں ہو..... ایک مجبور لڑکی ہو جس کی مجبوری کو میں زبردستی روئوں گا تو اس کی مزاحمت مجھے لطف اندوز کرے گی۔“

”کیا تمہیں میری بے کسی پر رحم نہیں آئے گا؟“

کنول مجسم سوال ہی نہ کی۔

”آپ کو اسی لیے فون کر رہا ہوں کہ اب میرا اس

www.technic.com

کے تعاقب میں جا نامناسب نہیں ہوگا۔“
 ”گڈ۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے اس کی ذہانت کو سراہا۔ ”تم کال ختم کر کے کسی اور طرف نکل جاؤ۔“
 ”ٹھیک ہے جناب۔۔۔۔۔ ٹیکسی نمبر وہی ہے، جس پر وہ دوبار پہلے بھی نظر آچکا ہے۔“
 ”آئی نو دیٹ۔“ اورنگ زیب نے فون بند کر کے لوچن سے موبائل پر رابطہ لیا۔ ”روم میٹ کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟“
 ”وہ باسٹرڈ ابھی آدھا گھٹنے پہلے کمرے سے نکلا ہے۔“
 دوسری جانب سے لوچن کی جھلائی ہوئی آواز ابھری۔ ”میں نے ابھی روم سروس سے برف کی ٹھیلی منگوائی ہے۔“
 ”میں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔؟“

”خود کو غصہ نہ کرنا۔ آخری فارمولا اختیار کر رہا ہوں جناب۔۔۔۔۔ اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ میں خود اس کو اوپر پہنچا دوں۔“ لوچن نے بد دستور اکھڑے اکھڑے لہجے میں اس کے اصل چہرے کے حوالے سے اس کی بکواس کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ بنیا۔۔۔۔۔ تیلی مرچنٹ، مجھے بالکل ہی انارڈی سمجھ رہا ہے، میں اسے زیادہ دنوں برداشت نہیں کر سکتا۔“
 ”فکرمت کرو۔۔۔۔۔ میں اس کی دم سیدی کرنے کا بندوبست کرتا ہوں۔“

”ایک دن کے لیے مجھے فری وینڈر، الاٹ کر دیں۔“
 لوچن نے سرسرائی آواز میں جواب دیا۔ ”دوسرے دن سے وہ ہلک (Blufe) کرنا بھول جائے گا۔“
 ”اور کچھ۔۔۔۔۔“

”خصوص فون کالیں اب بھی اس کے پاس آتی ہیں۔ اس کے خیال میں اس کا مسلم باپ ابھی زندہ ہے لیکن وہ ہر بار اس سے ڈائریکٹ بات کرنے کی کنڈیشن رکھ کر فون بند کر دیتا ہے۔ کل اس نے ایک اہم بات اور کہی تھی۔“
 ”وہ کیا۔۔۔۔۔؟“

”فون کرنے والے چاہتے ہیں کہ وہ دو ہندوں کو اوپر پارسل کر دے۔۔۔۔۔ ممکن ہے اس نے یوں ہی بکواس کی ہو لیکن اس نے یہی کہہ کر ٹال دیا تھا کہ باس سے بات کرنے کے بعد ہی ان کی ڈیمانڈ پوری کرے گا۔“

”تمہارا کیا انداز ہے ان دو آدمیوں کے بارے میں؟“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔
 ”اس نے نام نہیں بتائے تھے لیکن لوچن اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا ہے کہ اگر دو غلے ہندو نے

جھوٹ نہیں بولا تو پہلا نمبر منڈریٹر سنٹ آپ ہی کا ہوگا۔“
 ”میں تم سے ڈس ایگری نہیں کروں گا۔“ اورنگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”تمہارے اس خیال کے بعد دوسرا نام بھی میرے ذہن میں آ گیا ہے لیکن تم میری فکر مت کرو۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ میں ایک دو دن میں دشمنوں کو کہیں اور شفٹ کر دوں۔“

”میں اس بات سے ایگری نہیں کروں گا جناب۔۔۔۔۔“ جواب بے حد سنجیدگی سے دیا گیا۔ ”اگر دشمنوں کو ہٹایا گیا تو ہو سکتا ہے کہ ہمارا شکار۔۔۔۔۔ اگر زندہ ہے تو مزید اثر ہٹ جائے گا۔“
 ”او۔۔۔۔۔ میں تمہارے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کروں گا۔“

اورنگ زیب نے ریسپورڈ کرپڈل پر رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر خون کی تمازت بڑھتی نظر آرہی تھی۔۔۔۔۔ اگر لوچن نے دشمنوں کے حوالے سے دو بندے کھڑکانے والی بات غلط نہیں کی تھی تو اس کے خیال میں دوسرا نمبر لیاقت حسین ہی کا ہو سکتا تھا جس کی نا دیدہ قوتوں نے کئی موقعوں پر آکٹوپس کا کھیل خراب کر دیا تھا۔ اس بات سے اورنگ زیب کے اس خیال کو بھی تقویت پہنچی تھی کہ آکٹوپس سمندر کی تہوں میں کہیں نہ کہیں ضرور سانس لے رہا ہوگا۔ وہ ان ہی خیالوں میں غرق تھا جب اس کے ان لفظ نمبروں پر ڈی آئی جی کی کال موصول ہوئی۔

”کیا آج پھر کوئی اہم حادثہ پیش آ گیا ہے؟“ ڈی آئی جی نے دوسری جانب سے اورنگ زیب کی آواز سنتے ہی پہلا سوال یہی کیا تھا۔

”جی نہیں۔۔۔۔۔ کم از کم میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ ڈی آئی جی نے بد دستور سنجیدہ انداز میں کہا۔ ”ابھی دس منٹ پہلے آئی جی نے مجھے اپنے ہنگامے سے کال کیا تھا۔ پہلے اس نے مجھے اور آپ کو اپنے دفتر آنے کو کہا تھا پھر اس نے صرف آپ کو بھیجنے کی ہدایت کی ہے۔۔۔۔۔ اس وقت پونے کی گیارہ بجے ہیں، آئی جی نے پونے بارہ کا وقت رکھا ہے۔“

”او۔۔۔۔۔ کس۔۔۔۔۔ میں پہنچ جاؤں گا۔“ اورنگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اس نے صرف آپ ہی کو کیوں طلب کیا ہے؟“
 ”اس کا جواب تو میں وہاں سے آنے کے بعد ہی

دے سکوں گا۔“
 ”جب نیا آفسر آتا ہے تو لوگ اس کے کان بھرنے سے بھی باز نہیں آتے۔۔۔۔۔ ہر شخص کا اپنا اپنا پرسنل اسٹریٹ ہوتا ہے لیکن آپ آئی جی سے ملتے وقت ایک بات ذہن میں ضرور رکھیے گا۔“
 ”آپ حکم دیں سر۔۔۔۔۔“

”حکم نہیں۔۔۔۔۔ یہ دوستانہ مشورہ ہے۔“ ڈی آئی جی نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ ”میرے ہوتے ہوئے آپ بھی خود کو تہانہ نہ دیجیے، میں ہر حال میں آپ کے ساتھ ہوں۔“
 ”ٹھیک یوسر۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے زیر لب مسکرا کر جواب دیا۔

کال ختم ہونے کے بعد وہ پانچ سات منٹ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر دشمنوں کے بارے میں کچھ غور کرتا رہا پھر اس نے دس گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دو منٹ بعد وہ اپنی کار میں بیٹھا آئی جی آفس کی طرف جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر آئی جی نے صرف اسے تنہا طلب کیا ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی اہم سبب بھی ضرور ہوگا۔

ٹھیک پونے بارہ بجے وہ آئی جی کے سامنے تنہا بیٹھا تھا، کچھ دیر تک رہی باتیں ہوتی رہیں پھر آئی جی نے سنجیدگی سے کہا۔

”مسٹر اورنگ زیب! قبل اس کے کہ ہمارے درمیان گفتگو کا آغاز ہو، میں ایک بات واضح کر دیتا مناسب سمجھتا ہوں۔ جو بات اس وقت ہمارے درمیان ہو وہ لیک آؤٹ نہیں ہونی چاہیے۔“

”آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ سر!“ اورنگ زیب نے سنبھل کر سنجیدگی سے جواب دیا۔

لیکن اس قدر کہ مجھے اس ملازمت سے کوئی دلچسپی نہیں رہی لیکن استعفیٰ منظور ہونے تک میں اپنی ذلالتی (Dignity) برقرار رکھنا پسند کروں گا۔“ آئی جی نے پُر وقار لہجے میں کہا۔ ”میں نے اوپر کے دباؤ کو بھی ابھی اہمیت نہیں دی۔۔۔۔۔ پھر بھی کچھ پروٹوکول کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پرسکون انداز میں بیٹھا آئی جی کے چہرے کے تاثرات دیکھتا رہا۔

اور۔۔۔۔۔ اتفاق سے دونوں مجھے اوپر سے دو دونوں آچکے ہیں آئی جی نے صوفے سے تھوڑے وقفے سے بات جاری رکھی۔ ”پہلا فون کنول کی بازیابی کے سلسلے میں تھا۔ دوسرے میں کہا گیا کہ میں آپ کو موجودہ سیٹ سے ہٹا دوں۔“

”کنول کی بازیابی کے سلسلے میں متعلقہ تھانے کا انسپکٹر تفتیش کر رہا ہے۔ میں ذاتی طور پر بھی اس میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس میں کچھ وقت لگے گا۔“
 ”کوئی خاص وجہ؟“

”میں سر۔۔۔۔۔ وہ چونکہ شیخ حامد کی منکوحہ ہے اس لیے اسے کسی خاص مقصد کے پیش نظر ہی اغوا کیا گیا ہوگا۔ چھوٹے موٹے مجرموں نے یہ کام نہیں کیا ہوگا۔“

”آئی سی!“ آئی جی نے لمبی سانس لی پھر پہلی بار معنی خیز انداز میں مسکرا کر پوچھا۔ ”موجودہ سیٹ سے ٹرانسفر کے سلسلے میں آپ کیا کہنا پسند کریں گے؟“

”اس کا فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے لیکن میں جنرل میٹنگ کے دوران بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں کچھ ڈسے داریاں حب الوطنی کے جذبے کے تحت نبھانے کا عادی ہوں اور جو میرا فرض بھی ہے۔ اس کے لیے کسی مخصوص سیٹ یا عہدے پر ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”گویا اس سیٹ سے ہٹنے کے بعد بھی آپ آکٹوپس کے معاملے سے دستبردار نہیں ہوں گے؟“ آئی جی نے پہلو بدل کر اسے گھورا۔

”ایسا نہیں ہے سر۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”انجینیئر کی ملازمتوں میں اوپر کے احکامات کی خلاف ورزی بھی جرم کے زمرے میں آتی ہے اس لیے میں پہلی فرصت میں اپنا ریٹائرنمنٹ پیش کر دوں گا۔“

”گڈ۔۔۔۔۔“ آئی جی نے غلاف توقع اسے سناہتی نظروں سے دیکھا۔ ”جب تک میں اس کرسی پر ہوں آپ کو موجودہ سیٹ سے کوئی نہیں ہٹا سکتا، دس از مائی کمٹمنٹ (Comitment)۔“

”ٹھیک یوسر۔۔۔۔۔“

”بائی دی وے۔“ آئی جی نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ”میں نے سنا ہے کہ مرکز کے کچھ بڑے لوگوں سے آپ کے بھی ایسے تعلقات ہیں۔“

”میں سر۔۔۔۔۔ لیکن میں نے ان کو کبھی کسی غلط مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا۔“ اس بار بھی اورنگ زیب نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”کنول کے اغوا کے سلسلے میں اوپر والے ایک دو افراد بڑی دلچسپی لے رہے ہیں۔“ آئی جی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس سلسلے میں انہیں پروگرسس سے آگاہ کرتے رہیے گا۔“
 ”او۔۔۔۔۔ کے۔۔۔۔۔“ جواب اختصار سے دیا گیا۔

”رائٹ.....“ آئی جی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آئی، وش یو آل دی بیٹ۔“
 ”ویری کانڈ آف یوسر“ اورنگ زیب نے اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ وہ قدم پیچھے ہٹ کر سیلوٹ کیا پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

لیاقت حسین کو یاد تھا کہ اس دن ہفتہ ہے لیکن راحیلہ بیگم کی ڈیوٹی پر ہونے کے سبب اسے دیر ہو گئی تھی، اسے یقین تھا کہ فرحین کو بھی اس کی اتفاقہ مصروفیت کا علم ضرور ہوگا اس لیے وہ برائیں مانے کی، پھر بھی وہ بے قدموں گھر میں داخل ہوا۔ فرحین کو بستر پر موجود نہ پا کر اس نے سکون کا سانس لیا، اس کے ذہن میں فوری طور پر یہی خیال آیا کہ وہ راحیلہ بیگم کی طرف ہوگی۔ اکثر جب عثمان صاحب راحیلہ بیگم ساتھ جاتے تھے تو فرحین کو اپنے گھر پر ہی چھوڑ جاتے تھے۔

اس نے خاموشی سے لباس تبدیل کیا پھر وہ بستر پر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں قفل خانے سے پانی گرنے کی مدھم آواز سنائی دی، وہ آہستہ سے اٹھ کر قدم بڑھاتا غسل خانے کے قریب چلا گیا، پانی کے گرنے کی آواز یہ دستور آ رہی تھی لیکن اندر روشنی نہیں تھی، شاید غسل خانے کا بلب فیوز ہو گیا ہو؟

”لائٹ کیوں بند کر رکھی ہے میڈم جان.....“ لیاقت حسین نے دروازے کے قریب جا کر اسے پیارے سے آواز دی۔
 ”بیگم جان نہیں..... سوات تھی، بولا کر۔“

فرحین کی آواز کے ساتھ ہی باہر کی لائٹ بھی روشن ہو گئی، لیاقت حسین نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا پھر..... دیکھتا ہی رہ گیا، فرحین جس لباس میں تھی لیاقت حسین کے لیے نہ صرف نیا تھا بلکہ اسے اس لباس میں دیکھ کر لیاقت حسین کے سارے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔

وہ تو لیے کا سفید گاؤں تھا جو بڑے گھر کی خواتین نہانے کے بعد پہنتی تھیں، گاؤں کے سفید بچے سے گرہ بھی اس انداز میں لگائی تھی کہ اوپر کا چمکا دکھتا جسم دعوتِ نظارہ دے رہا تھا، گاؤں کے نیچے کوئی زیر جامہ بھی نہیں تھا جس کی وجہ سے سڈول اور خوب صورت پاؤں بھی رانوں تک نظر آ رہا تھا۔ بیروں میں اسی مناسبت سے سفید ٹاول کی سلپرتھی۔

لیاقت حسین کی توجہ کے برعکس فرحین ہاتھوں میں برش لیے اپنے لیے اور کھنے والوں کو ستوار رہی تھی، مدھم آواز میں منگنٹانے کا عمل بھی جاری تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے

اسے لیاقت حسین کی وہاں موجودگی کا علم ہی نہ رہا ہو۔ لیاقت جانتا تھا کہ یہ لباس بھی اسے راحیلہ بیگم نے لے کر دیا ہوگا۔ ۸۰ بیٹھ ہی فرحین کا خیال رکھتی تھیں۔ سرفراز خان کے آنے کے بعد تو انہوں نے فرحین کے علاوہ لیاقت حسین کو بھی گھر کا ایک فرد ہی سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ اس لباس میں ہونے اور غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز کا کیا مقصد تھا۔ خاموش کھڑا وہ فرحین کو ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی محبت بھری والہانہ نظروں سے دیکھتا رہا، اچھی غذا اور صاف سترے ماحول میں وہ پہلے سے زیادہ صحت مند نظر آنے لگی تھی۔
 ”کچھ لمبے خاموشی سے گزر گئے پھر لیاقت حسین نے اس کے قریب جا کر کہا۔

”آج تو اس لباس میں تو بچ لگ رہی ہے۔“
 ”واٹ.....؟“ فرحین نے اسے دیکھ کر بیگموں والے انداز میں کہا۔ ”ٹم..... اصر اندر کیسے آیا..... گٹ وٹ۔“
 ”گٹ وٹ نہیں..... گیٹ آؤٹ بولتے ہیں۔“
 ”او۔ کے..... ابھی ٹم ادھر سے جاؤ..... کوئی کام ہوگا تو، ٹم کو بلا لگا۔“

”کام تجھے نہیں..... مجھے ہے میری بلبل۔“ لیاقت حسین نے اسے آگے بڑھ کر اپنے بازوؤں کے حصار میں دبوچ کر اٹھالیا، اسی طرح لیے لیے بستر پر آ گیا۔
 ”سچ بتا.....“ فرحین نے اپنا گاؤں ٹھیک کرتے ہوئے شوہر کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”یسی لگ رہی ہوں اس لباس میں؟“

”تو روز اول سے لیاقت کی جان ہے..... اگر تو نہ ہوتی میں زندہ بھی نہ رہتا۔“
 ”چپ کر جالیاقت۔“ فرحین نے سہم کر شوہر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ایسی بات دوبارہ کبھی مذاق میں بھی نہ بولنا۔“
 ”نہیں بولوں گا جان۔“ لیاقت حسین نے اس کے کھلے بالوں سے کھیلے ہوئے کہا۔ ”میں تو سمجھا کہ آج دیر ہونے کی وجہ سے تو خفا ہوئی لیکن تو تو پہلے سے سیم بنی ہوئی ہے۔“
 ”یہ بے شری والا لباس ہے لیکن بیگم صاحب نے کہا تھا کہ گھر کے مردوں کو بھی میں رکھنے کی خاطر ایسے ہی پہناوے کام آتے ہیں۔“

”اور کیا کہا تھا بیگم صاحب نے مردوں کو لہانے کے لیے؟“ لیاقت حسین نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔
 ”بہت سی گر کی باتیں بتائی ہیں لیکن وہ میں تجھے نہیں بتاؤں گی۔“ فرحین نے شوخی سے جواب دیا۔ ”تو پہلے ہی

گروگھٹال ہے۔ سب باتیں بتا دیں تو پھر فائدہ کیا ہوگا؟
”یہ سب بڑے آدمیوں کی بڑی بڑی باتیں ہیں
میری جان.....“ لیاقت حسین نے اسے خود سے اور قریب
کر لیا، انگریزی کشتی میں وہ مزہ بھی نہیں ہوتا جو کھاڑے کی
اشٹانچ میں دونوں پہلو انوں کو ملتا ہے، سمجھ رہی ہے میری
باتیں.....“

”پہلے دن سے سمجھ رہی ہوں۔“ اس نے شوخی سے
کہا۔ ”چل ہٹ ایک طرف میں یہ لباس بدل لوں، آج ہی
نیگم صاحبہ نے دیا ہے۔“
”اس کی فکر مت کرو..... اس کے خراب ہونے اور بار
بار دھونے میں بھی بڑا سوا دلتا ہے۔“

”ج کھر رہا ہے؟“
”ایک دم سولہ آنے لگا.....“
”پر تو نے یہ تجربہ کب اور کہاں کیا؟“ فرحین نے
اسے پہلی بار ایک عورت کی نظروں سے دیکھا۔

”شادی کے بعد انسان آہستہ آہستہ سب کچھ آپ ہی
آپ سیکھ جاتا ہے۔“ لیاقت حسین نے اس کی آنکھوں میں
دور تک جھانکا۔ ”پہلے دن تو بھی بالکل اناڑی تھی لیکن اب
تجربہ بھی کھاڑے کے سارے داؤ بیچ آگئے ہیں..... رہی
سہی کس نیگم صاحبہ پوری کر رہی ہیں۔“

لیاقت حسین کا جواب سن کر فرحین کی چھوٹی موٹی کے
بووے کی طرح اس کے کشادہ سینے میں سٹ گئی۔ لیاقت
حسین نے ایک ہاتھ سے اسے سینا۔ دوسرے ہاتھ سے
ناٹ بلب کی مدد روشنی بھی آف کر دی۔

جگا کے نام کی پرچی دیکھ کر اورنگ زیب چونکا۔ ایک
لمحے میں اس کے ذہن میں بے شمار خیالات گڈھ ہو کر رہ
گئے۔ جگانے اس سے پیشتر بھی اس کے قریب آنے کی غلطی
بھی نہیں کی تھی پھر..... اس نے دفتر پہنچ کر سپاہی کے ذریعے
اپنے نام کی پرچی اندر بھیجی کی جرات کیسے کی؟

”وہ جانتا تھا کہ جگا کے ہاتھ صاف ہیں..... نہ ہوتے تو
ملٹری انٹیلی جنس والے آسانی سے اس کا پیچھا بھی نہ
چھوڑتے۔ قانون کے ہاتھوں ملنے والی سزا پوری کرنے
کے بعد اس نے کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اپنے تحفظ کی خاطر
اس نے کچھ سر بھرے افراد بھی جن کر لیے تھے جنہیں وہ
ضرورت مندوں کو ان کے تحفظ کے لیے فراہم کرتا تھا مگر ان
سب کو بھی اس نے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ قتل و غارت
گری سے دور رہی رہیں۔“

جگا کی رہائی کی سفارش بھی اورنگ زیب نے اس کا
ساتھ ریکارڈ دیکھ کر کرنا احتیاط سے ہی لیکن ان تمام
حقیقتوں کے باوجود اسے کسی بدنام آدمی کا اس طرح اپنے
دفتر آنا پسند بھی نہیں تھا۔ شری چند عرصہ اس بات کو دوسرا رنگ
بھی دے سکتے تھے۔ وہ ایک لمحے تک اپنے خیالوں میں گم
رہا پھر کاشیبل سے پوچھا۔

”اور کون ہے جہانگیر بٹ کے ساتھ.....؟“
”وہ تمہارا آپ بے سر لیکن.....“ کاشیبل نے ہچکچا کر دہلی
زبان میں کہا۔ ”کئی وجہ سے جھلایا ہوا لگ رہا ہے۔“
”اسے اندر بھیج دو..... اور جب تک وہ اندر رہے
کسی اور کو نہ آنے دینا۔“

سپاہی اگلے قدموں واپس لوٹ گیا، اورنگ زیب
کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایک منٹ بعد ہی جگا
اس کے سامنے موجود تھا، سپاہی نے جو کہا تھا وہ بھی غلط نہیں
تھا۔ جگا اس وقت کچھ الجھا الجھا سا نظر آ رہا تھا۔ اورنگ زیب
نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کیسے زحمت کی میرے پاس آنے کی؟“ اورنگ
زیب نے کھردرے لہجے میں سوال کیا۔
”میں جانتا ہوں صاحب کہ آپ کو اس وقت میرا
یہاں تک آنا.....“

”میرے پاس وقت کم ہے.....“ اورنگ زیب نے
اس کا جملہ کاٹ کر کہا۔ ”آنے کا مقصد کیا ہے؟“
جواب میں جگانے چار دھندو بریں نکال کر اورنگ
زیب کے سامنے رکھ دیں۔ وہ تصویریں اس نے خود اتاری
تھیں جس میں فرنیچر کی بربادی اور دکان کی تباہ کاری کے
سارے مناظر موجود تھے۔ اورنگ زیب نے ان تصویروں
کو غور سے دیکھا پھر اس کی نظریں جگا کی سمت اٹھ گئیں۔

”یہ کیا ہے؟“
”یہ جگا کی شرافت اور اس خاموشی کے منہ پر ایک
بھر پور چھڑ ہے صاحب۔“ جگانے اسے تفصیل بتاتے
ہوئے کہا۔ ”میں اس وقت آپ کے پاس نہ آتا تو بعد میں
آپ کو بھی مجھ سے شکایت ہی ہوتی۔“

”کس بات کی شکایت.....؟“
”مجھے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا آتا ہے صاحب
لیکن.....“ جگانے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کوئی قدم
اٹھانے سے پیشتر آپ سے مل لینا ضروری سمجھا ہے۔“

”اگر میں تم کو بے دستور برداشت کرنے کا مشورہ
دوں تو.....؟“

کشکول

”تو.....“ جگانے کسم کسم جواب دیا۔ ”میں انکار
نہیں کروں گا صاحب لیکن ایسی صورت میں اس شہر میں کسی
کو نہ بھی نہ دکھاؤں گا۔“

”تم نے اس حادثے کی ایف۔ آئی۔ آر درج
کرائی؟“
”جی نہیں.....“ جگانے نظریں جھکا کر کہا۔
”کیوں.....؟“

”اس لیے کہ ابھی تک قانون کی نظریں بھی اس کی
تلاش میں ہیں جس کے اشارے پر یہ سب کیا گیا ہے۔ ایف
آئی آر کا پیٹ بھرنے کی خاطر پھر کسی جہانگیر بٹ کو بے گناہ
پکڑ لیا جائے گا۔ میں نے خود کو سنہال لیا تھا۔ شاید وہ بھی زندہ
رہنے کی خاطر جیل میں استادوں سے ٹکے ہوئے طریقوں کو
زندہ رہنے کا ذریعہ بنا لے..... یہ مجھے منظور نہیں ہے۔“

”میری طرف سے سبز جھنڈی دکھائے جانے کے
بعد تم کیا کرو گے؟“
”بڑی چھپلی کے حلق میں کاٹنا چھانسنے کی خاطر کچھ
چھوٹی چھپلیوں کی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔“ جگانے دہلی
زبان میں کہا۔ ”میں کچھ ایسے لوگوں پر ہاتھ صاف کروں گا
جن لوگوں نے یہ کام کیا ہے..... ہو سکتا ہے میرا دو ٹوک
جواب ملے کہ بعد وہ بھی سامنے آجائے جس کے اشارے
پر یہ سب کچھ کیا گیا ہو.....“

”تم جاؤ تو ان کے نام مجھے بھی بتا سکتے ہو۔“
”قانون ثبوت اور گواہیوں کے بغیر کوئی قدم نہیں
اٹھاتا جناب۔ جبکہ ایسے معاملات میں غیر قانونی اقدامات
زیادہ موثر کے مطابق ثابت ہوتے ہیں۔“

”تم جس کی سمت اشارہ کر رہے ہو وہ بیشتر لوگوں
کے خیال اس دنیا میں نہیں ہے۔“
”سانپ کے بچے بھی سپو لیے ہوتے ہیں
صاحب۔“ جگانے بل کھا کر جواب دیا۔ ”(خود کو بڑا منوانے
اور اقتدار کی جنگ بھی پشت ہاپشت تک چلتی رہتی ہے۔“

اورنگ زیب نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا، اس کی
تجربے کا نظریں کچھ دیر جگا کے چہرے پر منڈلائی رہیں
پھر اس نے ریسپورڈر اٹھا کر متعلقہ تھانے سے رابطہ کر کے کشمیر
فرنیچر زبرد ہونے والی واردات کی ایف۔ آئی۔ آر درج
کرنے کو کہا۔ کچھ ضروری ہدایتیں دینے کے ساتھ ہی اس
بات کی تاکید بھی کی کہ اس معاملے میں ملا جو دکان کے
مالک کو ہزار سال نہ کیا جائے، پھر اس نے ریسپورڈر رکھ کر جگا
سے کہا۔

”تم میرے حکم کے بغیر کوئی قدم فی الحال اٹھانے
سے گریزی کرو گے۔“
”اگر آپ کا بھی یہی حکم ہے صاحب تو پھر ٹھیک
ہے۔“ جگا ضبط کرتے ہوئے اٹھا، جانے کے لیے مڑا تو
اورنگ زیب نے تیزی سے آواز دی۔
”ون منٹ.....“

”اور کیا حکم ہے بڑے صاحب؟“ جگانے پلٹ کر
بڑی بے بسی سے پوچھا، اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔
”میں نے تمہیں جو مشورہ دیا ہے اسے دوستانہ ہی
سمجھنا، کوئی حماقت نہ کرنا۔“ اورنگ زیب کے لہجے میں
اپنائیت کے ساتھ ہی کوئی ایسا پیغام بھی ضرور تھا جسے کچھ کر جگا
کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ ایک لمحہ وہ خاموش کھڑا
اورنگ زیب کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر
نظریں جھکا کر خاموشی سے چلا گیا۔

ڈرائیور سے کہا پھر اگلے قدموں لوٹ گیا۔ لڑکی نے جس انداز میں اسے ملازمت قائم نہ رہنے کی دھمکی دی تھی وہ ایسی نہیں تھی جیسے وہ نظر انداز کر دیتا۔ بہت سی ایسی خفیہ اور راز کی باتیں ہوتی تھیں جو صرف آفیسران کو بتائی جاتی تھیں۔

مین گیٹ پر پہنچ کر اس نے ڈیوٹی آفیسر کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ڈیوٹی آفیسر نے اوپر کی ہدایت کے مطابق فوراً ہی کرنل احتشام سے رابطہ قائم کر کے اسے آنے والی کے نام سے آگاہ کر دیا پھر دوسری طرف سے جواب ملنے کے بعد وہ گاڑی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بجائے خود ہی اٹھ کر گیٹ پر آگیا۔ اس کے حکم پر ہی ڈیوٹی گاڑی نے ٹیکسی ڈرائیور کو آگے آنے کا اشارہ کیا تھا ٹیکسی گیٹ پر پہنچ کر روری۔ ڈیوٹی آفیسر کی ہدایت پر ایک گاڑی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ دو تین منٹ بعد ٹیکسی کو ایک سیرک کے سامنے روک دیا گیا۔ ڈیوٹی گاڑی نے نیچے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے لڑکی سے بڑے مہذب انداز میں کہا۔ ”آپ سامنے والے کمرے میں چلی جائیں بی بی۔۔۔۔۔ کرنل صاحب ادھر ہی ہوتے ہیں۔“

وہ ٹیکسی سے اتر کر کرنل کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ درمیان میں کسی نے مداخلت نہیں کی۔ کمرے میں کرنل احتشام کے ساتھ ایک اور جوان بھی یونیفارم میں موجود تھا۔ کرنل کرنل کا اشارہ ملنے کے بعد اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ چند لمحوں تک کرنل احتشام کنول کی ظاہری کیفیت کا اندازہ لگا تا رہا پھر تنجید کی سے بولا۔

”پولیس رپورٹ کے مطابق آپ کو دو تین روز قبل اغوا کر لیا گیا تھا؟“

”آپ کی اطلاع غلط نہیں ہے۔“ کنول نے خالی خالی نظروں سے کرنل کو دیکھ کر اداس لہجے میں کہا۔ ”مجھے کہاں لے جایا گیا تھا، میں اس کی نشان دہی بھی نہیں کر سکتی گی۔ رہائی کے وقت بھی میری آنکھوں پر بلاسٹڈر چڑھا کر اوپر سے ٹیپ کر لیا گیا تھا۔ ایک گھنٹے پیشتر مجھے ایک مصروف سڑک کے قریب اتار دیا گیا، میری آنکھوں کی پٹی بھی کھول دی گئی۔“ وہ رکے بغیر بولتی رہی۔ ”وہاں سے ٹیکسی پکڑ کر میں ایک واقع کار نیوز رپورٹر کے پاس گئی، اسے کچھ تفصیل سے آگاہ کیا پھر اسی کے مشورے پر آپ کے پاس آ گئی۔“

”کیا تم نے اغوا کرنے والوں کو پہچان لیا ہے؟“

”صرف ایک کو۔۔۔۔۔ وہ بھی اس کے حلیے یا صورت سے نہیں بلکہ اس کی آواز سے۔“ کنول کے مردہ ہونٹوں پر

ایک تلخ مسکراہٹ ابھری، اس نے دروازے پر پلکیں چمکا کر اس انداز میں کرنل کو دیکھا جیسے وہ گہری نیند کی کیفیت سے دو چار ہو۔

”کون تھا وہ؟“

”وہ۔۔۔۔۔ وہی ہے کرنل، جس نے سب کی نیندیں خراب کر رکھی ہیں۔“ کنول نے ہر خند سے بولی۔ ”اس کے ایک نہیں کئی نام ہیں۔۔۔۔۔ سیکڈل۔۔۔۔۔ عیاش۔۔۔۔۔ بد معاش۔۔۔۔۔ قاتل۔۔۔۔۔ آنکولس۔۔۔۔۔ شیخ حامد۔“

”کیا!۔۔۔۔۔“ کرنل احتشام نے حیرت سے کنول کو دیکھا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا جب اس نے اپنی اورنگ زیب بھی اندر داخل ہوا، کرنل نے کنول کے آنے کی خبر سنتے ہی اسے آگاہ کر دیا تھا۔ کرنل کی نظروں کے تعاقب میں کنول نے بھی اورنگ زیب پر ایک نظر ڈالی پھر ہونٹ چبانے لگی، اورنگ زیب کے پیٹھ جانے کے بعد کرنل نے دوبارہ کنول کو مخاطب کیا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ شیخ حامد ہی تھا؟“

”میں کل تک اس کی مشکوچہ بھی کرنل۔۔۔۔۔“ کنول نے جمائی لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”ماں اپنی اولاد اور بیوی اپنے شوہر کو چھوٹے کے بعد اسے شناخت کرنے میں بھی غلطی نہیں کرتی۔“ پھر اس نے شیخ حامد کے آخری پتلے بھی تفصیل سے دہرا دیے۔

”تمہاری ماں کے قتل میں جو لوگ ملوث تھے کیا تم ان کی کوئی نشاندہی کر سکتی ہو؟“ اس بار اورنگ زیب نے سوال کیا۔

”وہ۔۔۔۔۔ سب اس کے شکاری اور بالائے کتبہ تھے۔۔۔۔۔ جو ہمیشہ پولیس کی نظروں سے بچنے کی خاطر میک اپ میں رہنے کے عادی ہیں۔“

”ون منٹ۔۔۔۔۔“ کرنل احتشام نے کسی فوری خیال کے تحت کنول کو متوجہ کیا۔ ”تم نے ابھی کہا تھا کہ کسی نیوز رپورٹر کے مشورے کے بعد ہی تم یہاں آئی ہو۔۔۔۔۔؟“

”میں نے غلط نہیں کہا تھا کرنل۔۔۔۔۔ ویسے بھی اس وقت میں کوئی غلط بیانی نہیں کر دوں گی۔“

”تم نے رپورٹر سے شیخ حامد کے بارے میں کیا کہا تھا؟“

”یہی کہ وہ ابھی مرنا ہیں۔۔۔۔۔ زندہ ہے۔“ کنول نے دوبارہ جمائی بی بی اس کا پتا خبری کی بیان بھی دے چکی ہوں۔“

”اوہ نو۔۔۔۔۔“ کرنل نے تمللا کر کہا۔ ”تم نے ٹھیک نہیں کیا بی بی۔۔۔۔۔ خبر اگر اخباروں میں آئی تو وہ باشر ذرا زیادہ ہوشیار ہو جائے گا۔“

تک

ککشکول

کنول نے کرنل کو خوابیدہ نظروں سے دیکھا۔ کوئی جواب نہیں دیا، اس کی پلکیں نیند سے پوٹھیل ہو رہی تھیں۔

کرنل کے برابر بیٹھا ہوا جوان، جو پوری توجہ سے اسے شروع سے واضح کر رہا تھا، چونکا۔ اس نے منہ قریب کر کے کرنل سے کچھ سرگوشی کی پھر اٹھ کر تقریباً ڈبل مارچ کرتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

”کیا بات ہے کرنل؟“ اورنگ زیب نے کرنل احتشام سے اس کی وجہ جاننے کی کوشش کی۔

”تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔“ کرنل نے اپنے ساتھی کے جانے کے بعد کنول کو بڑے پیار سے مخاطب کیا۔ ”تم نے اچھا نہیں کیا بی بی۔۔۔۔۔ جب تم نے ہمارے پاس آنے کا ارادہ کر لیا تھا تو پھر ہمیں کوئی حماقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

کرنل کا جملہ سن کر اورنگ زیب بھی چونکا، اس کی نظریں بھی کنول پر مرکوز ہو گئیں جس کی پلکیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں۔ اسی وقت لیب کوٹ میں لیوس ایک ڈاکٹر تیز قدم اٹھاتا اندر داخل ہوا، اس کے پیچھے اسٹریچر لائے والے بھی تھے، اورنگ زیب کو صورت حال سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔

ڈاکٹر نے تیزی سے قریب آ کر کنول کی اٹلی کلائی پر ہاتھ جما کر اس کی نبض ٹولی۔

”نو ڈاکٹر۔۔۔۔۔ نو۔۔۔۔۔ پلینز۔“ کنول نے بڑی مضحل آواز میں کہا۔ ”اگر تم۔۔۔۔۔ حت۔۔۔۔۔ تم میرے ہمدرد ہو تو مجھے بچانے کی کوشش نہ کرنا۔۔۔۔۔ پل۔۔۔۔۔ پل۔۔۔۔۔ ایڑ۔۔۔۔۔ جملے کے اختتام کے ساتھ ہی کنول نے میز پر سر ٹیک دیا، اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

”ڈاکٹر!۔۔۔۔۔!۔۔۔۔۔“ کرنل کے ساتھ ہی اورنگ زیب بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”نبض بڑی مدہم رفتار میں چل رہی ہے۔۔۔۔۔ پھر بھی میں پوری کوشش کرتا ہوں۔“

کنول کو اسٹریچر پر ڈال کر کمرے سے لے جایا گیا، ڈاکٹر بھی ساتھ ساتھ تھا۔ کرنل کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خون کی سرخی کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے اورنگ زیب سے کہا۔

”پلینز۔۔۔۔۔ آپ اپنے ذرائع استعمال کریں۔ شیخ حامد کے زندہ ہونے کی خبر پریس میں نہیں آنی چاہیے۔“

اورنگ زیب نے جیب سے موبائل نکال کر کیے بعد دیگرے چار پانچ فون کیے لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اپنے مقصد میں پوری طرح

کامیاب نہیں ہو سکا۔

”بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی ہے کرنل۔۔۔۔۔ جو وعدے کیے جا رہے ہیں، میں ان پر یقین بھی نہیں کر سکتا۔“

کرنل کے چہرے پر بھی اشتعال کی کیفیت گہری ہونے لگی پھر اس نے اورنگ زیب کو تفصیل سے اپنی باتوں سے آگاہ کر دیا جو اس کے اور کنول کے درمیان ہو چکی تھیں۔

”آئی۔ سی۔!۔۔۔۔ اورنگ زیب نے کسمسا کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ کنول نے جو قدم اٹھایا ہے وہ سوچ سمجھ کر ہی اٹھایا ہوگا۔“

”میں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔؟“ کرنل نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”جنگل کا قانون بھی یہی ہے۔۔۔۔۔ شیر جب شکار سے پیٹ بھر کر ایک طرف ہو جاتا ہے تو پھر بھیڑیے اور لکڑ بھگے بھی اپنا اپنا حق وصول کرنے سے باز نہیں آتے ہیں۔ ہڈیوں پر بچا کھچا گوشت بھی کدھو نچ ڈالتے ہیں۔“ اورنگ زیب نے بڑے زنجی لہجے میں وضاحت کی۔ ”آنکولس کے طلاق دینے کے بعد اس کی غیرت کو جس طرح مجروح کیا گیا۔ اس کے بعد دو ٹکے کے مجرم بھی اپنا اپنا حق وصول کرنے سے باز نہ آتے۔“

”یو آر رائٹ۔۔۔۔۔ لیکن اگر وہ پریس میں بیان دینے کے بجائے براہ راست ہمارے پاس آ جاتی تو ہم اسے تحفظ بھی فراہم کر سکتے تھے۔ خود وہ بھی ہماری رہنمائی کرنے میں خاصی موثر ثابت ہو سکتی تھی۔“

”آئی اگری دو یو کرنل لیکن کنول کی جگہ اگر کوئی دوسری شریف لڑی ہوتی تو شاید وہ بھی خود اپنی نظروں میں گر جانے کے بعد نہ رکھانے سے گریز نہ کرتی۔۔۔۔۔“

”ہو سکتا ہے لیکن۔۔۔۔۔ لٹ اس فورگٹ آل اباؤٹ اٹ۔“ کنول نے ہونٹ چباتے ہوئے بے حد تنجیدگی سے کہا۔ ”اب ہمیں کنول کے بیان کی روشنی میں نئے سرے سے اس باسٹڈر کو ٹریس کرنے کی خاطر بہت محتاط اور موثر کارروائی کرنی ہوگی۔ اگر وہ زندہ ہے تو اسی شہر میں کہیں نہ کہیں ضرور چھپا ہوگا۔ ہمیں ہر مشکوک شخص پر نظر رکھنی ہوگی۔“

”ڈونٹ وری کرنل۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ”میں ایک لچھ بھی اس کی طرف سے غافل نہیں رہا ہوں۔“

کرنل احتشام کو کوئی جواب دینا چاہتا تھا جب میڈیکل یونٹ کا ایک میل نرس دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس نے معذرت کر کے کہا۔ ”سر۔۔۔۔۔ ڈاکٹر نے آپ کو سلام کہا

ہے، مریض بے ہوشی کی حالت میں کچھ بڑبڑا رہی ہے۔“
کرنل احتشام اور اورنگ زیب دونوں ایک ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

ڈاکٹر کا پیغام سننے ہی اورنگ زیب اور کرنل احتشام میڈیکل وارڈ کے اس سائڈ میں گئے جہاں کنول کو رکھا گیا تھا۔ وہ بستر پر مردوں کی طرح بے سدھ پڑی تھی، سینے کے مدھم مدھم انداز میں متحرک ہونے سے ایک شہر سا ہوتا تھا کہ ابھی جسم اور روح کا رشتہ ختم نہیں ہوا۔ کچھ سانس باقی رہ گئے ہیں جنہیں وہ پورے کر رہی تھی۔

”ڈاکٹر.....“ کرنل نے ڈاکٹر کے قریب جا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
”بھی بھی یہ بے ہوشی کی حالت میں کچھ بڑبڑانے لگتی ہے۔“

اورنگ زیب کی نظر پر بدستور کنول کے چہرے پر مرکوز تھیں..... اس کی آنکھوں میں وہ رہ کر چنگاریاں سی چلنے لگتی تھیں جس سے اس نفرت اور انتقام کی شدت کا احساس ہو رہا تھا جو اس کے دل میں آنکلوں کے خلاف سرابھاری تھی۔

کرنل ڈاکٹر سے بات کر رہا تھا جب اچانک کنول کے جسم میں کسی دم توڑنے پر ندے کی سی پھڑپھڑاہٹ ہوئی۔ اس کے ہونٹوں سے بے ربط الفاظ نکل رہے تھے۔
”نہیں..... نہیں..... خدا کے لیے..... مت کرو..... ایسا مت کرو..... آہ..... ظالم..... قتالی..... تم تم..... تم میری ماں کے قاتل ہو..... تم میں..... میں تم سے نفرت کرتی ہوں..... تھوکتی ہوں..... چھ..... چھوڑ دو مجھے..... خدا..... کے لیے..... اف..... آہ..... ت..... تم جی.....“

بے ربط جملوں کے درمیان میں وہ اچانک بڑی انداز میں چیختی۔ ”ماں..... ماں..... مجھے چھوڑ کر نہ جاؤم..... میں..... میں بھی آ رہی..... ہی..... ہوں..... آ..... آ.....“

پھر اس کی آواز طلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ دوبارہ اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اس کی نبض پر..... ہاتھ رکھ دیا۔
”ڈاکٹر.....“ کرنل احتشام نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”اسے بچانے کی کوشش کرو.....“

”نبض کی رفتار تشویشناک حد تک گر رہی ہے..... میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا..... ہو پ ازاد ٹی ٹین پرسنٹ.....“

ڈاکٹر نے کنول کو ایک اور انجکشن لگایا پھر دھیرے دھیرے باہر آ گئے۔
”ذہن ایک بار مکمل طور پر ڈیپ سلیپ (گہری

نیند) کی کیفیت سے دو چار ہو جائے تو سکون بھی ملتا ہے لیکن مریضہ کو کسی نے بہت مارا چڑ کیا ہے۔“

ڈاکٹر نے بات جاری رکھی۔ ”کون تھا وہ؟“
”اے گولی مارو ڈاکٹر.....“ کرنل نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ مریضہ ہر قیمت پر زندہ رہے۔“

”خاموش رہو..... ہم سب اپنی جیت کے لیے ہر امید ہوتے ہیں کرنل لیکن..... ہم فوجی ہیں..... جیت گئے تو غازی..... مر گئے تو شہید..... مگر مریضہ فوجی نہیں ہے اور میں..... میں صرف اپنی ہی کوشش کر رہا ہوں۔“

”او..... کے ڈاکٹر.....“ کرنل نے طویل سانس لے کر کہا پھر اورنگ زیب کے ساتھ قدم اٹھاتا دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

”موت اور زندگی خدا کے اختیار کی بات ہے کرنل۔“ اورنگ زیب نے لب کشائی کی۔ ”لیکن اگر کنول مر گئی تو میں آنکلوں کو اس کے آخری انجام تک پہنچاتے وقت بھی کسی قانونی تقاضوں کا احترام نہیں کروں گا۔“

”آئی..... ابھی دیکھو.....“ کرنل نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ مریضہ زندہ رہے۔“

خاصی دیر تک دونوں کنول کی باتیں کرتے رہے پھر دونوں کی نظریں دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔ آنے والا ڈاکٹر کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

”اب کیا پوزیشن ہے ڈاکٹر.....“
”میں نے مریضہ کا کس بحال کرنے کے لیے آکسیجن ماسک بھی لگا دیا ہے لیکن.....“

”لیکن کیا.....“ اورنگ زیب نے بے چینی سے پوچھا۔
”امید کا گراف بڑھنے کے بجائے گرتا ہی جا رہا ہے پھر بھی میں اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہوں گا۔ ہمارے پروفیشن کا تقاضا بھی یہی ہے مگر اتنی خوب صورت لڑکی کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک کرنے والا کون تھا؟“

ڈاکٹر نے پہلی بار بخیرہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا وہ بڑا گیا؟“
”نہیں.....“ کرنل نے جھلا کر کہا۔ ”وہ..... وہی باسٹرڈ ہے جو ہمارے خیال میں ڈوب گیا تھا۔“

”اوہ..... نو.....“ ڈاکٹر نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”لیکن اس لڑکی سے اس کا کیا تعلق تھا؟“
”وہی..... جو جنگل میں کسی آدم خور چیتے کا معصوم بچہ تھا.....“ کرنل نے حقارت سے جواب دیا۔

اسی وقت وارڈ بوائے نے اندر داخل ہو کر ڈاکٹر سے

کشکول

کچھ کہا تو وہ اٹھ کر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔
”کرنل.....“ اورنگ زیب نے کچھ دیر بعد اٹھتے ہوئے درخواست کی۔ ”میں آپ سے مریضہ کی حالت معلوم کرتا رہوں گا۔“

”او..... کے.....“ کرنل نے اٹھ کر فوجی انداز میں اورنگ زیب سے مصافحہ کیا پھر اس کے جانے کے بعد اس نے ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر ریسپورڈ اٹھایا۔ شیخ حامد کے بارے میں پھر اپنی ٹیم کے افراد کو دوبارہ ایکٹو ہونے کی ہدایتیں دینے لگا۔

دوسرے دن اخباروں نے شیخ حامد کے زندہ ہونے کی خبریں کنول کی تصویر اور اس کے تحریری حوالے کے ساتھ جلی سرخیوں سے شائع کیں تو متعلقہ حلقوں میں پھر سے بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ کاروباری لوگوں کے ایک گروپ کا سانس پھر تیز چلنے لگا۔ ان میں سرفہرست رحمت علی آغا خانی تھا۔

میڈم روبی نے جہاں اس خبر کو پڑھ کر مسمیٰ کی انگلی ہاتھ سے اتار کر سیف میں رکھ دی تھی۔ وہیں ڈی آئی جی بھی تملاکر رہ گیا تھا۔ صبح اورنگ زیب اور سراج کی پیشی کا مقدمہ بھی سنا تھا۔ اسے ایک طرف میڈم روبی کے ساتھ گھر بسانے کا خواب ٹوٹنے کا غم تھا تو دوسری جانب کچھ ذاتی

غدشات بھی اس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔
”میرا خیال ہے کرنل احتشام نے آپ کو کنول ہی کے سلسلے میں بلایا ہوگا۔“ اس نے اورنگ زیب سے پوچھا۔

”جی ہاں..... اس کی اطلاع میں آپ کو کل رات بھی مختصر اُدے چکا ہوں۔“

”اب کنول کس پوزیشن میں ہے؟“
”ڈاکٹر کو اس کے بچنے کی زیادہ امید نہیں ہے۔“

اورنگ زیب نے بدستور بخیرہ لہجے میں پوچھا۔
”میرا ذاتی خیال ہے کہ کنول نے پریس کو اپنا تحریری بیان دے کر کسی دانش مندی کا ثبوت نہیں دیا۔“

ڈی آئی جی نے پہلو بدول کر کہا۔ ”اس طرح ہمارا شکار اور چونکا ہو جائے گا۔“

”اس خبر سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ جس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے وہاں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی کوئی غور نہیں کی جاتی۔ آنکلوں تو اس قبیلے کے ایک سردار کی حیثیت رکھتا ہے۔“

”جس سے اوپر والوں نے پھر میری نیند حرام کر رکھی ہے۔“ ڈی آئی جی ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ ”میں اس

بار پہلے سے زیادہ محتاط رہتا ہوگا۔“
”میں پہلے ہی محتاط ہی تھا سر لیکن.....“
”لیکن کیا.....؟“ ڈی آئی جی نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”میں کسی ایک کی نشاندہی نہیں کروں گا جناب..... لیکن بہت سے ذمے دار جیشیتوں کے مالک بھی آنکلوں کے سلسلے میں ذیل رول ملے کرتے رہے ہیں..... اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید.....“

”جو کچھ ہو چکا اب اس کو دہرانے سے کیا فائدہ؟“ ڈی آئی جی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اب آپ کو زیادہ محتاط رہ کر ایسی پلاننگ کرنی ہوگی کہ وہ زیادہ دیر ہاتھ پاؤں نہ چلا سکے۔“

اورنگ زیب خاموش رہا۔
”آپ کے ذہن میں کوئی نہ کوئی پلاننگ تو ضرور ہوگی۔“ ڈی آئی جی نے اس بار الفاظ چباتے ہوئے اسے دیکھا۔ ”خاص طور پر ایسی صورت میں کہ جب آپ نے اسے سرے سے مردہ تصور ہی نہیں کیا تھا۔“

”میں برابر اسی کے بارے میں ورک کرتا رہا ہوں..... آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔“

”اس خبر کے اخبارات میں شائع ہونے کے بعد آپ نے کچھ نہ کچھ تو سوچا ہوگا؟“

”میں سر.....“ اورنگ زیب نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”مجھے بسا پر اپنے کچھ مہروں کی پوزیشن تبدیل کرنی ہوئی لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی پلاننگ کو کامیاب ہونے تک زبان سے نہیں نکالوں گا۔“

”کیا مطلب.....؟ کیا آپ مجھے بھی بتانا پسند نہیں کریں گے؟“

”موجودہ حالات میں ایسا کرنا ضروری ہے سر.....“

”آئی سی.....“ ڈی آئی جی تملاکر رہ گیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی تو اس نے ایک لمحے ریسپورڈ گھور کر دیکھا پھر ریسپورڈ اٹھایا۔

”میں روبی بول رہی ہوں.....“
”زے نصیب..... اس وقت کیسے فون کیا؟“ ڈی آئی جی نے نکٹش کا شکار ہو کر بھی دوستانہ لہجے میں بات کی۔

”میرا خیال ہے کہ اخبارات کے ذریعے اب تک.....“

”جی ہاں..... میں بھی اس وقت اپنی ٹیم کے ساتھ سر

جوڑے بیٹھا ہوں اس کے علاوہ.....“ ڈی آئی جی نے میڈم کے لہجے کو محسوس کرتے ہوئے وہ بات بھی خود ہی کہہ دی جو شاید میڈم کہنا چاہتی تھی۔ ”مجھے آپ کی شرط یاد ہے۔“ خضر گفتگو کے بعد اس نے دوبارہ اورنگ زیب اور سراج کو باری باری دیکھا۔

”کنول کے بارے میں آخری خبریں کیا ہیں۔ وہ ہمارے لیے خاصی کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔“

”ملٹری کے ڈاکٹر نے صرف دس فیصد امید دلائی ہے۔“ اورنگ زیب نے کہا۔

”بہر حال.....“ ڈی آئی جی نے اس بار کسی ہارے ہوئے جوارے کے انداز میں دونوں افسران کو مخاطب کیا۔

”میں آپ دونوں کو فری پیڈ دیتا ہوں۔ میری جانب سے آپ کے کسی اقدام میں کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔“

”شکریہ سر.....“

ڈی آئی جی کے آفس سے فارغ ہو کر دونوں باہر نکلے تو اورنگ زیب نے سراج سے مسکرا کر پوچھا۔

”تم کس شے پر پینچے.....؟“

”خوب صورت خواب ٹوٹ جائیں تو پھر آدمی مجبوراً کھٹکے دیتا ہے۔“ سراج نے جواب دیا۔ ”مجھے یقین تھا کہ میڈم ان خبروں کو پرکھنے کے بعد مکئی کو کوئی اہمیت نہیں دے گی۔“

”میرے بارے میں کیا کہو گے؟“

”اس وقت ڈیوٹی پر ہوں جناب۔“ سراج نے شوفی سے کہا۔ ”رات کو الماس کی موجودگی میں تفصیلی بات ہوگی۔“

اورنگ زیب ڈی آئی جی کی کیفیت پر خاصا لطف اندوز ہو رہا تھا جب اس کے موبائل پر سکنل ملا، اس نے نمبر دیکھ کر کال انیڈن کرنے میں دیر نہیں کی۔

”اب کیا صورت ہے کرنل.....؟“

”دیری سیڈ نیوز فار اس (Very sad news for us)“ کرنل احتشام نے اداس لہجے میں کہا۔ ”ڈاکٹر کی کوششیں بھی میرے کھدے کے ساتھ کم توڑ گئیں۔“

”اوہ.....“ اورنگ زیب کے چہرے کے تاثرات یکسر بدل گئے۔ ”ڈیڈ باڈی کا کیا ہوگا؟“

”ڈونٹ وری..... ہم مرنے والی کو پورے اعزاز اور احترام سے سپرد خاک کریں گے۔“

دوسری جانب سے جیلے کے اختتام کے ساتھ ہی رابطہ بھی منقطع کر دیا گیا۔

ککشول

(Suite) لے رکھا ہے، وہاں جوائنڈنٹ ہوگا وہ تمہاری رہنمائی کر دے گا۔“

”شکریہ.....“ جونی نے بے پروائی سے جواب دیا پھر آنے جانے والے بھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھتے لگا۔ اس وقت بھی اس کے ذہن میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔

اصول کے مطابق مس ڈکسن سے ملنے والوں کو ایک دن پہلے اپنے نام کے ادفون نمبروں کے ساتھ بھی پسندیدہ پھول کا نام لکھ کر دینا پڑتا تھا۔ بعد میں جن لوگوں کو ملاقات کا وقت دیا جاتا تھا انہیں بذریعہ فون آگاہ کر دیا جاتا تھا۔ جونی نے پسندیدہ پھول کی جگہ ”گوبھی کا پھول“ لکھ دیا تھا اور..... اب وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ مس ڈکسن کس انداز میں اس کی پذیرائی کرے گی؟

پندرہ منٹ بعد میز پر رکھے ہوئے فون کی کھنٹی بجی، اڈویزر عمر کی عورت نے سنبھل کر کال ریسیو کی پھر ”میں میڈم! کہہ کر اس نے ریسیور کرڈل پر رکھتے ہوئے جونی کو مخاطب کیا۔

”ڈش ہوڈلڈ نو جوان..... تمہارا نمبر آ گیا ہے۔“ جونی مسکراتا ہوا اٹھا۔ لفٹ کے ذریعہ آخری منزل تک پہنچنے کے دوران وہ صرف اور صرف مس ڈکسن کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس سے ملاقات کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ اپنے نامی کے بارے میں وہ باتیں بھی جانے کا خواہش مند تھا جو اس کے علم میں نہیں تھیں۔ مس ڈکسن کے بارے میں اس نے اخبارات میں یہی پڑھا تھا کہ وہ ملاقات کرنے والوں کو ”گہوارے سے لے کر قبر تک“ کے تمام حالات اس طرح بتا دیتی ہے جیسے وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہی ہو۔

مطلوبہ سوٹ تنگ پہنچنے میں جونی کو کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہاں موجود ہونٹل کے انیڈنٹ نے ضروری معلومات کرنے کے بعد اسے ملاقات کرے میں پہنچا دیا جہاں مس ڈکسن ایک صوفے پر موجود تھی۔ جونی نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا، اس کی عمر چالیس سے کچھ تجاوز کرتی نظر آ رہی تھی۔ وہ خوب صورت خدوخال کی مالک تھی۔ اس نے جونی کو بس ایک ہل کے لیے غور سے مسکرا کر دیکھا پھر سنبھل کر بولی۔ ”تم وہ پہلے خوش نصیب ہوئے میں نے آج پہلی بار آٹھواں نمبر دیا ہے۔“

”یہ بات مجھے بتائی جا چکی ہے۔“ جونی نے محتاط رویہ اختیار کیا۔

بڑھا جہاں رنگ برنگ لباس میں سر پر کلف شدہ اونچی کپڑی چمائی ایک ملازم آنے جانے والوں کے لیے دروازہ کھولنے پر تعینات تھا۔ نو جوان کو دیکھ کر اس نے دروازہ کھولنے کے بجائے بڑے مہذب انداز میں کہا۔

”ہوٹل میں اس قسم کا لباس پہن کر.....“

”میرے پاس مس ڈکسن کا دعوت نامہ موجود ہے۔“ نو جوان نے مسکرا کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس سے ملاقات کے لیے یہ لباس بھی اضافی ہی ثابت ہوگا۔“

ڈیوٹی پر مامور کاندے نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا پھر دروازہ کھول دیا۔ وہ جانتا تھا کہ مس ڈکسن ایک عالمی شہرت رکھنے والی مستقبل شاس تھی۔ اس ہوٹل میں مقیم تھی اس کی فیس کی ادائیگی کرنا بھی معمولی لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی۔

دروانے سے گزر کر نو جوان سامنے داہنی جانب رکھی ہوئی اس میز کی طرف بڑھا جس پر ایک اڈویزر عمر کی عورت بیٹھی تھی، میز پر مس ڈکسن کے حوالے سے ایک لمبے کارڈ دور سے نظر آ رہا تھا جس نے نو جوان کی رہنمائی کے لیے کچھ آسانی بھی کر دی۔

وہ میز کے قریب پہنچ کر سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”مجھے مس ڈکسن سے ملنا ہے۔“

”اوہ.....“ عورت کے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ ابھری۔ ”آپ کا نام؟“

”جونی.....“

بوڑھی عورت نے سامنے میز پر رکھے پیڈ پر نظر ڈالی، اس نے بھی ایک بار جونی کو بہت غور سے دیکھا۔ فہرست میں جونی کا نمبر آٹھواں تھا جبکہ مس ڈکسن ایک دن میں سات آدمیوں سے زیادہ پروٹیکشن ملاقات نہیں کرتی تھی، یہ بات دنیا میں اس کے تمام کلائنٹس کو معلوم تھی کہ وہ کسی قیمت پر بھی اپنا اصول نہیں توڑتی تھی۔

”تم خوش قسمت ہو نو جوان جس نے آج مس ڈکسن کے ساتھ سال پرانے اصول کو توڑ دیا ہے۔“ اس نے اپنی بات کی وضاحت کی تو جونی نے صرف مسکراتے پر اکتفا کیا۔ اسے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

”میرا خیال ہے کہ کہیں ابھی دس پندرہ منٹ اور انتظار کرنا ہوگا۔“ عورت نے دقت کھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”جو کلائنٹ اندر ہے اس کے باہر آتے ہی وہ مجھے کال کر دے گی۔ اس کے بعد ہمیں لفٹ کے ذریعے آخری منزل پر جانا ہوگا جہاں مس ڈکسن نے ایک سوٹ

اورنگ زیب کے چہرے کے بدلتے تاثرات..... کرنل اور ڈیڈ باڈی کے حوالے ہی سے سراج نے سمجھ لیا تھا کہ اورنگ زیب کو کنول کے انتقال کی خبر دی گئی ہوگی۔ اس نے فوری طور پر اورنگ زیب سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ خود بھی اس خبر کو سن کر کسی گہری سوچ میں غرق نظر آ رہا تھا۔ دو چار منٹ خاموشی سے گزر گئے پھر اورنگ زیب نے موبائل پر کچھ نمبر پچ کر کے اسے آن کر دیا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے گفتگو کا آغاز کیا۔

”کیسی ہو الماس..... ہاں، میں اور سراج اس وقت ڈی آئی جی سے مل کر وہاں آفس جا رہے ہیں۔ میں تنگ میں سوائے وقت کی بربادی کے اور کیا ہوتا ہے..... ٹھیک ہے لیکن اس وقت میں نے تمہیں ایک خاص مقصد سے فون کیا ہے.....“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اوپر کا اسٹور روم صاف کر کے اس میں میرے لیے ایک بیڈ کلاو دو..... نہیں..... گیسٹ روم مناسب نہیں رہے گا۔ اوکے۔“ اورنگ زیب نے کال ختم کی تو سراج نے دہلی زبان میں پوچھا۔

”کیا ابھی.....“

”خطرہ نہیں..... صرف احتیاط سمجھ لو۔ کنول کا بیان اخبارات میں آنے کے بعد انکوائس سب سے پہلے میرا اشار کرنے کی کوشش کرے گا۔ تم لیاقت حسین کو بھی محتاط رہنے کی تاکید کرو۔“ افضل خان اور شیخیم کی حفاظت کا بھی خاص خیال رکھنا۔ وہ دونوں ابھی ہمارے لیے بہت کارآمد ہیں۔“

اورنگ زیب نے جن خدشات کا اظہار کیا اس کے پیش نظر سراج بھی بے حد سنجیدگی سے حالات کی تحلیل نفسی کرنے لگا۔

ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے وہ باہر آیا تو وہاں موجود ڈیوٹی دینے والے نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ اس وقت وہ جینز کی چٹلون اور ٹی شرٹ میں ملیں تھا۔ ٹی شرٹ کے سامنے کے دو بٹن کھلے تھے جس سے اس کا صحت مند اور کشادہ سینہ نظر آ رہا تھا، گیلے میں اس نے مصنوعی سونے کی ایک موتی چین بھن کر رکھی تھی۔ پاؤں میں جو گر تھے۔ اس کے چہرے کی رنگت مائل گندمی تھی۔ عمر تیس کے لپٹے میں رہی ہوگی۔ وقت اور حالات نے اسے اس قدر مصروف کر رکھا تھا کہ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں وقت ضائع کرتا۔ گاڑی سے باہر نکل کر وہ سیدھا مین گیٹ کی جانب

”تم..... اپنے بارے میں کیا جانتا چاہتے ہو.....؟“
”ماضی کی وہ تمام باتیں جو سلے دار میرے علم میں نہیں ہیں۔“

”تم نے شاید اسی لیے مجھ سے ایک بھونڈا مذاق کیا ہے۔“ مس ڈکسن یکنخت سنجیدہ ہو گئی۔ ”کوئی کچھ بھول فلاورز میں شمار نہیں کیا جاتا۔“

”میں معذرت خواہ ہوں.....“ جونی نے اعتراف کرنے میں عار نہیں سمجھا۔

جواب میں مس ڈکسن نے اس کے نام کا لفظ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”یہ فیس کی وہ رقم ہے جو تم نے مجھ سے ملاقات کی خاطر پیشگی ادا کی تھی۔“

”گویا مجھے یہاں سے واپس جانا پڑے گا۔“ جونی لگافہ لے کر اٹھا تو مس ڈکسن نے تھکمانے لہجے میں کہا۔

”بیٹھ جاؤ جونی..... تم رقم کی واپسی کا غلط مطلب اخذ کر رہے ہو۔ میں ایک دن میں چونکہ صرف سات لوگوں کو

وقت دیتی ہوں اس لیے فیس بھی سات افراد سے لیتی ہوں۔ تمہارا نمبر آٹھواں ہے اس لیے میں تم سے فیس کی رقم نہیں لے سکتی۔ یہ میرے اصول کے خلاف ہوگا۔“

جونی نے پہلی بار مس ڈکسن کے اصول کو دل ہی دل میں سراہا پھر دوبارہ بیٹھ گیا۔ کمرے میں پانچ منٹ تک خاموشی مسلط رہی پھر مس ڈکسن نے پہلو بدل کر دوستانہ انداز میں کہا۔

”تمہارا ماضی کھلی کتاب کی طرح میری نظروں کے سامنے ہے۔“

”کیا آپ میرے ان تمام صفحات کو پڑھ سکتی ہیں جو میں نے ابھی تک نہیں پڑھے؟“

مس ڈکسن نے جونی کے سوال پر اسے مسکراتی نظروں سے دیکھا پھر اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی مسلط ہو گئی۔ اس نے جونی کے چہرے سے نظر ہٹا کر خلا میں گھورتا شروع کیا پھر..... اس کے ہونٹ متحرک ہو گئے۔

”آج سے ٹھیک آٹیس سال گیارہ ماہ قبل تم نے اس دنیا میں اکٹھکھولی تھی۔ وہ تمہاری ماں کے لیے اس کی زندگی کا

سب سے منحوس ترین دن تھا۔ تمہاری پیدائش کے بعد تمہارے باپ کی نگاہوں کے زاویے بھی تبدیل ہونے لگے..... وہ..... وہ ایک عیاش اور فریبی شخص تھا جس نے

تمہاری ماں کو محبت کا فریب دے کر اس سے رشتہ جوڑا تھا جو تمہارے دنیا میں قدم رکھنے کے بعد کچے دھاکے کی طرح

رفتہ رفتہ ٹوٹ گیا۔ شاید اس لیے کہ تمہیں جنم دینے کے بعد وہ غریب عورت وقتی طور پر تمہارے باپ کے لیے کسی کام کی نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے دوسری عورتوں سے دل بھلانا شروع کر دیا۔ تین سال تک تمہاری ماں کی کشتی ڈنگاتی رہی اس کے بعد تمہارا باپ تم دونوں کو چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا۔“

مس ڈکسن کی نظریں یہ بدستور خلا میں چکرار ہی تھیں۔ جونی دھڑکتے ہوئے دل سے اسے دیکھتا رہا۔

”تمہاری ماں بڑے نامساعد حالات میں تمہاری پرورش کا بوجھ اٹھاتی رہی۔ چار سال تک گھریلو ملازمہ کی طرح کام کرتی رہی۔ کسی ایک جگہ نہیں ٹک سکی اس لیے.....

اس لیے کہ وہ خوب صورت تھی۔ بہر حال، وہ خود کو ہوس پرست مردوں کے ہاتھوں سے بچاتی رہی لیکن کب تک.....

جنگل میں رہنے والی ہرنی بھی کبھی نہ بھی کسی شیر یا چیتے کی درندگی کا شکار بن جاتی ہے۔ تمہاری ماں کے ساتھ جیسا ایسا ہی ہوا۔ جب تم دس سال کے ہوئے تو جس گھر میں وہ ملازمت کرتی تھی وہاں کے ایک مرد نے اس کی عزت طاقت کے بل

پر لوٹ لی۔ وہ پاکباز اور خود دار عورت تھی۔ اس نے رسوا ہونے سے پیشتر ہی خودکشی کر لی۔ تم نے سہارا ہو گئے۔“

مس ڈکسن ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

”تمہاری پرورش جس ماحول میں ہوئی وہ نہایت نامناسب تھی۔ کلی کے کم حیثیت بچوں کے ساتھ کھیل کود کر تمہاری شخصیت منج ہوئی رہی پھر..... تمہاری ماں کی موت کے بعد کچھ لوگوں نے تم کو ایک یتیم خانے کے حوالے کر دیا۔ یتیم خانے کے مالکان بہ ظاہر خدمت خلق کے نام پر پیسے نورہے تھے۔ درپردہ وہ ناجائز کاروبار میں بھی ملوث تھے۔ جب تمہاری عمر ان گلی (Un-Lucky) کے

ہندسوں نمبر تیرہ کی گئی، اس وقت کسی نے یتیم خانے والوں کے خلاف خبری کر دی۔ پولیس کی ریڈ کے دوران کچھ لوگ پکڑے گئے۔ کچھ فرار ہو گئے۔ اس افراتفری کے عالم میں تمہاری عمر کے کچھ لڑکوں کو بھی فرار ہونے کا موقع مل گیا۔

سر چھپانے کی خاطر تم کو بھی گھریلو ملازمت کرنی پڑی۔ ماں کی طرح تم نے بھی خود کو بچانے کی کوشش کی لیکن اس بار ایک شادی شدہ عورت نے تمہارے اندر پوشیدہ مرد کو تلاش کر لیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب تم نے ایک انوکھی لذت کا ذائقہ چکھا۔ ماں کی طرح تم نے بھی خوف سے وہ

ملازمت چھوڑ دی۔ تمہاری پرورش درست خطوط پر نہیں ہوئی تھی اس لیے تم کو کھیلنے کا موقع نہیں ملا۔ ملازمت

کشکول

چھوڑنے کے بعد تم آوارہ لڑکوں کی صحبت میں پڑے رہے پھر چار سال بعد، اس روز تم کو اپنی قیمت کا اندازہ ہوا جب تم نے پہلی بار بازار حسن کے گندے ماحول میں قدم رکھا۔ تم نے ایک عام گاہک کی طرح ہی اس طوائف زادی کی فیس ادا کر دی تھی۔ بعد میں اس نے تمہیں فیس واپس کرنے کے ساتھ ساتھ چار گنا زیادہ رقم بھی دی..... یہ بھی کہا تھا تم رات کے بجائے دن میں اس سے ملنے رہنا۔ ہر بار وہ تم کو اتنی ہی رقم ادا کرتی رہے گی۔ اس نے ایسا ہی کیا اور..... اس طرح تم اس کے غلام بن گئے۔“

مس ڈکسن نے خلا میں گھورتے گھورتے اپنی پلکیں بار بار جھپکائیں پھر اس نے براہ راست جونی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میں نے اب تک تمہیں جو کچھ بتایا، اس میں کچھ غلط نہیں تھا؟“

”نہیں.....“ جونی نے کسمسا کر اقرار کیا۔

”تمہیں یہ بھی یاد ہو گا کہ اس کے بعد تم کس طرح شیلا دریا تک پہنچے جو بیوٹی پارلر چلا رہی ہے؟“ مس ڈکسن نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔ ”کیا یہ بھی بتا دوں کہ تمہاری ملاقات کے بعد شیلا درما نے اپنے شوہر سے کیوں علیحدگی اختیار کی تھی اور اب تم کس قدر شاہانہ زندگی گزار رہے ہو؟“

”میں اعتراف کرتا ہوں مس ڈکسن کہ تم نے اب تک جو کچھ کہا اس کا ایک حرف بھی غلط نہیں..... لیکن..... میں شیلا درما کے اشارے پر جو کام انجام دے رہا ہوں وہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ کیا اس کے بارے میں بھی تم مجھے کچھ بتا سکتی ہو؟“

”کیوں نہیں.....“ مس ڈکسن نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔ ”تمہاری زندگی میرے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔“ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے تمہارا نام جان محمد تھا، جس عورت نے تمہیں پہلی بار براد کیا اس نے تمہیں جانو کا نام دیا..... بازار حسن میں تم جس طوائف زادی کے پاس گئے اس نے رخصت کرتے وقت تمہیں جونی کہا کہ تم کو مخاطب کیا تھا اور اب..... شیلا درما نے تمہیں مکمل طور پر جونی کے روپ میں ڈھال دیا ہے۔“

”میں نام کے بارے میں نہیں بلکہ اس کام کے بارے میں معلوم کرنا پسند کروں گا جو تم سے لیا جا رہا ہے۔“ جونی نے پھر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ”مجھے آئے دن شیلا کے کہنے پر کسی خوب صورت اور کس لڑکی کو اس کے دیے ہوئے مختلف چٹوں پر پہنچانا پڑتا ہے..... میں جانتا ہوں کہ ان لڑکیوں کو کیا خدمت کرنی پڑتی ہے لیکن وہ..... وہ کون

ہے جو لڑکیوں کے عوض منہ ماگی رقم دیتا ہے؟..... ایک لڑکی کا نمبر بھی دوسری بار نہیں آتا..... کبھی کبھی کوئی لڑکی معصوم ہونے کے باوجود شیلا کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس کر تباہ ہو جاتی ہے۔“

”آئی ایم سوری جونی..... میں غیر ضروری سوالات کا جواب دینے میں وقت برباد نہیں کرتی پھر بھی..... اتنا بتا سکتی ہوں کہ خود شیلا درما بھی نہیں جانتی کہ وہ لڑکیاں کتنے ہاتھوں سے گزر کر کہاں پہنچانی جاتی ہیں لیکن..... ذاتی طور پر میں تم کو ایک ہی مشورہ دے سکتی ہوں۔“

”پلیز..... مس ڈکسن۔“ جونی نے عاجزی سے کہا۔ ”مجتنی جلدی ممکن ہو شیلا درما کی دنیا سے نکل کر کہیں دور چلے جاؤ..... کسی ایسی جگہ جہاں تک اس کی رسائی ممکن نہ ہو۔“

”کیا یہ ممکن ہوگا.....؟“

جواب میں مس ڈکسن نے دوبارہ خلا میں گھورتا شروع کیا پھر لمحوں بعد اس نے جونی کی طرف دیکھ کر پہلی بار بڑے روکے انداز میں کہا۔

”تم اب جا سکتے ہو..... میں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتی.....“

”میں اگر ضد کروں تو.....؟“

”مجھے مجبوراً ہوئی کی انتظامیہ کو کال کرنا پڑے گا جو تمہیں دھکے دے کر نکال دیں گے۔“ مس ڈکسن ہونٹ چبالتے ہوئے تھی۔ ”ناؤ..... پلیز گٹ لاسٹ.....“

جونی کے لیے اس کا فیصلہ عمل ناقابل فہم تھا لیکن اس نے وہاں رکتا مناسب نہیں سمجھا، مس ڈکسن کو آخری بار گھور کر دیکھا پھر تیز ترین قدم اٹھا تاہر نکل گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ دوبارہ شیلا درما کے بیوٹی پارلر کی طرف جا رہا تھا جس کے اوپر اس کی رہائش تھی۔ وہ مس ڈکسن کے آخر جملوں اور یکنخت بدلے ہوئے انداز پر غور کرنے میں اتنا منہمک تھا کہ یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ ایک عجیب سی ہونٹ سے نکلنے کے بعد ہی کچھ قاصطے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔

لیاقت حسین کچھ دیر پہلے ہی راجیلہ بیگم کی طرف سے ہو کر آیا تھا، کچھ بھان آئے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے فرحین کو روک لیا تھا، اسے خوشی تھی کہ فرحین راجیلہ بیگم کے ساتھ مل جانے کے بعد شہر کے مہذب طور طریقے بھی سیکھتی جا رہی تھی۔

گھر آکر لیاقت حسین نے لباس تبدیل کیا پھر وہ کچھ

دیر آرام کرنے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ تھا اس لیے اس کی آنکھیں لگ لگی، کچھ دیر بعد فرحین ہی نے اسے آواز دے کر جگا دیا تھا۔
”میرے بغیر آج تیری آنکھ کیسے لگی؟“ اس نے معصوم انداز میں شکوہ کیا۔

”تیرے ہی خواب دیکھ رہا تھا۔“ لیاقت حسین نے حسب دستور اسے اپنے قریب کر لیا۔
کچھ دیر تک وہ باتیں کرتی رہی۔ آنے والے مہمان، خواتین کے رکھ رکھاؤ اور ہنسنے بولنے کے طور طریقے بتاتی رہی۔ لیاقت حسین ہوں، ہاں کرتا رہا پھر دوبارہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ کتنی دیر سو یا اسے یاد نہیں لیکن کوئی بات تھی جس نے اسے سوتے ہی سوتے ایک ڈراؤنے خواب سے دوچار کر دیا تھا۔ ایک متحرک فلم اس کی نگاہوں کے سامنے چلنے لگی۔

اس نے دیکھا کہ بیٹکے کا چوکیدار گیٹ کے ساتھ ہی اپنی رائفل سمیت فرش پر پڑا ہے، شاید وہ کچھ دیر آرام کرنے بیٹھا تھا پھر نیند کے جھونکوں نے اسے کرسی سمیت فرش پر لا رکھا دیا تھا۔ اس نے چوکیدار کو ٹولنا مناسب نہیں سمجھا، قدم اٹھاتا آگے بڑھا تو اس کے آفس کا کراجنے وہ بند کر گیا تھا اس کے دروازے کھلے نظر آرہے تھے، دروازے کے ساتھ ہی ایک انسانی ہولنا بھی دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ اس کی نظریں اندر کی جانب تھیں اس لیے وہ لیاقت حسین کو نہیں دیکھ سکا۔

ایک لمحے میں لیاقت حسین نے اپنی پوزیشن تبدیل کی وہ بیچوں کے بل پکٹا ہوا کمرے کی ایک کھڑکی کے قریب پہنچ گیا جہاں دیوار کے ساتھ ہی ایک اور آدمی اونڈھا پڑا تھا، لیاقت حسین نے جھک کر اسے دیکھا پھر اس کی سانسوں کی رفتار تیز ہوئی، زمین پر کسی آدمی کی لاش پڑی تھی جس کی گردن پر خون ہی خون نظر آ رہا تھا۔ پل بھر میں ساری پوزیشن اس کے ذہن میں آگئی۔

وہ یقیناً ڈاکو ہی تھے جو بیٹکے میں کسی نیک ارادے سے نہیں آئے ہوں گے۔ چوکیدار نے مزامت کی ہوگی، اس نے کسی کو کوئی کا نشانہ بنایا ہوگا پھر خود بھی کوئی سنسائی ہوئی اندھی گولی اس کے وجود کو چاٹ گئی ہوگی۔ آنے والوں نے اپنے سامگی کی لاش کو سامنے سے ہٹا دیا ہوگا لیکن..... اب وہ لیاقت حسین کے کمرے میں کیا تلاش کر رہے تھے؟..... اس کا ذہن تیزی سے کی امکانات پر غور کر رہا تھا، ابھی وہ کوئی حتمی نتیجہ قائم نہیں کر سکا تھا۔ جب

دروازے پر کھڑا ہوا ہولنا اپنے کسی دوسرے ساتھی کے قریب آکر مدد میں بولا۔
”خیال رکھنا..... کوئی بھی سامنے آئے تو ٹھکانے لگانے سے دریغ نہ کرنا۔“

”تم لوگ اندر کیا کر رہے ہو؟“ دوسرے نے سرسراتے کچے میں پوچھا۔ ”اسے اٹھا کر ساتھ کیوں نہیں لے چلتے۔ سوچ میلا بھی ہو جائے گا اور باس کا حکم بھی سکون سے پورا کر لیں گے۔“

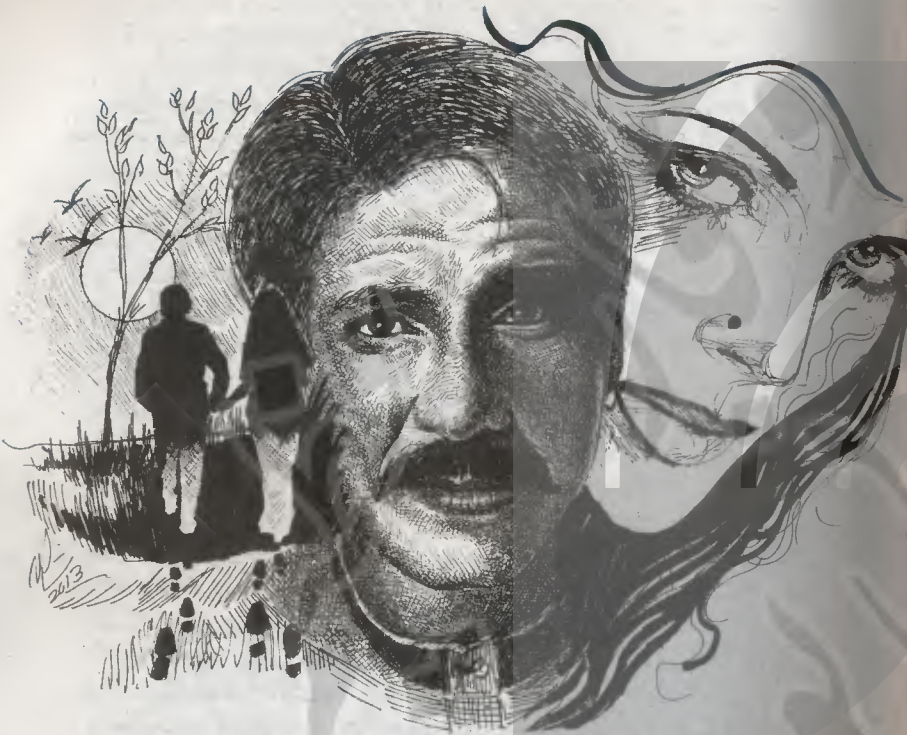
”نہیں..... ہمیں وہی کرنا ہے جس کا حکم دیا گیا ہے۔“
”تم بھول رہے ہو۔“ پہلے نے شک کر جواب دیا۔
”ہمارا ایک سامگی کام آچکا ہے۔“
”اس کے بدلے میں ہم نے بھی چوکیدار کے خطرے کو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیا ہے۔“

”لیکن اندر.....“
”وہ کسی زخمی شیرنی کی طرح پھری ہوئی ہے۔“ پہلے نے کہا۔
”فکر مت کرو، ہمارے ساتھی اسے قابو کر لیں گے۔“
”اور اگر اتنی دیر میں وہ ادھر آ گیا جو انگیسی میں سو رہا ہے تو.....؟“
”وہی سب سے ٹیڑھی کبیر ہے! باس کا خیال ہے کہ وہ انسان نہیں کوئی جن بھوت ہے جس پر کوئی حربہ اثر نہیں کرتا۔“

”ایسی صورت میں تصویروں سے کیا بنے گا؟“
دوسرا بولا۔ ”اگر یہی خوب صورت بلا اس کی کمزوری ہے تو اسی کو بوری میں سیٹھ لے چلو، اس کے پیچھے وہ بھی ہمارے جال میں پھنس جائے گا۔“
”میں نے بھی یہی مشورہ دیا تھا لیکن باس نے میری بات نہیں مانی۔“

متحرک فلم کے کلائمکس کے بارے میں لیاقت حسین کے سوتے ذہن نے سوچا تو وہ اس طرح ہڑبڑا کر جا گیا جیسے کسی زہریلے پھوونے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے پلٹ کر بستر پر نظر ڈالی تو فرحین وہاں نہیں تھی۔ کمرے کا دروازہ بھی کھلا نظر آ رہا تھا۔ باہر ایک سایہ بھی موجود تھا، شاید وہ لیاقت حسین کی چوکیداری پر مامور تھا۔

اس پر اسوار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے



اندھیرنگری

محمد الیاس

جیسے نیند آدھی موت اور موت مکمل نیند کا نام ہے اسی طرح آزادی درحقیقت ایک ایسی قید کا احساس ہے جس کی حدود کا تعین ہمیں خود کرنا پڑتا ہے اور جب اس تعین میں ہم سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو تمام عمر اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال ان بدحال لوگوں کا بھی تھا جہاں آزادی کی کوئی حد مقرر تھی اور نہ ہی قید و بند کی صعوبتوں کا کوئی شمار تھا۔ لہذا جب رشتوں کے تقدس اور تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو انسان دھیرے دھیرے اذیتوں کی دلدل میں اترتا چلا جاتا ہے۔

مزاج کے خلاف سمجھوتوں اور ذہنی تقادوں کا سبق آموز ماجرا

نہیں رفتہ رفتہ اس کا مزاج بھی بدلتا گیا اور اس کی ساقہ نے پچیس برس قبل راولپنڈی میں سکونت اختیار کرتے ہی اخبار میں نام کی تبدیلی کا اشتہار چھپوایا کہ آئندہ اس کو احمد دین کے بجائے آفاق احمد کے نام سے پکارا جائے۔ نام ہی

وقت انسان کو بدل ڈالتا ہے۔ ماضی کے احمد دین نے پچیس برس قبل راولپنڈی میں سکونت اختیار کرتے ہی اخبار میں نام کی تبدیلی کا اشتہار چھپوایا کہ آئندہ اس کو احمد دین کے بجائے آفاق احمد کے نام سے پکارا جائے۔ نام ہی

نرنے میں آئی اور چند برسوں میں اپنی شناخت کھو بیٹھی۔ اُس کی بیوہ ماں نے گھر میں ہی ایک سادہ سی مٹین لگا رکھی تھی جس پر بجلی کے پتھروں میں استعمال ہونے والا پلاسٹک کا معمولی سا پرزہ بنایا کرتی۔ وقت نکال کر وہ خود بھی ماں کا ہاتھ بنایا کرتا۔ دن رات محنت کرنے کے باوجود ماں بیٹے کا گزارہ ذرا مشکل سے ہی ہوا کرتا۔ کم دیش سارے ہی چھوٹے بڑے لڑکے اُس وقت کے احمد دین پر حاوی تھے۔ وہ دور اُس نے سہے ہوئے ہی گزارا۔ ماں نے اُس کا نام یقیناً عقیدت سے رکھا تھا مگر رشتہ داروں میں وہی نام مذاق بن گیا۔ اُس کو دینیا دیکھ کر پکارتے۔ زچ کرنے پر آتے تو اُس کے بارے میں جوڑا ہوا کہتے ڈہرایا کرتے۔ ”ایک جہلم سے آگے دینہ ہے، یہ اپنی ماں کا دینہ ہے۔“

ماں کو ایک ہی دھن سوار تھی کہ بیٹے کو چودہ جماعتیں پڑھا کر دم لینا ہے۔ گھر کے کام کاج، اسٹھک محنت، بچکانہ نماز، نفی روزے اور طویل وظائف کرنے سے شریفاں بی بی بڑی تیزی سے گھٹی جا رہی تھی۔ اُس کا پختہ ایمان تھا کہ رزق حلال کھائے اور اللہ کی عبادت کرنے سے آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا بھی سنبھال جاتی ہے۔ وہ اپنی ہر مرضی بذریعہ وظائف اللہ کے حضور پیش کرتی۔ شاید اُس تک بخت نہ تو جوانی میں گجرات شہر کے بی اے پاس افراد کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے دیکھا تھا۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ وطن آزاد ہو چکا اور زمانہ بدل گیا ہے۔ آزادی کی خوش خصال دیوی، بچاؤ و قوموں پر مہربان ہوئی ہوگی۔ سوختہ سختوں کے آنگن میں اتر کر جون بدل لیتی ہے اور پہلی فرصت میں اپنے آشنائے دیرینہ، حرص و ہوس کے دیوتا کو مسند اقتدار پر بٹھاتی ہے۔ طاغوتی قوتوں کے مالک دیوتا کے لاتعداد ہاتھ ہیں جو نیک نفس ماؤں کی دعائیں آسمان تک بلند ہونے سے پہلے ہی روک لیتا ہے۔ ایسی ریاستوں کے بے نوا شہری آسیب کے سامنے میں شب دروز گزارتے ہیں۔

راولپنڈی، اسلام آباد کے بڑاؤں شہروں میں، سابقہ احمد دین اور حال کے آفاق احمد نے خوب خوار ہو کر بہت کچھ جان لیا تھا۔ نیک طبیعت بیٹے اپنی سادہ لوح ماؤں کے رد و ردو سارا ج نہیں بولا کرتے۔ اُن کو اپنی ماؤں سے محبت ہوتی ہے۔ آفاق احمد بھی سمجھا کرتا کہ یہ سرزمین ایسی ہی مائیں پیدا کرتی ہے جو اپنے وجود سے جنم لینے والی تھی جان کی خاطر بھری جوانی تیاگ دیتی ہیں۔ اُس نے ایک اور ماں بھی دیکھ رکھی تھی۔ صفائی اپنے چھ سات سالہ بیٹے مہدی علی کے ہمراہ ان کے صحن کے کونے میں کوشری نما بویہ کمرے میں

کرائے پر رہنے لگی تھی۔ آفاق احمد نے راولپنڈی، اسلام آباد میں بڑی ادنی حیثیت کی ملازمتوں سے عملی زندگی آغاز کیا تھا۔ جن کی وجہ میں سفارشی خط ہوا، نہ بھاری مال کے کرنی نوٹ، وہ اسی طرح دردر کی ٹھوکریں کھایا کرتے ہیں۔ بدعنوانوں کے عہد میں سفارش بھی سکہ راج الوقت کا اہل ہل ہوا کرتی ہے۔ غاصب طبقوں کے افراد کا پسندیدہ آدمی آرمودہ بارڈر سسٹم میں نے تیری سفارش پر کام کر دیا۔ میرے اکاونٹ میں کریڈٹ کر لے۔ جب میرا نقد یا فو کال موصول ہو تو حساب برابر کر دینا۔ جن سے کوئی فائدہ پہنچنے کی توقع نہ ہو، اُن کو سفارشی خط نہیں ملا کرتے۔

آفاق احمد ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ مناسب مکان کرائے پر لے کر ماں کو پاس لے آتا۔ یوں چوداں جماعتیں کا پول بھی کھل جاتا۔ بعض بیٹے سمجھتے ہیں کہ خوش گمان ماؤں دل ٹوٹنے سے عرش کا کنگرہ ٹوٹ جائے گا۔ ظلم و جبر کے استحصالی نظام میں پیش چھوٹے بڑے حکومتی اہل کاروں نے ایلیس کے ہاتھ پر بیعت کر رکھی ہوتی ہے۔ ہر روز لاکھوں ماؤں کے دل بیرون تلے چل کر گزر جاتے ہیں۔ اندر ہر ٹکڑے چوٹ راج میں مقدر بھی شاید بے کسوں سے ناراض ہو جاتا ہے۔ ہمت مرداں، مدد خدا کو ترس جاتی ہے۔ تاہم کچھ مرد، طاغوتی دیوتا کے چرن چھو کر آشیر باد حاصل کرتے ہیں۔ ریاستی قانون کو سدھار کھیل ڈال لیتے ہیں۔ آفاق خوب جانتا تھا کہ آبائی گھر خالی ہوتے ہی منہ زور درگزر کے قبضے میں چلا جائے گا۔ وہ آج بھی اُس کو دیکھتے ہی ”او دیو، اوئے دیو“ کہہ کر بلا یا کرتے تھے۔ اپنی نئی شناخت اور نام بتا بھی دیتا تو ٹھٹھا اڑایا جاتا۔ مبینہ دو مبینہ بعد گھر جاتا تو یوں گویا چور اندھیرے میں دبے پاؤں آیا ہو۔ ایک آدھ دن اندر ہی گزار کر کھری کو نکل آتا۔

مہدی علی کی ماں صفائی بھی شریفاں بی بی کے نقش قدم پر چل رہی تھی۔ اندرون شہر سے اس لیے نکل آئی کہ قریبی رشتہ داروں کی اولادیں، اُس کے خیمہ اکھوتے بیٹے کو کھانا نشانہ بنائے رکھیں۔ صفائی کے مشاغل بھی شریفاں بی بی کے سے تھے۔ عبادت گزار تھی۔ بیٹے کو ذہن نشین کرا دیا کہ چوری کرنے اور جھوٹ بولنے سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ حالانکہ گھر میں کچھ تھا ہی نہیں کہ برکت شامل ہو پائی۔ بچوں کی فیکٹری میں پیالوں کی چھائی کرتی اور نماز پڑھتی۔ بیٹے اچھا انسان بننے کی ہر وقت نصیحتیں کرتی۔ لینڈ لیدی شریفاں بی بی کی روشن مثال کو ہمیشہ پیش نظر رکھتی، جس نے گھر روزے رکھ کر اور وظائف کر کر کے بیٹے کو چودہ جماعتیں

پڑھا دیں۔ اُس نے بھی یہی مقصد حیات بنالیا۔ انیس تیس برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ بیٹا پیدا ہونے کے دو ماہ بعد ہی خاندان ٹریفک حادثے میں مر گیا۔ بے نوا شہری کے مرجانے کے باوجود افراد کو اطمینان قلب کی وافر نعمت میسر رہتی ہے کہ جلالہ کی رضامندی وہی ہوا۔ بیوہ اور اس کے بچے کا پالنہ ہار وہی نسل چھت والا ہے۔ لہذا وہ حکومتوں والا جانے اور اُس کا کام۔ اہل ثروت کے ٹکلوں پر نہیں برستا ہے اور غریب بستیوں پر بھوک اترتی ہے تو یہ ادب پر والے کی منشا ہے۔

صفائی اپنی ماں اور بہن بھائیوں کے لاشے اور سب اٹائے مشرقی پنجاب میں ہی چھوڑ آئی تھی مگر یوں اور خصوص لب و لہجہ بڑی چابکدستی سے بلوایوں کی نظروں سے بچا لائی۔ خود کو پاں، بیٹے کو پوت، فیس کو چھٹا اور گھومنے کو گھسٹوں لہتی۔ کیوں کے خشک پھٹکے جیسی رنگت والی اس عورت کی جھب اور نین کش کبھی بڑے پرکشش رہے ہوں گے۔ بیٹا بھی ماں جیسا ہی تھا۔ دین کے سامنے والوں کا معاشرہ، جوانی میں بیوگی کاٹنے والیوں کو جس کڑے امتحان سے گزارتا ہے، اس سے سرخرو ہو کر نکلنے والی ماں کا رتبہ ویوں سے کم نہیں ہوتا۔

شریفاں بی بی اپنے بیٹے کو ”سی“ جج (session judge) کی کرسی پر بٹھانے کے لیے وظیفہ کرتے کرتے اتنی بے تار ہوئی کہ اپنا جذباتی مضطر پر چھو کر، وقتی عرضی لیے بذات خود اللہ کے حضور حاضر ہوئی۔ مہدی علی ابھی تیسری جماعت میں تھا، اس لیے صفائی نے دوبارہ الٹی میں ذاتی پیشی موخر کیے رنجی۔ چوری نہیں کرنی، جھوٹ نہیں بولنا اور ہر وہ کام جس سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع کیا ہے، نزدیک نہیں جانا۔ یہی راجھا اصول اس کم سن لڑکے کی فطرت ثانیہ بن گئے۔ ماں نے ذہن نشین کرا رکھا تھا کہ مجبوری بن جائے تو بندہ چیز مانگ لے، یا جن سے کچھ لیا ہو، اُن کا کوئی محنت طلب کام کر کے حساب چکاوے۔ ممبر کرنے والے کو اللہ اجر ضرور دیتا ہے۔ ایک دن کا فائدہ ہو جانے سے بندہ نہیں جاتا۔

مہدی علی کو کوئی پیچیدہ الجھن درپیش تھی کہ پڑھائی میں لائق ہونے کے باوجود تیار کر لولنا۔ جن الفاظ کی سلاخ کھوڑی بولنا۔ اس کی ادائیگی درست نہ کر پاتا۔ تجھڑی کو ذات کی نفی کر کے اسی مائیں جو بے سروسامانی کے عالم میں اپنی اپنی جنڈری کھول دیتی ہیں صفائی جنڈری کو چند بولتی۔ بچے کے ننھے دماغ میں ”ماں جھوٹی“ کے بجائے صرف ”ماں

گھوٹی“ کے الفاظ نقش ہو کر رہ گئے۔ وہ ماں کو مخاطب بھی اسی طرح کیا کرتا۔ ”ماں گھوٹی، اوہ ماں گھوٹی۔“

اندرون شہر میں قریبی رشتہ داروں کے ہمراہ رہتے ہوئے صفائی کے دل پر چر کے لگتے ہی رہتے تھے۔ اس کی غیر موجودگی میں بیٹے کو کزن کی تفریح کا سامان بننا پڑتا۔ تین منزلہ بڑے سے گھر کا ایک ہی صحن تھا۔ ماں بیٹے کے حصے میں صرف ایک کمر آیا تھا۔ صفائی بائری فیکٹری میں پیالوں کی چھائی کر کے دن بھر میں دال روٹی کے پیسے کمالیا کرتی۔ گرمیوں کا موسم ماں بیٹے کے لیے زیادہ سازگار ہوا کرتا۔ ماں بکتی۔ ”پوت کا چھاپا لے لے چھاپا لہ دے۔ ایدھاں ای مگھس جاؤ۔“ (بیٹا! کچھ پکین لو اور تھیں اتار دو۔ ایسے ہی مگھس جائے گی) مہدی کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اس کے تایا زاد بڑے بھائی روزانہ ہی چھوٹے لڑکوں کی کشتیاں کروا دیتے۔ بھائی خادمہ بچیں پیسے کا سکھ سامنے رکھ کر اعلان کرتا۔ ”یہ انعامی رقم ہے، شرط نہیں۔ شرط لگانا اسلام میں حرام ہے اور انعام حلال۔ اللہ کا حکم ہے کہ مسلمان قوم طاقت ور ہو۔ ورڈ میں کرے اور پہلوان بنے۔ آج کا پہلوان مہدی علی ہے۔ کون ہے مائی کا کسل۔ جو اس کے مقابلے میں آئے۔ جیتنے والے کے لیے انعام تیار ہے۔ مہدی علی ہر روز ایک نئے عزم سے اکھاڑے میں اترتا، مگر جا رہا تھا۔ سب لڑکیاں لڑکے نعرے لگانے لگتے۔ مہدی نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ اعلان کرنے لگتا۔ ”اوئے سنو، سب میری بات سنو۔ رات کو میں نے دال کھوڑی (تھوڑی) پی لی تھی۔ آج تین روٹیوں کے ساتھ دو پیالے دال پیوں گا۔ بچو جی! اکل کشتی جیت کے دکھاؤں گا۔“

دن کے وقت ماں فیکٹری گئی ہوتی۔ مہدی اسکول سے واپس آ کر صبح کی پکی ہوئی روٹی، پیاز یا گڑ کے ساتھ کھایا کرتا۔ اس لڑکے کی شخصیت جس طرح سے منفرد انداز میں تشکیل پائی، وہ ایک لحاظ سے قدرت کا کرشمہ ہی تھا۔ ٹھٹھا خول اڑائے جانے پر مشتعل ہونے کے بجائے ہندو نصائح کرنے لگتا۔ باقاعدہ کئی مبلغی طرح یہ آواز بلند تقریر شروع کر دیتا۔ ”میرا مذاق اڑانے سے تم سب کو کتنا ہو رہا ہے اور میرے گناہ معاف ہو رہے ہیں۔ یہ بات ماسٹر نڈرہ صاحب نے بتائی ہے اور میری اماں نے بھی۔ شاباش بچو! خوب میرا مذاق اڑاؤ۔ میرا فائدہ ہو رہا ہے۔“

مہدی کی چودہ پندرہ سالہ چھوٹی زاد بہن سکینہ اس بھولے بھالے لڑکے کو خیمہ مشق بنا کر کچھ زیادہ ہی خط اٹھاتی۔ اپنے ذمے پڑے کاموں میں سے کئی اس ننھے

ماموں زاد سے کروانے کے لیے کوئی بچی کبھی چیز کھلا دیا کرتی۔ وہ خود ہی پیشکش کر دیتا۔

”باجی! اب کوئی کام بتاؤ۔ اماں کہتی ہے، مزدوری کر کے کھانے میں کوئی خرابی نہیں۔“ نیاز کھا کر کبھی خوشی کام کرنے پر آمادہ ہو جایا کرتا۔ کسی روز تاتی چاچی پھوپھوں سے کوئی کھانا کھلا دیتی تو خوب سیر ہو کر کھڑا ہو جاتا اور پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہتا۔ ”اتنا اچھا کھانا کھلایا ہے، اب کوئی بڑا سا کام بتاؤ۔“

مہدی ایک اور مجھے کا بھی شکار ہوا رہتا۔ اس کو پتا نہیں چلتا تھا کہ پیٹ بھر گیا ہے یا نہیں۔ ماں بیٹا اکثر سرشام ہی کھانا کھالیا کرتے۔ اصل میں جو بیٹے کھٹھوں کے دوران دونوں کا بھی ایک پورا کھانا ہوا کرتا تھا۔ ماں روٹی پکا رہی ہوتی اور وہ کھانے چلا جاتا۔ ماں کہتی۔ ”پیٹ بھرا یا ابھی نہیں؟“ وہ بھولا سا منہ بنا کر کہتا۔ ”مجھے نہیں پتا ماں گھولی! تم بتاؤ، اگر بھر گیا ہے تو کھانا چھوڑ دیتا ہوں۔“ ماں کا دل نادیدہ گرفت میں آ جاتا۔ رو ہا ہا ہو کر بیٹے کو دیکھتی۔ سوچنے لگتی کہ دو چپاٹیوں کے ساتھ پیالہ دال بھی منسوب کیا ہے۔ کیا کروں؟ روک دوں یا کھانے دوں؟ کیا پتا، ابھی بھوکا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی دل پر گھونسا پڑتا۔ بول اٹھتی۔ ”تھوڑی سی اور کھالو۔“ روٹی کا تیسرا اھڑ توڑ کر بیٹے کے آگے رکھتی اور تھوڑی سی دال بھی پیالے میں ڈال دیتی۔ مہدی جلد ہی روٹی ختم کر لیتا اور ماں سے کہتا۔ ”ماں گھولی! کھوڑی سی دال بچ گئی ہے، کھوڑی سی روٹی اور دے دو۔“ اگلے مرحلے پر کہتا۔ ”ماں گھولی، کھو۔ ڈی سی روٹی بچ گئی ہے، کھوڑی سی دال اور دے دو۔“ اس حکمت عملی کا حاصل یہ ہوتا کہ وہ کم و بیش ایک روٹی اور کھانا جاتا۔ دال چونکہ پانی جیسا پلا شوربا ہوا کرتی اس لیے روٹی کھانے کا انداز وہی تھا، جس طرح بیج کے ناشتے میں نوالہ منہ میں ڈال کر چائے کا کھونٹ لیا جاتا۔

صغریٰ اندر ہی اندر غم کھانے والی عورت تھی۔ چھوٹے بڑے رشتہ دار بچوں کی جانب سے مہدی کے ساتھ روا رکھی گئی زیادتیوں پر چپ چاپ آنسو بہا کر صبر کر لیا کرتی۔ مگر ایک دن ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ فیصلہ کر لیا کہ جلد سے جلد بیٹے کو لے کر یہاں سے نکل جائے۔ اُس روز حسب معمول عصر کے بعد فیکٹری سے واپس گھر پہنچی تو دیکھا کہ بیٹے کا پیٹ قدرے زیادہ پھولا پھولا سا ہے اور نیل پڑے ہوئے ہیں۔ دل گرفتہ ہو کر وجہ پوچھی تو خدا داد ہمت اور حوصلے کا مظہر تھا مرد، سینہ پھلا کر حسب عادت بلند آواز میں بولا۔ ”روٹی کیوں ہوا

اسکول سے آکر میں نے باجی سکینے سے کہا۔ کھوڑا سا گڑوے دو یا کھنڈا (پیناز)۔۔۔۔۔۔ روٹی کھاتی ہے۔ اماں فیکٹری سے واپس پر کھنڈے لائے کی تو تم واپس لے لیتا، ابھی کوئی کام کروالو۔ باجی کہنے لگی۔ برتن اور روٹی کا فرش دھو لیا ہے۔ صحن میں جھاڑ دھبی دے چکی ہوں۔ اس وقت کوئی کام نہیں۔ میں کھنڈا دے دیتی ہوں مگر یہی سب بہت بڑے بڑے۔ تم مفت میں لیتے بھی نہیں۔ ایسا کرو، اپنے پیٹ پر مگن کے دس جو تے مارو۔ میرا تیرا حساب برابر ہو جائے گا۔ باجی نے پاؤں سے سپر اتار کر کہا کہ بے ایمانی نہ کرنا۔ اگر تم نے جو تے آہستہ مارے تو بڑا سخت گناہ ہوگا۔ کھنڈا کھانا تم پر حرام ہو جائے گا۔ اگلے جہاں میرا حساب کیسے برابر کرو گے؟ وہاں کھنڈے ملیں گے ہی نہیں اور بھی سچی نہیں ہوتے۔ میں نے کہا کہ بات ہی کوئی نہیں باجی اماں گھولی نے بتایا ہوا ہے، بے ایمانی بالکل نہیں کرتی۔ تم دیکھتی رہنا۔۔۔۔۔۔ میں نے سات جو تے اپنے پیٹ پر اتنے زور سے مارے کہ سب نے تالیاں بجا کر شاباش دی۔۔۔۔۔۔ تب تک صغریٰ کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ وہ بیروں کے بل چولے کے قریب بیٹھی تھی۔ خود کو سنبھالنا مشکل ہوا تو پھر چڑی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تب تک ہمت جواب دے چکی تھی۔ دھم سے بدن فرش پر ڈال دیا۔ مہدی پر اپنی اٹلی کار کردی اور دیانت داری کا احوال بیان کرنے کی ذمہ دہن پر دستور سوار تھی۔ اپنا دایاں بازو اونچا کر کے بڑے جوش سے بولنے لگا۔ ”یہ بازو تھک گیا تو میں نے بائیں ہاتھ سے تین جو تے اور مارے۔ مگر وہ بہت آہستہ لگے۔ میں سمجھ گیا کہ بے ایمانی ہو گئی ہے اور یہ بہت بری بات ہے۔ اللہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ پھر میں نے مرٹے کی طرح دونوں بازو زور زور سے پھڑ پھڑائے تو طاقت آگئی۔ پھر تین جو تے اور مار دے۔ وہ بڑے ٹھیک ٹھیک لگے۔ کل تیرا نے اور زیادہ شاباش دی۔ باجی کہنے لگی۔ اب تم پر کھنڈا لنگل حلال ہے۔ جاؤ کھاؤ عیش کرو۔“ بے کس ماں کی روح فنا ہو گئی اور بیٹے کو بائیںوں میں بھر کر زور دھنسا روٹی۔

کہتے ہیں، مظلوم کی فریاد ساتویں آسمان تک پہنچتی ہے۔ حقیقت ہے یا افسانہ یا پھر ایک ایسا معما، جو شاید ہی مت کھل پائے۔ رقت بھرے اُن لمحات میں ساتوں آسمان زمین اور کل کائنات کا نظام اسی طرح مربوط اور قائم و دائم رہا یا پھر ننھا مہدی علی اپنے موقف پر مضبوطی سے ڈٹا ہوا تھا۔ ماں کی گردن کے گرد بازو ڈال کر، کال چوستے ہوئے معمول کے اونچے لہجے اور اعتماد سے بولا۔ ”روٹی کیوں ہوا

گھولی! خود ہی کہتی ہو، حرام کا ایک نورالہجی منہ میں چلا جائے تو اللہ کو حساب دینا پڑے گا۔“ ماں نے خوب رو لیا تو بیٹے کو اگ کیا۔ ایک نگاہ چھر پیٹ پر ڈالی۔ نیلی رنگیں زیادہ نمایاں ہو رہی تھیں۔ ڈھنکی ہوئی آواز میں بولی۔ ”پنت اچھا پائے“ (پینا ایس پہن لو)۔

جن ریاستوں میں ظلم، نا انصافی اور لوٹ کھسوٹ کا نظام قائم ہوتا ہے، ان کی بیشتر مائیں بھکاریاں یا کسیاں بن جاتی ہیں اور مرد کم و بیش سارے ہی بے غیرت۔ بھکاری ان اپنی بھیک اور کبھی اپنی خرچی میں سے جو روٹی بچوں کے لیے خرید کر کھلاتی ہے، اس پر ریاست پیشگی ٹیکس وصول کر چکی ہوتی ہے۔ اس ٹیکس پر حکومتی اہل کاروں کے علاوہ حاکم وقت عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ عالی شان محلات، رشہ و کھواب، ہیرے جواہرات، اعلیٰ ترین پھل میوے باکولات و شروبات، شراب اور عورتیں۔ جو مائیں جوانی میں بیوہ ہو کر زلت آمیز کسپری میں آلائشوں سے دامن بجا کر نکل جاتی ہیں، ان کی دادا استحصالی معاشروں میں نہیں ملا کرتی۔

ماں کی دائمی جدائی کے بعد آفاق احمد نے بڑی راز داری سے مکان بچ کر اسلام آباد کے مصفاات میں پانچ مرلے کا پلاٹ خرید لیا اور اس پر تعمیر شروع کر دی۔ دوبارہ

کبھی بھول کر بھی گجرات نہیں گیا۔ مہدی علی کی باتیں یاد تھیں۔ اُس کو اپنے کمرے کی کھڑکی سے سخن میں کئی بار دیکھا تھا۔ مہدی نے بھی شاید اس کو سرسری سا دیکھا ہو۔ اولاد کو حلال کارزق کھلانے والی مائیں مگر اپنے پیچھے درد بھری یادیں چھوڑ جاتی ہیں۔ آفاق احمد کو ماں بہت یاد آیا کرتی اور اس موقع پر صغریٰ کا چہرہ بھی نظروں کے سامنے آ جاتا۔ کبھی کبھی دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ ان ماں بیٹا کے بارے میں پتا لگائے۔ لیکن وہ رشتہ داروں میں اپنا سراغ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس پر چھائی ازلی اداسی اور تنہید ہر طلوع ہونے والے دن میں مزید گہر ہوئی جاتی۔ وہ اب حکمرانوں کے شہر کا مستقل شہری تھا۔ آفاق کے پاس رہنے کو شاندار پُر آسائش گھر اور متولی عام میک کی گاڑی زیر استعمال تھی۔ پھر بھی دن بھر لیوں پر مسکراہٹ نہ آتی۔ مگر بیٹی کے یونیورسٹی سے لوٹنے پر دل سے حقیقی خوشی پھوٹ کر لیوں پر آ جاتی۔ دونوں باتیں کرتے، خوب ہنستے، گویا مین ہی اس کی زندگی کا حاصل ہو۔ سبھی بھولی، پرکشش اور نفیس طبع ایم اسے کی طالبہ۔ باپ بیٹی اگلے گھونٹے نکلے، تفریحی مقامات اور ریسٹورنٹ میں نظر آیا کرتے۔ کبھی کبھی لمبی ڈرائیو پر نکل جاتے۔ دونوں کے مابین بے تکلفی تھی، مگر ہمیشہ ایک چلن بھی

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

وسط سرکاری اگلیاں
مارچ 2013ء کی تقریبیاتی

سرورق کی کھانیاں

پھلی کھانی ● جنون عشق میں سبک دشت ہو جانے والوں کا قصہ دل گذار
دوسری کھانی ● جاسوسی اور تھرلر کے سنگ لمحہ۔ لوجہ گیمبر داستان کی لڑائیاں
اولین صفحات ● زندگی کے صحرائیں تنہا بھٹکی لڑکی کی کہانی... جس کے گرد زندگی کا دائرہ تنگ ہو رہا تھا... سلیم فاروقی کے قلم کی سبک رفتاری

گرداب ● واقعات کے گرداب میں گرفتار کروں گا تیرا دل... اسما قادری کا سلسلہ
لکار ● محبت کی کئی شکلیں... محبت کے بڑے شعلے طاہر جاوید مغل کی کہانی

مغرب کے نالے انداز
مغربی دنیا کی تین تین احوال کی جو کہ ترجم اور محبت کی ہر ذرہ نایاب نثر شمس الدین

آپ کے تہہ...
مشوے...
اور نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

حائل رہی۔ باپ بیٹی کے باہمی تقدس کی ادب۔ دل میں خواہش ہمیشہ بیدار ہوتی کہ بیٹی کو زندگی کا اچھا سماجی ملے مجلس اور وفادار جس کی نظراس کی دولت پر نہ ہو محض شخصی خوبیاں مد نظر ہوں۔ سوچنے لگتا کہ بیٹی کے لیے ایسا گہرا تیاہ کہاں سے ڈھونڈ لائے۔ باتوں باتوں میں پوچھ بھی لیا کہ شاید کوئی یونیورسٹی فیلو دل بچھا ہو۔ سمن جینپ کرشمکاردی اور بولی۔ ”بہنیں! اہو! اتنے پیچھو رہے، اوجھے، شوئے اور ہونکے لڑکے، کوئی سنجیدہ دیکھ لی دیا بھی تو سوڈو انٹلیجنسٹ..... جھوٹا اور مکار۔ فیض احمد فیض کے اسٹائل میں اسونگ کرنے اور شعر پڑھنے یاچی گویا کا ساحلیہ بنا لینے سے بندہ انقلاب نہیں ہو جاتا۔ میرا کوئی ایسا خاص آئیڈیل بھی نہیں۔ بھلے عام سا ہو، سادہ قبول صورت مگر ظاہر و باطن میں ایک جیسا۔“ ذرا سا توقف کر کے مسکرائی اور مزید کہا۔ ”آپ جیسا۔“ باپ نے بیٹی کے سر پر ہوسو دیا۔ ”آکھیں نم ہو گئیں۔ کہنے لگا۔“

”بیٹا! مجھے بھی آئیڈیل پلانز نہ کرتا۔ بہت معمولی انسان ہوں۔ مجھے صرف زندگی میں ماں نے پسند کیا تھا۔ تم میری روح کا حصہ ہو۔ اپنی نگاہ بلند رکھو۔“

آفاق احمد نے سب سے پہلا پلاٹ ٹیکم ظاہرہ خان سے خرید لیا تھا۔ پانچ مرلہ رقبے پر سادہ مگر پائیدار و منزلہ گھر تعمیر کے آخری مراحل میں تھا کہ تقریباً تین لاکھ روپے متانف پر کھڑے کھڑے بک گیا۔ وقت سانح کے بغیر، اسی خاتون سے دس مرلہ کا ایک اور پلاٹ خرید کر تعمیراتی کام کا آغاز کر دیا۔ راولپنڈی کی مقامی عورت ظاہرہ خان سے دوسرا پلاٹ خریدتے ہوئے کاروباری تعلقات میں ٹھوڑی سی بے تکلفی راہ پا گئی۔ اسلام آباد راولپنڈی میں درجنوں رہائشی و کمرشل پلاٹوں کے علاوہ مضامقات میں ایکڑوں زمین کی مالک بالدار خاتون اپنے سچی اور کاروباری معاملات میں خود بخیر تھی۔ آفاق احمد سے عمریں آٹھ دس برس بڑی ہوئی۔ پہلے مرحلے پر آفاق کو بھائی بنایا مگر سنجیدہ اور سادہ مزاج بھائی پر بہت جلد منہ بولی بہن کے اصل عزائم مکمل کئے۔ تب بھی اغلاس کا دامن نہیں چھوڑا اور نکاح کر لیا۔ سمن کی صورت میں قدرت کی طرف سے اولاد کا تحفہ بھی مل گیا۔ تاہم زوجگی کے موقع پر چچیدہ آپریشن ہوا جس کے نتیجے میں آئندہ اس نعمت کی توقع نہ رہی۔ آفاق کا ذاتی کاروبار خوب چکا اور بدستور وسعت پذیر تھا۔ جلد ہی انکشاف ہو گیا کہ بیٹے صاحب اس کے عقد میں آنے سے قبل دوبار متعلق لے چکی تھیں۔ اب بھی گونا گوں دلچسپیوں کا محور ایک ہی تھا۔ جانکاد کی دیکھ بھال اور بھاگ دوڑ کے لیے کوئی نوجوان، بہ طور منجر رکھتی اور

جب جی میں آتا، فارغ کر دیتی۔

عورت ذات کے بارے میں آفاق کا بلند تصور مجروح ہوا مگر حقیقت کر لیا کہ وہ کسی بھی صورت میں ہارس نہیں۔ خود کو یاد دلایا کرتا کہ اس نے عورت ذات شریفان لی بی کے روپ میں دیکھ رکھا ہے۔ اور ایک منہ بھی تھی۔ اللہ کرے وہ اور اس کا بیٹا، دونوں حیات ہوں بیٹی سے بے پناہ محبت تھی۔ سینے پر ممبر کی بھاری سیل رکھ اور دل سے فیصلہ کر لیا کہ عزیز از جان مصوم زوج کو کوڑے ہونے گھر کے اذیت ناک تجربے سے کبھی نہیں گزرا رہے گا۔ اولاد کی محبت میں بھری جوانی قربان کرتے ہوئے ماں کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی تو باپ اتنا پر کیوں ثابت ہو؟ آبا کی گھر کے صحن میں صغریٰ اس کی مرحومہ ماں سے باتیں کرتی ہوئی سنائی دینے لگی۔ ”بارا ایک بار دیکھا یادس بار، میں اب شادی بھی نہ کر رہی کی..... ماں گھولی! کھوڑی روٹی بیچ گئی ہے، کھوڑی وال دے دے..... پیٹ پر پڑے نل اور ابھری رہیں دیکھ کر ماں نے بیٹے سے کہا تھا۔“ پُت! اچھا کھائے“ صغریٰ اپنے سارے درد شریفان کے سامنے کھول دیا کرتی۔ دونوں عورتوں کی باتیں ہی ختم نہ ہوتیں۔ اپنے بیٹے کی خاطر کمرے کے درستی حقوق سے دست بردار ہو گئی۔ قریبی رشتہ داروں کی اصل سازش سمجھ گئی تھی۔ ایک دن پوچھنے پر کہ مہدی کو کتنی بھوک لگتی ہے، کہنے لگی۔ ”کیا بتاؤں خالہ جی! اس لڑکے کی ساری باتیں ہی زانی ہیں۔ جب تک پوچھوں، پُت! روٹی کب کھاؤ گے؟ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا ہے۔ ماں گھولی! ابھی دے دو، شام کو دے دو، جب دوک، کھانوں گا۔ میں کہوں، اگر آج نہ ہوئی تو؟ کہتا ہے۔ پھر کل کھانوں گا۔ میں پوچھتی ہوں، کتنی بھوک ہے؟ گردن نیچر می کر کے جواب دیتا ہے، پتا نہیں ماں گھولی! کھوڑی ہوئی کھوڑی کھانوں گا۔“ زیادہ ہوئی زیادہ کھانوں گا۔ کبھی کسی چیز کی ضد نہیں کی۔ جو بھوک خور امان جاتا ہے۔“ ظاہرہ خان کسی چچیدہ نفسیاتی مرض کا شکار تھی۔ کبھی خود احتسابی کا دورہ بھی پڑتا۔ اپنے آپ کو خوب کوئی معافیاں مانگتی اور آفاق سے لپٹ کر آٹھ آٹھ آنسو روٹی چہرے پر بوسے دیتی اور ہاتھ پوتی۔ وہ ہاتھوں میں کر سیتے سے لگا لیتا اور تسلیاں دیتا۔ مگر رات گئی اور بات کئی موقع برابر آتے ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتی۔ غوت غود کر آتی۔ بڑی ڈھٹائی سے غم ٹھونک کر کہتی۔ ”کر جو کرنا ہے۔“

بیٹی اسکول جانے لگی تو میاں بیوی میں طویل مکالمہ ہوا۔ آخر کار وہ بیچ ہو کر بولی۔ ”مجھے طلاق لینے کا شوق بھی نہیں۔ لیکن تم میرے معاملات میں دخل نہیں دو گے۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہیں بیٹی سے محبت ہے اور اس کے مستقبل کی فکر رکھتے ہو۔ میرا بھی سمن کے سوا کوئی نہیں۔ میں خود جانتی ہوں کہ تمہارے اور میرے ٹوٹے ہوئے تعلق کی حقیقت کسی پر نہ کھلے۔ تمہاری تجویز ٹھیک ہے۔ تم باپ بیٹی اور والے پورشن میں شفٹ ہو جاؤ۔ کاروبار پہلے ہی ہم دونوں کا اپنا اپنا ہے۔ پھر صرف مشنر کہ ہے سمن کے سوا اس کا کوئی اور وارث بھی نہیں۔ اسٹیر کیس اور لاؤنج کی پارٹیشن جس طرح تم نے سوچ رکھی ہے، بے شک کارو۔ لیکن ہلکی پھلکی اور نفس ہونی چاہیے۔ لکڑی اور گراندز گلاس وغیرہ لکڑی۔ میں تمہیں دیکھوں نہ تم آتے جاتے مجھے دیکھ باؤ۔ باقی گھر کا نظام اسی طرح چلتا رہے گا۔ صفائی تھرائی اور دوسرے کام کرنے والی عورتیں دوپہر تک فارغ ہو کر چلی جایا کریں گی۔ گھر میں ملازموں کی ہر وقت موجودگی مجھے بری لگتی ہے۔ تم باپ بیٹی کی غیر موجودگی میں اوپر سارے کام ہو جایا کریں گے۔“

چودہ پندرہ برس اسی طرح بیت گئے۔ بہت سوچ بچار کے بعد آفاق نے بیٹی سے کہا کہ امتحانات نزدیک ہیں، بہتر ہوگا کہ وہ دس تین ماہ کے لیے یونیورسٹی ہوسٹل میں شفٹ ہو جائے۔ سمن نے لمحہ بھر باپ کی آنکھوں میں دیکھا، مگر سوال کرنے سے کتر گئی۔ مہادا مناسب جواب دینے میں شفیق باپ کو مشکل پڑے۔ بیٹی کے بولنے سے پہلے ہی وہ دوبارہ بول پڑا۔ ”میں روزانہ شام کو آ جایا کروں گا اپنی بیٹی سے ملنے..... کھانا ہر روز باہر کھایا کریں گے۔ بھی فائین اسٹار اور بھی فوڈ اسٹریٹ۔“ سمن مسکرا کر رہ گئی۔ وہ سب بھی تھی مگر باپ پر یہی ظاہر کرتی، گویا کچھ نہیں جانتی۔ باپ کی تقلید کرتے ہوئے دل میں اترتی ادا کی پر بھاری سیل رکھ دی۔ کہنے لگی۔

”ٹھیک ہے ابو۔ میں ہوسٹل چلی جاتی ہوں۔ لیکن آپ ہر روز کیوں آئیں گے؟..... کام کا خارج ہوگا۔“ باپ کے چہرے سے لطائیت جھلکنے لگی۔ پیار سے پچکار کر بولا۔ ”وہ اس لیے کہ ابا اپنی بیٹی کی جدائی سے اداس ہو جایا کرے گا۔ اور حرج کیا ہوتا ہے؟ چاروں بچوں کا کام بڑے اسوتھ چل رہے ہیں۔ دن کے وقت ایک چکر ہی لگتا ہوتا ہے۔ شام کو جب معمول میری بھی آڈننگ ہو جایا کرے گی۔“ ذرا سوچ کر مسکرایا اور بولا۔ ”باپ بیٹی کو عادت بھی ہو گئی ہے ناں شام کو آوارہ گردی کرنے کی۔“

دونوں یک بارگی ہنس پڑے۔ اولاد سے روح کا رشتہ جڑا ہو تو دوطرفہ نازک احساسات اور ضروری پیغامات لاسکی واسطے سے ہی ایک دوسرے کو مکمل ہو جاتے ہیں۔

بڑے سے بڑے عہد میں بھی، خوش گمان ماؤں میں سے اکاؤ کا کی دعا، بدی کے کوتاہیوں کو دے کر آسمان تک بلند ہوئی جاتی ہے۔ آفاق احمد، تیشن جج نہ بن سکا مگر گل جنگ میں گنا ہوں یا جانوں کا بیو پار جتنا مال کھینچا جا سکتا ہے، کم و بیش اتنا ہی وہ ہر تقریر شدہ مکان کی فردخت پر بربہ آسانی کمالیا کرتا۔ آمدن کے مقابلے میں اخراجات نہ ہونے کے برابر تھے۔ گزشتہ بیس بائیس برسوں سے گھر کے معمولات تقریباً لگے بندھے تھے۔ وہ بہت صبح اٹھ کر اپنا ناشتا خود تیار کیا کرتا اور ستر پڑھوڑوں کے آنے سے پہلے کسی نہ کسی تعمیراتی کام پر پہنچ جاتا۔ جہاں جہاں کام ہو رہے ہوتے، دن بھر کھوم پھر کے باری باری سب کی گھرائی کیا کرتا۔ دن کو ہلکا ہلکا کھانا باہر ہی کھا لیتا۔ پچھلے پھر گھر لوٹ کر سردیوں گرمیوں میں آدھے سے پونے کھٹے کی نیند ضرور پوری کیا کرتا۔ شام کو باپ بیٹی تیار ہو کر باہر گھومنے کو نکل جایا کرتے۔ اب بھی وہی معمول رہا۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ شام کو ہوسٹل چلا جاتا اور باپ بیٹی دو اڑھائی گھنٹے ایک ساتھ گزرا لیا کرتے۔

بڑواں شہروں میں سردیاں ظلم ڈھاتی ہیں۔ بارش ہونے لگے تو برقیلا پانی برستا ہے۔ بیٹی کو ہوسٹل چھوڑ کر آفاق واپس ہونے لگا تو ہلکی بارش برسنے لگی۔ جس طرح کی گٹھا چھائی ہوئی تھی، امکان تھا کہ موسلا دھار برے گی۔ سوچنے لگا، سیدھا گھر جاؤں اور ناشتے کے لیے ڈبل روٹی ساتھ والی مارکیٹ سے لے لوں۔ مگر دل نہیں مانا۔ پسند کی ڈبل روٹی مرکز سے ہی دستیاب تھی۔ لہذا ایک آدھ میل کے چکر کو خاطر میں لائے بغیر گاڑی موڑ لی۔ اس اثنا میں بارش بھی مکمل کر ہونے لگی۔

بیکری سے ڈبل روٹی کے ساتھ کچھ اور اشیائے خورد و نوش لے کر باہر آیا تو آسمان سے پانی آبشار کے مانند گرنے لگا۔ برآمدے میں چلتا ہوا بارنگ کے نزدیک آ گیا۔ سامنے کھڑے نوجوان پر نظر پڑی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں شانینگ بیگ لٹکار رکھے تھے، جن سے تازہ پکے ہوئے گوشت اور دیگر لوازمات کی تیز مہک اٹھ رہی تھی۔ سر پر ترقی چھتری کو سنبھالنے میں وہ دقت محسوس کر رہا تھا۔ بارش کی تیز ہوا چھاڑ آئی تو دونوں پیچھے ہٹ گئے۔ اسی نوجوان نے گزشتہ دو ماہ سے انیسکی آباد کر رکھی تھی۔ اس کے جوگر زار و جینز گھٹنوں تک بیک رہی تھی۔ وہ متلاشی نگاہوں سے پارنگ کی طرف دیکھ

رہا تھا، گو یا گھر جانے کی جلدی ہو۔ گھر میں جب بھی دونوں کا سامنا ہوتا تو آفاق نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی مگر نوجوان نے ہر مرتبہ سلام دعا کرنے میں بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ اس دراز قد، خوش شکل نوجوان کے پاٹ دار آواز میں بولنے کے مخصوص انداز اور لب و لہجے سے آفاق کو داغ میں ہر مرتبہ اٹھل پھٹل ہی ہوتی محسوس ہوتی مگر کچھ سمجھ نہ پایا۔ آفاق نے اس کو اپنی جانب متوجہ کر کے کہا کہ دو اتنی دور سو دینے پیدل کیوں آیا ہے۔ اُس نے جھٹ گردن گھمائی اور آفاق پر نظر پڑتے ہی چونک گیا۔ قدرے بلند آواز میں بولا۔ ”السلام علیکم۔ سر آپ.....؟“ اُس کی پُر تپاک لاؤڈ آواز سن کر آفاق کا ذہن الجھنے لگا۔ وہ اسی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”سر! کھانا بنوایا ہے اور انڈے ڈبل روٹی لی ہے۔“ چہرے کا رخ ریٹورنٹ کی طرف کرتے ہوئے دوبارہ بولنے لگا۔ ”یہاں سے یون لیس ہانڈی بنوائی ہے..... اور ڈبل روٹی بھی اس سامنے والی بیکری سے لینی تھی۔“ آفاق نے کوئی جواب نہیں دیا مگر وہ بولتا گیا۔ ”ٹیکسی نہیں ملی، اس لیے پیدل چل پڑا۔“..... ذرا سانس لیا اور بات وہاں سے پھر شروع کر دی، جہاں چھوڑی تھی۔ ”آدھا فاصلہ طے ہو گیا تو تین ٹیکسی والوں نے باری باری ہارن دے کے مجھے متوجہ کیا۔ لیکن میں نے سوچا، اب آدھے پونے کلومیٹر کے لیے کیوں ٹیکسی لوں..... سر! مجھے پیدل چلنے کی ویسے بھی بہت عادت ہے۔ دن بھر میں تیس تیس کلومیٹر پیدل چلنا میرے لیے کوئی مشکل نہیں۔ ویسے اسی جان مجھے گاڑی چلانا سکھا رہی ہیں۔ انہی نے گاڑی نکالنے کو کہا لیکن میں خود ہی نہیں لایا۔ ابھی پوری مہارت حاصل نہیں ہوئی، اس لیے.....“

آفاق کو یوں لگا، جیسے آسمان پر چمکنے والی بجلی کا کوندا اس کے بدن سے چھو گیا ہو۔ وہ مسکلا بولے جا رہا تھا، مگر اس نے نوک دیا۔ ”کون اسی جان!“

وہ جھٹ بولا۔ ”سر! یہی جی..... میڈم طاہرہ خان۔ بڑی رحم دل خاتون ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اڑھائی ماہ پہلے میری نظر چھوٹے سے ایڈ پر پڑ گئی۔ لکھا تھا۔ بنگ اسٹارٹ میجر کی ضرورت ہے جو جائداد کی دیکھ بھال کر سکے۔ تجربہ ضروری نہیں۔ امیدوار کا گریجویٹ ہونا کافی ہے۔“ ڈرتے ڈرتے آگیا۔ مرحومہ ماں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔“

سیدھے سادے نوجوان کی بے لاگ سی باتیں سن کر آفاق احمد کے دماغ میں پھر وہی کھد بدھوئے لگی۔ اس کا نام پوچھا تو جواب ملا۔ ”سر مہدی علی نام ہے میرا۔“ اب کی بار جی کا کوندا آفاق احمد کے بدن سے چابک کے مانند لپٹ

گیا۔ جسم گو یا شل ہو رہا ہو۔ یہ نام وہ کبھی نہ بھول سکا۔ پہلی بار سنا تو حیرت ہوئی تھی۔ ماسوائے کسی شاعر، راجا مہدی علی خان کے، یہ نام بھی سنای نہ تھا۔ صرف مہدی یا علی ہوتا تو تعجب کی بات نہ تھی۔ آج تک دوبارہ کوئی ایسا شخص نہ ملا جس کا نام مہدی علی ہو۔ مغربی مرحومہ ہونچلی۔ عجیب سا اطمینان قلب محسوس ہونے لگا۔ شرفیال بی بی کو ہم نشین مل گئی۔ ہم خیال دہم نفس۔ ذہنی ہم آہنگی عمروں کے فاصلے پاٹ دیتی ہے۔ اللہ نے یہ فرمان اپنے کن بندوں کے لیے جاری کیا ہے؟ ”اے اطمینان دہی روح، تُو اپنے رب کی طرف لوٹ چل۔ اس طرح کہ تُو اس سے راضی، وہ تجھ سے خوش۔ پس، میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں چلی جا۔“..... پاک رو جس دہی ہوتی ہیں جو بھلائی کے راستے پر چلی ہوں۔ اس استقامت کے ساتھ کہ کہیں پاؤں نہ پڑے۔ آفاق احمد نے بلا جھجک مہدی علی کے پیٹ پر نگاہ ڈالی۔ وہ ریڑھ کی ہڈی سے لگا ہوا محسوس ہوا۔ دن میں تیس تیس کلومیٹر پیدل چلنے والے نوجوان کا جسم ایسا ہی ہوتا چاہیے۔ نوک زبان پر آنے کو یہ الفاظ لکے۔ ”پٹ اچھکا پائے۔“

دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے تو آفاق نے کہا۔ ”گھر کے ساتھ والی مارکیٹ میں جو ہوٹل ہے، یون لیس ہانڈی وہاں بھی بن جاتی۔ اور ساتھ ہی بیکری بھی تھی۔“ مہدی کہنے لگا۔ ”سر! اسی جان نے منع کر رکھا ہے۔ مارکیٹ اب میں جاتا ہی نہیں۔ بیکری والا راجا بڑا عجیب بندہ ہے۔ شروع میں اس سے ایک دن انڈے لیے۔ سب پر پھٹ لگی ہوئی تھی۔ میں نے انتہائی کہا کہ آپ نے جس ہاتھ سے انڈے اٹھائے ہیں اسی سے باقی سودا نکال رہے ہیں۔ کہنے لگا ہر بار نیا ہاتھ کہاں سے لاؤں؟..... اور ہر مرتبہ دھونے بیٹھ جاؤں تو چھ مہینوں میں میرے ہاتھوں کی چھٹی ہو جائے گی۔ میں نے مزید بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا مگر اس کو چھین نہیں آیا اور پھر بول پڑا۔ ”آپ فکر نہ کریں صاحب بہادر! آج قادم والوں سے کہہ دوں گا کہ مرغیوں کو ہر روز استیجا کروایا کریں۔ ان کے انڈے دینے سے پہلے پہلے، تاکہ صاف ستھرے انڈے دیں۔ پس، آپ ایک وعدہ کریں کہ سودا مجھ سے لیا کریں گے۔“ آفاق کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے میٹر، ڈی نوکر، واپچر اور لائٹس آن کیں۔ اگلی پچھلی اسکرین صاف ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مہدی کے بچپن کی باتیں بھوم کیے ہوئے تھیں۔ اس کی آزمائش کرنے کا خیال آیا تو بول پڑا۔ ”تم نے ناحق مشقت اٹھائی۔ پیدل چلے اور بھیگ

بھی گئے۔ اتنی تیز بارش اور جھکڑوں میں چھتری الٹی مصیبت لگے پڑ جاتی ہے۔ چپ کر کے سودا مارکیٹ سے لے لیا ہوتا۔ تمہاری میڈم کو کیا پتا چلتا تھا۔“

مہدی کے بدن میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہونے کے آثار نظر آئے۔ اُس نے بے چینی سے بدن کو لاسی سی حرکت دی اور معمول سے بلند آواز میں بولا۔ ”نہیں سر! ای جان کو پتا چلے نہ چلے، میں جھوٹ بول کر اپنا اندر میلایوں کیوں کر لوں؟ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کوئی فاصلہ نہیں۔ بھینکنے سے مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ بڑا سخت جان ہوں۔ مگر جا کے کپڑے بدل لوں گا۔ غلط کام کرنے سے بندے کی نیند ہی اڑ جاتی ہے۔“

آفاق احمد کے لبوں پر مسکراہٹ کھل گئی۔ دل میں اطمینان اترنے لگا۔ گاڑی پارکنگ سے نکال کر گھر کا رخ کرتے ہوئے مہدی سے پوچھا کہ اس کی تعلیم کہاں تک ہوئی ہے۔ وہ کہنے لگا۔ ”میں نے ایم اے ہنری کا داخلہ بھیجا ہوا ہے۔ اچھی تیاری ہو رہی ہے۔ ایف اے اور بی اے کا امتحان بھی پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پاس کیا تھا۔ اللہ ای جان کو جزا دے۔ بہت حوصلہ افزائی کر رہی ہیں۔ رات کو بارہ ایک بجے تک بڑے سکون سے اسٹیڈی کرتا ہوں۔ صبح نوں بجے کے درمیان ای جان اٹھ جاتی ہیں تو ناشتا بناتا ہوں۔ پھر ہم باہر کام کاج پر نکل جاتے ہیں۔ جہاں رش ہو، وہاں گاڑی خود چلائی ہیں۔ سڑک کھلی ملے تو مجھے موقع دیتی ہیں۔ میں شلوار قمیض میں آیا تھا۔ نیچے لنڈے کی گرم بنیان پہن رکھی تھی اور پیروں میں ریز کے سلیپر تھے۔ جا رہے تھے گرم لباس دلاوے اور تنخواہ بھی پوری دس ہزار کئی بار گزارش کی ہے کہ مجھ سے کوئی بڑا کام لیا کریں۔ اس طرح روزی حلال نہیں ہوتی۔“ مہدی بولے جا رہا تھا۔ آفاق کا سر چکرانے لگا۔ یوں جیسے موت کے کنوئیں میں اڑھائی سو گھنٹہ فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلا رہا ہو۔

☆☆☆

رات بارہ بجے کے قریب نیچے لاؤنج میں بیٹھنے چلانے کی آواز سنائی دی۔ کچھ برتن کے بعد دیگرے پارٹیشن کے ساتھ ٹکرا کر نیچے گرے اور ٹوٹ گئے۔ ساتھ ہی پارٹیشن کا ایک شیشہ بھی چمٹا کے سے ٹوٹ کر کھڑ گیا۔ آفاق احمد بڑا کراٹھ بیٹھا اور نیچے پاؤں سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ فوراً ہی واپس پلٹا اور بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز سے روٹا اور نکال کر نیچے کی طرف دوڑا۔ وہ یہی سمجھا کہ گھر میں ڈاکوئیں آئے ہیں۔ اوسان خطا ہونے لگے۔ ابھی چند سیڑھیاں ہی اتر آتا تھا کہ بڑی پاٹ دار آواز سنائی دی۔ ”ای جان! میں

ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ نے مجھے بیٹا کہا ہے۔“ آفاق انہی قدموں پر ٹک گیا۔ جواب میں طاہرہ خان کی چلا ہٹ سنائی دی۔

”نکل جاؤ میرے گھر سے ورنہ ابھی پولیس بلا لوں گی۔ پانچ چھ سال نیل میں سڑو گے۔“ آفاق احمد مزید چند سیڑھیاں اتر آکر ہمت جواب دے گی اور وہ لینڈنگ پر بیٹھ گیا۔ سیڑھیوں پر قالین بچھا ہوا تھا مگر ٹھنڈک بدن میں سرایت کرنے کی۔

مہدی کہہ رہا تھا۔ ”بابر بارش ہو رہی ہے۔ میں صبح ناشتا کر کے چلا جاؤں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ کلام پاک پڑھیں۔ میں بھی پڑھتا ہوں۔ انشا اللہ بلائیں جائے گی۔“ طاہرہ نہ جانے کیا کیا بدیان بک رہی تھی۔ لڑکے کے سر سے ہوئے والدین کے بارے میں نازیبا کلمات بولتے ہوئے چلا کر کہا۔

”ناشتا کیوں، میں تمہیں زہر نہ کھلاؤں؟ تم ابھی دفع ہو جاؤ۔ ایک منٹ کے اندر اندر..... اور یہ لباس اتارو۔ اپنی شلوار قمیض پہن کر نکلو۔ تمہارے سلیپر آبیہ نے کوڑے میں پھینک دیے تھے۔ ننگے پاؤں جاؤ گے۔“

اس مرتبہ مہدی بولا تو آواز پہلے کی یہ نسبت دھبی تھی۔ اتنا ہی کہا۔ ”میں چلا جاتا ہوں ای جان! آپ آیت الکرسی پڑھیں۔ میں بھی پڑھتا ہوں۔“

آفاق احمد اپنے کمرے میں آیا۔ غلجٹ میں لباس تبدیل کیا۔ چھوٹے گیٹ کی چابی لی اور سرورٹ کوارٹر کی بالکونی سے لوہے کی سیڑھیاں اتر گیا۔ مین گیٹ کے سامنے پورٹیکو میں طاہرہ کی ذاتی گاڑی کھڑی ہوئی تھی، جبکہ آفاق احمد اپنی گاڑی گھر کے کونے پر چھوٹے گیٹ کے اندر سائڈ پورچ کے پیچھے کھڑی کیا کرتا تھا۔ بغیر کھانے کیے گیٹ کھولا تو باہر کی کاسیکوری گاڑ کھڑا نظر آیا۔ اُس کو ہاتھ کے اشارے سے کھلی دی۔ حسب عادت گاڑی کے پیئر پر بیک کھولے تو بغیر اسٹارٹ کے ریمب کی ڈھلان اتر گئی اور اسی جھونک میں موڑ ٹک چلنے دی۔ ٹھو والی کوشی کی اوٹ میں روک کر واپس آیا اور گیٹ بند کر دیا۔ گاڑی میں پیئر کے انتظار کرنے لگا۔ نظریں عقی آئینے پر جم رہی تھیں۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد مہدی علی کالا شاپنگ بیگ اٹھا کر سڑک پر نمودار ہوا۔ اسٹریٹ لائٹ میں نظر آ رہا تھا کہ اُس نے شلوار قمیض پہن رکھی ہے۔ آفاق کی نظریں بے اختیار اُس کے پیروں پر پڑیں۔ وہ نیچے پاؤں تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ گاڑی سے آگے نکل جاتا، آفاق نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور

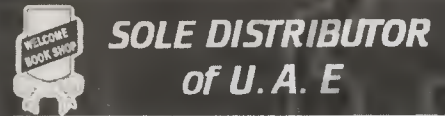
اُسے آواز دے کر بیٹھنے کو کہا۔ مہدی نے جھک کر دیکھا اور بیچانے ہی معمول کی بلند آواز میں بولا۔ ”اوہ، یہ آپ ہیں سر!“ سیٹ پر بیٹھتے ہی کہا۔ ”میں نے سیر ودھائی لاری اڑے پر جانا ہے یا فیض آباد..... آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟“ آفاق نے جواب دینے کے بجائے گاڑی اسٹارٹ کی اور اس کا میٹر آن کر کے تاب پوری گھاڑی گرم ہوا کا رخ پیروں کی طرف ہو گیا۔ چند منٹ کی خاموشی طاری رہنے کے بعد مہدی نے پاؤں میٹھے ہوئے کہا۔ ”سر! بڑی گرم ہوا ہے۔ آپ نے میٹر مچھے لے لیے چلا یا ہوگا۔ اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے سر دی نہیں لگتی۔ جوتے اسکول جانے کے لیے پہنا کرتا تھا۔“ آفاق اس مرتبہ بھی کچھ نہیں بولا۔ مہدی سے خاموشی نہیں رہا گیا اور گردن دائیں جانب گھما کر ایک نگاہ آفاق کے چہرے پر ڈال کر کہنے لگا۔ ”سر! میٹر اپنی طرف کر لیں۔ میرے پاؤں جلنے لگے ہیں۔“ آفاق نے بغیر کوئی لفظ بولے میٹر بند کر دیا۔ بارش یہ دستور جاری تھی۔ مہدی سے چپ نہیں رہا گیا۔ پھر بول پڑا۔ ”سر! آپ گاڑی بہت تیز چلا رہے ہیں۔ بارش بھی ہو رہی ہے..... اور آپ بولتے کیوں نہیں؟ شاید ناراض ہیں۔ مجھے کسی اسٹاپ پر اتار دیں۔ میرے پاس پیسے کافی ہیں۔ تنخواہ کی رقم میں سے ایک روپیہ بھی ای جان نے واپس نہیں مانگا۔ وہ بہت اچھی خاتون ہیں۔ دراصل اُن پر کوئی بڑا سخت جتن آتا ہے۔ اللہ کرے، کوئی نیک نیت والا سامنا مل جائے۔ جتن بھی بڑے نوڈر کیکٹر والا ہے۔ جس طرح انسان اچھے اور برے ہوتے ہیں، سنا ہے جحش میں بھی نیک و بد ہوتے ہیں۔ مجھے ای جان کی بڑی فکر لگی ہوئی ہے۔“

گاڑی اس وقت اسلام آباد ہائی وے پر تھی۔ طاہرہ کو جتن جھنے کی بات سنتے ہی آفاق کی ذہنی کیفیت بدل گئی۔ یوں جیسے بدنتار یک اجنبی عمارت میں سمٹتے ہوئے اچانک سوچ بوڑھ پر ہاتھ پڑنے سے روشنی ہو جائے اور راستہ نظر آنے لگے۔ اعصاب پُر سکون ہونے لگے۔ گاڑی بھی متوازن رفتار پر چلنے لگی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تک وہ سوچ رہا تھا کہ گاڑی سڑک کے کنارے روک کر ڈنگی سے ویسل پانڈنگ لے اور اس احمق کے سر پر دے مارے۔ مگر اب سوچ کا زوئی ہی مختلف ہو گیا۔ ذہن میں اچھوتا خیال آیا کہ پیچیدہ نفسیاتی اچڑچڑ اور جتن میں فرق ہی کیا ہے؟ مہدی کا دامن صاف تھا۔ گھر میں جو کچھ ہوتا رہا وہ جن کے تذکرے سے میل کھاتا تھا۔ طاہرہ خان نفسیاتی مرض کا شکار تھی کوئی اچھا سائیکسٹ یا روحانی عامل اس کا معالج ہو سکتا تھا..... اس کے تن بدن میں سکون کی ایک گہری لہری سرایت کر گئی۔ اس

نے سڑک پر نظریں جمائے، پھر بے ہوشے لکھے میں کہا۔ ”ایئر پورٹ کا لونی میں اپنا ایک مکان تقریباً فیض ہو چکا ہے۔ چونکدار ہے۔ گزارے لائق بستر مل جائے گا۔ ٹھیک ٹھیک لگی ہوئی ہے۔ فی الحال سحرات جانے کی ضرورت نہیں۔ کل بات کریں گے کہ تمہیں کیا کام کرنا ہے۔“ اس مرتبہ مہدی کے خاموش رہنے کی باری تھی۔ صرف ایک نظر آفاق پر ڈال کر سامنے سڑک کا منظر دیکھنے لگا۔ آفاق نے اس کی گود میں پڑا کالا شاپنگ بیگ دیکھ کر پوچھا کہ اس میں کیا ہے تو جواب ملا۔

”اس میں کتا ہیں، ایک تولیا، پاجامہ، بنیان، ریزر اور کنگھی وغیرہ..... ذرا سا توقف کر کے مسکرایا اور بولا۔ ”سر! صابن اور کریم بھی ہے۔“

آفاق نے گردن گھائی اور نظر ملا کر پوچھا ”کیسی کریم۔“ مہدی ہنس پڑا اور جھینپ گیا۔ تاہم کچھ بھر خاموش رہ کر بول پڑا۔ ”سر! بیوی کریم..... رنگ گور کرنے والی۔“



SOLE DISTRIBUTOR of U. A. E

WELCOME BOOK SHOP

P.O.Box 27869 Karama, Dubai Tel: 04-3961016 Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817 E-mail: welbooks@emirates.net.ae

Best Export From, Pakistan

WELCOME BOOK PORT
Publisher, Exporter, Distributor

All kinds of Magazines, General Books and Educational Books

Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32633086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

آفاق کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ کہنے لگا۔ ”تمہیں کریم کی کیا ضرورت ہے؟ اچھے خاصے گورے ہو..... اور یہ اشتہاری کریمیں وہیں بچے جلد کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں۔“ مہدی کھائی ہنسی ہنپتے ہوئے بولا۔ ”سر! میری ماں کا حکم تھا کہ اور کوئی پیسا خرچ کروں نہ کروں، کریم ضرور لگایا کروں۔ اس خیال سے حکم عدولی نہیں کرتا کہ اُس کی روح کو صدمہ نہ پہنچے۔“ کھل کے ہنس دیا اور کہنے لگا۔ ”میری ماں فکر مند ہو کر کہا کرتی تھی کہ میرے بیٹے کا چاند چہرہ دھوپ میں پھرنے سے کالا ہو جائے گا..... سر! جب میں ہائی اسکول جانے لگا تو وہ دال روٹی میں سے پیسے بچا کر بھی میرے لیے کریم لے آیا کرتی تھی۔“ آفاق نے محسوس کیا کہ مہدی کا کلا رندہ گیا ہے۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی جھپک گئیں۔ شرفیاف بی بی اور صفیٰ کچن میں بیٹھی باتیں کرتی سنائی دینے لگیں۔ مہدی کی بھوک کے بارے میں باتیں..... اور میری باتیں۔ آفاق احمد نے مہدی سے اس کی بھوک کے بارے میں سوال کرنا چاہا، مگر اس احتیاط سے کہ صفیٰ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ نہ دہرائے جائیں۔ اسکرین کے پار سڑک پر نظر کر جمائے بولا۔ ”مہدی علی! کھانا اور ناشتا وغیرہ کس وقت کرتے ہو۔ کیا پسند ہے.....؟ میرا مطلب ہے، ذرا تمہاری روٹیں کا پتا چل جائے۔“

وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”کوئی خاص روٹیں اور ٹائم نہیں سر! جو ملے، جب اور جیسا بھی، کھا لیتا ہوں۔ نہ ملے تو پانی کے دو تین گلاس پی کر سو جاتا ہوں۔ ایک آدھ دن کی بھوک مجھے زیادہ تنگ نہیں کرتی، نیند آ جاتی ہے۔ ویسے اب میرے پاس کافی پیسے ہیں لیکن میں ہونے سے کھانا پسند نہیں کرتا۔ چھٹے پیسوں میں وہاں ایک وقت کا کھانا ملتا ہے، اتنے میں گھر پر تین گنا تنگ جاتا ہے۔ بندہ ایک ہی بار کھالے تو دن بھر فکر نہیں رہتی۔ بلکہ اگلے روز تک نہ ملے تب بھی گزرا رہا جاتا ہے۔“ آفاق نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کو صفیٰ کے الفاظ سنائی دیے۔ ”حالہ ہی! اس لڑکے کی ساری باتیں ہی نرالی ہیں۔ کہتا ہے، روٹی آج نہیں ملتی تو کل کھا لوں گا..... ماں گھولی! کل تو مل جائے گی ناں۔“ آفاق کی بصارت دھندلانے لگی۔

سامنے ان پورٹ چوک تک ٹریفک روک دی گئی تھی۔ چوکس کھڑی پولیس دیکھ کر آفاق سمجھ گیا کہ روٹ لگا ہوا ہے۔ حکومت وقت کی کسی اعلیٰ شخصیت کو گزرتا ہے۔ اس کے راستے پر کوئی معمولی سے معمولی رکاوٹ بھی نظر نہیں آ رہی۔ دیگر راستوں پر بھی قطاریں لگ گئی ہیں۔ اتنے میں اس کے

دائیں ہاتھ رنگ رنگی روشنیاں چمکیں، ہوا بجا اور درجنوں گاڑیوں پر مشتمل قافلہ گزرنے لگا۔ گولی کی رفتار سے گزرتی گاڑیوں کو کتنا محال ہو گیا۔ لگ بھگ پچاس گاڑیاں گزری ہوں گی۔ اعلیٰ و افرغ نظریات کی ائین قوموں کے رنگ نیارے۔ قائدین اور حکمران بڑی ثابت قدمی سے مزدور ماں کی مزدوری، بھکاریوں کی بھیک اور سبکی کی خرچی سے حصہ بخور کر کیا شان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان پورٹ سے اسلام آباد تک صرف فیول کی مدد میں لاکھوں روپے پھونک ڈالے۔ روٹی کی ٹریفک کا وقت اور پیسہ ملا کر بات شاید کروڑوں تک پہنچی ہو۔ روٹ کھل گیا اور گاڑیاں رینگنے لگیں۔

مہدی کہہ رہا تھا ”سر! اس وقت آپ کو گھر پر ہونا چاہیے تھا۔ امی جان کو آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔ بھوت پریت کا سایہ ہو یا کوئی بڑی بیماری، آسانی سے چھانچیں چھوٹی۔ اس میں بندے بے جا رے کا قصور نہیں ہوتا۔ کوئی بھی اپنے سر آفٹ مول لینا پسند نہیں کرتا۔ میری مرحومہ ماں نے بڑی حسرتوں سے مجھے زمیندارہ کالج میں داخلہ دلا یا مگر بے چاری بیمار رہنے لگی۔ میں نے کالج چھوڑ دیا اور پائری ٹیکسٹر میں مزدوری کرنے لگا۔ ڈیڑھ سال بعد معلوم ہوا کہ ماں کو کینسر ہے۔ اماں رو رو کر خدا سے فریاد کرتی، کیکرھاں جان چھڑ میرے بٹ دی؟ میں اُس کے چہرے پر ہوسہ دے کر کہا کرتا کہ ساٹھ سال بعد، جب میری ماں ایک سو ایک سال کی ہو جائے گی..... سر! اپنے پیاروں کا خیال خود رکھنا پڑتا ہے۔ بندے کو قادر ہونا چاہیے۔“

آفاق شاید اب بھی چپ رہتا، مگر مہدی کی نقشہ کی لیے بول پڑا۔ ”تم طاہرہ کی فکر نہ کرو۔ وہ بہت جلد سو گئی۔ اب وہ کل دس گیارہ بجے سے چلنے نہیں اٹھے گی۔ دورہ پڑنے کے بعد وہ بہت سی دوائیاں لے کر سو جایا کرتی ہے۔“ ان پورٹ کا لوٹی سے آفاق واپس گھر پہنچا اور لباس بدل کر بیچے آ گیا۔ بیوی بے سدھ پڑی سو رہی تھی۔ بغیر ڈسٹر ب کے بیڈ پر بائیں پہلو لیٹ گیا۔ صبح چھ بجے کے قریب وہ اٹھی اور سوئی جا کی حالت میں وائس روم چلی گئی۔ چند منٹ بعد واپس آئی تو شوہر پر نگاہ پڑی۔ آنکھیں جھپک گئیں۔ بہت آہستگی سے اپنا بدن بستر پر ڈال دیا۔ آفاق نے بازو بڑھا کر بیوی کو ساتھ لگایا۔ دونوں باہم لیٹ گئے مگر کچھ نہیں بولے۔ آفاق کو اپنے کال پرنی محسوس ہونے لگی۔ آنکھیں کھول کر بیوی کے چہرے پر نظر پڑیں ڈالیں۔ اُس کی آنکھوں سے لگا تار آنسو بہ رہے تھے۔ نیم دراز ہو کر نیپل سے ٹشو لیے اور اُس کا چہرہ اور آنکھیں اچھی طرح

صاف کر دیں۔ چپکے سے دوبارہ ساتھ لگایا۔ وہ جلد ہی گہری نیند سو گئی۔

تقریباً ایک ماہ اسی طرح گزر گیا۔ میاں بیوی گوانٹے رہے۔ گاہے قربت ہو جاتی، مگر جذبات میں وہ شوریدگی نہ آئی عمومی بات چیت ہو کر رہی۔ تعمیراتی منصوبوں یا سمن کے بارے میں۔ اُس کی روم میٹ کون ہے؟ امتحان کی تیاری کیسی جارہی ہے؟ آج باپ بیٹی کہاں گھومے اور کھانا کہاں کھایا؟ تمہاری صحت کیسی ہے؟..... میں ٹھیک ہوں۔ گھر میں دن کیسا گزرا، تم ٹھیک ہو ناں!..... ہاں، شکر ہے۔ ایک دن اور گزر گیا۔ کسی اختلافی مسئلے پر بات نہیں ہوئی۔ تم ایسی ہو..... تم ویسے ہو۔ جو ہوا سو ہوا، اب گلہ گھٹو کیا۔ وہ دونوں ایک ایسے ادھیر عزم کو اور سنجیدہ جوڑے کی طرح رہ رہے تھے جنہیں ایک دوسرے سے محبت ہو نہ کوئی شکایت۔ سہ پہر کی جائے کے لیے آفاق احمد بچن کی طرف جانے لگا تو طاہرہ کی آواز کانوں میں پڑی۔ ”آفاق! میں نے جانے بنا رکھی ہے۔ ادھر آ جاؤ۔“ دونوں آئے سانسے بیٹھ گئے۔ طاہرہ پر سنجیدگی طاری تھی۔ شوہر کے آگے کپ رکھ کر اپنے کپ سے گھونٹ بھرا۔ میز پر اُس کا پاسپورٹ اور ٹریول ایجنسی کا لفافہ بھی پڑا تھا، جس پر روز دیدہ نگاہ ڈال کر آفاق نے کہا۔ ”تھینک یو فائی۔“ وہ چپ رہی۔ چند لمحے مزید اسی طرح گزر گئے۔

وہی آواز میں بول پڑی۔ ”میں کچھ عرصہ کے لیے بھائی جان کے پاس جا رہی ہوں..... بھائی کو میرے پرائیلم کاتب سے علم ہے، جب ہم دونوں کالج میں کلاس فیلوز تھیں۔ اُس نے کسی اسپیشلسٹ سے کنسلٹ کر کے ہی مجھے بلایا ہے..... پھر خاموشی چھا گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں لمحہ بھر کر دیکھا۔

آفاق نے ہاتھ بڑھا کر بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔ اُس کی آنکھیں بھرا آئیں۔ دوبارہ بول پڑی۔ ”صبح چار بجے قطر ایئر لائنز سے دوبارہ آجے ہو ناں۔“ آفاق نے دوسرا ہاتھ بھی بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیا اور بڑے آرام سے اُس کا بازو پیچنے ہوئے گویا عندیہ دیا کہ وہ اٹھ کر ساتھ صوفے پر آن بیٹھے۔ ذرا سا سوچ کر اُٹھی مگر جذباتی ہو گئی۔ ساتھ بیٹھے ہوئے توازن برقرار نہ رہا اور اندازے کی غلطی بھی ہوئی، لہذا دھم سے گری اور زیادہ سے بڑے کے بیٹھ گئی۔ دونوں کے زانو دب گئے۔ ذرا سنبھل کر سرسٹنے کی مگر اس اثنا میں آفاق نے اُس کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیا اور گال سے گال ملا کر مہمی آواز میں بولا۔

”آئی ایم ویری سوری۔“

طاہرہ کی لہر زنی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”فاروہاٹ؟“ آفاق نے اُسی طرح دھم سے سرگوشی کی۔ ”تم سے لاطعلق ہو گیا اور تمہارا خیال نہیں رکھا۔“ طاہرہ پر رقت طاری ہوئی۔ اُس نے سٹے ہوئے بازو پھیلایے اور میاں کو پیچ لیا۔ تھوڑی دیر بعد طاہرہ ذرا ہٹ کر بیٹھ گئی۔ پاسپورٹ اٹھا کر اس کے نیچے رکھی شاشی کارڈ کی فوٹو کا پی اٹھائی اور شوہر کی طرف بڑھا کر بولی۔ ”آفاق! یہ لڑکا تمہارے آبائی شہر کا ہے۔ اس کا پتا کج کر کسی طرح واپس لے آؤ۔ وہ تمہارا ڈپلیکیٹ ہے۔“

آفاق نے کاغذ لے کر میز پر رکھ دیا اور بولا۔ ”میں اس لڑکے کے مقابلے میں صفر ہوں۔ اتنا سختی، ذمے دار اور قابل بھروسہ نوجوان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ تم نے میرا تلاش کر لیا۔ میں نے اُس کو کیری ڈبا دے رکھا ہے۔ اتنی جافٹاشی سے ہر کام کی نگرانی کرتا ہے، میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ ہر دوسرے تیسرے روز تمہاری زمینوں پلاٹوں پر ایک نظر ڈالنے کے لیے جکر لگتا ہے۔ تمہارے لیے بہت فکر مند تھا۔ ہر روز پوچھا کرتا کہ ای جان کا کیا حال ہے؟ مجھے تسلیاں دیتا کہ میں کام کی فکر چھوڑ دوں۔ صرف تمہارا خیال رکھوں۔“ طاہرہ چھوٹ چھوٹ کر روئی اور بولی۔ ”آفاق! میں دنیا کی ذلیل ترین عورت ہوں۔“

آفاق نے بیوی کو دوبارہ ہاتھوں میں لیے لیا اور اُس کے ہونٹ چوم کر بولا ”تم بہت اچھی عورت ہو۔ نادانگی میں مجھ سے غفلت ہوئی۔ ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔ تمہیں تنہا چھوڑ کر میں نے بہت بڑا ظلم کیا۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ سمن کے امتحانات ختم ہوتے ہی ہم باپ بیٹی تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ ہم تینوں اکٹھے واپس آئیں گے۔“

ایک ایک آفاق احمد کی آنکھیں بھی جھپک گئیں۔ اسے اپنی ماں یاد آگئی تھی جس نے حرام و حلال کی تیز گویاں کی مٹھی میں ڈال دی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں بڑے کرب و الم سے لیکن ماں کے سکھائے ہوئے سبق سے بڑا رہا۔ آخر کار رزق حلال کا مکمل زندگی کے ہمہ جہت سکھ کی صورت میں اسے میسر آ ہی گیا تھا۔ صفیٰ کا مہدی بھی اس شہر سے محروم نہیں رہا تھا۔ آفاق، دینو یا دینیا فیصلہ کر چکا تھا کہ اپنے ساتھ مہدی کو بھی اسی شہر سے ہیپوسٹ رکھے گا جس کی آبپاری شرفیاف اور صفیٰ نے کی تھی۔

فسادِ جہل

ملک صندریا

جب انسان جہالت میں فسادات کا سبب بنتا ہے تو مقدر کی تاریکیاں اسے سورج کی روشنی میں بھی منزل سے بھٹکا دیتی ہیں اور... محبت جب بے اعتباری کا شکار ہو جائے تو بعض اوقات اپنے ہی خون کی بھینٹ لے لیتی ہے۔ وہ کیسے بڑے تھے جن کی نادانیوں نے بچوں کا بچپن تک چھین لیا۔

نفسا نفسی کی دوڑ میں نفس کے غلاموں کا

عبرت اثر واقعہ

گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے بچے کا ناموں اعجاز میرے پاس پہنچا تھا۔ میں نے اسے بٹھایا اور پوچھا۔ ”بچے کا نام کیا ہے اور وہ کب سے کم ہے؟“

”اس کا نام تو جاوید ہے جناب۔“ اعجاز نے جواباً بتایا۔ ”لیکن سب اسے ”جیدا“ کہتے ہیں، جیدا آج دوپہر ہی سے غائب ہے۔“

اس وقت شام ہونے والی تھی۔ وہ ماہ اگست کی اختتامی تاریخیں تھیں۔ بھادوں جوین پر تھا۔ سادون نے جو کسر چھوڑی تھی اسے بھادوں بڑی ڈسے داری کے ساتھ پورا کر رہا تھا۔ میں نے اعجاز حسین کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جیدا دوپہر سے غائب ہے اور تم اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے اب میرے پاس آئے ہو۔؟“

”ہم لوگ اب تک اپنے طور پر جیدا کو گاؤں میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے

بولاً۔ ”ایک ایک گھر میں جھانک لیا ہے۔ پورے ”شاہ پور“ میں اس کا نام و نشان نہیں ملا۔“

شاہ پور میرے قحانے سے نزدیک ترین ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ قحانے سے گاؤں کا فاصلہ یہ مشکل ایک فرلانگ ہوگا۔ شاہ پور میں لگ بھگ سوا سو گھر ہوں گے۔ اس حساب سے یہاں کی آبادی کو چار سو سے پانچ سو نفوس تک شمار کیا جاسکتا ہے۔

”ہوسکتا ہے، جیدا گاؤں سے کہیں باہر چلا گیا ہو؟“

میں نے ایک واضح امکان کی جانب اشارہ کیا۔

اعجاز حسین نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ایسا نہیں ہوسکتا جناب۔ ابھی اس کی عمر اتنی نہیں کہ وہ اکیلا گاؤں سے باہر چلا جائے۔“

”جیدا کی عمر تھی ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

اعجاز نے بتایا۔ ”لگ بھگ آٹھ سال۔“

”اوہ.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی

”بھولا! اس وقت تو لوگ کس جگہ کھیل رہے تھے؟“
 بھولانے ایک جگہ کی نشاندہی کر دی۔
 میں نے جوہڑ کے اندر موجود لوگوں سے کہا کہ وہ اس کنارے پر پانی میں ہاتھ پاؤں چلا کر یہ جاننے کی کوشش کریں کہ جیدا کہیں پانی کے اندر ڈوبا ہوا تو نہیں۔ جب گاؤں کے ایک نو عمر بچے کے ڈوبنے کے بارے میں ان لوگوں کو پتا چلا تو انہوں نے ماہر تیراکوں کے مانند جیدا کی تلاش کا کام شروع کر دیا۔
 بوٹا، کرمو اور بھولا کے بیان سے تو یہی بات سامنے آئی تھی کہ جیدا ان سے جدا ہو کر سیدھا اپنے گھر کی طرف گیا تھا لیکن میں نے پھر بھی اپنا شک دور کرنے کے لیے جوہڑ میں جیدا کی تلاش کا کام ضروری سمجھا تھا۔
 میں پچیس منٹ کی کڑی تلاش کے بعد میرا شک دور ہو گیا۔ یعنی جیدا کا جوہڑ کے اندر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ وہاں پر موجود لوگوں میں سے ایک عمر رسیدہ شخص آگے بڑھا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔
 ”تھانے دار صاحب! اگرچہ اس چھوڑ میں ڈوبا ہوتا تو اب تک اس کی لاش اور پراچھی ہوتی، دوپہر سے اب تک کافی وقت گزر چکا ہے۔“
 میں نے بے غور اس شخص کا جائزہ لیا اور پوچھا۔
 ”چاچا! تمہارا نام کیا ہے؟“
 ”میرا نام ہے جی..... برکت۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔
 ”چاچا برکت! تم جس جگہ کی طرف اشارہ کر رہے ہو، وہ میرے ذہن میں بھی ہے لیکن پھر بھی تفتیش کے دوران ہر پولو کو نظر میں رکھنا پڑتا ہے۔ اب یہی لی تو ہو گئی تاکہ جیدا اس چھوڑ میں کہیں غائب نہیں ہوا۔“
 ”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
 میں نے وہاں موجود لوگوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور بے آواز بلند کہا۔ ”تم سب اس حقیقت سے اب تک واقف ہو چکے ہو کہ اعجاز کا بھانجا جاوید عرف جیدا آج دوپہر سے غائب ہے۔ اعجاز نے جیدا کی تلاش میں پورا گاؤں چھان مارا ہے۔ آپ لوگ بھی اپنی آنکھیں مل کر دیکھیں۔ جیسے ہی جیدا نظر آئے یا اس کے بارے میں کوئی اہم بات معلوم ہو، آپ سیدھے تھانے آکر مجھے بتائیں گے۔“
 انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ جیدا ان کے اپنے بچوں جیسا بچہ ہے۔ وہ بھی اس کی کشمکش پر بہت پریشان ہیں۔

میری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم حوصلہ رکھو اور خالدہ کو بھی حوصلہ دو۔ جھوکو میں نے ابھی سے جیدا کی تلاش کا کام شروع کر دیا ہے اور اندھیرا ہونے سے پہلے میں خالدہ سے ملنے اس کے گھر بھی آ رہا ہوں۔ تم کوشش کرنا کہ جیدا کے وہ تینوں دوست مل جائیں، کشمکش سے پہلے وہ جن کے ساتھ چھوڑ کے کنارے کھیل رہا تھا۔ میں ان سے پوچھ کر کچھ کروں گا۔“
 ”آپ فکر نہ کریں جناب۔“ وہ محسوس انداز میں بولا۔ ”میں ان بچوں کو جمع کر کے رکھوں گا۔ آپ جب آئیں گے تو میں ان تینوں کو خالدہ کے گھر لے آؤں گا۔ وہ جاگیں گے کہاں۔ آس پاس ہی کے بچے تو ہیں۔“
 میں نے تسلی دلا سادے کرا عجاز کو رخصت کر دیا۔
 جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، موضع شاہ پور میرے تھانے سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر واقع تھا۔ شہروں میں رہنے والے اور ”فرلانگ“ سے نا آشنا افراد اس فاصلے کو دو سوئس گز سمجھ لیں۔ تھانے سے بڑے آرام سے ٹہلنے جوئے شاہ پور جایا جاسکتا تھا۔ شاہ پور کا رہنے والا ایک کانٹیل بھی میرے تھانے میں ہوتا تھا۔ اس کا نام افضل تھا اور ظاہر ہے، وہ جیدا کی کشمکش والے واقف سے واقف نہیں ہوگا۔ وہ بے چارہ صبح ہی سے ڈھولی پر تھا۔
 میں نے افضل کو اپنے ساتھ شاہ پور لے جانے کا فیصلہ کیا اور ضروری تیاری کے لیے اسے اپنے پاس بلا دیا۔
 XXX
 میں نے جیدا کے ڈوبنے والے امکان کو ذہن میں رکھتے ہوئے تفتیش کا آغاز کیا اور بوٹا، کرمو، بھولا وغیرہ کو ساتھ لے کر گاؤں کے جوہڑ پر پہنچ گیا۔ اندھیرا ہونے میں زیادہ دیر باقی نہیں تھی۔ میں دن کی روشنی میں یہ کام نشتا دینا چاہتا تھا۔
 بوٹا، کرمو اور بھولا کی عمریں سات اور دس سال کے درمیان تھیں اور ان میں بھولا نسبتاً زیادہ سمجھ دار تھا۔ وہ پورے دس سال کا تھا۔ جیدا کے گھر سے جوہڑ کی جانب آتے ہوئے میں نے ان تینوں کا مفصل انٹرویو بھی کر ڈالا تھا لیکن کوئی ایسی بات سامنے نہ آئی جو جیدا کی تلاش میں میری مددگار ثابت ہو سکتی۔ ان سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ اعجاز مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا۔
 میں اور کانٹیل پولیس یونیفرم میں تھے لہذا ہمیں دیگر کرفصوحہ ورجن سے زیادہ لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ چند افراد اس وقت بھی جیمینوں کے ساتھ جوہڑ کے اندر موجود تھے۔ میں نے بھولا سے پوچھا۔

اور حالیہ بارشوں نے چھوڑ کو کناروں تک بھر رکھا ہے۔“
 میرے ذہن میں اس خدشے نے سرا بھارا کہ کہیں جاوید عرف جیدا چھوڑ میں نہاتے ہوئے ڈوب نہ گیا ہو۔ ٹھیک ہے، کناروں پر چھوڑ کی گہرائی زیادہ نہیں ہوتی لیکن جیسے جیسے آگے بڑھیں، اس کی گہرائی میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور عین وسط میں تو جوان بندے کے سینے تک پانی کھڑا ہوتا ہے۔ جیدا کے ڈوبنے کے خدشے کے پیش نظر میں نے اعجاز سے سوال کیا۔
 ”جیدا آج دوپہر میں جن بچوں کے ساتھ چھوڑ کے قریب کھیل رہا تھا، ان کے نام کیا ہیں اور انہوں نے اس کے بارے میں کیا بتایا ہے؟“
 ”بچوں کے نام تو ہیں جی..... بوٹا، کرمو اور بھولا۔“ اعجاز نے بتایا۔ ”میں نے بہت کرید کرید کر ان سے پوچھا ہے، سب نے ایک جیسا بیان دیا ہے جناب..... وہ کہتے ہیں، انہیں جیدا کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔ وہ سب مل کر ایک ساتھ کھیل رہے تھے، پھر جیدا اپنے گھر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد انہیں کچھ پتا نہیں۔“
 ”جیدا..... بچوں کے مطابق، اپنے گھر چلا گیا تھا مگر وہ اپنے گھر پہنچا نہیں۔“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر اعجاز سے پوچھا۔ ”جیدا نے لباس اور جوتے کس طرح کے پہن رکھے تھے؟“
 ”اس بارے میں تو مجھے کچھ پتا نہیں جناب۔“ وہ معذرت خواہانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے اس سوال کا جواب تو جیدا کی ماں خالدہ ہی دے سکتی ہے یا پھر وہ بچے جن کے ساتھ وہ کھیل رہا تھا۔ میرے ذہن میں بالکل نہیں آیا کہ ان سے پوچھوں.....!“
 ”کوئی بات نہیں اعجاز! تمہارے ذہن میں نہیں آیا تو میں پوچھ لوں گا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جیدا کی ماں سے بھی اور اس کے دوستوں سے بھی۔“
 ”جیدا مل تو جائے گا تا تھانے دار صاحب؟“ وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔
 میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”فکر نہ کرو اعجاز اور اللہ سے امید رکھو۔ میں جلد از جلد جیدا کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کروں گا۔“

اور پوچھا۔ ”جیدا کے ماں باپ کہاں ہیں؟“
 ”ماں اور تانی تو گھر پر ہے تھانے دار صاحب!“ وہ ہونٹ پیچھتے ہوئے بولا۔ ”اور جیدا کا باپ لاہور میں رہتا ہے۔“
 شہر لاہور، موضع شاہ پور سے کم و بیش پینتیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں اعجاز سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ”کیا جیدا کے باپ کو اس کی کشمکش کا پتا ہے؟“
 ”ابھی تک تو پتا نہیں ہے جناب۔“ وہ برا سامنے بناتے ہوئے بولا۔ ”اور پتا چل بھی جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں.....!“
 ”یہ کیا بات کی تم نے!“ میں نے حیرت بھری نظر سے اعجاز کی طرف دیکھا۔ ”سب سے پہلے تو جیدا کے باپ ہی کو اس واقعے کی خبر ہونا چاہیے تھی۔ تم نے ایسے کیوں کہا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں؟“
 ”وہ بات دراصل یہ ہے تھانے دار صاحب.....!“ وہ بددلی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جیدا کے باپ علی نواز نے چار سال پہلے میری بہن کو طلاق دے دی تھی۔ جب سے خالدہ امی کے پاس ہی رہ رہی ہے..... علی نواز نے ادھر لاہور میں دوسری شادی کر رکھی ہے..... اس کے ساتھ ہمارا جینا مرنا چار سال پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔“
 ”اوہ..... تو یہ بات ہے!“ میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ ”تم نے دوسرے بچوں سے جیدا کے بارے میں پوچھا تھا کچھ ہے؟“
 ”جی، سب سے پوچھ کے دیکھ لیا۔“ اعجاز نے بتایا۔ ”وہ دوپہر میں تین بچوں کے ساتھ چھوڑ کے پاس کھیل رہا تھا۔ اس کے بعد ہی سے وہ غائب ہے۔“
 چھوڑ بے معنی جوہڑ..... پنجاب کے گاؤں دیہات میں جوہڑ کو چھوڑ کہا جاتا ہے۔ چھوڑ بہت کام کی چیز ہوتا ہے۔ کچے مکانوں کی لپٹا پوٹی کے لیے اسی چھوڑ سے مٹی نکالی جاتی ہے۔ گاؤں کی گلیاں اور دیگر ڈھور ڈگر اسی چھوڑ سے نہ صرف اپنی پیاس بجھاتے ہیں بلکہ ان کا نہانا دھونا بھی چھوڑ ہی میں ہوتا ہے۔ بعض بچے اور بڑے بھی چھوڑ میں ڈبکیاں لگاتے نظر آتے ہیں۔ جب اعجاز نے چھوڑ کا ذکر کیا تو میرا ہاتھ ٹھنکا۔
 ”کہیں جیدا چھوڑ میں دوسرے بچوں کے ساتھ نہا تو نہیں رہا تھا؟“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔
 ”تھانے دار جی! تو بچوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔“ وہ معتدل لہجے میں بولا۔ ”آج کل تو ویسے بھی گرمی کا موسم ہے

انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ جیدا کو اپنے تئیں تلاش کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔
میں مطمئن ہو کر جیدا کے گھر آ گیا۔

اس گھر میں جیدا کی ماں خالدہ اور اس کی نانی گھڑار بی بی کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ اعجاز کی زبانی مجھے پتا چلا کہ اس کی رہائش یہاں سے ایک کھلی چھوڑ کر گھر میں جہاں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ میں خالدہ کو لے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

خالدہ کی عمر تیس کے آس پاس نظر آتی تھی۔ وہ ایک قبول صوزت اور فریاد اندام عورت تھی تاہم اس وقت اکلوتے بیٹے کی جدائی نے اسے طول کر رکھا تھا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”خالدہ بی بی! میں تمہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں اور میرا یہ وعدہ ہے کہ جیدا کو جلد از جلد ڈھونڈ نکالوں گا لیکن اس کام کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

وہ انجمن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔
”جی..... میں آپ کی بھلا کیا مدد کر سکتی ہوں.....؟“
”مجھے جیدا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات کی ضرورت ہے۔“

”کس قسم کی معلومات؟“ اس کی انجمن میں اضافہ ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ”آپ کو کب پتا چلا کہ جیدا غائب ہے؟“
”دن میں جب وہ گھانا کھانے کے لیے گھر نہیں آیا تو مجھے فکر ہوئی۔“ اس نے بتایا۔ ”میں بھائی اعجاز کے گھر گئی۔ وہ کبھی کبھی اس کے بچوں کے ساتھ کھینے بھی چلا جاتا تھا لیکن ادھر جا کر پتا چلا کہ جیدا وہاں گیا ہی نہیں۔ بھائی اعجاز کو فکر ہوئی۔ اس نے دکاندار کی چھوڑی اور جیدا کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے سارا پنڈ چھان مارا مگر جیدا انہیں نہیں ملا۔ تھک ہار کر اعجاز رپورٹ لکھوانے آپ کے پاس چلا گیا۔“ وہ لمبے بھر کے لیے متوقف ہوئی، ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”یہ سب کچھ کہانی تھانے دار صاحب.....!“
”ہوں.....!“ میں نے متاسفانہ انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ”وہ آج کتنے بجے گھر سے نکلا تھا؟“

”میرا خیال ہے، دس بجے۔“ خالدہ نے جواب دیا۔ ”پھر وہ واپس نہیں آیا۔“
”کیا پہلے بھی کسی ایسا ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جی، یہ پہلا واقعہ ہے۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”کھینے کے لیے تو وہ روز ہی گھر سے باہر جاتا تھا لیکن دن میں کھانے کے وقت وہ واپس آ جاتا تھا مگر.....“ بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی اور وہ دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھ گئی۔

میں نے انہی کی توقف کے بعد اس سے پوچھا۔ ”آج جب وہ گھر سے نکلا تھا تو اس سے پہلے کوئی خاص واقعہ تو پیش نہیں آیا تھا؟“

”مثلاً؟“ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ ”کس قسم کا واقعہ تھانے دار صاحب.....!“
”مثلاً یہ کہ.....“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ لوگوں میں سے کسی نے اسے ڈانٹا ہو، جھڑکا ہو یا بہت زیادہ غصہ کیا ہو اس پر؟“

”ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔“ وہ ایک پوچھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی پھر مجھ سے پوچھا۔ ”کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ وہ ناراض ہو کر کہیں چلا گیا ہے.....؟“
”تمہارا اندازہ درست ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”پولیس آفیسر ہونے کے ناتے مجھے ہر انداز میں سوچنا پڑتا ہے۔ میں اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ وہ کسی بات پر خفا ہو کر ادھر ادھر نکل گیا ہو، ویسے.....“ میں نے تھوڑی دیر تک کمرسوچی ہوئی نظر سے خالدہ کو دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس بات کا ثبوت تو مل گیا ہے کہ وہ دوپہر تک چھپر کے کنارے اپنے دوستوں کے ساتھ میل رہا تھا۔ یوں کہہ کر اور بھولانے مجھے بتایا ہے کہ وہ انہیں سے ہٹا کر آیا تھا کہ گھر جا رہا ہے..... ساری گزربز چھپر سے لے کر تمہارے گھر تک کے راستے میں ہوئی ہے۔“

”جو بھی ہوا ہے یہ تو مجھے نہیں پتا.....“ وہ رونا نے لہجے میں بولی۔ ”مجھے جیدا چاہیے۔ آپ جلد از جلد اسے تلاش کریں۔ وہ سب کی آنکھ کا تارا تھا۔ پتا نہیں میرے جیدا کو کس کی نظر کھا گئی ہے.....!“

خالدہ کی حالت کو دیکھتے ہوئے میں نے اس کے بھائی اعجاز کو بھی قریب بلایا۔ اعجاز کی کرپانے کی دکان تھی جو اس نے جیدا کی کشدگی کی وجہ سے آج دوپہر ہی کو بند کر دی تھی۔ میں نے اعجاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگوں کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ تو نہیں ہے؟“
”بالکل نہیں جناب!“ وہ جلدی سے بولا۔ ”ہم صفا کسی سے رہنے والے اس پسند لوگ ہیں۔ دشمنیاں پانا

ہمارے بس کا کام نہیں۔“

میں نے ایک فوری خیال کی تسکین کے لیے پوچھ لیا۔ ”کیا خالدہ کے سابق شوہر یعنی جیدا کے باپ علی نواز کا تعلق بھی شاہ پوری سے ہے؟“

”جی ہاں، وہ ہمیں کارہنہ والا تھا۔“ اعجاز نے جواب دیا۔ ”لیکن اب کافی عرصے سے وہ مستقل لاہور ہی میں رہ رہا ہے۔ بس کبھی بکھاری ادھر کا چکر لگاتا ہے.....!“
”بھائی اعجاز!“ خالدہ نے شکی نظر سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ ”آپ تھانے دار جی کو آدمی بات بتا رہے ہیں.....“

”اچھا.....“ میں نے چونک کر خالدہ کی جانب دیکھا۔ ”تو اس کے علاوہ اور کچھ بھی ہے.....؟“

اعجاز جڑبڑ ہو کر رہ گیا۔ میں نے خالدہ سے کہا۔ ”میں پوری تو جبر سے سن رہا ہوں۔ باقی کی آدمی بات تم بتا دو۔“ وہ تھوک نلقتے ہوئے بولی۔ ”دراصل، علی نواز کے ماں باپ بچپن ہی میں خاندانی دشمنی کی حیثیت چڑھ گئے تھے۔ اسے اس کے چاچا اور چاچائی نے پالا ہے جو ادھر شاہ پوری میں رہتے ہیں۔ علی نواز کو تھوکتی باڑی اور زراعت کے کاموں سے چڑھی لہذا وہ کوئی تلاش میں لاہور چلا گیا۔ جب میری شادی ہوئی، اس وقت بھی وہ لاہور میں ملازمت کرتا تھا۔ مہینے میں ایک دو دن کے لیے یہاں آتا تھا اور پھر واپس چلا جاتا تھا، پھر ہمارے بیچ جھگڑے شروع ہو گئے اور.....“ وہ یک دم، بے حد اداس ہو گئی۔
”اور پھر.....؟“ میں نے کرپا۔

”پھر ہمارے راستے الگ ہو گئے۔“ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ”چار سال پہلے علی نواز نے مجھے طلاق دے دی۔ اس وقت جیدا چار سال کا تھا.....“
”اس انفس ناک واقعے کے بعد ہی اس نے دوسری شادی کی ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ خالدہ نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ ”دوسری شادی اس نے ایک سال پہلے کی ہے اور ہمارے درمیان جھگڑے کی بنیادی وجہ بھی علی نواز کی دوسری شادی ہی تھی۔ یہ تنازع ایک سال تک چلتا رہا پھر علی نواز نے نورین کے حق میں فیصلہ کیا اور مجھے طلاق دے دی.....“

”نورین، علی نواز کی دوسری بیوی کا نام ہے؟“ میں نے تعجب سے انداز میں پوچھا۔
خالدہ نے تائیدی انداز میں گردن ہلا دی۔
میں نے پوچھا۔ ”طلاق کے وقت علی نواز نے اپنے

بیٹے کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی؟“
”بالکل نہیں تھانے دار صاحب!“ اعجاز نے جواب دیا۔ ”اس نے جھوٹے منہ سے بھی ایک بار جیدا کو لینے کا مطالبہ نہیں کیا.....!“

”یعنی اس کے دل میں جیدا کے لیے کوئی طلب، کوئی ترپ نہیں تھی۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔
”آپ سیانے بیانے ہیں تھانے دار صاحب!“ اعجاز نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جس شخص کو اپنی اولاد سے محبت ہو، وہ اپنی بیوی کو طلاق نہیں دیتا اور نہ ہی وہ دوسری شادی کے بارے میں سوچتا ہے۔“

میں نے اعجاز سے پوچھا۔ ”تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ علی نواز بھی بکھار ادھر چکر لگاتا ہے تو کیا جب وہ یہاں آیا ہوتا ہے تو اس نے اپنے بیٹے کو دیکھنے یا اس سے ملنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔“

”بھئی تو میں آپ کو بتاتا چاہ رہی تھی تھانے وار صاحب!“ خالدہ جلدی سے بولی۔ ”بھائی اعجاز نے کسی مصلحت کی وجہ سے آپ کو پوری بات نہیں بتائی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب مجھے طلاق ہوئی اس کے بعد سے تو علی نواز نے شاہ پور میں قدم ہی نہیں رکھا، جیدا کو دیکھنے یا اس سے ملنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔“

”تم نے کس مصلحت کی بنا پر مجھ سے غلط بیانی کی ہے؟“ میں نے اعجاز کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”کوئی مصلحت نہیں جناب!“ وہ عداوت آمیز لہجے میں بولا۔ ”بس، وہ کیا کہتے ہیں کہ..... فیصل اٹھاؤ تو اپنا ہی پیٹ ننگا ہوتا ہے.....“

میں نے باری باری خالدہ اور اعجاز کی جانب دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ”کیا جیدا کی کشدگی میں علی نواز کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“

”یہ ظاہر ایسا لگتا تو نہیں تھانے دار صاحب!“ اعجاز نے جواب دیا۔

”یہ ظاہر جو شے نظر نہ آ رہی ہو اس کے بارے میں زیادہ سوچنے کی ضرورت ہوتی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے علی نواز کا اتنا پتا بتائیں۔ میں اسے بھی چیک کر دوں گا۔“

”اس کا پتا تو ہمارے پاس نہیں ہے۔“ خالدہ نے جواب دیا۔ ”اس کے چاچا، چاچائی سے مل سکتا ہے۔“
”ٹھیک ہے، میں علی نواز کے چاچا چاچائی سے بھی مل لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ لوگ جیدا کی کشدگی کے

حوالے سے اور کچھ جانتے ہیں تو مجھے بتائیں.....؟“
جب خالدہ اور اعجاز اس سلسلے میں مجھے مزید معلومات فراہم نہ کر سکے تو میں انہیں تسلی دلاسا دے کر واپس آ گیا۔

XXX

اگلے روز میں نے دو اہم کام کیے۔
نمبر ایک، میں نے ایک بندہ بھیج کر علی نواز کے چاچا نذیر حسین کو تھانے بلا لیا۔ نمبر دو، میں نے دو سادہ لباس پولیس اہل کاروں کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ شام پور میں گھوم پھر کر جیدا کے بارے میں معلومات اکٹھی کریں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کانسٹیبل افضل کو بھیج کر کھوجی شرافت علی کو بلا لیا۔ ایک بات کا میں ذکر کرنا بھول گیا کہ میں نے رات خالدہ سے بات کرتے ہوئے جیدا کی تصویر کے بارے میں سوال کیا تھا تا کہ اس بچے کی تلاش کے کام کو آسان بنایا جاسکے لیکن خالدہ اور اعجاز نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس جیدا کی کوئی تصویر موجود نہیں۔ اب مجھے دوسرے ذرائع ہی سے اس کا کھوج لگانا تھا.....!

میں تھانے میں بیٹھا جیدا کی گمشدگی کے بارے ہی میں سوچ رہا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ بھادوں کی بارش انتہائی ناقابل اعتبار ہوتی ہے۔ ایک لمحے میں سورج چمک رہا ہوتا ہے اور دوسرے لمحے بارش شروع ہو جاتی ہے اور بعض اوقات تو دھوپ اور بارش ایک ساتھ اپنی اپنی جھلک دکھا رہی ہوتی ہیں۔ بھادوں کی بارش کی ایک خاصیت یہ ہے کہ بارش کے فوراً بعد دھوپ نکل آتی ہے اور دھوپ بھی ایسی کہ بدن میں سونیاں چھونے والی۔ اس موسم میں ویسے بھی جسم گرمی دانوں سے بھرا ہوتا ہے۔ ایسے میں دھوپ کی چمک اور بارش کے کھڑے پانی کی تپش بل کر قیامت ڈھاتی ہیں۔

اس اچانک شروع ہو جانے والی بارش نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا اور اس تشویش کا سبب تھا جیدا کا کھرا.....!

میں نے سوچا تھا کہ کھوجی شرافت علی سے جیدا کا کھرا نکلاؤں گا تا کہ بتاؤں کہ وہ کچھ پھینچے اپنے گھر جاتے ہوئے راستے میں کہاں غائب ہو گیا تھا لیکن اس بارش نے جیدا کیا، باقی لوگوں کے پاؤں کے نشانات کو بھی لمبا میٹ کر دیا تھا۔ اب گھر کے بارے میں جیدا کا سراغ لگانا ناممکن نہیں رہا تھا۔
تھوڑی ہی دیر کے بعد نذیر حسین میرے پاس پہنچ گیا۔ نذیر حسین کی عمر بیٹیسائیس سے تجاوز دکھائی دیتی تھی۔ وہ وضع قطع سے ایک عام دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ میرے

پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ کھتی بازی کا کام کرتا ہے۔ گویا، وہ ایک چھوٹا سا میسران تھا۔
”نذیر حسین!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”جانتے ہو، میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟“
”کچھ کچھ اندازہ تو ہے تھانے دار جی۔“ اس نے

جواب دیا۔
”مثلاً..... کیا کچھ کچھ؟“

”خالدہ کا بچہ کل سے غائب ہے۔“ وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ”میرا خیال ہے، آپ نے جیدا کے بارے میں کچھ پوچھنے کے لیے مجھے بلایا ہے۔“
”تمہارا خیال بالکل درست ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں نے جیدا ہی کے سلسلے میں تمہیں بلایا ہے لیکن تم نے جیدا کے لیے ”خالدہ کا بچہ“ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ کیا وہ علی نواز کا بھی بچہ نہیں ہے.....؟“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب!“ وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔ ”لیکن چار سال پہلے علی نواز نے خالدہ کو طلاق دے دی تھی۔ اس کے بعد دونوں خاندانوں کا میل ملاپ نہیں رہا اس لیے میرے منہ سے نکل گیا..... خالدہ کا بچہ!“
”کون سے دونوں خاندان؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”میں..... میرا مطلب ہے، خالدہ اور علی نواز کا خاندان.....“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔
”لیکن میں نے تو سنا ہے، خالدہ کو طلاق دینے کے بعد علی نواز مستقل لاہور ہی کا ہو کر رہ گیا ہے؟“ میں نے جیسے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ”پچھلے چار سال سے اس بے وفائے پلٹ کر آپ لوگوں کی گنجائش نہیں.....!“
وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔
”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں.....!“

”آپ لوگوں کے ساتھ علی نواز کی کیا تاراشی ہے؟“ میں نے زبردستی والے انداز میں پوچھا۔ ”مجھے پتا چلا ہے، وہ چھوٹا سا تھا جب اس کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ آپ دونوں میاں بیوی نے اسے پال پوس کر جوان کیا، اس کی شادی کرائی اور وہ..... آپ لوگوں ہی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ کیا ماجرہ نذیر حسین؟“
”ماجرہ کیا تھا تھانے دار صاحب.....!“ وہ ایک ہنسی آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ”زمانے کا دستور یہی ہے۔ جس

فساد چھل

رہا۔ اس کی زندگی میں کبھی کوئی نہیں آنے دی لیکن وہی ہوا جو عنایت بی بی نے مجھ سے اکثر کہتی رہی تھی۔ علی نواز نے ہم سے وفائیں کی بلکہ ہماری ناک کنوا دی۔ جب سے اس نے خالدہ کو طلاق دی ہے واپس پلٹ کر گاؤں کی طرف نہیں آیا۔ اپنی دوسری بیوی اور بچوں کے ساتھ لاہور ہی میں رہتا ہے۔ نورین سے اس کی دو اولادیں ہیں۔ یہ بھی مجھے اس وقت پتا چلا جب پچھلے سال میں کسی کام سے لاہور گیا تو علی نواز سے ملنے اس کے گھر بھی چلا گیا تھا۔ اس وقت مہوش دوسال کی اور فراز چھ ماہ کا تھا.....“

”یہ سب تو ٹھیک ہے نذیر حسین!“ میں نے اسے ٹوک دیا۔ ”مجموعہ خالدہ کی طلاق کے دوسرے اسباب کے بارے میں بتا رہے تھے؟“

”جی.....!“ وہ لفظ کو اچھا خاصا کھینچنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔ ”ہمارے لیے سب سے زیادہ شرمندگی کی بات یہ ہے کہ علی نواز، خالدہ کے کردار پر شک کرنے لگا تھا اور ڈھکے چھپے الفاظ میں کئی بار کہہ چکا تھا کہ جاوید عرف جیدا اس کا خون نہیں ہے۔ اصل فساد یہیں سے شروع ہوا تھا۔ جب بعد میں پتا چلا کہ اس نے لاہور میں دوسری شادی کر رکھی ہے تو یہ فساد بڑھ کر خطرناک جنگ کی صورت اختیار کر گیا اور ایک سال کے اندر اندر خالدہ کو طلاق ہو گئی۔ پہلے وہ ہمارے ساتھ رہتی تھی۔ طلاق کے بعد وہ اپنی ماں گلزار بی بی کے پاس چلی گئی۔ اعجاز ان لوگوں کی ہر قسم کی مدد کرتا رہتا ہے۔“

”کردار پر شک“، والی بات خالدہ یا اعجاز نے مجھے نہیں بتائی تھی۔ اب یہ نکتہ اچھی طرح میری سمجھ میں آ گیا کہ علی نواز نے خالدہ کو طلاق دینے کے بعد اپنے بیٹے جیدا کے حصول کے لیے چارہ جوئی کیوں نہیں کی تھی۔ جب وہ جیدا کو اپنا خون ہی نہیں ناستا تھا تو پھر کسی قسم کی چارہ جوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!

میں مزید آدھے گھنٹے تک نذیر حسین سے گھما پھرا کر مختلف نوعیت کے سوالات کرتا رہا جس سے بس یہی پتا چل سکا کہ علی نواز کا ان لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ بس، نذیر حسین نے ایک سال پہلے علی نواز کو لاہور میں اس کے گھر میں ہی دیکھا تھا۔ اس کے بعد کی کوئی خبر نہیں تھی۔

میں نے علی نواز کا لاہور کا ایڈریس اور اس کے کام کاج کے بارے میں نذیر حسین سے تفصیل حاصل کی اور اسے رخصت کر دیا۔ نذیر حسین جس حد تک میرے لیے کارآمد ہو سکتا تھا وہ میں نے جان لیا تھا۔

کے ساتھ نیکی کرو، وہی ڈنک مارتا ہے.....!“
”میں تفصیل جانا چاہتا ہوں نذیر حسین؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
نذیر حسین اپنے بیٹے علی نواز کی طرف سے خاصا خفا اور دل برداشتہ نظر آتا تھا۔ میں اسی لیے اسے ٹٹولنے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ جیدا کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی مفید نکتہ ہاتھ آ سکے۔ چند لمحات تک چپ رہ کر وہ اپنی یادداشت میں ماضی کے واقعات کو جمع کرتا رہا پھر پھر پھر کہہ رہا تھا۔

”بڑے بھائی صاحب یعنی علی نواز کا باپ فرید احمد اور بھابی رفعت موضع جمال نگر میں رہتے تھے۔ ان کی پانچ اولادیں تھیں۔ ایک ایک کر کے چار بچے اور بھابی بھابی خاندانی دشمنی کی بیخست چڑھ گئے۔ علی نواز چھوٹا سا تھا کہ میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ اس کی پرورش کی۔ پال پوس کر جوان کیا۔ اپنے بیٹے طفیل سے زیادہ اس کا خیال رکھا۔ اسے زمیں داری کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ روزگار کے سلسلے میں لاہور کا رخ کرنا بھی اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ دس سال پہلے میں نے اس کی شادی اعجاز کی بہن خالدہ سے کرادی۔ چھ سال تک یہ شادی روئے جوتے پلٹی رہی پھر میاں بیوی کے درمیان ایسا تنازع اٹھا کہ جس کے نتیجے میں علی نواز نے خالدہ کو طلاق دے دی.....“

”یہ تنازع علی نواز کی دوسری شادی کی وجہ سے اٹھا تھا یا کوئی اور سبب بھی تھا؟“ وہ سانس لینے کے لیے تھما تو میں نے پوچھ لیا۔

”ایک سبب تو دوسری شادی بھی تھی جناب.....!“ وہ کول مول انداز میں بولا۔

”اور دیگر اسباب کیا تھے؟“ میں نے سوال کیا۔

”جناب تھانے دار صاحب! میں نے مرنے کے بعد اپنی قبر میں جانا ہے اس لیے آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کروں گا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”چاہے کوئی بات علی نواز کے حق میں جانی ہو یا اس کی مخالفت میں.....“

”مجھے داری کا تقاضا یہی ہے نذیر حسین کہ کم از کم پولیس اور ڈاکٹر سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہیے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میری گھر والی عنایت بی بی ہمیشہ مجھ سے کہتی تھی کہ علی نواز پر محنت کر کے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر رہا ہوں۔“ وہ گھبرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ”لیکن میں نے بھائی کی اولاد سمجھ کر علی نواز کو اپنی اولاد کی طرح پالنا

”شاہ پور.....!“ الفاظ اس کے حلق میں انک کر رہ گئے۔
 ”ہاں، شاہ پور!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور میں وہاں کا تھانے دار ہوں.....!“
 ”پولیس.....!“ اس کی گھبراہٹ ہوئی آواز نکلی۔
 ”آپ..... ہمارے دروازے پر کیوں آئے ہیں.....“
 ادھر سب خیریت تو ہے نا.....؟“

”پولیس کی آمد کا مطلب خیریت نہیں ہوتا نورین بی بی!“
 میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم دروازہ کھولو۔ مجھے تم سے بھی چند باتیں کرنا ہیں۔ میں کئی میں زیادہ دیر کھڑا رہا تو لوگوں کو تشویش ہوگی کہ تمہارے گھر پولیس کیوں آئی ہے.....؟“
 بات اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے میں نورین کی معیت میں اس کی بیٹھک میں پہنچ گیا۔

وہ لگ بھگ تین مرے رہتے پر بنا ہوا دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ آگے پیچھے دو کمرے اور بیچ میں چھوٹا سا کھن۔ ہم اس وقت گھر کے اگلے کمرے یعنی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ وہ ایک سادہ سی سجاوٹ والی عام بیٹھک تھی۔ میں نے بیٹھنے ہی نورین کا تھوڑا سا جائزہ لیا۔
 وہ علی نواز کی دوسری بیوی تھی۔ میں اس کی پہلی..... بلکہ سابق بیوی خالدہ سے بھی لگ چکا تھا۔ خالدہ کے مقابلے میں نورین کہیں زیادہ خوب صورت اور دلکش عورت تھی۔ علی نواز کا اس کی جانب جھکاؤ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔
 ”آخر ہوا کیا ہے..... کچھ بتائیں تو سہی؟“ وہ پریشان لہجے میں بولی۔

”ہوا یہ ہے کہ علی نواز کا بیٹا جاوید عرف جیدا کہیں غائب ہو گیا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے بتانا شروع کیا۔ ”نورے شاہ پور میں اسے ڈھونڈ لیا گیا ہے۔ میں اسی سلسلے میں علی نواز سے بات کرنے آیا ہوں۔“
 ”لیکن علی نواز کا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے تو پچھلے چار سال سے شاہ پور گئے ہی نہیں۔“ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ”جب سے انہوں نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دی ہے، اپنی سسرال والوں سے ہر شے تاتا توڑ دیا ہے۔“
 ”زبان سے قائم کیے گئے رشتے زبان سے توڑے جاسکتے ہیں نورین۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن خون کے رشتے ہر حال اور ہر قیمت پر.....“
 ”میں..... غور.....“ لاکھ خالدہ کو طلاق دے دی ہے.....
 ”اچھے..... چچی سے بھی منہ موڑے بیٹھا ہو لیکن جیدا تو اس

ہمارے درمیان تھانے کے انتظامی امور کے حوالے سے بات چیت ہوتی رہی۔ ان دنوں تھانے میں زیادہ مصروفیات نہیں تھیں۔ جاوید عرف جیدا والا کیس اگست کے مہینے کا پہلا ایسا کیس تھا جس میں، صبح معنوں میں ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقع مل رہا تھا.....!“
 XXX

میں سہ پہر تین بجے لاہور میں تھا۔ سب سے پہلے میں نے متعلقہ پولیس آفس جا کر اپنی آمد کی غرض و غایت سے انہیں آگاہ کیا پھر علی نواز کے گھر کا رخ کیا۔ نذیر حسین سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق علی نواز لاہور کے علاقے کڑوسی شاہ میں رہتا تھا اور جب ایک سال پہلے نذیر حسین اس سے مل کر گیا تھا تو وہ کسی ٹیکسٹری میں کام کرتا تھا اور نذیر حسین کو اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ بہت جلد ٹیکسٹری کی ملازمت چھوڑ کر کوئی اور کام کرے گا، اسی خیال کے پیش نظر میں نے ٹیکسٹری کے بجائے اس کے گھر کا رخ کیا تھا۔
 کڑوسی شاہ میں علی نواز کا گھر ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ میں نے مطلوبہ دروازے پر جا کر دستک دی۔ دوسری دستک کے جواب میں اندر سے آواز آئی۔
 ”کون ہے جی.....؟“

آواز سوائی تھی لہذا مجھے یہ اندازہ لگنے میں مشکل پیش نہ آئی کہ وہ علی نواز کی بیوی نورین ہوگی۔ میں نے ہتھکار کر گنا صاف کیا اور یہ آواز بلند کیا۔
 ”نورین بی بی! میں علی نواز سے ملنے آیا ہوں.....!“
 ”وہ تو گھر میں نہیں ہیں.....“
 ”علی نواز کہاں گیا ہے؟“
 ”وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈیوٹی پر گئے ہیں۔“
 ”اس وقت ڈیوٹی پر.....؟“ میں نے انہیں زدہ انداز میں کہا۔ ”کیا علی نواز آج کل رات کی ڈیوٹی کر رہا ہے؟“
 ”جی ہاں..... آپ کو نہیں پتا کیا.....!“ نورین کی حذب و آواز ابھری۔ ”وہ روزانہ اسی وقت جاتے ہیں اور آدھی رات کو واپس آتے ہیں۔“ لہذا تو قف کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔
 ”آپ نے بتایا نہیں، کون ہیں..... آپ کو علی نواز سے کیا کام ہے؟“

”میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔“ میں نے اپنا تعارف کرتے ہوئے بتایا۔ ”مجھے علی نواز سے بہت ضرورت کام ہے۔ میں موضع شاہ پور سے آیا ہوں.....“

ترقی کا خواہاں تھا اور میں نے اسے ترقی کا گر بتا دیا تھا۔ ہمارے درمیان لگ بھگ آدھا گھنٹا جیدا کی گمشدگی کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی۔ افضل چونکہ مقامی تھا لہذا ان میں سے بہت ساری باتیں وہ بھی جانتا تھا جو خالدہ اور نذیر حسین کی زبانی مجھ تک پہنچی تھیں۔ اس کا بھی نذیر حسین کی طرح یہی خیال تھا کہ جیدا کی گمشدگی میں اس کے باپ علی نواز کا کوئی ہاتھ نہیں ہو سکتا تھا لیکن میں ذرا دھڑکی مٹا کر اس کا تھانے دار تھا اور میرا سوچے کا ایک مخصوص انداز تھا۔ میں کسی معمولی سے معمولی امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے افضل ہی کو بھیج کر اسے ایس آئی مظفر کو اپنے کمرے میں بلایا۔ مظفر میرے تھانے کا ایک مہتمم پولیس اہل کار تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

وہ میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے پوچھا۔ ”مظفر تمہاری مصروفیات کیسی چل رہی ہیں؟“
 ”مصروفیات تو سب آپ کے سامنے ہیں ملک صاحب۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ حکم کریں.....؟“
 مظفر ایک کم گو، سنجیدہ اور بردبار شخص تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری مصروفیات میں، میں اضافہ کرنے والا ہوں۔ آج کا دن تمہیں میرے بغیر اس تھانے کا انتظام سنبھالنا ہوگا۔“
 ”آپ کہیں جارہے ہیں؟“ مظفر نے مجھ سے پوچھا۔
 ”ہاں، میرا لاہور جانے کا ارادہ ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ابھی نکلوں گا اور کوشش کروں گا رات تک واپس آ جاؤں اور..... میری واپسی میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔“

”آپ بے فکر ہو کر جائیں ملک صاحب!“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”انشاء اللہ! میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“
 ”مجھے تم سے یہی امید تھی مظفر.....!“
 ”ملک صاحب! آپ خیریت سے لاہور جارہے ہیں نا؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔
 ”خیریت کہاں ہے مظفر.....!“ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں گمشدہ جیدا کے سلسلے میں اس کے باپ علی نواز سے ملنے جا رہا ہوں.....!“
 ”ہوں.....!“ وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
 وہ مزید تھوڑی دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا اور

نذیر حسین کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد افضل میرے پاس آ گیا۔ افضل نامی اس کا نشیمل کا تعلق موضع شاہ پور ہی سے تھا۔ میں نے افضل کو کھوئی بابا شرافت علی کولانے کے لیے بھیجا تھا۔
 ”کیا رپورٹ ہے افضل؟“ وہ آکر میرے سامنے بیٹھا تو میں نے پوچھ لیا۔
 ”رپورٹ تسلی بخش نہیں ہے ملک صاحب!“ وہ

ماپوسی بھرے لہجے میں بولا۔ ”کھوئی شرافت علی دودن سے چکوال گیا ہوا ہے اور اس کی واپسی میں ابھی دو تین دن مزید لگیں گے۔“
 ”تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟“ میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ ”اس کی اب مجھے ضرورت نہیں رہی۔“

”ضرورت نہیں رہی.....!“ کا نشیمل نے حیرت بھری نظر سے میری طرف دیکھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک صاحب؟“
 ”اوئے جھملا.....!“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”پچھلے دو گھنٹے سے وقفے وقفے سے بارش کا جو سلسلہ جاری ہے اس نے..... کھرا نشان سب کا سواستیا تاس بھیر دیا ہے۔ پانی میں ڈوبی ہوئی کئی زمین پر کھوئی کیا خاک کھرا تلاش کرے گا.....!“
 ”اوہ.....!“ وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں کیا تھا۔“

”اپنے دھیان کو ریڈار کی طرح چاروں جانب حرکت دیتے رہا کرو۔“ میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ”تم پولیس والے ہو، کوئی سائنس داں نہیں جو تمہارا دھیان کسی ایک طرف لگا رہتا ہے۔“
 ”بس جی، غلطی ہو گئی۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”آئندہ میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔“
 ”پولیس کا حکم بہت زیادہ ہوشیاری اور چالاکی کا تقاضا کرتا ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”انسان کو ہر وقت آنکھ، کان اور دماغ کے دروازے کھلے رکھنا پڑتے ہیں۔“
 ”میں آپ کی نصیحت کو یاد رکھوں گا ملک صاحب.....!“
 ”یاد رکھنے میں ہی تمہاری بھلائی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ غمکے میں زندگی گزار جائے گی اور تم کا نشیمل کے کا نشیمل ہی رہو گے.....“
 افضل نے مجھے یقین دلایا کہ وہ زیادہ محنت اور لگن سے خدمات انجام دے گا۔ وہ محکمہ پولیس میں بہت زیادہ

میں نے مہوش اور فراز کو پیار کیا اور نورین کا شکر یہ ادا کر کے اس کے گھر سے نکل آیا۔

شاہ پور واپسی سے پہلے میں نے متعلقہ سنیما جا کر علی نواز سے بھی ملاقات کی۔ وہ ایک دہلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ عمر بتائیں گے اس پاس رہی ہوگی۔ اس کے بال سلکی تھے اور انہی بالوں کی ایک موٹی کیلٹ بار بار اس کے چہرے پر آ جاتی تھی۔

علی نواز کی ڈیوٹی ڈریس سرکل والی نکٹ وینڈو پر تھی۔ اس وقت ہال کے اندر شو چل رہا تھا لہذا وہ فارغ ہی بیٹھا تھا۔ میں نے وہاں پہنچ کر اپنا تعارف کرایا اور سری علیک سلیک کے بعد اسے اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔ اس نے جیدا کی گمشدگی پر کسی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا، بس افسوسناک انداز میں گردن ہلا کر دیا۔

”علی نواز!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”ایسا کیوں..... تمہیں جیدا کی گمشدگی کا دکھ کیوں نہیں ہوا..... وہ تمہارا خون ہے.....؟“

اس نے زنجی نظر سے مجھے دیکھا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تمہارے دار صاحب! اس ذکر کو چھوڑ دیں تو اچھا ہے.....“

”اگر اس ذکر کو چھوڑنا ہوتا تو میں شاہ پور سے سفر کر کے یہاں تک نہیں آتا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ میں جیدا کی تلاش میں تم تک پہنچا ہوں۔ میں اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ جیدا کی گمشدگی میں تمہارا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے لیکن جیدا والے معاملے کے علاوہ بھی میرا تم سے ملنے کا ایک خاص مقصد تھا.....“

”خاص مقصد؟“ اس نے چونک کر سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”ہاں علی نواز..... یہ بات مجھے ادھر شاہ پور ہی میں پتا چلی تھی کہ تم جیدا کو اپنا خون تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہو اور اس حوالے سے تم خالدہ کے کردار کو ٹھک کی نظر سے دیکھتے تھے جیسی تم نے اسے طلاق دی تھی۔“

”نہیں آپ اسی وجہ سے تو مجھ پر ٹھک نہیں کر رہے تھے دار صاحب!“ وہ مگر مندی سے بولا۔ ”آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں، میں جیدا کی گمشدگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ چاہیں تو میرے گھر کی تلاشی بھی لے سکتے ہیں.....“

کو کرایے پر دے دیا جس سے ایک مخصوص رقم گھر میں آنے لگی۔ علاوہ ازیں وہ گھر پر پچوں اور عورتوں کے کپڑے سلائی کر کے بھی کچھ پیسے کمایا کرتی تھی۔ اس کام میں نورین بھی اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی تھی جس کے نتیجے میں بڑے اچھے انداز میں ان کی گزر بسر ہو رہی تھی۔ انہیں بھی مالی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

گھر کی بیٹھک میں، مختلف ادوار میں مختلف کرایہ دار آکر رہائش اختیار کرتے رہے تھے۔ انہی کرایہ داروں میں علی نواز سب سے آخری ثابت ہوا تھا۔ علی نواز کسی فیکٹری میں ملازم تھا اور اس نے سلطانی بی بی کی بیٹھک کرایے پر لے رکھی تھی۔ اسی قیام کے دوران میں علی نواز اور نورین کے سچ پسندیدگی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ علی نواز نے نورین یا سلطانی بی بی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور گاؤں میں اس کی بیوی اور بچہ بھی ہے۔

سلطانی بی بی کی صحت خراب رہنے لگی تو اسے اپنی بیٹی کے مستقبل کی فکر ہوئی۔ وہ نورین اور علی نواز کے درمیان پسندیدگی کے پروان چڑھتے ہوئے جذبات سے بے خبر نہیں تھی لہذا ایک روز اس نے علی نواز سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس ”صاف صاف بات“ کے نتیجے میں نورین اور علی نواز کی شادی ہو گئی۔ ان کی شادی کے دو ماہ بعد سلطانی بی بی کا انتقال ہو گیا۔ اب نورین اور علی نواز اس گھر کے مالک و مختار بن گئے تھے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد علی نواز نے نورین کو خالدہ اور جیدا کے بارے میں پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

نورین کو حقیقت جان کو اتنا دکھ نہیں ہوا تھا جتنا افسوس اسے علی نواز کے جھوٹ بولنے پر ہوا تھا۔ بہر حال علی نواز نے کسی طرح منت خوشامد کر کے نورین کو سنا لیا اور یہ وعدہ کیا کہ نہ صرف وہ خالدہ کو طلاق دیدے گا بلکہ کبھی پلٹ کر شاہ پور بھی نہیں جائے گا۔ نورین مطمئن ہو گئی۔

علی نواز نے طلاق کے حوالے سے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور پچھلے چار سال سے اس نے پلٹ کر شاہ پور کی طرف بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا۔ نورین سے اس کی دو اولاد تھیں۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ بیٹی کا نام مہوش تھا جو اب تین سال کی تھی۔ اس سے چھوٹے بیٹے فراز کی عمر ڈیڑھ سال تھی۔ وہ دونوں اپنی ماں کی طرح خوش شکل اور پرکشش بچے تھے۔

چاہتے ہیں۔“ وہ جیسے لہجے میں بولی۔ ”تاکہ اس بات کا اطمینان کر سکیں کہ کہیں خالدہ کے بچے جیدا کو ہم نے اپنے گھر میں تو نہیں چھپا رکھا.....“

”اگر تم ایسا جانتی ہو تو ایسا ہی سہی۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

آئندہ چندہ منٹ میں، میں نے اس مختصر سے مکان کا تفصیلی معائنہ کر لیا اور بلاشبہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ گھر جیدا کے وجود سے خالی تھا۔ ہم دو بارہ بیٹھک میں آ بیٹھے۔

”اب تو آپ کی تسلی ہو گئی نا؟“ نورین نے طنز پر لہجے میں پوچھا۔

”میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”کسی گھر کے پھوٹے موٹے سروے سے اگر پولیس والوں کی تسلی ہونے لگے تو پھر سب کیس تھانے میں بیٹھے بٹھائے ہی حل ہو جائیں..... لچائی تو قوت کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”جیدا کی گمشدگی کے بارے میں تو میں سنیما جا کر علی نواز سے پوچھ چکھ کر ہی لوں گا..... تم ذرا مجھے علی نواز کی گمشدگی کے بارے میں تو بتاؤ؟“

”علی نواز کی گمشدگی؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”میں سمجھی نہیں تھانے دار صاحب..... علی نواز کہاں گم ہو گیا ہے؟“

”لاہور میں!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”وہ علی نواز جو شاہ پور سے ملازمت کی تلاش میں شہر لاہور آیا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔“

اس نے متذبذب انداز میں مجھے دیکھا تاہم منہ سے کچھ نہ بولی۔

میں نے کہا۔ ”نورین بی بی! میں تمہاری اور علی نواز کی شادی کی کہانی سنا چاہتا ہوں.....؟“

وہ چند لمحات تک خاموش رہ کر اپنے ذہن میں بکھرے ہوئے خیالات کو ایک نقطے پر مرکوز کرتی رہی پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں مجھے اپنی کہانی سنانے لگی۔ میں نورین کی داستان میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

نورین اپنی بوڑھی ماں سلطانی کے ساتھ اس گھر میں رہتی تھی۔ عرصہ پہلے اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ مگر ان کا اپنا تھا لہذا نورین کے باپ اکرام اللہ کی وفات کے بعد ان ماں بیٹی کے لیے رہائش کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ ان کے لیے ایک کمرہ کافی تھا چنانچہ سلطانی بی بی نے بیٹھک

کا بیٹا ہے، اس کا خون ہے.....!“

”ہاں..... آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار بی بی پر.....!“

”پر کیا.....؟“ اس نے جملہ نامک چھوڑا تو میں نے جلدی سے پوچھا۔

”وہ جی..... میری کئی بار علی نواز سے اس موضوع پر بات ہوئی ہے۔“ وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ”لیکن وہ تو جیدا کو اپنا خون ہی نہیں سمجھتے.....“

”میں اس کہانی سے بھی واقف ہو چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور میں یہاں اس سلسلے میں کوئی ریسرچ کرنے نہیں آیا علی نواز جیدا کو اپنا بیٹا سمجھتا ہے یا نہیں..... میں تو یہ دیکھنے آیا ہوں کہ کہیں جیدا کی گمشدگی میں علی نواز کا ہاتھ تو نہیں.....؟“

میرے انداز نے نورین کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ وہ بے حد اچھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”علی نواز کیوں جیدا کو غائب کریں گے.....؟“

”یہ تو میں اسی سے پوچھوں گا۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”ذرا اس سے میری ملاقات تو ہو جائے.....“

”علی نواز سے ملنا ہے تو آپ سنیما چلے جائیں۔“ وہ برا سامنے بناتے ہوئے بولی۔

”سنیما؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں، وہ سنیما ہی میں تو کام کرتے ہیں۔“ وہ ہلکی جھپکاتے ہوئے بولی۔

”تو کیا فیکٹری کی نوکری اس نے چھوڑ دی؟“

”ہاں..... کافی دن ہو گئے۔“ اس نے جواب دیا۔

”آٹھ دس ماہ سے تو وہ سنیما جاتے ہیں..... اور رات کو دیر سے واپس آتے ہیں۔“

”وہ سنیما میں کیا کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ٹکٹ وغیرہ دیتے ہیں.....“ اس نے بتایا۔

میں نے سوال کیا۔ ”کس سنیما میں؟“

نورین نے ایک سنیما کا نام بتایا۔ کومی شاہو میں پہلو بہ پہلو دو سنیماز بنے ہوئے تھے۔ ان کے نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ علی نواز ان ہی میں سے ایک میں ٹکٹ کلرک تھا۔ میں نے نورین کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

”علی نواز سے تو میں سنیما جا کر ہی ملاقات کر لوں گا کیونکہ میں آدھی رات تک یہاں بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار تو کر نہیں سکتا۔ لیکن اس سے پہلے میں تمہارے گھر کا تڑپنا چاہتا ہوں۔“

”سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہتے کہ گھر کی تلاشی لینا

”میں نے یہ چاہا تھا اور تمہاری اطلاع کے لیے بتاتا چلوں کہ میں تمہارے گھر کی تلاشی لینے کے بعد ہی ادھر آیا ہوں اور میں نے تمہاری بیوی کا بھی انٹرویو کر لیا ہے۔“ میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ”اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہی میں تمہاری طرف آیا ہوں۔“

”وہ پکلیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ”اس کا مطلب ہے جیسا کہ گمشدگی کے حوالے سے آپ کی تسلی ہوئی ہے.....؟“

”ہاں..... صرف جیسا کہ گمشدگی کے حوالے سے۔“

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ابھی ایک اہم حوالہ باقی ہے اور اس حوالے سے صرف تم ہی میری تسلی کر سکتے ہو.....“

”کون سا حوالہ تھا نے دار صاحب؟“ وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تمہیں خالدہ کے کردار پر کیوں شک تھا اور یہ کہ تم جیسا کہ اپنا خون تسلیم کرنے سے گریزاں کیوں ہو.....؟“

”آپ نے اس موضوع کو پچھڑ ہی دیا ہے تو پھر سنیں۔“ وہ ایک پوچھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”اور مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے سوالات کے جوابات حاصل کیے بغیر جایں گے نہیں۔“

”مہمیں بالکل درست یقین ہے۔“ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”اس نکتے نے میرے ذہن میں اچھا خاصا انتشار پیدا کر رکھا ہے۔“

”میں بتاتا ہوں آپ کو سارا پکڑ۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ ساتھ ساتھ چائے بھی پیتے جائیں.....“

ایک بات کا ذکر کرتا میں بھول گیا کہ علی نواز نے میرے منع کرنے کے باوجود بھی جانے منگوائی تھی۔ میں نے چائے کی پیالی اٹھائی اور ایک چمکی لینے کے بعد سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”تھانے دار صاحب! میرے ماں باپ کا بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا جب میں بہت چھوٹا سا تھا.....“

”یہ ساری کہانی میرے علم میں آچکی ہے علی نواز! میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے والدین اور گھر کے دوسرے لوگ خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے اور تمہاری پرورش چاچا چاچی نے کی ہے۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم مجھے اپنی خالدہ سے شادی کے بعد کی کہانی سناؤ.....؟“

”شک ہے جی۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”خالدہ سے میری شادی چاچا چندیر حسین کے زور دینے پر ہوئی تھی ورنہ نہ چاچی عنایت کا تو کوئی اور ہی ارادہ تھا۔“

”تمہاری چاچی کا کیا ارادہ تھا؟“ میں پوچھتے بنا نہ رہ سکا۔

”وہ اپنی بہن جمیلہ کی بیٹی نرگس سے میری شادی کرنا چاہتی تھی۔“ علی نواز نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”لیکن نرگس مجھے بالکل پسند نہیں تھی۔“

”نا پسندیدگی کی وجہ؟“

”بس، مجھے اس کی آنکھیں بڑی عجیب لگتی تھیں۔“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولا۔ ”اس کو دیکھ کر میری ہنسی نکل جاتی تھی۔“

”تمہارا مطلب ہے نرگس بھیقتی تھی؟“

”بھیقتی سے بھی دس تھوڑا آگے۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”میری آخری معلومات کے مطابق ابھی تک نرگس کی شادی نہیں ہوئی۔“

میں نے اپنی تسلی کی خاطر پوچھ لیا۔ ”یہ آخری معلومات تمہیں کب اور کس نے دی تھیں۔ تم تو پچھلے چار سال سے شاہ پور گئے ہی نہیں ہو.....؟“

”کوئی ایک سال پہلے چاچا چندیر حسین مجھ سے ملے لاہور آیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اس وقت میں ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ چاچا کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ نرگس ابھی تک بیٹھی ہوئی ہے۔“

”اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لیے اس کی زندگی کا ساقی پیدا کر رکھا ہے، بس تلاش کرنے کی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ تم مجھے خالدہ کے کردار کے بارے میں کچھ بتا دے تھے.....؟“

”جی..... میری خالدہ سے شادی ہوئی۔“ وہ قہقہے آگے پڑھاتے ہوئے بولا۔ ”چاچی اس رشتے پر مجھ سے ناراض تھی کیونکہ میں نے اس کی بھانجی نرگس کو ٹھکرا دیا تھا۔ گھر میں ہلکی پھلکی نوک جھوک چلتی رہتی تھی اور پھر میں ملازمت کی تلاش میں لاہور آ گیا۔ زمینداری اور بھتی بازی میں میرا ابھی بدل نہیں لگا تھا۔ شادی سے پہلے تو کسی نہ کسی طرح چل رہا تھا لیکن ایک ڈسے دار شخص ہونے کے ناتے اب مجھے کچھ نہ کچھ لا زما کرنا تھا۔ گاؤں میں میرے لیے کچھ نہیں تھا لہذا روزگار کی تلاش میں، میں یہاں آ گیا۔“

فسادِ جہل

”ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ خالدہ میری بات کو سنجیدگی سے سنتی لیکن نتیجہ اس کے برعکس برآمد ہوا۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ”وہ میری بات سننے ہی الٹا اشتیاق کی حمایت کرنے لگی۔ میں اس کا شوہر تھا لیکن ہر خوبی اسے اشتیاق میں نظر آتی تھی۔ بیوی کا ایسا رویہ کسی بھی شوہر کا دماغ خراب کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ تک ہمارے درمیان اس معاملے پر سرد جنگ چلتی رہی پھر میں نے چپکے سے یہاں لاہور میں نورین سے شادی کر لی.....“ وہ تھوڑی دیر کے لیے تھا، ایک پوچھل سانس خارج کی پھر اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”ایک سال کے اندر ہی، پتا نہیں کیسے میری دوسری شادی کی خبر شاہ پور تک پہنچ گئی۔ اس دفعہ جب میں گاؤں گیا تو خالدہ نے میرے ساتھ جھگڑا کیا۔ میں نے بھی اس موقع پر اپنے دل کا سارا غبار نکال لیا۔ اشتیاق اور خالدہ کے تعلقات کے حوالے سے میرے دماغ میں جو جہنم دکھ رہا تھا اس کی ساری آگ میں نے خالدہ پر اگل دی۔ گھر میں بڑا سنگین ہنگامہ ہوا۔ چاچی آستینیں چڑھا کر اشتیاق کی حمایت پر اتر آئی اور اس نے اعلان کر دیا کہ اشتیاق اس کا بھانجا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے گھر میں آنے سے نہیں روک سکتی۔ چاچا نے بھی خالدہ کے آنسوؤں کا پاس رکھا اور مجھے ہی سمجھانے بھجانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے سب پر لعنت بھیجی، خالدہ کو طلاق دی اور لاہور آ گیا۔ پھر میں نے پلٹ کر شاہ پور کی طرف نہیں دیکھا۔ میں یہاں نورین اور دونوں بچوں کے ساتھ بہت خوش ہوں اور ماضی کے کسی قصے کو دہرا کر اپنی زندگی میں تنخیل نہیں بھرنا چاہتا۔ اگر آپ قانون کے محافظ نہ ہوتے تو شاید میں اس موضوع پر آپ سے کوئی بات نہ کرتا۔“

میں نے چائے قہم کی، علی نواز کے تعاون کا شکر یہ ادا کیا اور گڑھی شاہو کے پچھراؤ سے نکل کر واپسی کے لیے لاہر اڑے کی جانب روانہ ہو گیا۔

گزشتہ پوری رات وقفہ وقفہ سے بارش ہوتی رہی تھی۔ میں صبح تیار ہو کر تھا نے پہنچا تو ایک نئی خبر میری منتظر تھی۔ میں نے جن دوسادہ لباس کا سنبھلوں کو شاہ پور کی کن لینے کے لیے روانہ کیا تھا ان میں سے ایک واپس آ گیا تھا اور فیاض نامی وہ پولیس اہلکار میرے لیے ایک سنخیز اطلاع لے کر آیا تھا۔

میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

”ہاں بھی فیاض! کیا خبر لائے ہو؟“ وہ میرے

اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ بیان کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”شادی کے دوسرے سال ہی جیسا پیدا ہو گیا تھا لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اس بچے میں وہ کشش محسوس نہیں ہوتی تھی جو ایک باپ کو اپنی اولاد کے لیے محسوس ہونا چاہیے۔ میں نے بہت سوچا، غور کیا اور پھر ایک حتمی نتیجہ پر پہنچ گیا۔ میں نے مسکے کا سبب ڈھونڈ نکالا تھا۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ”تم نے کون سا سبب ڈھونڈا تھا؟“

”اس کا نام تھا اشتیاق.....“ وہ پر خیال انداز میں بولا۔ ”میرے سننے کی جڑ صرف اشتیاق ہی تھا۔“

”یہ اشتیاق کون تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس بندے کے بارے میں کچھ بتاؤ.....“

”اشتیاق، نرگس کا چھوٹا بھائی ہے تھانے دار صاحب!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”دونوں کی عمروں میں دو تین سال کا فرق ہوگا۔ اشتیاق پہلے بھی بھاری اپنی خالدہ یعنی میری چاچی سے ملے آجایا کرتا تھا لیکن جیسے ہی میں نے لاہور کا رخ کیا، گھر میں اشتیاق کی آمدورفت بڑھ گئی تھی۔ میں جب بھی شاہ پور جاتا، گھر میں سب سے زیادہ اشتیاق کا ذکر ہوتا تھا۔ یہ میرے لیے ناقابل یقین اور حیرت کی بات تھی کیونکہ پہلے ہر کوئی اشتیاق کو مطمئن کیا کرتا تھا۔ وہ ایک آوارہ گرد اور لنگھٹا شخص تھا۔ سارا دن اپنے ہی جیسے آوارہ لوگوں کے ساتھ گھومتا رہتا تھا۔ ایسے لفٹے کی گھر میں تو نہیں سن کر میرا ماتھا ٹھنکا اور میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ گھر کے دوسرے افراد کی مجھے زیادہ پروا نہیں تھی لیکن خالدہ کی زبان سے اس لفٹے کا بار بار نام سن کر مجھے بہت اذیت پہنچتی تھی۔ میں پورا مہینہ پریس میں گزار کر ایک دو دن کے لیے خالدہ اور جیسا اسے ملے آتا تھا اور یہ لوگ مجھے پراسے پرانے سے نظر آتے تھے۔ میں کوئی بھی بات شروع کرتا تو خالدہ گھما پھرا کر قہقہے کو اشتیاق کی طرف لے جاتی اور اس کی بے جا تعریفیں کرنے لگتی۔ خالدہ کا یہ رویہ مجھے زہر لگنے لگا۔ دوسری طرف میں نے دیکھا کہ جیسا بھی اشتیاق کے ساتھ بہت زیادہ ملا ہوا تھا۔ وہ میرے پاس کم آتا اور اشتیاق کی گود میں زیادہ چڑھتا رہتا۔ میں کچھ عرصہ تک تو یہی بے ہودہ برواشت کرتا رہا پھر میں نے خالدہ کو سمجھانے کا فیصلہ کر لیا۔“

”تمہارے سمجھانے کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟“ وہ خاموش ہوا تو میں نے سوال کیا۔

ہو..... میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”ایسا کچھ بھی نہیں کہ مجھے کسی حوالے سے تم پر شک ہو۔ میں نے جنہیں شخص اس لیے شاہ پور میں رکنے کی تاکید کی ہے کہ وہ دونوں مشکوک بندے کسی وقت بھی پولیس کے ہتھے چڑھ سکتے ہیں۔ ان کی شناخت کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی اس لیے تمہارا گاؤں میں موجود رہنمائی ضروری ہے۔“

شوکت علی نے ایک سکون بھری سانس خارج کی اور مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں نے فوراً کانٹیل فیاض کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ فیاض آیا تو میں نے اسے ان دو افراد کے حلیوں سے تفصیلاً آگاہ کیا اور ہدایت کی کہ وہ.... نہایت ہی محتاط انداز میں یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس وضع قطع کے بندوں کو گاؤں میں اور کس کس نے دیکھا ہے۔ ہو سکتا ہے، اس طرح ان کا سراغ لگانے میں آسانی ہو جائے۔

فیاض نے میری ہدایات پر کماحقہ عمل کرنے کا یقین دلایا اور مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں نے مقامی کانٹیل افضل محمود کو اپنے پاس بلا لیا۔

”جی حکم ملک صاحب!“ وہ میرے سامنے باادب ملاحظہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”افضل! تم اشتیاق کو جانتے ہو؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”کون سا..... اشتیاق ملک صاحب؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ”شاہ پور میں تو تین چار اشتیاق ہیں.....“

”میں نذیر حسین کی سالی جمیلہ کے بیٹے اشتیاق کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”جس کی بہن نرگس جھٹکی ہے.....“

”اچھا اچھا..... وہ اشتیاق!“ وہ جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ کوئی خاص بات؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”بس، میں یہ جانتا ہوں کہ وہ کس قسم کا بندہ ہے اور آج کل کس نوعیت کی مصروفیات میں لگا ہوا ہے.....؟“

”بہت ہی نکلا اور فضول قسم کا بندہ ہے۔ وہ۔“ کانٹیل نے برا سامنے بناتے ہوئے کہا۔ ”اسے آوارگی ہی سے فرصت نہیں ہے، کرے گا کیا۔ جتنا زمین کے اوپر ہے اتنا ہی زمین کے اندر.....“

”تمہارا مطلب ہے، وہ پستہ قامت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

کرنا اور شلوار!“

”شوکت علی!“ میں نے سوال کیا۔ ”تم نے ان کے نام وغیرہ نہیں پوچھے تھے؟“

”جی، میں نے پوچھا تھا لیکن انہوں نے نام بتانے کے بجائے کچھ اور ہی جواب دیا۔“ وہ سادگی سے بولا۔

”پھر میں نے انہیں کریدنا ضروری نہیں سمجھا اور اپنے یقینی باڑی کے کام میں مصروف ہو گیا.....“

”انہوں نے ایسا کیا جواب دے دیا تھا شوکت علی کہ تمہاری بولتی بند ہو گئی۔“ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔

”انہوں نے کہا تھا کہ.....“ شوکت نے جواب دیا۔

”ہر لاہور سے آئے ہیں۔ علی نواز نے ہمیں بھیجا ہے۔“

خالدہ کو کوئی خاص اطلاع دینا ہے.....“

شوکت علی کی بات سن کر میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا

لگا۔ فوری طور پر میرے اندر یہ خیال ابھرا..... وہ دونوں جو کوئی بھی تھے ان کا علی نواز سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں کل ہی علی نواز سے مل کر آیا تھا اور اس ملاقات میں، میں نے اس کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی اس کی روشنی میں وہ جیدا کی گمشدگی میں ملوث نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر ان دو مشکوک اجنبی افراد نے علی نواز اور لاہور کا ذکر

کیا تھا تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ علی نواز کو کسی پکڑ میں پھنسانے کی سازش کر رہے تھے اور عین ممکن تھا کہ جیدا کو انہی لوگوں نے کہیں غائب کر دیا ہو۔ اگر وہ علی نواز کے

ہتھے ہوئے بندے ہوتے تو پھر یہ کئی ظاہر نہ کرتے کہ انہیں علی نواز نے کسی ضروری کام سے خالہ کے پاس بھیجا ہے۔

اگر وہ دونوں نامعلوم افراد میرے ہتھے چڑھ جاتے تو جیدا کی گمشدگی کا عقدہ حل ہو سکتا تھا۔

شوکت علی مجھے جتنی معلومات فراہم کر چکا تھا اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا تھا لہذا مزید چند سوالات کے بعد میں نے اسے اس ہدایت کے ساتھ رخصت کر دیا۔

”شوکت علی! جب تک جیدا کی گمشدگی کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا، تم شاہ پور گاؤں سے باہر نہیں جاؤ گے اور اگر تمہارا جانا بہت ہی ضروری ہو تو پہلے تم تمہارے میں آکر مجھے اطلاع دو گے۔ اس کے بعد ہی کسی طرف کا رخ کرو گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا.....؟“

”جی، سمجھ رہا ہوں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”شاید آپ کو کسی حوالے سے مجھ پر شک ہو رہا ہے.....“

”لگتا ہے، تم میری بات کو کچھ زیادہ ہی سمجھ گئے

شوکت علی کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔ وہ عام شکل صورت کا مالک ایک دیہاتی شخص تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”وہ دونوں بندے تمہیں کب اور کہاں ملے تھے؟“

”جس دن جیدا کم ہوا ہے اس سے پہلے والی شام۔“

شوکت نے جواب دیا۔ ”میں کھیتوں میں موجود تھا کہ انہوں نے مجھ سے اعجاز کریمانے والے کی بہن خالہ کے گھر کا پتا پوچھا۔ خالہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ میں نے انہیں گلزار بی بی کے گھر کا پتا بتا دیا۔ بس جناب، میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا.....“

”وہ دونوں تمہارے لیے اجنبی تھے۔“ میں نے شوکت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے انہیں پہلے کبھی شاہ پور میں نہیں دیکھا.....؟“

”نہیں جی.....!“ اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ ”نشاہ پور کے اندر اور نہ ہی باہر کہیں.....“

”ان کے حلیے اور مشکیں وغیرہ تمہیں یاد ہیں؟“ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ”اگر وہ دوبارہ تمہارے سامنے آجائیں تو تم پہچان لو گے.....؟“

”جی بالکل پہچان لوں گا۔“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔

”ان کے حلیوں کے بارے میں مجھے بھی بتاؤ.....؟“

”ان میں سے ایک دراز قد اور دہلا پتلا تھا۔ رنگ سانولا، عمر تیس سال کے قریب۔“ شوکت علی نے اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی بنے ہوئے تھے جیسے دو تین راتوں سے جاگا ہوا ہو۔ وہ خاصا لمبا ہوا اور بیزار نظر آتا تھا۔“

”اور دوسرا؟“ شوکت علی کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔

”دوسرا درمیانے قد اور متناسب بدن کا مالک تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس کا رنگ گندری اور عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ اس بندے کے سر کے بال حد سے زیادہ سیاہ اور گھونگر یا لے تھے۔“

”شوکت علی!“ میں نے تقریبی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم نے بڑی وضاحت کے ساتھ ان کے حلیے بیان کیے ہیں۔ اب ذرا ان کے لباس کے بارے میں بھی بتاؤ۔“

”جی تمہارے دار صاحب.....!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”سانو لے رنگ کے لیے تڑتے آدی نے بادی رنگ پائلیں کا شلوار میں پہن رکھا تھا جبکہ گھونگر یا لے بالوں والے کے جسم پر لٹھے کا لباس تھا۔“

سامنے آکر کھڑا ہوا ہی تھا کہ میں نے پوچھا۔

”ملک صاحب! جس دن جیدا غائب ہوا ہے ناچی، اس سے ایک دن پہلے دو مشکوک افراد شاہ پور میں دیکھا گیا ہے۔“ فیاض نے بتایا۔ ”وہ اعجاز کی بہن خالہ کا گھر ڈھونڈ رہے تھے.....“

یہ اطلاع واقعی بے حد چونکا دینے والی تھی۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور فیاض کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”وہ دونوں مشکوک افراد کون تھے؟“

”جناب! ان کے بارے میں میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے.....“

”انہوں نے گاؤں کے کس بندے سے خالہ کا گھر پوچھا تھا؟“

”شوکت علی سے.....!“

”یہ شوکت علی کون ہے؟“

”شاہ پور کا ایک چھوٹا زمیندار ہے۔“

”کیا شوکت علی بھی ان دو بندوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا؟“

”نہیں جناب!“ کانٹیل نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”وہ دونوں شوکت علی کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ اس سے پہلے شوکت نے انہیں شاہ پور میں شاہ پور سے باہر نہیں دیکھا۔“

”کیا شوکت علی نے ان مشکوک افراد کو خالہ کے گھر کا پتا بتا دیا تھا؟“

”جی..... شوکت نے یہی بتایا ہے۔“ فیاض نے جواب دیا۔

”تم نے شوکت سے ان بندوں کے حلیے اور وضع قطع کے بارے میں سوال نہیں کیا؟“ میں نے سرسراہٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ملک صاحب! میں شوکت علی کو اپنے ساتھ تھانے لے آیا ہوں۔“ کانٹیل نے جوش بھرے انداز میں بتایا۔

”تا کہ آپ اس سے تفصیلی پوچھ چکے ہو؟“

”یہ تم نے عقل مندی کا کام کیا ہے.....“ میں نے ستائشی نظر سے فیاض کی طرف دیکھا پھر حکیمانہ انداز میں کہا۔ ”شوکت کو میرے پاس بھیجو.....“

تھوڑی دیر کے بعد شوکت علی نامی وہ زمیندار میرے سامنے موجود تھا۔ اس نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”بس، تمہیں اشتیاق پر گہری نظر رکھنا ہے۔“ میں نے مازدارانہ انداز میں کہا۔ ”اس کا وہ حصہ جو زمین کے اوپر ہے اس پر بھی اور جو زمین کے اندر ہے، اس پر بھی کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”آپ کی بات سمجھ میں آرہی ہے ملک صاحب!“

وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”لیکن یہ پتا نہیں چل رہا کہ اچانک اشتیاق پر نظر رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”یہ میں نہیں سمجھا دیتا ہوں.....“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

پھر میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں کانشیل افضل کو سمجھا یا کہ اشتیاق پر نظر رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آرہی ہے۔ علی نواز کی زبانی مضمی کے جو حالات و واقعات میرے علم میں آئے تھے ان کی روشنی میں اشتیاق کو چیک کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اپنی بات کے اختتام پر میں نے افضل سے کہا۔

”افضل! ابھی اور اسی وقت سے تمہاری ڈیوٹی اشتیاق پر ہے۔ تم نے اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھنا ہے۔ وہ کس کس سے ملتا ہے اور ان کے سچ کیا معاملات طے پاتے ہیں وہ تمہیں خبر ہونا چاہیے۔ اگر اشتیاق کاؤں سے باہر کہیں جانے کی کوشش کرے تو تم اس کا تعاقب کرو گے اور ضرورت پڑنے پر اسے گرفتار بھی کر سکتے ہو.....“

خاص طور پر میں نے جن دو اجنبی مشکوک افراد کے بارے میں بتایا ہے، اس حوالے سے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر اشتیاق اور ان لوگوں کے سچ کوئی کنکشن نکل آئے تو فوراً مجھے بتانا ہے.....“

”جی ملک صاحب..... آپ فکر ہی نہ کریں۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”میں اس سلسلے میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

”شاباش!“ میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے امید ہے تم جلد ہی کوئی خوشخبری سناؤ گے.....“

”انتا اللہ.....!“ وہ بڑے عزم سے بولا۔

وہ جانے لگا تو میں نے کہا۔ ”افضل! تم نے ایک کام کرنا ہے.....“

وہ رک گیا اور پوچھا۔ ”حکم ملک صاحب.....؟“

”خالدہ کے بھائی اعجاز علی نواز کے چچا نذر حسین سے کہنا کہ وہ آج کسی وقت تمہارے آکر مجھ سے ملیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے ان سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

”ٹھیک ہے ملک صاحب۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں بھیجتا ہوں انہیں.....“ ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ ”ملک صاحب! وہ دونوں ایک ساتھ آپ کے پاس آئیں یا.....“

”جیسے بھی!.....“ میں نے کہا۔ ”بس، تم انہیں میرا پیغام دے دو۔ یہ فیصلہ میں خود کروں گا کہ انہیں ایک ساتھ اپنے کمرے میں بلانا ہے یا الگ الگ.....“

”ٹھیک ہے ملک صاحب، جو آپ کا حکم۔“ وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔

افضل کے جانے کے بعد میں جیدا کی گمشدگی پر ایک نئے زاویے سے غور و خوض کرنے لگا۔ مجھے اس شخص کی تلاش تھی جو علی نواز کو اس واردات میں ملوث کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر وہ دونوں مشکوک افراد علی نواز کے پیچھے ہوئے ہوتے تو وہ کبھی یہ ظاہر نہ کرتے کہ انہیں علی نواز نے بھیجا ہے۔ یہ کوئی دوسرا ہی چکر تھا اور مجھے اس چکر کے سرخند کا سراغ لگانا تھا۔

XXX

میں دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوا تو ایک عمر رسیدہ شخص مجھ سے ملنے آگیا۔ وہ اپنی وضع قطع اور چال ڈھال سے مجھ کے بیٹے میں نظر آتا تھا۔ اس پر نگاہ کی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے اسے پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔ کہاں اور کب..... یہ یاد نہ آسکا۔

اس نے میرے سامنے بیٹھنے کے بعد جب اپنا تعارف کرایا تو میری الجھن دور ہوگئی۔ ”تھانے داری!“ اس نے کہا۔ ”میرا نام برکت علی ہے۔ ادھر چھپرے کے کنارے آپ سے ملاقات ہوئی تھی جب آپ نے جیدا کی تلاش میں لوگوں کو کچھپے کے اندر چھوڑا ہوا تھا.....“

مجھے سب یاد آگیا۔ اس وقت برکت نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا تھا۔ ”اگر بچہ اس چھپرے میں ڈوبا ہوتا تو اب تک اس کی لاش اوپر آچکی ہوتی۔ دوپہر سے اب تک کافی وقت گزر چکا ہے۔“

”چاچا!“ میں نے برکت علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے چہرے کے تاثرات سے لگتا ہے کہ تم کوئی الجھن لے کر میرے پاس آئے ہو۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا.....؟“

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے تمہانے داری۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”پتا نہیں، آپ میری بات کا کیا مطلب نکالیں لیکن میں جو کچھ دیکھ کر آ رہا

فسادِ جہل

ہوں اس نے میرے دماغ کو الجھا دیا ہے۔ میں نے لکڑیوں والا گھر گھر میں پھینکا اور سیدھا آپ کے پاس آگیا ہوں۔“

”تم نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے چاچا؟“ میں نے سسنی خیر لہجے میں پوچھا۔

”میں لکڑیوں کی تلاش میں جنگل کی طرف گیا تھا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ”بھتے میں ایک آدھ چکر میں جنگل کا لگا لیتا ہوں.....“

میں اضطرابی نظر سے اسے دیکھنے لگا کہ وہ آگے کون سا انکشاف کرتا ہے۔ ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں لکڑیاں اٹھا کر جنگل سے واپس آ رہا تھا کہ میں نے ایک درخت کے نیچے ایک چنل پڑی دیکھی ہے..... آجھ سے دس سال تک کے بچے کی چنل!“

”جنگل میں چنل!“ میں نے چونک کر برکت علی کی طرف دیکھا۔ ”کسی آٹھ دس سال کے بچے کا جنگل میں کیا کام.....؟“

”اسی سوال نے تو میرا دماغ خراب کیا ہے تمہانے وار صاحب!“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”پتا نہیں کیوں..... میرے اندر سے ایک آواز ابھرتی ہے کہ کہیں وہ چنل گمشدہ جیدا کی تو نہیں.....“

”چاچا.....!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے اس چنل کی تفصیل بتاؤ؟“

”جناب..... وہ ہرے رنگ کی ہوائی چنل ہے جس کا ایک اسٹریپ بڑا ہوا ہے یعنی اس اسٹریپ پر موچی کے ہاتھ کا پوند لگا ہوا ہے۔“

”اس چنل کے آس پاس تمہیں اور کچھ بھی نظر آیا؟“

”جی نہیں۔“ اس نے فنی میں گردن ہلا دی۔

میں نے کہا۔ ”تمہیں میرے ساتھ جنگل کے اس حصے میں جانا ہوگا جہاں تم نے وہ چنل پڑی دیکھی ہے.....“

”ٹھیک ہے جناب.....!“ وہ آمادگی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے ساتھ جنگل کی طرف جانے کو تیار ہوں۔“

موضع شاہ پور کے شمال اور جنوب میں تاحدنگاہ سربیز و شاداب مکھنوں کا لاقتا ہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ مشرق میں ایک فرلانگ کے فاصلے پر میرا تھا تھا تھا۔ اس تھانے سے نصف میل آگے ایک نیم پینڈہ سڑک تھی جو لاہور کی جانب جانے والی سڑک سے جالٹی تھی جبکہ شاہ پور کے مغرب میں

دو فرلانگ کے فاصلے سے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ یہ کوئی دس میل تک دراز ایک چھوٹا سا جنگل تھا۔ گاؤں کے لوگ ایندھن کی تلاش میں اسی جنگل کا رخ کرتے تھے اور برکت علی بتا رہا تھا کہ اس نے اسی جنگل کے ایک حصے میں کسی بچے کی ہوائی چنل پڑی دیکھی تھی۔

اگر وہ چنل گمشدہ جیدا کی تھی تو پھر اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی کہ جیدا کو کسی نے اسی جنگل میں گم کیا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ خود تنہا دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے جنگل کی طرف گیا ہو اور پھر اپنی چنل وہاں چھپک کر کہیں رو پش ہو گیا ہو۔

میری یہ سوچ اس نقطے پر منحصر تھی کہ وہ چنل جاوید عرف جیدا ہی کی ہو۔ اگر میں مذکورہ چنل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو خالدہ کو وہ چنل دکھا کر شناخت کرانی جا سکتی تھی اور..... چنل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے جنگل کی طرف سفر کرنا لازمی تھا۔

میں نے ضروری تیاری کی اور برکت علی کی راہنمائی میں جنگل کی جانب روانہ ہونے لگا تو کانشیل افضل میرے پاس پہنچ گیا۔

”ہاں بھی افضل! خیریت تو ہے.....“ میں نے اس پر نگاہ پڑتے ہی پوچھ لیا۔ ”تم خلاف توقع اتنی جلدی کیسے واپس آ گئے؟“

”آپ کو ایک ضروری اطلاع دینا تھی جناب۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”کیسی اطلاع؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے آپ کے حکم کے مطابق، نذیر حسین کو تو تمہانے آنے کے لیے کہہ دیا ہے اور وہ میرے ساتھ تھانے آ بھی گیا ہے۔“ افضل نے رپورٹ پیش کرنے والے انداز میں بتایا۔ ”لیکن اعجاز گھر پر موجود نہیں۔ اس کی گھر والی فریدہ نے بتایا ہے کہ وہ کسی ضروری کام سے کوٹ مکھن گیا ہے اور اس کی واپس آئی ہی ہوگی.....“

کوٹ مکھن، موضع شاہ پور سے کوئی دو میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میں نے افضل کی بات پوری تو جیسے سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

”اعجاز کی گھر والی نے یہ نہیں بتایا کہ اسے کوٹ مکھن میں ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا تھا؟“

”میں نے فریدہ سے یہ سوال کیا تھا۔“ افضل نے جواب دیا۔ ”اس نے بتایا ہے کہ وہاں کے ایک بندے

سے اعجاز نے کوئی رقم وغیرہ لیتا تھی۔ وہ اسی رقم کی وصولی کے لیے وہاں گیا ہے۔“

”پلو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ وہ جب کوٹ مکھن سے واپس آئے گا تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”یہ بتاؤ، نذیر حسین کہاں ہے؟“

”وہ باہر آمدے میں بیٹھا ہے ملک صاحب۔“

”ٹھیک ہے، تم جاؤ افضل۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نذیر حسین کو خود ہی دیکھ لیتا ہوں۔“

وہ مجھے سلام کر کے واپس چلا گیا۔

میں نے نذیر حسین کو بھی اپنے ساتھ رکھا اور چاچا برکت علی کی گرائی میں ہم چنگل کی سمت روانہ ہو گئے۔ میں نے احتیاطاً برکت علی کو آگے چلنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ اس سے میرا صرف اتنا سامقہ تھا کہ میں نذیر حسین سے جو بھی گفتگو کروں وہ برکت علی کی سماعت تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔

”نذیر حسین!“ میں نے علی نواز کے چاچا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کل لاہور گیا تھا۔۔۔۔۔“ میں نے دانستہ آواز کو دھیمار رکھا تھا۔

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور میرے ہی انداز میں آواز دبا کر بولا۔ ”آپ علی نواز سے ملنے گئے تھے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ”تم نے یہ اندازہ کس بات سے لگایا ہے نذیر حسین؟“

”آپ نے مجھ سے علی نواز کا پتا وغیرہ لیا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اسی وقت محسوس ہو گیا تھا کہ آپ جیذا کی تلاش میں لاہور ضرور جائیں گے۔ میں پولیس کے طریقہ کار کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”پھر مجھے تم پر سخت افسوس ہے۔“ میں نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔ ”بلکہ مجھے تم سے تنکین شکوہ ہے۔۔۔۔۔“

”کس بات کا شکوہ اور کیسا افسوس تمہانے دار صاحب؟“ وہ متعجب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”نذیر حسین! تم پولیس کے طریقہ کار سے واقفیت کے کبھی دعوے دار ہو اور تم نے مجھ سے بہت سے حقائق چھپانے کی کوشش بھی کی ہے۔۔۔۔۔“

”کون سے حقائق تمہانے دار صاحب؟“ اس کے تعجب میں اضافہ ہو گیا۔

”میں نے تم پر واضح کیا تھا کہ۔۔۔۔۔ پولیس اور ڈاکٹر

سے کوئی حقیقت نہیں چھپانا چاہیے ورنہ مصیبت الٹی اپنے ہی گلے میں آ جاتی ہے۔۔۔۔۔“

”جناب! میں نے آپ سے کیا چھپایا ہے؟“ وہ نیم احتجاجی انداز میں بولا۔ میرے پر اسرار سوالات نے اس کی تشویش کو باہم عروج تک پہنچا دیا تھا۔

”جب میں نے تم سے خالدہ کی طلاق کا سبب پوچھا تھا تو تم نے بتایا تھا کہ علی نواز کو خالدہ کے کردار پر شک ہو گیا تھا۔ وہ جیذا کو اپنا خون نہیں سمجھتا تھا؟“

”جی ہاں، میں نے آپ کو یہی بتایا تھا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے۔۔۔۔۔ ”اور حقیقت بھی یہی ہے تمہانے دار صاحب۔۔۔۔۔!“

”یہ آدمی حقیقت ہے نذیر حسین!“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آدمی حقیقت!“ وہ مزید الجھ گیا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں جناب۔۔۔۔۔؟“

”یہ ٹھیک ہے کہ علی نواز کو خالدہ کے کردار پر شک ہو گیا تھا اسی لیے وہ جیذا کو اپنا خون تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم نے مجھ سے یہ حقیقت چھپائی کہ علی نواز کے شک کی بنیاد کون شخص تھا۔۔۔۔۔؟“

”کون شخص؟“ اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

”اشتیاق۔۔۔۔۔!“ میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔ وہ کھینٹا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ”علی نواز کو اشتیاق ہی کے حوالے سے خالدہ کے کردار پر شک تھا۔“

”تو کیا علی نواز کا شک درست تھا؟“ میں نے چہچہاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”دلوں کے حال اور نیت کا احوال تو صرف اللہ ہی جانتا ہے تمہانے دار صاحب!“ وہ ذومتی انداز میں بولا۔ ”میں نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا اس لیے کسی پر الزام لگانا میں ٹھیک نہیں سمجھتا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے نا کہ اشتیاق اکثر و بیشتر تمہارے گھر میں گھس رہا تھا؟“ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ ”اور وہ بھی علی نواز کی غیر موجودگی میں۔۔۔۔۔!“

”جی ہاں، یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”وہ میری بیوی کا بھانجا ہے۔ میں اسے گھر میں آنے سے تو نہیں روک سکتا۔۔۔۔۔؟“

میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”نذیر حسین! پولیس کی تفتیش کی گاڑی ٹھک کے بیڑوں سے آگے بڑھتی ہے۔ ایک اشتیاق کی کیا بات ہے، مجھے تو ہر اس شخص پر شک ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے جاوید اور عرف جیدا سے تعلق رکھتا ہو.....“ میں نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اسی لیے میں نے لاہور جا کر سب سے پہلے علی نواز کو چیک کیا ہے۔ کیونکہ جیدا کے ساتھ سب سے زیادہ گہرا تعلق تو اسی کا بنتا ہے۔ جب علی نواز مجھے اس معاملے میں ملوث نظر نہیں آیا تو میں نے اپنی تفتیش کو شاہ پور تک محدود کر دیا ہے اور اللہ کے فضل و کرم سے مجھے اس سلسلے میں ابتدا ہی میں، دو بڑی کامیابیاں حاصل ہو گئی ہیں۔“

”کون سی دو کامیابیاں؟“ نذیر حسین نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”ایک کامیابی تو تمہیں ابھی جنگل میں پہنچنے کے بعد نظر آجائے گی۔“ میں نے سخی خیر انداز میں کہا۔ ”اور دوسری کامیابی کے بارے میں، میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“

میں نے دو مشکوک افراد کا ذکر راستہ کو ل کر دیا تھا۔ نذیر حسین نے بیجاں بھرے لہجے میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے، آپ بہت جلد جیدا کو ڈھونڈ نکالیں گے؟“

”انشاء اللہ!“ میں نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

سہ پہر چار بجے ہم نے جنگل میں قدم رکھ دیا۔

”چاچا برکت!“ میں نے اپنے راہنما کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ہمیں جنگل کے اندر کتنی دور تک جانا ہوگا؟“

”زیادہ دور نہیں جناب۔“ وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ ”زیادہ سے زیادہ سو گز آگے۔ آپ لوگ میرے پیچھے آئیں.....“

میں اور نذیر حسین اس کے پیچھے ہو لیے۔ برکت علی نے غلط نہیں کہا تھا۔ اسی نوے گز آگے وہ مقام آ گیا جہاں کسی بچے کی ہوائی جہل بڑی ہوئی تھی۔ میں نے جہل کے دونوں پاؤں اٹھا کر بغور ان کا جائزہ لیا۔ وہ آٹھ سے دس سال کے کسی بچے کی جہل تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اتنا کم عمر کوئی بچہ خود ہی گاؤں سے تنہا اس جنگل کی طرف آ نکلا ہو اور جہل یہاں چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا ہو۔

”جس بچے کی جہل تھی اسے یقیناً زبردستی اٹھا کر یا بے ہوش کر کے جنگل کی طرف لایا گیا تھا۔ گاؤں میں صرف

رہ سکا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اشتیاق، خالدہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“

”یعنی وہ اپنے جرم پر ہمہ قصد یقین ثابت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا؟“

”آپ کچھ بھی کہہ اور سمجھ لیں تھانے دار صاحب۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”لیکن اشتیاق کے موقف میں بھی جان تھی!“

میں نے اپنی معلومات کی غرض سے پوچھ لیا۔ ”اس نے کیا موقف اختیار کیا تھا.....؟“

”اس کا کہنا یہ تھا کہ اس کے اور خالدہ کے بیچ کبھی کوئی غلط رشتہ نہیں رہا تھا لیکن یہ خالدہ کی بد قسمتی کہ اس کی وجہ سے خالدہ کو طلاق ہو گئی۔“ نذیر حسین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ خالدہ کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی کا ازالہ کرنے کے لیے اس سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔“

”کیا خالدہ بھی اس سے شادی کرنے پر آمادہ تھی؟“

میں نے ایک نہایت ہی حاسس سوال کیا۔

”جی ہاں، وہ تو تیار تھی لیکن.....!“

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھا۔ ”لیکن کیا نذیر حسین؟“

”خالدہ کو بھائی اعجاز اس رشتے کے لیے تیار نہیں تھا۔“ نذیر حسین نے بتایا۔ ”اس نے دو ٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ یہ کام کسی بھی صورت نہیں ہو سکتا۔ اس کی بہن کو اشتیاق کی وجہ سے بدنامی اٹھانا بڑی اور طلاق کا طوق پہننا پڑا۔ اب اگر اسی شخص سے خالدہ کی شادی کر دی گئی تو پورا گاؤں یہی کہے گا کہ علی نواز کا شک سولہ آنے درست تھا.....“

”مطلب یہ کہ خالدہ اور اشتیاق کی شادی نہ ہو سکی؟“

”جی ہاں.....!“ نذیر حسین نے جواب دیا۔

”پھر چار سال کا عرصہ گزر گیا.....؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اور پھر چار سال کے بعد جیدا غائب ہو گیا؟“ میں نے پر خیال انداز میں کہا۔

”نہیں آپ..... جیدا کی..... گمشدگی کا شک اشتیاق پر..... تو نہیں کر رہے..... تھانے دار صاحب!“

نذیر حسین کی جھرجھرائی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

”میں گھر میں آنے سے روکنے کی بات نہیں کر رہا ہوں نذیر حسین۔“ میں نے ایک ایک لفظ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس پر اور اس کی حرکتوں پر نظر رکھنے کی بات کر رہا ہوں.....“

”جناب! میں نے کبھی اس حوالے سے غور نہیں کیا تھا۔“ وہ خجالت آمیز انداز میں بولا۔ ”وہ جیدا کو بیٹا بیٹا اور خالدہ کو بھائی بھائی کہتے نہیں ٹھکتا تھا اور ہر وقت ان کی خدمت میں لگا رہتا تھا.....“

”اور اشتیاق کا بھی بیٹا بیٹا“ اور ”بھائی بھائی“ والا ڈراما علی نواز کو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”غلط یا صحیح، میں اس بات کی بحث میں نہیں پڑوں گا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اشتیاق کے اسی خدمت گارانہ رویے کی وجہ سے علی نواز کو خالدہ کے کردار پر شک ہوا تھا۔ اس نے بار بار محسوس کیا تھا کہ خالدہ، اشتیاق کو اس پر اہمیت دیتی تھی اور جیدا بھی اسے نظر انداز کر کے اشتیاق کی گود میں گھس رہا تھا۔ جب علی نواز نے اس ایٹو پر آواز اٹھائی تو تمہاری بیوی عنایت بی بی نے اشتیاق کی حمایت کی۔ اس موقع پر تم نے بھی بیوی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس کے ساتھ ہی خالدہ نے علی نواز کی دوسری شادی کا معاملہ بھی اچھال دیا۔ وہ بے چارہ اپنی چاچی کے رویے سے تو پہلے ہی نالاں تھا۔ جب تم نے بھی اس کا ساتھ نہیں دیا تو اس نے خالدہ کو طلاق دی اور تم لوگوں کو اپنے ذہن و دل سے نکال کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لاہور کا ہو کر رہ گیا۔“

”میں تو یہی کہوں گا کہ جی گڑے مردے اکھاڑنے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔“ وہ ڈھیلے ڈھالے لہجے میں بولا۔ ”جو کچھ ہوا، بہت برا ہوا.....!“

نذیر حسین کے یہ شکست خوردہ کلمات اس بات کا یقین ثبوت تھے کہ علی نواز غلطی پر نہیں تھا۔ اس نے جو بھی فیصلہ کیا تھا وہ اس وقت کے حالات کا تقاضا تھا۔ اس تمام فتنے اور فساد کی جز صرف اور صرف اشتیاق ہی تھا۔

میں نے اندھیرے میں ایک تیر چھوڑا۔ ”نذیر حسین!“ میں نے رازدارانہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

”میں نے سنا ہے، اشتیاق خالدہ کی طلاق کے بعد بھی اس کے گھر کے چکر لگاتا رہا تھا.....؟“

میرا چھوڑا ہوا تیر عین نشانے پر جا کر لگا۔ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے شیک سنا ہے تھانے دار صاحب لیکن اشتیاق کی نیت صاف تھی۔“

”نیت صاف تھی..... کیا مطلب؟“ میں چونکے بنانہ

جذبہ

چائے: بچہ ایک ہی اچھا پو کے: بچہ دو ہی اچھے انڈیا: بچے تین یا چار پاکستان: بچہ بیہ جنوں تو ہمت نہ ہار

☆☆☆☆☆

حل

لڑکا: ”اگر میں مر گیا تو کیا تم دوسری شادی کرو گی؟“

لڑکی: ”نہیں میں اپنی بہن کے ساتھ رہ لوں گی۔“

لڑکی: ”اور اگر میں مر گئی تو.....؟“

لڑکا: ”میں بھی تمہاری بہن کے ساتھ رہ لوں گا۔“

☆☆☆☆☆

دو لڑکیاں بس میں ایک سیٹ کے لیے لڑ رہی تھیں۔ ایک لڑکا کافی دیر سے دیکھ رہا تھا۔ تو کہنے لگا۔

”کیوں لڑ رہی ہو، اس کا حل میں بتاتا ہوں تم میں سے جو عمر میں بڑی ہے وہ بیٹھ جائے۔“

”پھر کیا..... دونوں لڑکیاں پورے راستے کھڑی رہیں۔“

مرسلہ: محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور

ایک بچہ کم تھا اور وہ تھا جیدا الہذا بڑی مضبوطی کے ساتھ یہ سوچا جاسکتا تھا کہ یہ چہل چہل کی ہوگی۔

میں نے وہ چہل نذیر حسین کو دکھا کر پوچھا۔ ”اس چہل کو پہچانتے ہو نذیر حسین؟“

اس نے بغور چہل کا جائزہ لیا اور فنی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں جناب! میں دو ٹوک کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”مجھے یقین ہے، جیدا کی ماں خالدہ ضرور اس چہل کے بارے میں دو ٹوک سے بتائے گی۔“ میں نے مذکورہ چہل کو ایک تیلے کے اندر محفوظ کرتے ہوئے کہا۔

تھے۔“ میں نے مزید تصدیق کی خاطر پوچھا۔ ”جس سے تم نے اندازہ لگایا کہ وہ اعجاز کے جاننے والے ہیں؟“
 ”جی ہاں، بالکل.....“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اسی بات سے اندازہ لگایا تھا۔“
 ”اللہ کے بندے نذیر حسین!“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”اگر وہ دونوں مشکوک اجنبی اعجاز کے جاننے والے تھے تو پھر وہ اعجاز اور اس کی بہن خالدہ کے گھر کا پتا کیوں پوچھ رہے تھے.....“

”ہاں..... یہ بات بھی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ کڑبڑا کر کیا پھر ایک دوبار گردن جھٹکنے کے بعد بولا۔ ”پتا نہیں کیوں، میرا دل کہتا ہے کہ وہ دونوں بندے اعجاز کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ آپ ایک کام کیوں نہیں کرتے؟“
 ”کون سا کام؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
 ”آپ ان دونوں بندوں کے بارے میں اعجاز حسین سے پوچھیں نا۔“ وہ مشورہ دینے والے انداز میں بولا۔ ”پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا.....“
 ”ہم باتیں کرتے ہوئے جنگل سے باہر نکل آئے۔“
 ”کہتے تو تم بالکل ٹھیک ہو نذیر حسین!“ میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ ”لیکن اعجاز حسین فی الحال شاہ پور میں نہیں ہے.....“

”کیوں..... وہ کہاں چلا گیا؟“
 ”مجھے پتا چلا ہے، وہ کسی بندے سے ملنے کوٹ کھن گیا ہوا ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”وہاں اس کا کوئی دوست رہتا ہے۔ وہ اس کے پاس گیا ہے۔“
 ”اڑہ.....!“ نذیر حسین نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور بولا۔ ”پھر تو فی الحال کچھ نہیں ہو سکتا.....“
 ”کیوں کچھ نہیں ہو سکتا؟“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

”وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔
 ”میں نے کہا۔“ نذیر حسین! اگر اعجاز، شاہ پور میں موجود نہیں تو اس کا یہ مطلب کیسے ہو گیا کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤں گا اور چپ چاپ اس کی وابسی کا انتظار کروں گا.....“

”میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں تھا جناب۔“ وہ اپنی پوزیشن صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اگر اعجاز گاؤں میں موجود نہیں تو پھر ان دو مشکوک بندوں کے بارے میں اس سے پوچھ کچھ نہیں کی جاسکتی.....“
 ”جب اعجاز کوٹ کھن سے واپس آئے گا تو میں

”میں نے ان دونوں بندوں کی تلاش کے لیے اپنے ہاتھ کے عمل کو ہائی الٹ کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے، میں بہت جلد ان بندوں تک پہنچ جاؤں گا۔“
 نذیر حسین نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میں نے محسوس کیا، اس دوران میں اس کے چہرے کی رنگت میں نمایاں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔ اس کے انداز میں تنبیہ کی اور سسٹنی خیزی پائی جاتی تھی۔

”قہانے دار صاحب! آپ کہیں ان دو بندوں کا ذکر تو نہیں کر رہے جن میں سے ایک راز قد سارو نی رنگت کا ہے اور دوسرا گورا ہے۔ اس گورے بندے کے سر کے بال گھونگرے یا لے ہیں.....؟“

”ہاں، ہاں..... وہی۔“ میں نے رک رک کر حیرت بھری نظر سے نذیر حسین کو دیکھا۔ ”کیا تم انہیں جانتے ہو.....؟“
 ”جانتا تو نہیں جناب.....“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مگر میں نے انہیں اسی شام دیکھا ہے جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔“
 ”کہاں دیکھا ہے.....؟“ میں نے سرسراہٹ سے لہجے میں دریافت کیا۔

”اعجاز سے باتیں کرتے ہوئے.....“ وہ انکشاف انگیز انداز میں بولا۔

”اعجاز سے.....؟“ میں نے دوبارہ چلتے ہوئے پوچھا۔
 ”جی ہاں..... وہ سینوں گاؤں سے باہر کھیتوں میں بہت گھل کر باتیں کر رہے تھے۔“ نذیر حسین نے جواب دیا۔ ”مجھے تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ اعجاز کے جاننے والے ہوں.....“

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ نذیر حسین نے میرے ساتھ چلتے ہوئے قیاس آرائی کی۔ ”قہانے دار صاحب! آپ نے بتایا ہے نا، جیدا کی گمشدگی سے ایک دن پہلے، شام کے وقت ان دونوں بندوں نے شوکت علی زمیندار کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں شوکت علی سے بھی پوچھ کچھ کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ ان دونوں بندوں کو نہیں جانتا۔ انہوں نے شوکت علی سے جیدا کا گھر پوچھا تھا..... وہ اس طرح کہ اعجاز دکاندار کی بہن خالدہ کا گھر کون سا ہے..... اور پھر اس کے اگلے روز ہی جیدا شاہ پور سے غائب ہو گیا۔ مجھے پکا شک ہے کہ جیدا کی گمشدگی میں انہی دو مشکوک افراد کا ہاتھ ہے۔“
 میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک طویل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں، میں نے انہیں دیکھا تھا۔“ نذیر حسین نے جواب دیا۔
 ”اور وہ اعجاز کے ساتھ گھل مل کر باتیں کر رہے

اپنی دو کامیابیوں کا ذکر کیا تھا۔ ایک تو آپ نے اس چیل کی صورت میں دکھادی۔ آپ کا اندازہ ہے کہ یہ چیل جیدا کی ہو سکتی ہے لیکن.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”آپ نے ابھی تک دوسری کامیابی کے حوالے سے مجھے کچھ نہیں بتایا؟“

”نذیر حسین!“ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے جو راز بانٹنے جا رہا ہوں اس کا ذکر کسی نہ کرنا.....“

”آپ فکر ہی نہ کریں جناب۔“ وہ گہری تنبیہ سے بولا۔ ”میرے پیٹے کے اندر بہت ہی گہرا کٹواں کھدا ہوا ہے۔ آپ اس میں جو بھی ڈالیں گے، کسی کو نظر نہیں آئے گا۔“

”شاباش نذیر حسین۔“ میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم بڑے کام کے بندے ہو..... لو، اب کام کی بات سنو.....“

وہ ہمدردی گوش ہو گیا۔ ہم باتیں کرنے کے دوران میں واپسی کا سفر بھی جاری رکھے ہوئے تھے اور بارش نے بھی ایک لمحے کے لیے سانس نہیں لی تھی۔ ہمارے لباس پوری طرح بھیج چکے تھے۔

نذیر حسین بڑی توجہ سے میرے بولنے کا منتظر تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے بتانا شروع کیا۔ ”میں نے دو ایسے مشکوک افراد کا کھوج لگایا ہے جن کا تعلق شاہ پور سے نہیں.....“

”دو مشکوک افراد؟“ نذیر حسین نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔

”ہاں دو اجنبی افراد۔“ میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جس دو پہر کو جیدا غائب ہوا ہے اس سے ایک دن پہلے شام کے وقت ان دونوں افراد کو شوکت علی زمیندار کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں شوکت علی سے بھی پوچھ کچھ کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ ان دونوں بندوں کو نہیں جانتا۔ انہوں نے شوکت علی سے جیدا کا گھر پوچھا تھا..... وہ اس طرح کہ اعجاز دکاندار کی بہن خالدہ کا گھر کون سا ہے..... اور پھر اس کے اگلے روز ہی جیدا شاہ پور سے غائب ہو گیا۔ مجھے پکا شک ہے کہ جیدا کی گمشدگی میں انہی دو مشکوک افراد کا ہاتھ ہے۔“
 میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک طویل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

برکت علی نے پوچھا۔ ”اب کیا ارادہ ہے قہانے دار صاحب؟“

”جنگل میں آگے جا کر چھان بین کرنے کا ارادہ ہے۔“ میں نے جنگل کے اندرونی حصے کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اور میرے لیے کیا حکم ہے جناب؟“ برکت نے مجھ سے پوچھا۔

”چا چا! تمہارا کام پورا ہو چکا ہے۔“ میں نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”واپس جانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو بھی تمہاری مرضی ہے.....“

”اگر آپ کو میری ضرورت نہیں تو میں گھر جانا چاہوں گا۔“ وہ بڑی سادگی سے بولا۔

میں نے اسے واپس جانے کی اجازت دے دی اور خود نذیر حسین کے ساتھ جنگل کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ میری نظریں کسی عقاب کے مانند چاروں جانب کا جائزہ لے رہی تھیں تاکہ جیدا کو دھونڈنے کے لیے کوئی اور سراغ باقیہ لگ جائے لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

پھر اچانک بارش شروع ہو گئی۔ یہ ایک نئی افتاد تھی۔ میں نے مزکر اپنے عقب میں دیکھا تو چاچا برکت علی نہیں نظر نہ آیا۔ اسے واپسی کی راہ اختیار کیے پندرہ سے بیس منٹ ہو گئے تھے۔ وہ اب تک جنگل سے باہر نکل چکا ہوگا یا نکلنے ہی والا ہوگا۔

میں نے نذیر حسین سے کہا۔ ”بارش تو لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی ہے۔ آگے جانے کا کوئی فائدہ نہیں..... واپس چلتے ہیں.....“

”میرا بھی یہی خیال ہے قہانے دار صاحب۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اگر بارش اسی رفتار سے جاری رہی تو ہم جنگل میں پھنس بھی سکتے ہیں۔“
 اس کی بات میں وزن تھا۔ جنگل کی بارش کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ ویسے پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ سے بارشوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ساون گزر چکا تھا اور اب بھادوں اپنی جوانی کی بہار دکھلا رہا تھا۔

ہم نے متفقہ رائے سے واپسی کی راہ لی۔
 راستے بھر ہمارے درمیان گمشدہ جیدے کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ نذیر حسین نے مجھ سے پوچھا۔ ”قہانے دار صاحب! آپ نے جیدا کی تلاش کے سلسلے میں

.... اسے بھی دیکھ لوں گا۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نی الحال تو میں گمشدہ جیدے کی ماں خالدہ کے پاس جا رہا ہوں.....“

”کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟“ نذیر حسین نے پوچھا۔

”یہ مناسب نہیں ہوگا۔“ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں خاندانوں کے درمیان پہلے ہی بہت ساری رنجشیں اور افتراقی پیمہلی ہوئی ہے۔ وہ میرے ساتھ تمہیں دیکھ کر بھڑک بھی سکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے جناب، تو پھر میں اپنے گھر جاتا ہوں۔“

”ہاں..... تمہارے لیے یہی مناسب رہے گا۔“ میں نے غصہ سے لہجے میں کہا۔

جب ہم شاہ پور گاؤں میں داخل ہوئے تو ہمارے راستے جدا ہو گئے۔ نذیر حسین اپنے گھر کی طرف چلا گیا اور میں نے خالدہ کے گھر کا رخ کیا۔ بارش اب مکمل طور پر ختم چکی تھی۔ شاید ہمیں جنگل سے نکلنے کے لیے ہی اس کے غریب و غضب میں اضافہ ہوا تھا۔

میں اس سے پہلے بھی خالدہ کے گھر آچکا تھا۔ اس نے میری دستک پر دروازہ کھولا اور مجھے لے جا کر بیٹھک میں بٹھایا پھر خود بھی میرے سامنے بیٹھتے ہوئے اضطرابی لہجے میں بولی۔

”تمہارے دار صاحب! میرے جیدے کا کچھ پتا چلا؟“

میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ”ہاں..... کچھ پتا چلا تو ہے!“

”کیا پتا چلا ہے؟“ وہ اضطرابی لہجے میں متحضر ہوئی۔ وہ سوالیہ نظر سے مجھے نکتے لگی۔ میں نے اپنے ہاتھ میں موجود تھیلے کو کھولا اور بڑے ڈرامائی انداز میں وہ ہوائی چپل نکال کر خالدہ کے سامنے رکھ دی جو مجھے جنگل کے اندرونی حصے سے ملی تھی۔

چپل پر نگاہ پڑتے ہی خالدہ ہچکائی انداز میں چلائی۔

”یہ..... یہ چپل تو..... میرے جیدے کی ہے..... آپ کو یہ چپل کہاں سے ملی.....؟“

میں نے اضطرابی کیفیت میں جھلا جیدے کی ماں کے سوالات کے جوابات میں وہ تفصیل بیان کر دی جواب تک میری تفتیش کے نتیجے میں سامنے آچکی تھی۔ میری باتیں سن کر خالدہ رو باکی ہوئی چمگوگیر آواز میں پوچھا۔

”تمہارے دار صاحب! میرا جیدال تو جانے گا نا.....؟“

”اللہ کے گھر سے بہتری کی امید رکھنا چاہیے۔“ میں

نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں پوری شد و مد سے تمہارے بیٹے کو تلاش کر رہا ہوں۔ کل صبح میں دوبارہ جنگل کی طرف جاؤں گا۔ آج تو طوفانی بارش نے میرا راستہ روک لیا، کل انشا اللہ! میں جیدا کا سراغ لگانے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔“

میں مزید دس پندرہ منٹ تک خالدہ کے پاس بیٹھ کر تسلی دلا رہے کی باتیں کرتا رہا پھر اس کے گھر سے نکل آیا۔ فی الحال اسے تسلی ہی دے سکتا تھا کیونکہ ابھی تک صورت حال کھل کر میرے سامنے نہیں آئی تھی۔

نذیر حسین کے انکشاف نے میرے ذہن میں سوچ کا ایک نیا دروازہ کھولا تھا۔ جس شام زمیندار شوکت علی سے دو اعینی مشکوک افراد نے اعجاز کی بہن خالدہ کے گھر کا پتا پوچھا تھا، اسی شام نذیر حسین نے انہی دو مشکوک بندوں کو اعجاز کے ساتھ کھیتوں میں کھل کر باتیں کرتے دیکھا تھا۔ یہ ایک ایسا کلا تصادف تھا کہ میری سوچ میں متعدد سوالات پیدا کر رہا تھا۔

علاوہ ازیں علی نواز نے مجھے اپنی سابق بیوی خالدہ اور اس کے مہینہ آشنا اشتیاق کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس ذکر کو اعجاز نے بالکل ہی گول کر دیا تھا۔ جب میں نے علی نواز کے چچا نذیر حسین سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو اس نے چند ایک معاملات کی پردہ پوشی کرتے ہوئے بانی باتوں کی تصدیق کر دی تھی۔ مثلاً یہ کہ جب علی نواز نے خالدہ کو طلاق دے دی اور وہ اپنے میکے آئی تو اس کے لیے اشتیاق نے رشتہ بھیجا تھا لیکن اعجاز نے اس رشتے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اعجاز نے یہ تمام تر معاملات مجھ سے چھپائے تھے جس کی کوئی وجہ نہیں کی جاسکتی تھی۔ اعجاز نے خالدہ اور علی نواز کے بچھڑنے کے حوالے سے مجھے جو قصہ سنایا تھا اس میں علی نواز کو قصور وار ٹھہرایا گیا تھا اور جیدے کی گمشدگی کے سلسلے میں بھی اس کے شک کا مرکز علی نواز ہی تھا۔ بہر حال، نذیر حسین کی فراہم کردہ تازہ ترین معلومات کے مطابق اعجاز کو بڑی باریک بینی سے چیک کرنا ضروری ہو گیا تھا تا کہ اس حقیقت تک رسائی حاصل کی جاسکے کہ اس نے حقائق کو چھپانے کی کوشش کس مقصد سے کی تھی۔

اپنے اسی تجسس کی تسکین کے لیے میں نے تمہانے جانے سے پہلے اعجاز کر یا نہ فروش کی بیوی فریدہ سے ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔ یہ تو مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اعجاز اپنے کسی دوست سے ملنے کوٹ کھن گیا ہوا تھا لیکن یہ جانتا ہی ضروری تھا کہ ایسا کون سا ہم کام تھا کہ ادھر شاہ پور میں ان کے بھانجے کی گمشدگی نے افتراقی چارگی مچی اور وہ

کوٹ کھن کی سیر کو نکلا ہوا تھا؟

XXX

کوٹ کھن، موضع شاہ پور سے صرف دو میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے اور میں شوکت علی کے ہمراہ اسی کوٹ کھن کی جانب رواں دواں تھا۔ ہم دونوں الگ الگ گھوڑوں پر سوار اب میں کوٹ کھن پہنچنے ہی والے تھے۔

خالدہ کے گھر سے اٹھ کر میں سیدھا اعجاز کے گھر پہنچا تھا اور میں نے وہاں اعجاز کی گھر والی فریدہ سے ایک بھر پور ملاقات کی تھی اور اسی ملاقات نے مجھے کوٹ کھن کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

فریدہ پہلے تو مجھے دیکھتے ہی گھبرا گئی۔ مجھے ایک پولیس اہلکار کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ اعجاز، اپنے کسی دوست سے ملنے کوٹ کھن گیا ہوا ہے لیکن جب میں نے فریدہ سے اعجاز کے بارے میں سوال کیا تو وہ بولہلا کر آئیں بائیں شاہیں کرنے لگی تھی۔

پہلے اس نے کہا کہ اعجاز گھر میں نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں واپس آئے گا۔ میں نے جب اسے پولیس اہلکار سے ہونے والی بات کا حوالہ دیا تو وہ چونک اٹھی اور پٹری بدلتے ہوئے بولی..... ہاں، مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ وہ تو کوٹ کھن گیا ہوا ہے۔ اس کے بعد بھی میں نے جو سوال کیا، اس نے حواس باختہ جواب ہی دیا۔ جب میں نے تھوڑی سی سختی کی اور دو مشکوک افراد کے بارے میں استفسار کیا تو اپنی مکمل معذوری ظاہر کرتے ہوئے وہ بڑی عاجزی سے بولی۔

”تمہارے دار بھی! مجھے تو اعجاز نے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنے دوست فاروق مہر سے ملنے کوٹ کھن جا رہا ہے۔ فاروق سے اس کا رقم کا کوئی لین دین ہے۔ وہ اپنی رقم وصول کرنے وہاں گیا ہے۔ اس کے سوا مجھے کسی بات کا پتا نہیں.....!“

میں نے فریدہ سے اعجاز کے کوٹ کھن والے دوست فاروق مہر کے بارے میں مکندہ حد تک معلومات حاصل کیں اور اس کے گھر سے اٹھ آیا تھا۔ جب سے نذیر حسین نے مجھے اعجاز اور مشکوک افراد کی ملاقات کے بارے میں بتایا تھا، میرا ذہن ایک خاص انداز میں سوچنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس معاملے میں ایک نہایت ہی اہم نکتہ تھا اور وہ یہ کہ اگر وہ دونوں مشکوک افراد اعجاز کے واقف کار تھے اور اس کے ساتھ مکمل مل کر باتیں کر رہے تھے تو پھر انہیں زمیندار شوکت علی سے خالدہ کے گھر کا پتا پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی اور یہی نکتہ مجھے موضوع شاہ پور

فسادِ جہل

سے کوٹ کھن لے آیا تھا۔

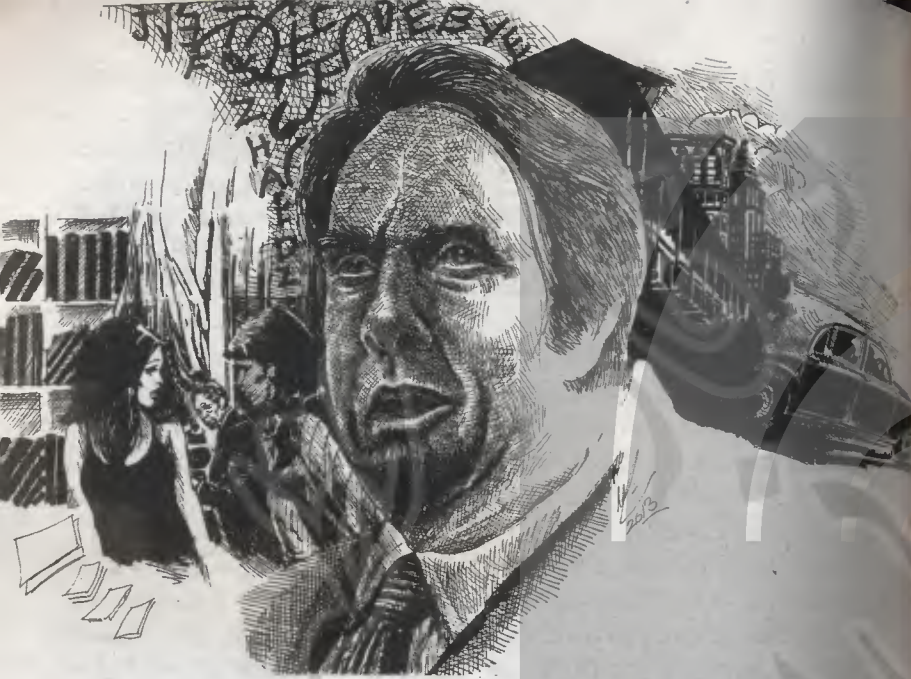
ان دونوں مذکورہ مشکوک افراد کو شاہ پور میں مہینہ طور پر تین افراد نے دیکھا تھا۔ نمبر ایک نذیر حسین، نمبر دو اعجاز اور نمبر تین زمیندار شوکت علی نے۔ اعجاز کوٹ کھن میں تھا اور میں نذیر حسین کو بہ وجہ اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا لہذا زمیندار شوکت علی کو ساتھ لے آیا تھا۔ واقعات کی روشنی میں شاہ پور میں وہ دونوں بندے سب سے پہلے شوکت علی ہی سے ملے تھے۔ میں نے راستے میں ایک مرتبہ پھر شوکت علی سے دوامور کی تصدیق کر لی تھی۔ نمبر ایک، ان بندوں نے شوکت علی سے اعجاز کی بہن خالدہ کے گھر کا پتا پوچھا تھا۔ نمبر دو، انہوں نے اپنے بارے میں شوکت کو بتایا تھا کہ وہ لاہور سے آئے ہیں۔ اعجاز کو کا شک تھا کہ جیدے کی گمشدگی میں اس کے باپ علی نواز کا ہاتھ جو کہ لاہور میں رہتا تھا۔ اب یہ معاشی وقت حل ہو سکتا تھا جب اعجاز میرے روبرو ہوتا، اسی لیے میں نے پہلی فرصت میں کوٹ کھن کا رخ کیا تھا۔

ہم ساڑھے آٹھ، پونے نو بجے کوٹ کھن میں تھے۔ فریدہ سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں، میں نے اعجاز کے دوست فاروق مہر کا گھر ڈھونڈنے کے لیے مقامی لوگوں سے پوچھنا چاہا کہ تو ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ کوٹ کھن میں فاروق مہر کی کوئی شخص رہتا ہی نہیں۔ ایک فاروق لوہار سے ملاقات ہوئی اور وہ شاہ پور کے اعجاز کر یا نہ فروش کو کہیں جانتا تھا۔ جب میں نے کوٹ کھن کے لوگوں کو اعجاز کی وضع قطع اور چلنے وغیرہ سے آگاہ کیا تو ایک شخص نے بتایا کہ ایسی شکل و شبہت کا ایک آدمی نواز کے گھر آیا ہوا ہے۔ میں معلومات فراہم کرنے والے اس بندے کو ساتھ رکھ کر نواز کی شخص کے گھر پہنچ گیا۔ یہاں ایک سنسنی خیز انکشاف میرا منتظر تھا۔

میری دستک کے جواب میں تھوڑی تاخیر سے دروازہ کھلا اور جس شخص نے ادھورا دروازہ کھول کر باہر جھانکا، شوکت علی نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔

”تمہارے دار صاحب!“ شوکت علی کی سرسراہٹ ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ ”یہ تو انہی دو بندوں میں سے ایک ہے جنہوں نے مجھ سے خالدہ کے گھر کا پتا پوچھا تھا.....“

پولیس کو دروازے پر دیکھ کر اور اپنے ہاتھ میں، میرے ہمراہی کا تبصرہ سن کر وہ بندہ ایسے اچھلا جیسے بجلی کے نیگے تار کو چھو لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میکانیکی انداز میں دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔



بیس منظر

تویر ریاض

دنیا کے بیشتر انقلابات میں جہاں دیگر عوامل کا فرما رہے ہیں وہیں قلم کی طاقت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ دوسروں کی داستان لکھنے والے اکثر لاشعوری طور پر خود بھی کسی نہ کسی داستان کا حصہ بن کر زندگی گزارتے ہیں۔ اگرچہ اس کا ادراک بہت آخر میں ہوتا ہے مگر اس وقت تک کہانی کا انجام درخشاں پاتا ہے۔

یروشلیم سے ایک تخلیق کار کی زندگی کے چند اوراق

یہ واقعہ اس سال پیش آیا جب مجھے رومانی ناول ہے شیونیتا پر گولڈ ہارٹ ایوارڈ ملا۔ اس کی کہانی ایک آسٹریائی موسیقار اور مصیبت زدہ برطانوی لڑکی کی محبت کے گرد گھومتی تھی جو ویانا میں زیر علاج تھی۔ مجھے بھی ایسے ناولوں کا پلاٹ سوچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ میری اپنی زندگی میں رومانی تجربات بہت کم ہیں۔ میرے لیے یہ ایوارڈ اور اس کے نتیجے میں ملنے والی توجہ بہت اہم تھی کیونکہ اس سے پہلے میں مختلف موضوعات پر پینتالیس کتابیں لکھ

واقعات کے مطابق، اشتیاق کی خالدہ میں حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی دلچسپی نے اعجاز کو بہت اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اسی شخص کی حرکتوں کے باعث اعجاز کی بہن خالدہ کو طلاق ہوئی تھی۔ اعجاز کے دل میں علی نواز کے لیے بھی بہت غم وغصہ تھا۔ اشتیاق کا رشتہ جب اعجاز نے بڑی شدت سے مستر ذکر دیا تو وہ جیدے سے ملنے کے بہانے گھر کے چکر لگانے لگا تھا۔ اعجاز نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ خالدہ اپنے دل میں اشتیاق کے لیے نرم گوشہ رکھتی تھی۔ جیدے کی ولایت اور خالدہ کی طلاق کے حوالے سے گاؤں میں اعجاز کی جو ذلت ہوئی تھی وہ اس کے دماغ کے پرچے اڑا دینے کے لیے کافی تھی۔ وہ جیدے کے لیے اپنے دل میں شدید ترین نفرت رکھتا تھا جو اس بدنامی کی جڑ تھا۔ ان تمام مسائل کو حل کرنے کے لیے اس نے ایک شاطرانہ منصوبہ بنایا اور ایک تیرے تین شکار کرنے کی کوشش کر ڈالی۔

نواز اور وحید کوٹ لمھن کے جرائم پیشہ تھے۔ اعجاز نے ان کی مدد سے جیدے کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ تیار کیا اور مجھے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ جیدے کی کشمکش میں علی نواز کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ اس کا منصوبہ تقریباً کامیاب ہو چکا تھا کہ بالکل آخری مراحل میں، میں نے اس کے عزائم کی پھیل روک دی تھی۔

جیدے کی چپل کی بازیابی اور شناخت کے علاوہ ندیر حسین کے انکشاف نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جیدے کی کشمکش میں انہی دو مشکوک افراد کا ہاتھ تھا اور بعد ازاں میرا یہ خیال سو فیصد صحیح ثابت ہوا۔ جیدے کے وجود کو منقرض ہستی سے مٹانے کے لیے اعجاز نے نواز اور وحید کی خدمات حاصل کی تھیں تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بچے بائرسی.....!

اسی روز شام سے پہلے میں نے نواز اور وحید کی نشاندہی پر چنگل کے دور افتادہ حصے میں جا کر معصوم جیدا کی لاش دریافت کر لی۔ ان نامرادوں نے جیدے کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ایک کڑے میں دبا دیا تھا۔ یہ تمام تر مذموم کارروائی انہوں نے اعجاز کے ایما پر کی تھی لہذا میں نے نواز اور وحید کے ساتھ ہی اعجاز کو بھی فٹ کر دیا۔ اس فتنے کا روح رواں وہی تھا۔

فساد تو فساد ہی ہوتا ہے اور اگر یہ فساد کسی جہالت کا رہین منت ہو تو پھر اس کی خطرناکی اور تباہ کاری کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا.....!

(تحریر: حسام بٹ)

شوکت علی کے انکشاف نے مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر حد سے زیادہ چونکا کر دیا تھا لہذا میں نے اس کی دروازہ بند کرنے والی کوشش کو ناکام بنانے کے لیے دروازے کے بیچ میں پاؤں پھنسا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دروازے کو زوردار دھکا دیا۔

اس بندے کو میری جانب سے شاید ایسے فوری رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ دروازہ اس کے منہ پر لگا اور وہ پشت کے بل دھڑام سے گھر کے کچن میں گرا۔ میں اچھل کر اندر پہنچا تو سامنے اعجاز کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بندہ بھی تھا۔ شوکت علی نے فوراً سے پیٹرس اس بندے کو کبھی پہچان لیا۔ وہ دھکا کھا کر گرنے والے کا وہی ساتھی تھا جنہوں نے جیدا کی کشمکش سے ایک رات پہلے شوکت علی سے خالدہ کے گھر کا پتہ چما تھا۔

اعجاز کو ان دو مشکوک افراد کے ساتھ دیکھ کر ساری کہانی میری سمجھ میں آگئی تھی۔ رہی سہی کسر اس وقت جانی رہی جب ان تینوں نے مجھے دیکھ کر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی۔

میں بھلا انہیں کیسے نکل جانے دیتا۔ شوکت علی اور میں تو تھے ہی، ہمارے علاوہ چار پانچ اور افراد بھی گلی میں تماشا دیکھنے کے لیے موجود تھے۔ یہ لوگ اپنے گاؤں میں پولیس کی آمد پر بے پناہ تجسس میں مبتلا ہو گئے تھے اور ہمارے ساتھ چلتے ہوئے نواز کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ ان سب نے پولیس کی مدد کی اور پانچ منٹ کے اندر میں ان تینوں پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔

رات نگارہ بچے اعجاز، نواز اور نواز کا ساتھی وحید میرے تھانے کی حوالات میں بند تھے۔ میں نے دو خوف ناک صورتوں والے کانٹیلو کو حوالدار کی ”مدد“ اور ”مہمانوں“ کی ”خاطر مدارات“ پر مامور کیا اور خود جا کر اپنے کوارٹر میں اطمینان سے سو گیا۔ یہ اطمینان اس بات کا تھا کہ میں نے جیدے کی کشمکش کا راز پالیا تھا اور..... یہ راز روکنے کے لیے کر دینے والا تھا۔

اگلی صبح میں تھانے پہنچا تو حوالدار نے ان تینوں کو کسی ریکارڈ کی طرح بیچنے کے لیے تیار کر دیا تھا۔ میں نے انہیں اپنے کمرے میں بلایا اور سوال و جواب شروع کیے تو انہوں نے اپنے جرائم کا اقرار کر لیا۔ اعجاز کوئی عادی مجرم نہیں تھا۔ وہ گزشتہ رات گرفتاری کے وقت ہی بہت ڈرا سہانظر آ رہا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ سب کچھ قبول کرنے کو تیار ہے۔ نواز اور وحید کو میرے تھانے کے عملے نے ”سیٹ“ کر دیا تھا۔

چکی تھی جن کی تعریف بہت کم لوگوں نے کی اور مجھے تاریخی کے بہت ہی کم خطوط موصول ہوئے۔ مجھے اس ایوارڈ کے ملنے کی بالکل بھی توقع نہیں تھی۔ اسی لیے میں اس انچ میں دیر سے پہنچی جہاں یہ ایوارڈ دیا جاتا تھا۔ تقریب کے اختتام پر بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی۔ میں آج بھی یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ اس سیمینار کی بول کا اثر تھا۔ جو انعامی رقم کے ساتھ مجھے دی گئی تھی اور نہ ہی انعام وصول کرتے وقت شاہی خاندان کے فرد سے ہاتھ ملانے کا نشانہ بلکہ دوسرے مصنفین کی آنکھوں سے نکلتی جلن نے مجھے مدہوش کر دیا تھا۔ وجہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن میں اس سے انکار نہیں کر سکتی کہ میرا دماغ اس وقت بھی چکر رہا تھا۔ جب میں کہنے رائل سے باہر نکل رہی تھی۔ اور میرا ذہن یہ سوچنے کے بھی قابل نہ تھا کہ مجھے دواؤں اور اسٹیشن جانے کے لیے کس راستے کا انتخاب کرنا چاہیے۔ میں نے پہلی بار اپنا اصول توڑتے ہوئے نیکی پکڑی اور گلفورڈ جانے والی ٹرین میں سوار ہونے کے لیے اسٹیشن پہنچ گئی۔ مجھ جیسی درمیانہ عورت کی عمر کے لیے یہ عیاشی بھی بہت زیادہ تھی اور نیکی کا کہہ کر مجھے انعام میں لینے والی رقم سے بھی زیادہ لگ رہا تھا لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ میں نے اپنی جیت کا یقین کرنے کے لیے وہ ڈبا کھول کر دیکھا جس میں وہ ایوارڈ رکھا ہوا تھا پھر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ان لحاظ کو یاد کرنے لگی جب سب لوگ اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔

”کیا یہی وہ ایوارڈ ہے؟“ ایک آواز نے میری محویت توڑ دی۔

میں نے اپنی آنکھیں کھولی کر دیکھا۔ میرے برابر والی نشست پر سفید بالوں والا ایک شخص براجمان ہو چکا تھا۔ اس نے قیمتی موٹ پہن رکھا تھا اور کافی اسمارٹ دکھائی دے رہا تھا۔ سیاہ قمیص، سلوٹر کی ٹائی اور سیاہ پٹے میں اس کی شخصیت متاثر کن لگ رہی تھی۔

”معاف کرنا میں کچھ بھی نہیں۔“ میں نے اجنبیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا کہ کیا یہ وہ ایوارڈ ہے جسے تم ایک اشار کی طرح گھر لے جا کر رکھ دو گی اور اس کے بعد یہ تمہارے لیے بے قیمت ہو جائے گا۔“

میں نے کوشش کی کہ اس سے نظریں نہ ملاؤں لیکن میں نے اس کے دانتوں پر چڑھا ہوا سونے کا خول دیکھ لیا تھا۔ میں نے کبھی بھی نمود و نمائش کو پسند نہیں کیا۔ وہ جو کوئی

بھی تھا لیکن میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی، مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ میرے بارے میں کس حد تک جاننا ہے۔ مجھے اس کے حد سے تجاوز کرنے کی پروا تھی اور نہ ہی میں اس کے سوال کے پیچھے پیچھے ہونے مقصد کو جاننا چاہتی تھی۔ لہذا میں نے اس کی حوصلہ شکنی کی خاطر کہا۔ ”اگر تم میری بات کا برا نہ مناؤ تو مجھے کہنے دو کہ اس سے تمہارا کوئی سروکار نہیں۔“

”اس طرح کی باتیں نہ کرو ڈولی۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے مزید اعتراض کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ میرا قلبی نام ڈولورس ہے اور میں اپنے دوستوں کو بھی مجبور کرتی ہوں کہ وہ مجھے اس کے علاوہ کسی دوسرے نام سے نہ بلا لیں۔ وہ اپنا سر میری طرف اس طرح جھکائے ہوئے تھا، جیسے چاہتا ہو کہ دوسرے مسافر ہماری گفتگو سن سکیں۔ بعض اوقات ٹرین کے سفر میں برابر بیٹھے ہوئے شخص سے باتیں کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر کوئی اپنا سر جوڑ کر بیٹھ جائے اور ڈولی کہہ کر بلائے تو اس عورت کے پاس ہنگامی زنجیر کھینچنے کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ اس نے یقیناً اندازہ لگالیا ہوگا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں لہذا وہ مجھے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”میں کچھ بے تکلف ہو گیا تھا۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ واقعی مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا چاہیے۔“ میں نے روکے انداز میں سر ہلایا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ بات کو آگے بڑھانے ہوئے بولا۔ ”لیکن تمہیں اس بارے میں ضرور سوچنا چاہیے۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”تم اگر چاہو.....“ اس نے معنی خیز انداز میں اپنا جملہ دہرا چھوڑ دیا۔

”میں کوئی چیز خریدنا نہیں چاہتی۔ براہ کرم مجھے تیار چھوڑ دو۔“

”میں کوئی چیز نہیں بیچ رہا۔ میرا اشارہ ہیٹ سیلر کی طرف ہے، ہم اس بارے میں ضرور سوچو تمہیں کس کتاب پر انعام ملا ہے۔“

”پے شیڈ تیار!“

”میرا خیال ہے کہ اس ایوارڈ کی بدولت اس کی چند سوکاپیاں اضافی فروخت ہو جائیں گی۔ ممکن ہے کہ یہ تعداد ہزار تک پہنچ جائے اور اس میں سے مصنف کو کیا ملتا ہے۔ اس کے لیے مرئی کی خوراک کی مثال دینا کافی ہوگا۔ میں پوری دنیا میں فروخت کی بات کر رہا ہوں جو لوگوں میں

ہوتی ہے۔“

”کیا واقعی؟“ میں اپنا پیلا ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔

”اگر تم مزید جاننا چاہتی ہو تو کل صبح اس لیوژن میں سوار ہو جانا جو تمہاری گلی کے آخری سرے پر کھڑی ہوگی۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا سفر بالکل محفوظ ہوگا اور اس کے بعد تمہاری زندگی بدل جائے گی۔“

میں اس سے پوچھنے ہی والی تھی کہ اسے میری رہائش گاہ کے بارے میں کس طرح علم ہوا لیکن وہ اچانک ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ کھوٹی پر سے اپنا ہیٹ اتارا اور اسے سر پر بھاتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ میں نے بقیہ سفر بے آراہی سے گزارا سارے راستے اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ عالم پیانے پر فروخت جولاخوں میں ہوتی ہے۔ میں نے اس کامیابی کا خواب کبھی نہیں دیکھا تھا جبکہ مجھے سال کے بہترین رومانی ناول کے مصنف کا اعزاز مل چکا تھا۔ بے ظاہرہ شخص احقانہ باتیں کر رہا تھا۔ وہ کون ہو سکتا ہے، کوئی ایجنٹ، پبلشر یا فلم ساز، میرے خیال میں وہ ان میں سے کوئی نہیں تھا۔ میں نے اس پر اور اس کی لیوژن پر لعنت بھیجی اور اس کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

گھر پہنچ کر میں ایک بار پھر اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ گھر کی حالت خاصی خستہ ہو گئی تھی۔ دروازوں کا رنگ اڑ چکا تھا۔ کچن کا ٹیبل رک رہا تھا اور اس کی ٹیپ ٹپ میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اتنی ساری کتابیں لکھنے کے بعد میرے حالات اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر ہونے چاہیے تھے۔ شاید یہ ایوارڈ میری قسمت بدل دے۔

اس رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ میں علی الصبح بیدار ہو گئی اور سوچنے لگی کہ اگر اس کی کاروائی مجھے لینے آئی تو مجھوں گی کہ وہ سچا تھا اور اس نے میرے ساتھ کوئی مذاق نہیں کیا تھا۔ عام طور پر میں گھر میں جیز اور سوٹر پہنتی ہوں لیکن اس روز میں نے باہر جانے کے لیے اپنا گرے سوٹ اور سفید بلاؤز زیب تن کیا۔ تیار ہو جانے کے بعد میں نے ایک سے زائد مرتبہ کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا لیکن گلی کے آخری سرے پر مجھے کر دوسری وین کے علاوہ کوئی گاڑی نظر نہیں آئی۔

نوبختے میں پانچ منٹ پر میں نے ایک بار پھر باہر کی جانب نظر دوڑائی تو مجھے وہاں ایک سیاہ چمک دار ویلر کار کھڑی نظر آئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے اپنے پالش شدہ سیاہ جوتے پہنے اور جسم کے گرد سرخ شال

اچھی طرح لپیٹ کر باوقار انداز میں چلتی ہوئی کار تک پہنچی۔ سفید بالوں والے شو فرنے کے رنگ کی وردی پہن رکھی تھی۔ اس نے موڈ بانہ انداز میں مجھے سلیوٹ کیا میرے لیے کار کا دروازہ کھول دیا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ میں نے کار کی پچھلی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ وہاں پہنچ کر آپ حیران رہ جائیں گی۔“

”گو یا تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔“

”اس طرح میں سارا مزاحم ہو جائے گا۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔ اگر گری دی نہیں دیکھنا چاہتے تو اس کا سوچ آف کر دیں۔ اگر مطالعہ کا شوق ہے تو آپ کوئی میگزین اور اخبارات... بھی لے سکتے ہیں۔“

”کیا یہ سفر طویل ہے؟“

”جی ہاں۔ ہمیں کم از کم ایک گھنٹا تو لگ ہی جائے گا۔“

میرے ذہن میں فوراً ہی لندن کا خیال آیا اور تھوڑی دیر بعد ہی اس کی تصدیق بھی ہو گئی جب کار اسے تھری کی جانب مڑی، میں کارنی دی یا میگزین کے بجائے راستہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک گھنٹا گزرنے سے پہلے میری لندن میں تھے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون سا علاقہ تھا۔ بالآخر ہماری کار ایک بڑے گیٹ کے باہر رک گئی۔ ڈرائیور کے ہارن دیتے ہی گیٹ خود کار طریقہ سے کھل گیا۔ وہ جاندار اتنی بڑی تھی کہ گیٹ میں داخل ہونے کے بعد بھی کار چلتی رہی اور پھر سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی عمارت کے باہر رک گئی۔ اس پر شکو عمارت کو دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گئی۔ میں نے کار سے باہر نکلنے سے شو فر سے پوچھا۔

”کیا تم واپس گھر چھوڑنے جاؤ گے؟“

”آپ اس کی فکر نہ کریں۔ تمام انتظامات مکمل ہیں۔“ جیسے ہی میں سے سیز جیوں پر قدم رکھا۔ سامنے والا دروازہ فوراً ہی کھل گیا ایک خوت صورت جوان عورت نام لے کر میرا استقبال کر رہی تھی۔ اس کے بال سرخی ناکل سنہرے تھے۔ اس نے گہرے سبز رنگ کا بلاؤز اور نیلی جیز پہن رکھی تھی۔ اس کا چہرہ جانا پہچانا لگ رہا تھا لیکن مجھے یاد نہیں آیا کہ اس سے پہلے کہاں مل چکی ہوں۔ وہ ان تمام عورتوں سے کہیں زیادہ جوان تھی جن سے میری ملاقات ایوارڈ کے موقع پر ہوئی تھی۔

”مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ تم نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا۔“ اس نے کہا۔ ”ایش کو پورا یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔ دراصل اس میں کچھ ایسی خداداد صلاحیتیں ہیں جو ہر ایک کو نظر نہیں آتیں۔“

”ایش؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں آتی کہ کوئی شخص مجھے ڈنگا نے پر مجبور کر سکتا ہے۔“

”ایش میرا شوہر جس نے تم سے ٹرین میں بڑے ٹیٹھے لہجے میں بات کی تھی۔“

”اس نے مجھ سے کسی کاروباری سودے کی بات کی تھی۔“

”ہاں اور اس کے لیے تمہیں اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہیں۔“

وہ مجھے سرخ قالین سے آراستہ راہداری سے گزرتی ہوئی ایک بڑے ہال میں لے گئی جہاں کئی بڑے بڑے صوبے رکھے ہوئے تھے۔ آتش دان میں لکڑیاں دھک رہی تھیں اور کمرے کا درجہ حرارت غیر معمولی طور پر زیادہ تھا۔

”کافی؟“ اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”ضرور۔ تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔“

”مجھے ریوین کہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا موبائل فون نکالا اور کسی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

”تین کافی۔“

گوکہ میں اخبار نہیں پڑھتی تھی لیکن میں نے ریوین کا نام سن رکھا تھا۔ وہ ماڈل، ایڈیٹر، منیجر، گلوکارہ اور ٹی وی کی مشہور شخصیت تھی۔ اس نے جس شعبہ میں بھی کوشش کی وہیں نام بنایا۔ میں اپنی جھینپ مٹانے کے لیے بولی۔ ”مجھے امید نہیں تھی کہ تم سے ملاقات ہو جائے گی۔ میرا خیال تھا کہ کسی اشتہاتی ادارے کے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ بولی۔ اچھا ہی ہے کہ کوئی مجھے نہ پہچانے۔ لوگ بڑے عجیب و غریب انداز میں اپنا رد عمل ظاہر کرتے ہیں۔ تم نے کسی کو اپنے اس خفیہ سفر کے بارے میں تو نہیں بتایا؟“

”نہیں۔ یہ راز ابھی مجھ تک ہی محدود ہے۔“

”بہت اچھے۔ کیا یہ سچ ہے کہ تم تمہارا بھتیجی ہو؟“

”ہاں۔“

”اور تم نے ہی اتنے سارے دلچسپ رومانی نوول لکھے ہیں؟“

جواب دیا۔ ”ہاں۔ کچھ تو لوگوں کو وہ پسند آئے ہیں۔“

”میں نے تمہارے سب ناول پڑھ رکھے ہیں۔“

اس کی آواز میں تحریف جھلک رہی تھی۔

میرے لیے یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ اس کی زندگی بذات خود مصروف تھی پھر اسے فراریت کی ضرورت کیوں پیش آئی جو میری کتابوں سے حاصل ہوتی ہے۔

”تم ایک افسانہ نویس بہترین مصنف۔ تم اس ایوارڈ کی حق دار تھیں۔ اب تمہیں بیٹھ کر بھی بننا چاہیے۔“

میں دل ہی دل میں اس سے شفق تھی لیکن تحریف سننے کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے اس کی بات مشکل سے ہضم ہوتی۔ میں نے کہا۔ ”میں نہیں سمجھتی کہ اس شہرت کو سنبھال سکوں گی۔ اس کے برعکس میں کافی بڑا دل واپس ہوئی ہوں۔ مجھ سے کئی بار انٹرویو کے لیے کہا گیا لیکن میں نے ہمیشہ منع کر دیا۔“

”پھر تمہاری بلیک ریشٹنگ کون کرتا ہے؟“

”کوئی نہیں۔“

”تمہارا کوئی ایجنٹ تو ہونا چاہیے۔“

”مجھے ایسے کسی شخص کی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ ہماری آمدنی میں حصے دار بن جاتے ہیں اور میں اسے انورڈ نہیں کر سکتی۔“

”گو یا تم اپنے سارے کاروباری معاملات خود ہی دیکھتی ہو؟“

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ اسی لمحے ایک عورت ٹرائی میں کافی لیے اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر ریوین نے برا سمانہ بنایا اور بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ ہم خود ہی کافی نکال لیں گے۔“

وہ عورت ایک پھکی مسکراہٹ چہرے پر سنبھالے واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ریوین بولی۔

”تم کسی طرح کی کافی لینا پسند کرو گی؟“

”بلیک!“ میں نے جواب دیا۔

”بالکل میری طرح بلکہ ایش بھی پسند کرتا ہے۔ اس کا اصل نام ایشیہ ہے۔ وہ کبھی تو مجھ ہی یہاں آسکتا ہے۔ اس کی ٹائٹنگ ہمیشہ درست ہوتی ہے۔ وہ کافی امارت ہے ورنہ اتنی بڑی جائداد کا مالک نہ ہوتا۔“

ریوین نے کافی کی تین پیالیاں بنا کیں جبکہ دیگر لوازمات ٹرائی کے نچلے حصہ میں رکھے ہوئے تھے۔ ابھی میں نے اپنی پیلٹ اٹھائی تھی کہ ایک آواز میری سماعت سے گزری۔

”عقل مند لڑکی ہو!“

مجھے کسی نے لڑکی کہہ نہیں سکا تھا لیکن میں عمریں ایش سے کم از کم دس سال چھوٹی تھی۔ لہذا میں نے اسے تھوڑی سی رعایت دینا مناسب سمجھا۔ اب میں نے اسے ٹرین کے سفر کے مقابلے میں زیادہ غور سے دیکھا۔ اس کی عمر ستر برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے جیک، چٹلون اور بھتیجی جوتے پہن رکھے تھے۔

اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور اتنی زور سے دبا یا کہ میرا ہاتھ بے جان ہو گیا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”تین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے تمہاری کوئی کتاب پڑھی ہے یا نہیں۔ ویسے مجھے پڑھنے کی عادت نہیں ہے۔ البتہ یہ مجھے بتاتی رہتی ہے کہ تم بہترین رومانی ناول لکھتی ہو۔“

”میرے خود بھی بہت فراخ دل ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم سال میں اوسطاً کتنا کمال لکھتی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

میں اس طرح سوالوں کے جواب دینے کی عادی نہیں تھی۔ اس لیے نالے کے انداز میں کہا۔ ”بس گزارہ ہو جاتا ہے۔“

”بھر بھی کتنا کمال لکھتی ہو؟“

”ایک مصنف کی آمدنی کتنی بڑھتی رہتی ہے۔“ میں نے تیرے کر لیا تھا کہ اسے سچ رقم نہیں بتاؤں گی۔ ”میں نے گزشتہ پندرہ برسوں کی کمائی سے یہ گھر بنایا ہے۔“

”کیسا گھر؟“ اس نے پوچھا۔ ”مجھے غلط نہ سمجھاؤ ولی مگر گلفورڈ جیسے علاقے میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے کو پسند کرتی نہیں سمجھتا۔“

ریوین نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”ایش یہ مناسب نہیں ہے۔“

اس نے ریوین کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی آنکھیں میرے چہرے پر جمائیں اور بولا۔ ”تم کھٹوں منظر بازی کرتی ہو۔ تمہارا کام بہت اچھا ہے۔ تم اس سے کہیں زیادہ کی حق دار ہو۔ میں نے اپنے پہلے دس لاکھ تیس سال کی عمر میں بنا لیے تھے۔ یہ بہت ہی گندا کام تھا جو کوئی بھی نہیں کرنا چاہتا لیکن میں نے کیا۔ گھر گھر سے کچرا جمع کرنا اور اسے ٹھکانے پر پہنچانا۔ آج میرے پاس اس ملک میں کچرا اٹھانے والی گاڑیوں کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ لوگ مجھے ایش کچرے والا کہہ کر بلاتے ہیں لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ میں اس پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ میرے پاس لندن، نیو یارک اور سان فرانسسکو میں ذاتی مکانات ہیں۔ میں ہر سال پہاڑ کی اونچائی چڑھتا ہوں جب تک

میرے کھٹے جواب نہیں دے جاتے اور اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین نہ پاتے۔ ”بھی عمر کی عورت سے شادی کر رہی ہے۔“

”یہ غیر مہذب انداز ہے۔“ ریوین نے احتجاج کیا۔

”یہ حقیقت ہے۔“ وہ اپنی جوان بیوی پر نظر کر جھاتے ہوئے بولا۔ ”تم میرے لیے صرف ایک خوب صورت چیز ہی نہیں بلکہ میری محبت بھی ہو۔ تمہارے ذہن میں بہت سے خیالات جمع ہیں۔ تم ڈولی کو اپنی کہانی سناؤ۔“

پھر وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”اس سے کہیں آگے بڑھنے کا راستہ ملے گا۔“

وہ میرے مقابل اپنی بیوی کے برابر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”ڈولی کو اپنی زندگی کے واقعات کے بارے میں سب کچھ بتا دو۔“

”ٹھیک ہے۔ وہ بولی میں نہیں جانتی کہ ڈولورس کیا سوچے گی۔ وہ مشہور مصنفہ ہے۔“

”اسے آئیڈیاز کی تلاش رہتی ہے۔“ ایش نے کہا۔

”اور یہ آئیڈیاز تم اسے دو گی۔“

”اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں مختصر افسانے کا خاکہ سنائے دیتی ہوں۔“ وہ مجھ پر نظر کر جھاتے ہوئے بولی۔ ”وہ چھوٹی سی لڑکی ایسٹ شین میں رہا کرتی تھی۔“

”میں جگہ کا نام تبدیل کر دینا چاہیے۔ ایش نے کہا، تم اس کی جگہ رجسٹر اسٹال کرو۔“

”ٹھیک ہے۔ جب وہ تیرہ سال کی ہوئی تو اس کی اٹھان دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ اس کی ماں نے اسے مقابلہ حسن میں بھیج دیا اور وہ جیت گئی لیکن کسی لڑکی نے اعتراض کر دیا کہ اس کی عمر کم ہے۔ مقابلے کے قواعد کے مطابق اس میں سولہ سال سے کم عمر کی لڑکی شرکت نہیں کر سکتی تھی۔ لہذا میں نائل قرار دے دی گئی۔“

”وہ؟“ ایش نے کھج کی۔ ”وہ نائل قرار دے دی گئی۔ ہم اس کا نام فالکن رکھ لیتے ہیں۔“

”میں اسی جانب آ رہی تھی۔“ ریوین نے کہا۔

ایش میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے ڈولی۔ فالکن اچھا نام ہے؟“

”بہت عمدہ۔“ میں نے دونوں میاں بیوی کے درمیان نظر آنے والے کھینچاؤ کو کم کرنے کے لیے کہا۔

”اوکے۔“ ریوین بولی ”اس طرح اس لڑکی فالکن

سپینس ڈائجسٹ 146 اپریل 2013ء

یہاں تک کہ ایش بھی نہیں۔“

”گو یا تم چاہتی ہو کہ یہ کتاب صرف انہی پئیس کی مدد سے لکھی جائے اور اس سلسلہ میں مزید کی مشاوری کی ضرورت نہیں۔“

”یہی مناسب رہے گا۔ ایش نے کہا۔“ ”ریوین مشہور شخصیت ہے اور اس کی تمام سرگرمیاں میڈیا کی نظروں میں رہتی ہیں۔ اگر تم نے اس سے ملنے کی کوشش کی تو بات پھیل سکتی ہے۔ تمہیں مواد کی کمی نہیں ہوگی۔ اس بارے میں انٹرنیٹ سے بھی بہت کچھ مل سکتا ہے۔“

”اگر تم میرے لکھے ہوئے مسودہ سے مطمئن نہ ہوئے تو کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

اس بار ریوین نے جواب دیا۔ ”ایسا نہیں ہوگا۔ ہم نے تمہارا انتخاب اسی لیے کیا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھیں مجھ پر جمادیں۔ اسے مجھ پر پورا بھروسہ تھا پھر بھی میں نے بات کو مزید واضح کرنے لیے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ کچھ غلط باتیں بھی شامل ہو سکتی ہیں۔ اس طرح کام کرنے میں یہ امکان بڑھ جاتا ہے۔“

”جب مسودہ ہمیں ملے گا تو ریوین ان غلطیوں کو درست کر لے گی۔“ ایش بولا۔ ”اب ہمیں تاریخ طے کر لینی چاہیے۔ تم تک یہ مسودہ ہمیں دے سکتی ہو؟“

”میرا خیال ہے کہ ہم پہلے ہی اس پر متفق ہو چکے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

جی بات تو یہ ہے کہ مقبول رقم ملنے کے لالچ میں ہی میں نے یہ کتاب لکھنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ اگلے چھ ماہ کے لیے میں نے گھر پر بیٹھ کر اپنے کام کی منصوبہ بندی کی میرے پاس اس کتاب کے لیے مواد حاصل کرنے کا واحد ذریعہ وہ پئیس تھے جن میں ریوین نے اپنی زندگی کے واقعات ریکارڈ کر رکھے تھے۔ اس نے کافی زیادہ مواد جمع کر رکھا تھا لیکن ان پئیس کو سنسنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس نے متعدد جگہ اپنی باتوں کو دہرایا ہے۔ مجھے ایڈیٹنگ کر کے اسے ایک خاص شکل میں لانا تھا۔ اس کے لیے میں نے پہلے بات کو کئی مرتبہ لکھا۔ مجھے لگا کہ ایش نے جو کچھ بتایا تھا، اس کے مقابلے میں یہ عمل خاصا محنت طلب اور طویل تھا۔ اس نے کہا تھا کہ غیر ضروری جملے اور الفاظ حذف کرو لیکن یہ بات اتنی آسان نہیں تھی۔

کوئی بھی کتاب لکھتا اس وقت بہت مشکل ہو جاتا ہے جب آپ کے پاس کوئی مضبوط پلاٹ نہ ہو۔ اس کی

بیان کردہ کہانی بالکل سبٹ تھی اور اس میں کوئی سین ڈرامائی عنصر شامل نہیں تھا۔ جبکہ رومانی ناول میں محبت جیت سے پہلے تضادات، آزمائشیں اور کچھ ناکامیوں کا سامنا کرنا ضروری ہے۔ مجھے ایسی تمام ناکامیوں کا سراغ لگا کر انہیں اجاگر کرنا تھا جن سے گزر کر وہ اس مقام تک پہنچی تھی۔ خاص طور پر اس مقابلہ حسن کے بارے میں تفصیل دینا ضروری تھا جس میں اسے کم عمر ہونے کی وجہ سے نابل قرار دے دیا گیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ قاری عموماً اس طرح کے واقعات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں کچھ ایسے واقعات کا بھی اضافہ کیا جن سے قارئین کے دل میں ریوین کے لیے ہمدردی کے جذبات ابھر سکتے تھے۔ مثلاً اس کی کارکوشش آنے والا حادثہ، خاندان میں ہونے والی موت اور ایسے شخص کی اس کی زندگی میں آمد جو آڑ میں رہ کر شکار کیا کرتا تھا۔

میرے لیے سب سے بڑی مشکل ایش کے کردار کو بیان کرنے میں آئی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ریوین اور ایک کھاڑیہ کے تعلق کو کس طرح رومانی شکل دی جائے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کتنا امیر تھا۔ اگر میں اس کی عمر میں سے تیس سال کم کر دیتی تو وہ اسے اپنی بے عزتی سمجھتا۔ اگر اس کا پیشہ تبدیل کر کے اسے دماغ کا سرجن یا کارکی دوڑ میں حصہ لینے والا ڈائریکٹر رکھتی تو وہ اس پر بھی تیار نہ ہوتا۔ اسے اپنے کام پر فخر تھا لیکن کسی رومانی ناول کے لیے اس طرح کے کردار موزوں نہیں ہو سکتے۔

میں نے جان بوجھ کر مکمل حد تک اس کے بارے میں لکھنے سے احتراز کیا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ کتاب ایک قابل قبول حالت میں آگئی ہے تو میں نے پوری توجہ ایش کے کردار پر مرکوز کر دی جو میرے لیے آخری بڑا چیلنج تھا۔ میں نے ماہوی کے عالم میں انٹرنیٹ کا سہارا لیا۔ اس امید پر کہ ایش کے بارے میں کوئی کارآمد بات معلوم ہو جائے۔ میں جانتی تھی کہ ایک کامیاب اور مشہور شخصیت ہونے کی وجہ سے اس نے کئی بار اخباری نمائندوں کو انٹرویو دیا ہوگا۔ شاید ایسے سے مجھے اس کی شخصیت کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہو جائیں۔ میں نے انٹرنیٹ پر اس کے بارے میں جو کچھ پڑھا وہ خاصا حیران کن تھا۔

1992 میں اس پر قتل کے الزام میں مقدمہ چلا اور وہ بری ہو گیا۔ اس کی پہلی بیوی ایک اداکارہ تھی جس کا اس ڈرامے کے ہدایت کار سے معاشرے چل رہا تھا جس میں وہ کام کر رہی تھی پھر وہ اچانک ہی پراسرار طور پر غائب

ہو گئی۔ اس کے خاندان والوں نے شہ ظاہر کیا کہ ایش نے اسے مار ڈالا ہے لیکن اس کی لاش کبھی نہ مل سکی۔ کشدگی سے پہلے اس نے اپنے محبوب کو خطوط لکھے جس میں اپنے اوپر ہونے والے ذہنی اور جسمانی مظالم کا ذکر کیا گیا تھا۔ اسی بنیاد پر ایش کے خلاف مقدمہ چلایا گیا لیکن وہ اپنے ذہین وکیلوں کی کوششوں سے بری ہو گیا۔

گویا کہ اس واقعہ سے مجھے کتاب کے پلاٹ کو مضبوط بنانے میں مدد ملتی تھی، میں اسے استعمال کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔ مجھے یقین تھا کہ ایش اسے ہرگز پسند نہیں کرے گا کہ ریوین کی رومانی داستان میں اس پر کیچڑا چھائی جائے اور نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا کہ ریوین اس بارے میں کتنا جانتی تھی۔

انٹرنیٹ پر اس کے کئی انٹرویوز پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ایش ایک خطرناک شخص ہے۔ اس نے بڑی کامیابی سے اپنی عظیم الشان سلطنت کو قائم رکھا ہوا تھا اور زیر زمین دنیا کے ان بااثر افراد کا بے جگری سے مقابلہ کرتا رہا جنہوں نے اس کے مقابلے پر آنے یا اس کی جگہ لینے کی کوشش کی۔ اس کا ایک مشہور جملہ تھا۔ ”تم ایش کو تباہ نہیں کر سکتے۔“

میں نے اس کے کیریئر کا نام آسٹن رکھا جو انچاس سال کا رنڈا تھا۔ اس کے کاروبار کو ملتا جلتا نام دیا اور اسے ایک مخیر و قابل اعتبار شخصیت قرار دیا۔ اس کی ملاقات فالکن (ریوین) ایک کنسرٹ میں ہوئی جو فلاحی کاموں کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے منعقد ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھ مشرقی افریقہ چلا گیا جہاں انہوں نے ایک یتیم خانہ قائم کیا۔ یہ کتاب مقررہ مدت سے ایک ہفتہ پہلے ہی مکمل ہو گئی۔ مجھے اطمینان تھا کہ اس کتاب کے ذریعے ریوین کی زندگی کے تمام گوشے بے نقاب ہو گئے جنہیں پڑھنے والے یقیناً پسند کریں گے۔

مقررہ تاریخ یعنی 9 مارچ کو میں ایک بڑا سائیک اٹھائے ہوئے اپنے گھر سے نکلی جس میں کتاب کا مسودہ اور ریوین کے دیے ہوئے مثنوی تھے اور کبھی کے آخری سرے پر کھڑی ہوئی کار میں سوار ہو گئی۔ گویا کہ میری کئی کتابیں شائع ہو چکی تھیں کسی بھی کتاب کا مسودہ جمع کراتے وقت میں ہمیشہ گھبراہٹ میں مبتلا ہوا جانتی تھی اور اس بار جو حالات تھے انہیں دیکھتے ہوئے یہ گھبراہٹ اب گناہ بڑھ گئی تھی۔

پہلے کی طرح اس بار بھی ریوین نے ہی مرکزی دروازہ خود کھولا۔ وہ آسٹریلیا میں ہونے والے ٹیلی ویژن

شو کے بعد کافی خوش باش اور سارٹ نظر آرہی تھی۔ اس نے میرے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا وہی ہے؟“
”یہ سن کر مجھے ایش کے وہی الفاظ یاد آ گئے جو اس نے ٹرین میں پہلی ملاقات پر کہے تھے۔ میں نے وہ مسودہ اس کے حوالے کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک ابھری وہ خوشی سے چمکتے ہوئے بولی۔ ”میں بتائیں سکتی کہ کتنی شدت سے اسے پڑھنے کا انتظار کر رہی تھی۔“

میں نے اس پر واضح کر دیا کہ اس مسودہ کو ڈرامائی رنگ دینے کے لیے مجھے بہت کچھ تبدیل کرنا پڑا ہے۔

”تم بالکل پریشان مت ہو۔“ اس نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم حیرت و مصنف ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم نے جو کچھ بھی کیا وہ کتاب کی بہتری کے لیے ہی ہوگا۔ کافی آرہی ہے اور ایش بھی چند منٹوں بعد یہاں ہوگا مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اس کتاب کو پڑھنا پسند کرے گا۔ حالانکہ اس نے اپنی پوری زندگی میں شاید ہی کبھی کوئی ناول پڑھا ہو۔“

”اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس سے کبھی یہ کتاب پڑھنے کے لیے نہ کہتی۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”یہ مردوں کے لیے نہیں لکھی گئی۔“

”لیکن یہ میری زندگی کی کہانی ہے اور وہ اس کا ہیرو ہے۔“

”میں نے اس کے کیریئر میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔“

وہ شاید خود کو نہ پہچان سکے۔
”وہ کیا تبدیلیاں ہیں؟“ ایش نے اچانک ہی کرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ کافی کڑی لڑائی دیکھتے ہوئے چلا آ رہا تھا۔ ”تم میرے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں؟“

”میں بتا رہی تھی کہ کتاب کی بہتری کی خاطر میں نے تم دونوں کی ملاقات ابتدائی عمر میں ہی دکھائی ہے۔“

”پھر؟“
”پھر یہ کہ تم اس کہانی میں جو ان نظر آؤ گے۔“

ریوین نے زیادہ وضاحت سے کہہ دیا۔

وہ غراتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں؟“

”بالکل نہیں۔“ وہ بولی۔ ”میں نے ہمیشہ تم سے ہی کہا ہے کہ مجھے تم جیسے مرد پسند نہیں۔“

”جب تک اس کے بیک اکاؤنٹ میں پیسے ہیں۔“

وہ طنز بہ انداز میں بولا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تمہیں بھی نوے ہزار پاؤنڈ دینا ہیں۔“

”ہاں“ ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا۔ ”میں نے بے خوفی سے کہا۔

اس نے اپنی آنکھیں ابھرا دھر گھما میں اور نیچے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں یہ ادائیگی کل ہو سکے گی بیک کو اتنی رقم کے لیے ایک دن پہلے نوٹس دینا ہوتا ہے۔“

”لیکن تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مسودہ ملتے ہی مجھے ادائیگی کر دی جائے گی۔“

اس نے کپ میں کافی انڈیلنے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں کل یہ رقم بحال میں دے دوں گا۔“

”تم مجھے چیک بھی دے سکتے ہو۔“

اس نے نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ”چیک کے ذریعہ بھانڈا پھوٹ سکتا ہے جبکہ میں تمہیں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس معاملے کو خفیہ رکھنا ہے۔“

مجھے کچھ شہ ہونے لگا اور سوچنے لگی کہ ایش باسانی اس معاہدے سے ٹکر سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں پہلے ہی دس ہزار پاؤنڈ وصول کر چکی تھی لیکن مجھے اپنی پوری رقم چاہیے تھی۔ یوں لگا جیسے اس نے میرا ذہن پڑھ لیا ہو۔ وہ ریوین سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”تمہیں ہے کہ بیک سے ملنے والا پیغام ابھی بھی آنس رنگ مشین پر ہو۔ میں چاہوں گا کہ ڈوئی بھی اسے سن لے تاکہ اسے میری بات پر یقین آجائے۔“

”کون سا پیغام؟“ ریوین نے چو سکتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹہلتا ہوا فون کے پاس چلا گیا۔ ”وہی پیغام جس میں بیک والوں نے کہا تھا کہ وہ یہ رقم آج نہیں دے سکتے۔“ یہ کہہ کر اس نے پلے بیک بین دبا دیا لیکن کوئی آواز نہیں آئی وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

”شاید میں نے ہی اسے مٹا دیا۔ بہر حال تمہیں مجھ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“

”لیکن میرے پاس تو اس گھر کا پتا یا فون نمبر کچھ بھی نہیں ہے۔“

”بہتر ہے کہ تمہیں یہ سب نہ معلوم ہو۔“

”لیکن تم تو جانتے ہو کہ میں کہاں رہتی ہوں۔“

”ہاں اور میرے ذرا نیچور نے بھی تمہارا گھر دیکھ رکھا ہے۔ وہ کل سہ پہر تمہیں یہ رقم پہنچا دے گا۔“

اس وقت میں نے اپنے آپ کو ایک کمزور عورت تصور کیا جو چالاک مرد سے ٹکٹ کھا چکی تھی۔ میں وہاں سے فوراً ہٹل دی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ کبھی یہ رقم وصول کر سکوں گی۔

☆☆☆

تین دن بعد میں نے اخبار میں پڑھا کہ ایشلے پارک کا انتقال ہو گیا۔ موت کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ اس نے زیادہ مقدار میں خواب آور گولیاں کھالی تھیں جس کے بعد وہ کوما میں چلا گیا اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہو گئی۔

انتقال کے وقت اس کی عمر بہتر برس تھی۔ اب ریوین ہی اس کی چار کروڑ مالیت کی جائداد کی وارث تھی۔ میں ایشلے کی موت کے بارے میں ہونے والی تحقیقات کی کارروائی بڑی دلچسپی سے پڑھ رہی تھی۔ اخبارات میں اس طرح کی کہانیاں بھی شائع ہو گئی کہ ریوین ضرورت سے زیادہ غزوہ

پیو کا کردار ادا کر رہی تھی تاکہ اس شہے کو دور کیا جاسکے کہ انہیں اس نے ہی تو اپنے شو پر کھواب آور دوا کی زیادہ مقدار نہیں دے دی تاہم تحقیقات کے دوران یہ سوال نہیں اٹھایا گیا۔ وہ جیوری اور سرائے رسالوں کا دل موم کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ایشلے کو ہمیشہ سے ہی بے خوابی کی شکایت تھی اور وہ سونے کے لیے ایسی دواؤں کا استعمال کرتا تھا جو جان لیوا بھی ہو سکتی تھیں۔

مجھے اپنی بقایا رقم بھی نہیں ملی۔ اس کے بعد میں نے ریوین کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔ اس میں اتنی عقل تھی کہ وہ اس کتاب کو شائع نہ کرے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے ان تمام واقعات کا جائزہ ضرور لیا ہوگا جو میری موجودگی کے دوران پیش آئے تھے۔

جب ایش نے مجھ سے کہا کہ آج مجھے رقم نہیں مل سکتی تو میں اس بارے میں مشتہ ہو گئی۔ میں کتاب ان کے حوالے کر چکی تھی اور اب وہ میرے کسی کام کی نہ تھی۔ لیکن میں ایش کے لیے بعد میں بھی خطرہ ثابت ہو سکتی تھی اور کسی وقت بھی یہ انکشاف کرے کہ اس کی اخبار یا رسالہ سے ہماری معاوضہ حاصل کر سکتی تھی کہ کتاب کی مصنفہ ریوین نہیں بلکہ میں ہوں۔ لہذا سب سے پہلے مجھے راستے سے ہٹانا ضروری تھا۔ میں نے ایک ایسی دوا کے بارے میں سن رکھا تھا جس کے چند قطرے اگر چائے یا کافی میں ملا دیے جائیں تو گھر تک پہنچتے پہنچتے میری موت واقع ہو سکتی تھی۔

اسی لیے میں نے احتیاط کے طور پر اپنی کافی کی پیالی ایش سے بدل ڈالی۔ یہ موقع مجھے اس وقت ملا جب ایش آنسر فون کی طرف گیا تھا۔

ان دونوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں نے رومانی ناولوں کے علاوہ جاسوسی کہانیاں بھی لکھی تھیں۔

محفل شہر و سخن

✽ نرگس علی..... مراد لپنڈی

ورق ورق مری چاہت مری وفا نہیں تھیں
پڑھا ہے میں نے چہرہ کتاب کی صورت
✽ تیور احمد..... حافظ آباد

ہمیشہ حلقہ نامہریاں میں رہتے ہیں
جو حق پہ ہوتے ہیں، وہ امتحان میں رہتے ہیں
حسد کی آگ سے کس کس کا گھر جلاؤ گے
کہ اہل عشق تو سارے جہاں میں رہتے ہیں
✽ طاہرہ یاسمین..... سرگودھا

کون کہتا ہے اس کی یاد سے بے خبر ہوں میں
میری آنکھوں سے پوچھ میری رات کیسے گزری ہے



✽ بخت علی خٹک..... خانیوال

پتوں سے بھر رہے تھے ہواؤں کی جھولیاں
گرتے ہوئے سحر بھی تھی انتہا کے تھے

✽ اشفاق شاہین..... کراچی

فصل جسم پر تانی ہے کرب کی چادر
ہم اہل درد سے پوچھ کہ زندگی کیا ہے!

✽ احسان سحر..... میانوالی

البتھا ہوا ایسا کہ کبھی کھل نہیں پایا
سکھا ہوا ایسا کہ مثالوں کی طرح تھا

✽ ماہا ایمان..... حافظ آباد

درختوں کی رہ گزر میں چمک چھوڑ جاؤں گی
بیچان اپنی دور تلک چھوڑ جاؤں گی
خاموشیوں کی موت گوارہ نہیں مجھے
شیشہ ہوں ٹوٹ کر بھی ٹکٹک چھوڑ جاؤں گی

✽ محمد طارق کلیر..... تور پور تحصیل

کہیں کوئی غم کوئی سلگنا خیال رکھنا بھی جرم ٹھہرا
عجیب رت ہے کسی کی یاویں سنیاں رکھنا بھی جرم ٹھہرا
اسے یہ کہنا مجھ سے ملنے بھی نہ آئے کہ اس نگر میں
دلوں کو آباد بستیوں کی مثال رکھنا بھی جرم ٹھہرا



✽ داؤد اشفاق..... اوکاڑہ

اتنا کی یوں تو ستائش کوئی نہیں کرتا
برا کیا اسے ابجھن میں ڈال کر میں نے

✽ ماہین فاطمہ..... اوکاڑہ

نہ ہو امید تو دوزخ سے کم نہیں دنیا
فریب کتنا ضروری ہے آدمی کے لیے

✽ انجی شاہد عمران..... سینٹرل جیل، گوجرانوالہ

خواب دیکھے شب زنداں میں سہانے کتنے
رنگ بھرتے ہیں نگاہوں میں نجانے کتنے
رات ہم نے تیری تصویر سے پوچھا اے دوست
تجھ سے پھڑپھڑے ہوئے بیتے ہیں زمانے کتنے

✽ محمد ندیم..... نامعلوم مقام

فقط باتیں اندھیروں کی فقط تھیں اجالوں کے
چراغ آزد لے کر نہ تم نکلے نہ ہم نکلے

✽ یاسر علی راجپوت..... گوجرہ، نواں لاہور

ہر اک سمت خاموشی کا کفر چھایا ہے
ہماری ذات کے صحرا میں دے اڈاں کوئی

✽ الطاف حسین..... کراچی

میں بیمار محبت ہوں مجھے کیا غرض حکیموں سے
اگر میری شفا چاہو میرا محبوب لے آؤ

✽ عامر اقبال جہاں..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا

ان کی وفا کا اتنا دعویٰ نہ کیا کر محسن
میں نے روح کو بھی جسم سے بے وفائی کرتے دیکھا ہے

✽ احمد یار خان..... لسیلہ، کراچی

تک، میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا، چراغ سحری کا

✽ ساجد تنویر گجر..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا

حالات ہی کچھ ایسے ہیں کہ خاموش ہوں درنہ
پوشیدہ میرے سینے میں طوفان بہت ہیں

✽ گلزار خان..... پشاور

نہیں معلوم تھا اس کو ہوا کا رخ بھی بدلے گا
لگائی آگ جس نے شہر میں وہ بھی جھلے گا
غبار مصلحت اوڑھے مرے فنکار بھی چپ ہیں
دستچے بند ہیں گھر سے دھواں پھر کیسے نکلے گا

✽ مناظر علی گوندل..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا

نزاروں اسباب راحت ہوں اسیری پھر اسیری ہے
فکس میں آہی جاتا ہے خیال آشیاں اکثر

✽ قیصر اعوان..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا

ہم جان سے جائیں گے تو جان جاؤ گے فراز
کہ حاصل کچھ نہیں ہوتا کسی کو آزمانے سے

✽ ایم زاکم علی خان..... راجن پور

تہائیوں سے تو بہتر تھا کہ تم زہری دے دیتے محسن
ہمارا کام ہو جانا، تمہارا نام ہو جانا

✽ عبدالغفور خان خٹک..... انک

نکلے تھے اس لیے کہ ڈھوڑ لیں گے تجھے
تیری اک تلاش نے عمر بھر کا مسافر بنا دیا

✽ محمد یونس فریادی..... چھب، ضلع انک

جانے کیسے جیتے ہیں لوگ یادوں کے سہارے محسن
میں تو کئی بار مرتا ہوں اک بار یاد آنے پہ

✽ راجا افتخار علی انی..... چوآسدن شاہ (موہڑہ)

ہے اک سودا اگر مانو تو دونوں مل کر طے کریں
قرار زندگی لے لو، جواز زندگی دے دو

✽ محمد اقبال..... کورنگی، کراچی

ترے بدن کی مہک بس گئی ہے سانسوں میں
جدائیوں میں بھی اترا نہ قربتوں کا نشہ

✽ بخت علی..... اڈاخاں آباد، خانیوال

تم میں ہیرے کی صفت ہے تو اندھیرے میں ملو
دھوپ میں تو کالج کے کٹوے بھی چمک جاتے ہیں

✽ احمد خان توحیدی..... الطوائی اسٹیل مل، کراچی

اس کی آنکھیں تو سمندر سے بھی گہری ہیں
تیرنا، تو آتا تھا مگر ڈوبتا اچھا لگا

✽ انیلہ رشید سیال..... خیر پور (میرس)

دل میں ہوتا تو کب کا بھلا دیا ہوتا فراز
وہ شخص تو بہت دور تک بسا ہوا تھا مجھ میں

✽ محمد اکبر..... حیدر آباد

وہ بے وفا تھا تو میں کب تلک وفا کرتا
بھلا نہ دیتا اسے میں تو اور کیا کرتا
برا بھی گھر کوئی ہوتا تو کس لیے آخر
تمام رات میں سڑکوں پہ یوں پھرا کرتا

✽ محمد امجد ریاض..... جی ٹی روڈ، چیچہ وطنی

روز و شب کے میلے میں غفلتوں کے مارے لوگ
شاید یہ سمجھتے ہیں، ہم نے جس کو دنیا ہے بس اسی کو مرنا تھا

✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی

میرے ساتھ جگنو ہے ہمسفر، مگر اس شرر کی بساط کیا
یہ چراغ کوئی چراغ ہے نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا

✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال

کتنے غمناک ہیں اس شہر کے اہل ایمان
چھتریوں تان کے بارش کی دعا کرتے ہیں

✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی

گلاب زخم جگر کے لگے ہیں پھر بھلنے
تمہاری یاد بہادوں کے ساتھ آئی ہے

✽ محمد عامر..... شاہ فیصل کالونی، کراچی

خون سے تر ہے پھول کی ہر اک پتھری
رویا ہے کون تھام کے دامن بہار کا

معاشرہ کوئی بھی پو اپنی بنیادی اور روایتی اقدار کی بنا پر منفرد ہوتا ہے۔ یہ اور بات کہ روایات کی یہ زنجیر کسے قید کرتی ہے اور کون بغاوت پر اتر آتا ہے۔ چاہتوں کے سونے انسان کو سودائی بنادیتے ہیں اور دیوانگی میں بھلا کون رسوم و روایات کی پاسداری کر سکا ہے۔ اور پھر چاہتوں کے اسی اختتامی موڑ سے اس خونیں کھیل کا آغاز ہوا جس نے کتنے ہی دلوں میں اندھیرا کر ڈالا۔

شاخسانہ

ڈاکٹر عبد اللہ ربیع



گاؤں کے جس زدہ ماحول میں بے جا رسومات کا شاخسانہ

گوٹھ گزھی خیر محمد میں ”راجواڑیں“ فیصلوں کو عداوتی حیثیت حاصل تھی جسے عموماً کچھری یا پنجابیت کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ چونکہ اندرون سندھ کے دور دراز علاقوں میں جنہیں ”تر“ یا ”لاڑ“ کا نام دیا جاتا ہے، ایک عرصے سے ان علاقوں میں وڈیروں، سرداروں اور بھوتاروں کا جاگیردارانہ نظام چلا آ رہا تھا جن میں مقامی سطح پر ہونے والے تنازعات زمینوں کا بھٹوا، پانی کاٹنا اور بالخصوص ”کاروکاری“ کے مسائل حل کیے جاتے تھے۔ اس

رجیمہ سرور..... ساہوواڑی، لاہور
مجھے کسی سے محبت نہیں اے دوست
یہ کیا ہوا کہ دل بیقرار بھر آیا

محمد ناظم..... ملیر، کراچی
وجود قطرہ کو دریا بنائے بیٹھا ہوں
خدا کی یاد میں خود کو سمائے بیٹھا ہوں
محمد راجیل..... کورنگی، کراچی
نہ کوئی زانچہ مچھنچوں نہ دیکھوں ہاتھ ترا
میں تیرے بارے میں سب کچھ بتا بھی سکتا ہوں

حفیظ الرحمان..... کورنگی، کراچی
ایک قطرہ ہی تو ہے تو اصل سے پھٹا ہوا
جذب ہو دریا میں تو اس بے مکانی سے نکل

امتیاز احمد..... ملیر، کراچی
خواب سفر میں گھوموں چاند ستاروں پر
آنکھ کھلے تو خود کو زمیں پر پاؤں میں

مولابخش..... اسلام آباد
محبت ہی نہیں نفرت بھی لوٹتا ہوں اکثر
میں کب باقی کسی کا اپنے سر احسان رکھتا ہوں

امیر اللہ..... کوئٹہ
موت کیسے مجھے مٹائے گی
جب فنا میں بقا کبھی ہے مری

دوست محمد..... میانوالی
اس نے بخشا ہے عجب سینہ خراش کا ہنر
میرے احساس کو زخموں کی قبائیں دے کر

جسیم احمد..... لاہور
آج کتابوں سے بچوں کا رشہ ٹوٹ گیا تو پھر
جسم بڑھیں گے ان کے لیکن سر چھوٹے رہ جائیں گے

غلام علی..... ملتان
پھر میرے مقابل اک ظالموں کا لشکر ہے
پچھے کیا ہوں گا میں پیچھے تو سمندر ہے

جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
تیرا بہار کا وعدہ بجا سہی لیکن
مجھے بہار کے رنگوں کا اعتبار نہیں

ادریس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی
تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تیری تصویر لیے پھرتے ہیں
محمد قدرت اللہ نازی..... حکیم ٹاؤن، خانیوال
تیرے قریب رہ کر کبھی تجھے تلاش کروں
محبوبوں میں میری بدحواسیاں نہ گنیں

کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی
اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے! کیا رہائی ہے!

زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
میں اس پر جان بھی واروں تو یارو!
میرا جان وارنا بھی وار ٹھہرے

فرحان شیخ..... پاک کالونی، کراچی
فقط تیرے عشق کی غلامی میں ہیں آج ورنہ
یہ دل اک زمانے تک نواب رہا ہے

سلیم کامریڈ..... کھاناں
انہیں سناں نہ دے گی شکست دل کی صدا
بنے ہوئے ہیں پجاری جو مال و دولت کے

ممتاز حسین ساغر..... ننکانہ صاحب
آرزو کا چاند ڈوبا غم کی گہری جھیل میں
درو کی وادی میں صنم ہم تنہا رہ گئے

احمد حسین عرضی خان..... قبولہ شریف
زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے

نور الامان..... حافظ آباد
کیوں کچھ سوچ کر میں اپنا دل چھوٹا کروں دہی
وہ اتنی ہی کر سکا وفا، جتنی اس کی اوقات تھی

محفل شِعْر و سِخَر

کوین

برائے

شمارہ

مئی
2013

نام: _____

پتا: _____

قسم کی کچھریاں ”چودہ“ کے مقام پر منعقد کی جاتی تھیں۔ چودہ..... کا علاقہ ایسے مقام پر ہوتا ہے جہاں چار پانچ گھنٹوں کی سرحدیں آپس میں منسلک یا ملحقہ ہوتی ہیں اور گھنٹوں کے چند بڑوں کی سرکردگی میں فیصلے ہوتے تھے جنہیں مقامی زبان میں ”راجواڑیں“ فیصلے کہا جاتا تھا۔ ابھی کچھ روز قبل ہی ایسا فیصلہ ہوا تھا۔

مذکورہ گھڑ گزری خیر محمد سے ہی تعلق والے دو فریقوں، باری میر محمد اور مٹھل ساری کے بیچ ایک تنازعہ طے ہوا تھا۔ کچھ دن قبل باری میر محمد کے بڑے جواں سال بیٹے خان محمد کے ہاتھوں ایک کل ہو گیا تھا۔ مقتول کا نام نبی بخش تھا۔ وہ مٹھل کے مرحوم بھائی کا بیٹا تھا جو اس کے پاس ہی رہتا تھا۔ خان محمد اور نبی بخش کی آپس میں کسی بات پر خجلائی ہو گئی اور نوبت با بھائی سے لکھا بڑی..... اٹھانے تک جا پہنچی تھی۔ میر محمد کے دو جوان بیٹے تھے، بڑا بیٹا خان محمد شادی شدہ تھا، دوسرا سدھتا، دو جوان بیٹیاں راڑیں اور شہزادی بھی تھیں جبکہ مٹھل کے تین جوان بیٹے کالو، ریمو اور لائقو..... اور ایک جواں سال بیٹی کونجاں تھی۔ اس سے پہلے کہ ان دونوں خاندانوں (قبیلوں) کے بیچ یہ جھگڑا آئندہ نسلوں تک بڑھتا اور علاقے میں خون ریزی پھیلے، فیصلہ فوری طور پر کچھری کے سپرد کر دیا گیا۔

وڈیرا سائیں آغل شاہ..... نے فوراً ہی دو پیشیوں میں اپنا راجواڑیں فیصلہ صادر کر دیا تھا جس کے تحت اب میر محمد مٹھل کو خون بہا یعنی ”بھونکنے“ کی صورت میں اپنی راڑیں اور شہزادی کا ”سنگ“ (رشتہ) ایک لاکھ نقد اور دو عدد بھینسیں دینی تھیں۔ مقتول نبی بخش چونکہ ایک یتیم لڑکا تھا اور اس کی شادی ہی سے نکالت مٹھل کے ذمے تھی اس لیے اپنے مقتول بیٹے کا بھونگا لینے کا وہی حق دار تھا، راڑیں اور شہزادی کی شادی وہ اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں ریمو اور لائقو سے کرنا چاہتا تھا اور اسے اور کیا چاہیے تھا کہ دونوں جوان لڑکیوں کے رشتے بلا عوض (بغیر روپے پیسے کے) مل رہے تھے۔ چونکہ یہ پانچایت کا فیصلہ تھا لہذا میر محمد وغیرہ کو اس سے سرتابی یا حکم عدولی کی بالکل جرات نہیں ہو سکتی تھی تاہم انہوں نے ”بھونکنے“ کی ادا ہو گئی کے سلسلے میں ایک ماہ کی مہلت مانگ لی تھی جو قبول کرنی گئی تھی۔

♦♦♦♦♦

دور ننگ کے درختوں کے بار مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا اور تاریکی اُفت پر تھکے ماندے پرندوں کی ترتیب وار قطاریں، ایک ہموار رفتار کے ساتھ اپنے

آشیانوں کی طرف جوہر دواتھیں۔

فضا میں اوائل دمبر کی رخ بنگی طاری تھی۔ سر پر کھیتوں سے ذرا پرے گارے پٹی کی دیواروں والے مکانوں کی بے ترتیب قطاریں پھیلی ہوئی تھیں۔ بیشتر گھروں کے کچے اور بوسیدہ مگر کشادہ مٹھوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایسے میں ایک کشادہ صحن والے گھر میں اس وقت سوگوار خاموشی طاری تھی۔ ایک کوشری نما تنگ سے کمرے میں اس وقت تین افراد اور بی بی چار پائیوں پر بہ ظاہر خاموش بیٹھے تھے مگر ان کے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ دوسرے ساتھ والے کمرے میں تین عورتیں بھی دو چار پائیوں پر سوگوار سے انداز میں بیٹھی تھیں۔ ان میں ایک عمر رسیدہ عورت مائی عجیاں تھی دوسری دو جوان لڑکیاں، یہ راڑیں اور شہزادی تھیں۔ تینوں کے چہرے غمگین تھے، البتہ راڑیں اور شہزادی کے معصوم مگر خوب صورت چہروں پر آنسوؤں کی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ دونوں میر محمد کی بد نصیب بیٹیاں تھیں جن کے بھائی خان محمد نے اشتعال میں آکر نبی بخش کو کھلا بڑی مار کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ سواں اس کی یادداشت میں ان دونوں کو بہ طور سزا بھونکنے میں مٹھل کے دونوں بیٹوں ریمو اور لائقو کی بیاں بیٹنا تھا۔

”بھونکنے“ کی صورت میں بیاہ کر پیا دیس سدھارنا ان دونوں معصوم لڑکیوں کے لیے اس لیے بھی تکلیف دہ تھا، وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ بھونکنے میں بیوی یا بیوی بن کر سسرال میں زندگی گزارنا انتہائی اذیت ناک کام تھا جو کئی سزا سے کم نہ تھا۔ ایسی بد نصیب لڑکیوں کے ساتھ وہاں جو سلوک اور خشر ہوتا تھا اس سے نہ صرف وہ دونوں بلکہ گھر والے بھی پریشان اور دکھی تھے مگر راجواڑیں فیصلے کے آگے سینہ سپر ہونے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

دفعتاً کمرے کی سوگوار پر سکوت فضا میں مائی عجیاں کی آواز گونجی۔ وہ ان دونوں بیٹیوں سے آڑھ لکھی کہہ رہی تھی۔ ”اب رونے اور جی ملانے کا کیا فائدہ دھیو..... اج ہونا ہے وہ ہو کر رہتا ہے، کیوں تم دونوں رو رو کر مجھے بھی آزار دیتی ہو، اللہ سائیں سے دعا کرو وہ آگے اچھا کرے۔“ مائی عجیاں کی تسلی آمیز گفتگو خود اسے بھی کھلی محسوس ہوئی تھی۔ راڑیں، جو شہزادی سے ایک سال بڑی تھی، رنجور سے لہجے میں ماں سے بولی۔

”امز.....! ہم کوئی بھیڑ بکریاں تو نہیں ہیں ناں..... کہ جس کا بچی چاہا کسی کے ساتھ ہانک دیا، آخر مردوں نے جھگڑوں میں ہمیں ہی قربانی کی سیبت کیوں چڑھایا جاتا

ہے۔“ ان کے لہجے میں بغاوت کی بوجھ تھی۔

”اڑی ماٹھ (چپ) کر..... ساتھ والے کمرے میں تیرا بیو (باپ) اور بھائی بیٹھے ہیں، انہوں نے سن لیا تو.....“ مائی عجیاں کے لہجے میں خوف تھا مگر اس کی بات مکمل نہ ہو سکی تھی۔ راڑیں نے جھٹ اپنے سر سے اجرک اتار دی اور ماں کی بات کاٹ کر ترخ کر بولی۔

”کیا ہو جائے گا پھر..... لکھت تو میں نہیں کہہ رہی..... قتل ادا خان محمد نے کیا ہم کیوں بھینسیں.....؟ یہ انصاف تو نہیں..... چھڑا..... ظلم ہے۔“ ساتھ والے کمرے میں میر محمد چار پائی پر پاؤں لٹکائے اور سر جھکا کر پریشان بیٹھا تھا، دونوں بیٹے خان محمد اور سرمد بھی تھے۔ ان کے باہم بشروں سے بھی اس کی شکایت تھی۔ ان تینوں باپ بیٹوں کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی کھائے جارہی تھی کہ بھونکنے یا خون بہا میں ایک لاکھ نقد رقم اور دو بھینسیں بھی دینا پڑ رہی تھیں، اگر معاملہ صرف راڑیں اور شہزادی کے سنگ (رشتے) دینے تک محدود رہتی تو وہ آج یوں سر جوڑے پریشان نہیں بیٹھے ہوتے۔

”بابا.....!“ خان محمد بولا۔ ”سائیں وڈے نے ہمارے حق میں کچھ زیادہ ہی سخت فیصلہ کر ڈالا ہے۔ صرف ایک خون پر ہمیں نہ صرف ادی راڑیں اور شہزادی کا سنگ بھی دینا پڑ رہا ہے اور نقد رقم کے علاوہ دو بھینسیں بھی، یہ سراسر نا انصافی ہے ہمارے ساتھ۔“ چھوٹا بیٹا سرمد خاموش بیٹھا تھا۔ جوانا میر محمد شکست خوردہ لہجے میں بڑے بیٹے سے بولا۔ ”اڑے پٹ! یہ راجواڑیں فیصلہ ہے، جسے ہمیں ماننا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں..... شکر کرو کہ یہ معاملہ تھانے اور کورٹ تک نہ گیا۔ ورنہ تینوں (تجھے) پھانسی بھی لگ سکتی تھی۔“

سرمد جو اب تک خاموش تھا، پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے بڑے بھائی کی تائید میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”بابا سائیں! ادا خان محمد ٹھیک کہتا ہے، مٹھل کے دونوں بیٹوں کو مفت کا سنگ مل رہا ہے اور اسے کیا چاہیے۔ ہماری ادی راڑیں اور شہزادی کا سنگ دو دو لاکھ روپے سے کیا کم نہ ہوگا۔“ سرمد خاموش ہوا تو خان محمد دوبارہ حوصلہ پا کر باپ سے بولا۔

”بابا! تو سائیں وڈے سے بات تو کر کے دیکھ..... ہم ادی راڑیں اور شہزادی کا سنگ مفت میں دینے کو تیار ہیں پر کم از کم ایک لاکھ روپے کی رقم اور دو بھینسیں دینے سے تو ہمیں معاف رکھا جائے۔“

میر محمد ایک جہان دیدہ شخص تھا، اس نے ایک عمر دور افتادہ گوشوں کے حوال میں گزرا تھی۔ فیملر کن لہجے میں بولا۔ ”اب کچھ نہیں ہو سکتا..... تیری غلطی کا خمیازہ اب ہم کو بھگتنا ہی پڑے گا اور بس.....!“

باپ کی حقیقت پر دونوں بھائیوں کو دوبارہ کچھ کہنے کی جرات نہ ہو سکی اور انہوں نے چپ سا دھلی۔ اس کمرے سے ملحقہ ایک تیسرے کمرے میں خان محمد کی بیوی سہتی اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ موجود تھی، جو بڑی جالاک عورت تھی اور اس وقت..... باری باری..... دونوں عموں میں ہونے والی خفیہ گفتگوں رہتی تھی۔ پہلے اس نے اپنی ساس، سرمد، دونوں نندوں کی گفتگو سنی تھی پھر اب وہ باہر والے کمرے سے کان لگائے ہوئے تھی۔ وہ بھی سہی چاٹتی تھی کہ اس کی بلا سے بھلے دونوں نندیں بیاہ کر جلد یہاں سے چلی جائیں مگر انہیں بھونکنے کا ایک لاکھ اور دو بھینسیں نہ دینا پڑیں کیونکہ وہ جانتی تھی کہ قتل کے شور سے ہوا ہے لہذا یہ سارا ”تاوان زر“ اسی سے ہی بھگتوایا جائے گا۔

♦♦♦♦♦

کچی مٹی کی دیواروں والے بوسیدہ صحن میں خوشگوار اور پچھلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ صحن کے وسط میں بھیجی ہوئی چار پائی پر ساٹھ سالہ دراز مائی بیٹی اپنا سفید چوندہ تھامے روئے جا رہی تھی۔ اس کے قریب بیٹی جواں سال بھاگی جو اس کی بیٹی تھی، ماں کو سننے لگے ہوئے تھی، مگر خود اس کی سرگیں آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ اس کی رنگت گندی تھی اور دراز بالوں کی چوٹی ناگن کی طرح اس کی کمر پر بل کھائے کٹھڑی مارے رہتی۔ اس نے مخصوص طرز کا مقامی لباس پہن رکھا تھا۔ سندھی کڑھائی (تیل بوئے) والے نکلے کی قمیص جس پر ترتیب وار چھوٹے چھوٹے سکوں کی طرح کے کول شیشے ٹکے ہوئے تھے۔ ایک ست لڑا اس کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

”پتا نہیں میرا اصل غلام کہاں ہوگا؟ مولا سائیں میرے پٹ کے سر کی خیر کرنا، اسے سلامت رکھنا۔“ وہ بوڑھی عورت دہائیاں دیتے ہوئے انگلیاں لہجے میں بولی۔ ”امز.....! چپ ہو جا..... اللہ سائیں بہتر کرے گا۔ ادا غلامو بالکل خیریت سے ہوگا۔“ بھائی نے ماں کو کھوکھلی تسلی دینا چاہی۔ درحقیقت اسے خود بھی اپنے بڑے بھائی غلامو کی واپسی کی امید نہ تھی۔ ”کیسے چپ ہو جاؤں میں..... دھیے!..... غلامو میرا

ہلک (ایک) ہی پٹ تھا..... سہارا تھا وہ ہمارا..... آج اسے گئے ہوئے چھادان ہے..... ماں کو کسی طور بھی تلی نہیں ہو رہی تھی۔ ہوتی بھی کیسے..... غلاموں کوئی دودھ پیتا بچہ تو نہ تھا۔ پورا چوبیس پچیس سالہ گبرو نو جوان تھا۔ پہلے تو وہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ دوستوں کے ساتھ سہون شریف حضرت لعل شہباز قلندرز کے میلے پر گیا ہوگا۔ وہ تھا بھی ایسا بے پروا، بتائے بغیر گھر سے نکل جاتا تھا، یہ دونوں ماں بیٹی وڈیرے کی حویلی بھی کئی تھیں مگر انہیں یہی دلا سادے کر وہاں سے چلتا کر دیا تھا کہ ”لعل سائیں“ کے سالانہ عرس پر گیا ہوگا کیونکہ گوٹھ کے من چلے نو جوانوں میں یہ باعام بھی کہہ دیا مگر بتائے بغیر یہی میلوں میں نکل پڑتے تھے اور ان کے گھر والے بھی عادی ہو گئے تھے۔

بھائی نے سر پر اینڈر وا..... دھڑا اوپر منکار رکھ کر پانی بھرنے گھر سے باہر نکل آئی۔ ابھی وہ کھیتوں کے درمیانی راستے پر تھی کہ اچانک ایک بانکا بجلا نو جوان اس کے سامنے آ گیا، کوئی اور موقع ہوتا تو اس جوان کو دیکھ کر بھائی کا چہرہ گنار ہو جاتا تھا مگر اس سے وہ خود پریشان تھی، وہ نو جوان سرمد تھا اور خود بھی اس وقت پریشان ہی نظر آ رہا تھا۔ بھائی کو اس کی پریشانی کا بہ خوبی علم تھا، بلکہ..... پورے گوٹھ کو ہی علم تھا۔

تاہم سرمد نے نظر سے پوچھا۔

”کیا بات ہے بھائی؟ تو آج بڑی پریشان سی نظر آ رہی ہے، ورنہ تو مجھے دیکھتے ہی گل پڑتی تھی گلاب کی طرح۔“ سرمد نے ہولے سے پوچھا۔

”سرمد!..... ادا غلامو..... نجانے کدھر چلا گیا ہے، سب لعل سائیں کے میلے سے واپس لوٹ آئے ہیں مگر اس کی کوئی خبر نہیں، پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ ماں بہت پریشان ہے۔“ بھائی نے مغموم لہجے میں اپنی پریشانی بتائی تو سرمد اپنی پریشانی بھول کر بھائی کے بھائی غلامو کی گمشدگی کے بارے میں فکر مند نظر آنے لگا، چند تانے کچھ سوچنے کے بعد جی آمیز لہجے میں بھائی سے بولا۔

”تو فکر نہ کر..... میں تھانے جا کر اطلاع کرتا ہوں۔“

بھائی یہ سن کر خوش ہو گئی اور بڑی رسائیت آمیز محبت بھری نگاہوں سے سرمد کا چہرہ دیکھنے لگی۔

میں..... دونوں نے اپنی محبت کو پروان چڑھایا تھا اور ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد سرمد بولا۔

”تو ایسا کر گھر پہنچ..... میں بھی آکر ماسی سے مل رہا ہوں اور پھر اس کو ساتھ تھانے لے جا کر غلامو کی گمشدگی کی رپٹ (رپورٹ) درج کرواتا ہوں۔“

سرمد کی بات پر بھائی کو قدرے اطمینان ہوا۔

سرمد نے اپنا کہا نبھایا تھا، وہ اسی دن بھائی کی ماں کے ساتھ متعلقہ تھانے جا پہنچا۔ تھانے کی پہلی عمارت خاصی بوسیدہ تھی۔ انسپکٹر چل جانوری اپنے کمرے میں موجود تھا۔ وہ ایک پختہ العرصہ شخص تھا اور دیانت و اذرفر شناس آفیسر بھی۔ ان دونوں کی دافریا دستانے کے بعد اس نے اپنے سامنے کمری پر مضطرب الحال بیٹھی غلامو کی بوڑھی ماں سے سوال کیا۔

”اماں جی! کیا تم اپنے بیٹے غلامو کے دوستوں سے واقف ہو؟؟؟ میرا مطلب ہے ایسے دوست جو تمہارے بیٹے غلامو کے ساتھ زیادہ اٹھتے بیٹھتے اور قریب رہتے ہوں؟؟“

”ہاں!“ غلامو کی بوڑھی ماں نے غزردہ لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا اور بتانے لگی۔

”مٹھل کے بیٹوں رجمو اور لائقو سے اس کی بنتی تھی۔ وہ دونوں میرے پٹ غلامو کے گہرے سگی (دوست) تھے۔“ وہ اتنا بتا کر خاموش ہوئی تو جانے کیوں اس کے قریب بیٹھا سرمد ڈراچونکا تھا۔ انسپکٹر محمد چیل چند لمحے پر سوچ خاموشی کے بعد سرمد کی طرف کھوجتی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

”تم کون ہو؟“

”سائیں! میرا نام سرمد ہے۔“ سرمد نے کہا۔

”کس کے بیٹے ہو؟“ انسپکٹر چیل یہ غور سرمد کے چہرے پر اپنی تیز نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

”ہاری میر محمد کا بیٹا ہوں..... سائیں!“

”او.....“ انسپکٹر نے اس کی بات پر بھوس اچکا نہیں پھر گہرے لہجے میں مستفہر ہوا۔ ”تو خان محمد کا بھائی تو نہیں جس نے مٹھل کے نتیجے میں جیٹس کا قتل کیا تھا؟“

”جج..... جی..... جی..... سائیں!..... پر..... اس کا وڈیرے سائیں کی اوطاق میں راجا وڑیں میں فیملہ ہو چکا ہے۔“ اس نے جلدی سے اس طرح بتایا جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں یہ خرائٹ پولیس افسر اسے کسی دوسرے ہی چکر میں نہ

الجمادے۔

”ہاں!..... مجھے معلوم ہے۔“ انسپکٹر نے سر کو اٹھاتی جنبش دی۔ ”تم بھی غلامو کے دوست تھے؟“ انسپکٹر نے عجیب سرسراتے ہوئے لہجے میں سرمد کی طرف دیکھ کر پوچھا تو سرمد جانے کیوں اس سوال پر ذرا اٹھرا سا کیا اور بہ مشکل بولا۔

”جی ہاں سائیں! پر مجھ سے زیادہ اس کی گہری دوستی..... رجمو اور لائقو سے تھی۔“

انسپکٹر محمد چیل کو..... سرمد کے لہجے میں چھپا خوف صاف محسوس ہوا تھا۔ پھر اس نے غلامو کی ماں سے چند مزید سوالات کیے اور پھر غلامو کی ماں کو تسلی دیتے ہوئے وہ انہیں رخصت کرنے لگا تو آخر میں اس نے سرمد کو مخاطب کر کے کہا۔

”سرمد!“

”جی سائیں!“ سرمد پلٹا، وہ اب خاصا گھبرایا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔

”تم میرے پاس آتے رہنا..... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“ انسپکٹر نے اسرار بھرے لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی سائیں! حاضر سائیں۔“ میں حاضری بھرتا رہوں گا۔“ سرمد نے بہ مشکل کہا۔

۔۔۔۔۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ تینوں کو ٹھہری نما کمرے میں دوری بیٹھی چار پارٹیوں پر سرکوشیوں کے سے انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ یہ تینوں مٹھل کے بیٹے کالو، رجمو اور لائقو تھے۔

”تم دونوں نے اپنا کام ہوشیاری سے کیا ہے ناں.....“

کمرے کی محدود اور دم بہ خودی فضا میں کالو نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں سے دھیمی آواز میں پوچھا تو سب سے چھوٹا بھائی لائقو پر جوش لہجے میں بولا۔

”ہاؤ ادا!..... ہم نے اپنا کام ایسا چیل طریقے سے کیا ہے کہ کسی کو بھی ذرا براہ رشک نہیں ہوسکا ہے۔“

”پر ادا کالو! ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“ یہ بھٹلا بھائی رجمو تھا۔

”کیسا مسئلہ.....؟“ کالو نے پوچھا۔

”نئی بخش..... بیمار پڑ گیا ہے۔“

”ہاں..... ہاں..... مجھے پتا ہے۔ پر حکیم سے تو تم نے اس کی دوا لے لی تھی ناں؟“

”اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے اس کو۔“ رجمو نے

بتایا اور آگے بولا۔ ”ظاہر ہے میں نبی بخش کو تو حکیم جی کے پاس نہیں لے جاسکتا تھا۔ بس!..... بیماری کی کیفیت بتا کر دوائی اس کی لے آیا تھا لیکن اب حکیم جی کہہ رہے تھے کہ مریض کو ان کے مطب لے کر آنا پڑے گا۔ وہ اس کی نبض وغیرہ دیکھنا چاہتا ہے۔“

رجمو نے اپنی صراحت مکمل کی تو کالو جھٹ سے فکر آمیز لہجے میں بولا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے..... اس طرح تو نبی بخش کے پہچان لے جانے کا خطرہ ہے۔“

”اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ ہے..... ادا! لائقو نے پر نظر لہجے میں بھائی سے کہا۔

”نبی بخش کی طبیعت دن بہ دن بگڑتی جا رہی ہے۔“ اس کی بات پر کالو کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں ہو گئے۔ پھر ایک گہری ہکاری لیتے ہوئے بولا۔

”ایسا کرو..... تم دونوں نبی بخش کو تیل گاڑی میں بٹھا کر بڑی ہوشیاری کے ساتھ حکیم جی کے مطب لے جانا۔ مگر خیال رہے۔ ایسے وقت جانا جب ان کے مطب میں لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہو اور اس کا چہرہ بھی ڈھانپے رکھنا۔“

”ہاؤ..... ادا!..... ایسا ہی ہوگا۔ میں نبی بخش کا چہرہ اجڑک سے ڈھانپنے کی کوشش کروں گا اور اسے اپنا دوست ہی ظاہر کروں گا، ویسے نبی بخش کی ڈانڈھی مونچھوں کے بال بہت بڑھ گئے ہیں۔ شاید وہ مشکل سے ہی پہچانا جائے۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ بڑا بھائی کالو قدرے خوش ہو کر بولا۔ پھر چند تانے گہری اور پر سوچ خاموشی میں مستغرق رہنے کے بعد خود کلامیے والے انداز میں دانت پیس کر بولا۔

”ایک بار..... میر محمد کے گھر والوں سے ”بھونگا“ مل جائے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ نہ ہی ہمیں کوئی مشکل ہوگی۔“ وہ خاموش ہوا تو لائقو نے بڑے بھائی سے قدرے مشکور لہجے میں پوچھا۔

”ادا وڈ!..... بھونگا ملنے کے بعد کیا ہوگا.....؟ کیا نبی بخش اسی طرح کمنائی کی زندگی بسر کرتا رہے گا؟“ چھوٹے بھائی کی بات پر کالو کے سانولے چہرے پر ایک لمحے کو عیارانہ رنگ جما پھر بولا۔

”تھوڑا عرصہ نبی بخش کو روپوشی بھگتی ہی پڑے گی پھر خود ہی آہستہ آہستہ جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔ تم دونوں سر پہ سہرا سجانے کی تیاری کرو، سنا ہے۔ میر محمد کی بنیاں راڑیں اور شہزادی بڑی خوب

صورت ہیں۔“ آخر میں معنی خیز لہجے میں اپنے دونوں بھائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ راجیو اور لائق کے چہروں پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہاں..... دونوں چھو کر یوں کے ساتھ ملنے والی بھونگے کی رقم نقد ایک لاکھ میری اور دو بیٹھیں، بابا سائیں کی ہوں گی۔“ کالو نے گرسنہ لہجے میں جیسے یاد دلا یا تو راجیو اور لائق معنی خیز انداز میں اپنے سر کو دھیرے دھیرے اٹھائی جنبش دینے لگے۔

♦♦♦♦♦

دور دراز کے گوشوں میں سرسری شام کے سائے ڈرا جلد ہی پھیل گئے ہیں۔ راجیو اور لائق، نبی بخش کو ایک موٹی سی رلی اڑھا کر سہارا دیے تیل گاڑی میں بٹھا کر حکیم جی کے مطب کی طرف چل دیے۔

نبی بخش کو کوئی بیماری تھی نہ۔ وہ تو زخمی تھا اور ان زخموں کی وجہ سے اسے بخار رہنے لگا تھا۔ زخم اگرچہ کافی حد تک بھر چکے تھے۔ حکیم جی کے مطب کی طرف لے جاتے ہوئے راجیو اور لائق کو یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ہمیں کوئی نبی بخش کو پہچان نہ لے۔

حکیم جی کی تو انہیں اتنی پروا تھی کیونکہ انہوں نے پہلے کبھی نبی بخش کو دیکھا ہی نہ تھا، کسی طرح نبی بخش کو تیل گاڑی میں سوار کروا کر حکیم جی کے مطب پہنچے۔ حکیم جی کا نام مشکل ہی تھا مگر گوشت کے لوگ باگ اپنی سہولت سے انہیں حکیم جی یا حکیم چاچا ہی کہتے تھے۔

پندرہ مئی منٹ تک حکیم جی نے نیم بے ہوش نبی بخش کا معائنہ کیا۔ اس وقت مطب میں لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ مطب کیا تھا، گھر میں ہی ایک بیٹھک کی طرز کے کمرے کو مطب کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

ادھر اوطاق سے جب راجیو اور لائق نبی بخش کو رلی اوڑھے مطب کے باہر تیل گاڑی میں سوار کرانے لگے تو اتفاق سے اس وقت خان محمد اپنے بیٹے کی دوا لینے مطب کی طرف ہی آ رہا تھا۔ اسے اچانک پیٹ میں درد اٹھا تھا۔ وہ راجیو اور لائق کو دیکھ کر ذرا ٹھٹکا۔ پھر اس کی نظر مریض پر پڑی۔ وہ رلی اوڑھے ہوئے تھا۔ اس لیے خان محمد اسے پہچانتے سے قاصر ہی رہا۔ مگر اس نے رلی پوش مریض پر سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔ خان محمد دیوار کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ راجیو اور لائق اسے نہیں دیکھ سکے تھے۔ مگر وقتاً وہ لائق اور راجیو کے انداز و اطوار پر چونک گیا تھا جو چوروں کے سے تھے اور پھر اچانک ایک موقع پر نجانے کس طرح

مریض کے چہرے سے رلی سرک گئی۔ ایسا تیل گاڑی کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ خان محمد کا فاصلہ تیل گاڑی سے بہ مشکل پانچ گز رہی رہا ہوگا۔ رلی چہرے سے ہٹتی ہی خان محمد نے فوراً نبی بخش کو پہچان لیا تھا۔ پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا مگر وہ اس چہرے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں..... جوش غیظ سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں اس قدر تیز ہونے لگیں جیسے انہی سینے کا پتھر جھج جائے گا۔ یہ بات ہی ایسی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی بیماری بھول کر وہیں دیکھا رہا۔ پھر تیل گاڑی خاصی دور ہونے لگی تو خان محمد بھی تنگ و تار یک بل کھائی گئی کی چکی دیوار کے ساتھ ساتھ نہایت ہوشیاری سے آگے بڑھنے لگا۔

وہ اب تیل گاڑی کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ اچھی طرح تلی کرنا چاہتا تھا کہ آیا یہ لوگ اپنے گھر کے سوا کسی دوسری جگہ تو نہیں جا رہے تھے۔ حکیم جی کے مطب سے ٹھل ہادی کا گھر زیادہ دور نہ تھا۔ وہ تیل گاڑی اس کے گھر کے سامنے ہی رکھی تھی۔ خان محمد اچھی طرح اطمینان کر کے جب لوٹا تو رات کی تاریکی چار اطراف ڈیرا جمانے لگی تھی۔ لوٹنے سے اس کے دل و دماغ میں ہونو زبردست یکدھڑکنی ہوئی تھی۔

اس رلی پوش مریض کا چہرہ ہونو اس کی نظروں کے سامنے گردش کر رہا تھا مگر خان محمد کو اس بات پر حیرت بھی ہو رہی تھی کہ آخر نبی بخش..... زندہ کس طرح بچ گیا تھا.....؟

بہر طور..... اسے اب نبی بخش کو زندہ دیکھ کر عجیب طرح کی خوشی کا احساس ہونے لگا تھا کیونکہ یہ حقیقت انہیں ٹھٹکا کو ”بھونگا“ دینے سے پہلے ہی کھل چکی تھی اور اب اصولاً..... ان پر بھونگا اور تادان زرجینے سے راجو اڑیں فیصلے کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

♦♦♦♦♦

”اڑے تو..... ہوش میں تو ہے خانو.....! یہ کیا کہہ رہا ہے تو.....؟“

میر محمد اپنے بیٹے کی بات سن کر خوشی اور حیرت کے طے جلے جذبات تلے بولا۔

”میں درست کہہ رہا ہوں بابا سائیں!“ خانو پر زور لہجے میں بولا۔ ”میں نے خود پڑیس ان گناہ گار آنکھوں سے نبی بخش کو ہی دیکھا ہے۔ راجیو اور لائق اسے حکیم جی کے دوا خانے لائے تھے۔ مجھے تو خود حیرت ہو رہی ہے کہ نبی بخش زندہ تھا اور ہمیں پتا ہی نہ چل سکا اور سب سے بڑی

بات یہ ہے کہ وہ بچ کیسے گیا۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ میری کپھاڑی کا ایک ہی وار.....“

”اڑے بس کر..... چنگا ہوا وہ بچ گیا۔“

اس کا باپ میر محمد یکدم اس کی بات کاٹ کر بولا۔ وہ ایک گھاگ آدمی تھا۔ اس کی تجربہ کار نظروں نے پس پردہ کہانی کو فوراً بھانپ لیا تھا کہ نبی بخش زخمی ضرور ہوا تھا مگر ہلاک نہیں ہوا تھا مگر ٹھٹکا اور اس کے بیٹوں نے نبی بخش کو مردہ ظاہر کیا تھا تاکہ اس کے بیٹے خان محمد پر زیادہ سنگین جرم عائد ہو سکے۔ تاہم اس نے بیٹے سے پوچھا۔ ”یہ بتا تو نے جب نبی بخش پر غصے میں آکر کپھاڑی کا وار کیا تھا تو اپنے سامنے اسے مرنے دیکھا تھا؟“

”نہیں!“ خانو بولا۔ ”وہ زخمی ہو کر گر گیا تھا۔ پھر کچھ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ زخمی نبی بخش کو فوراً شہر کے اسپتال لے جایا گیا تھا۔ اس کے تین چہرے بھائی لائق وغیرہ نے بعد میں خبر پھیلا دی کہ نبی بخش مر گیا ہے۔“

”تو پھر وہ کفن میں لپیٹ لاش اور قبر میں دفنایا جانے والا مردہ کس کا تھا؟“ ہاری میر محمد کچھ سوچتے ہوئے بولا تو خانو بولا۔

”بابا سائیں! بات ظاہر ہو چکی ہے۔ اب ہمیں جلدی سے وڈیرے سائیں کو ساری حقیقت بتا دینی چاہیے۔“

♦♦♦♦♦

اگلے دن علی الصباح میر محمد نے بیٹوں کے ساتھ سویرے سے پہلے خفیہ طور گوشت کے چند مستر لوگوں سے ملا اور انہیں لیے وڈیرے سائیں آغل شاہ کی اوطاق پہنچا اور اسے ساری حقیقت سنا ڈالی۔ وڈیرا اور اس کے آدمی فوراً حرکت میں آگئے اور یہ سب لوگ ٹھٹکل کے گھر پہنچے اور یوں مردہ نبی بخش کو زندہ برآمد کر لیا گیا۔ یہ سب اتنا جانک اور تیزی سے ہوا تھا کہ ٹھٹکل اور اس کے تینوں بیٹے تنگ رہ گئے، اس سارے گھن چکر میں وہ لوگ ایک ایک ہم بات فراموش کر بیٹھے تھے کہ اگر نبی بخش زندہ تھا تو پھر ٹھٹکل اور اس کے بیٹوں نے بیٹوں نے کچھ دن پہلے نبی بخش کی جگہ کس کی کفنانی ہوئی لاش قبر میں دفن کی تھی.....؟ لیکن ظاہر ہے یہ اتنی معمولی بات نہ ہے جو زیادہ دیر ذہن سے محو رہتی۔ سرمد ہی کے ذہن میں اچانک یہ خیال ابھرا تھا اور جس کا بلا تردد اظہار اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کے علاوہ جرگے کے سرخی وڈیرے آغل شاہ کے گوش گزار کر دیا۔

بہر طور نبی بخش کی وہ چٹکی قبر کھولی گئی تو سب نے اپنے دھڑول تے انگلیاں داب لیں۔ وہاں واقعی ایک گلی سڑی

لاش برآمد ہوئی۔ یہ معاملہ اب سنسنی خیز حد تک امد و ہٹاک اور پر اسرار ہو گیا تھا۔

لاش برآمد ہونے پر لوگ انگشت بدندان تھے کہ جب نبی بخش زندہ تھا تو پھر یہ کس بد نصیب کی لاش تھی؟ اسپیکٹر پبلک جانوری..... جو پہلے ہی سے اس معاملے میں دلچسپی کی وجہ سے اس پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسے بھی مطلع کیا گیا اس کے وڈیرے آغل شاہ سے اچھے تعلقات تھے۔ تب اس کے ذہن میں فوراً ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے کودا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ تھوڑے دن پہلے گمشدہ غلامو نامی نوجوان کی یوڑھی ماں اور سرمد اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے تھانے آئے تھے۔ اس نے ایک سوال پر اسے بتایا تھا کہ اس کے بیٹے غلامو کی سب سے زیادہ گہری دوستی ٹھٹکل کے بیٹوں کا، راجیو اور لائق سے تھی۔ بس پھر کیا تھا۔ اس نے لاش کی شناخت کے لیے فوری طور پر غلامو کی یوڑھی ماں اور اس کی بہن بھاگی کو بلا لیا۔ اگرچہ غلامو کچھ اور لوگ بھی پہچانتے تھے مگر لاش کی حالت اس قدر ناقابل شناخت ہو رہی تھی کہ حتی طور پر یہ فیصلہ بھاگی اور اس کی ماں پر ہی چھوڑا گیا تھا۔ دونوں ماں بیٹی روٹی جیتی وہاں پہنچی تھیں اور سب توقع بجلی کی نظر میں غلامو کی لاش پہچان لی۔ بھاگی کی ماں تو بے جاری جوان اکلوتے بیٹے کی لاش دیکھتے ہی غم سے غش کھا کر گر پڑی جبکہ بھاگی کی حالت بھی غیر ہونے لگی۔

پورے گوشت میں کھرام بچ گیا اور بے نام سی سنسنی پھیل گئی۔

ٹھٹکل اور اس کے تینوں بیٹوں کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ ان سے جرم اگلوانے کے لیے وڈیرے سائیں آغل شاہ نے اسپیکٹر پبلک کی خدمات مستعار لی تھیں۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے فوراً ہی حوالاتی تشدد سے مجبور ہو کر باجماعت یہ اعتراف کر ڈالا کہ جب نبی بخش کی بات پر اشتعال میں آکر خان محمد نے اس پر کپھاڑی کا وار کیا تو نبی بخش شدید زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ بعد میں خون میں نہاے ہوئے نبی بخش کو اس کے چچا زاد بھائی کا، راجیو اور لائق اپنے گراٹھا لائے۔ سب ہی سمجھ رہے تھے کہ نبی بخش مر چکا ہے مگر وہ بے ہوش تھا۔ جسے بعد میں ایک سوے سجھے خفیہ منصوبے کے تحت راتوں رات شہر لے جا کر اسے طبی امداد دے کر بچالیا گیا مگر چونکہ یہ لوگ خان محمد کو اس غلطی یا جرم کا زیادہ سے زیادہ مزہ چکھنا چاہتے تھے اس لیے پورے گوشت میں اسے مردہ ہی ظاہر کیا گیا لیکن چونکہ گوشت

والوں کے سامنے نبی بخش کی لاش کو ظاہر کرنا بھی ضروری تھا اس لیے کالو، رجمو اور لائقو نے نبی بخش کی لاش کو دکھاوے کی خاطر غلامو کو قتل کر کے گوشت والوں کی نظروں کے سامنے قہر کو دکھو کہ اس کی لاش کو دفن کر دیا۔ تینوں بھائیوں اور باپ کے سر پر اب بھونکنے اور زرتاوان حاصل کرنے کا لالچ سوار ہو گیا تھا۔

◆◆◆◆◆

چونکہ یہ معاملہ پہلے ہی سے راجواڑ میں طور پر نمٹایا جا رہا تھا لہذا اب اس معاملے کی سسٹی خیز ”کایا کلب“ پر پہلا فیصلہ معطل کر کے نیا فیصلہ سنا دیا گیا۔

اب نہ صرف باری میر محمد پر عائد ہو گئے کو معاف کر دیا گیا تھا بلکہ دھوکا دینے اور ایک بے گناہ کے قتل کے سنگین جرم کی یادداشت میں اب الٹا مٹھل کو بد نصیب غلامو کی ماں کو نقد دو لاکھ روپے ادا کرنا تھے اور اپنی جوان بیٹی کو کونجاں کا سنگ (رشتہ) میر محمد کے چھوٹے بیٹے سرمد کو دینا پڑ گیا۔

اس فیصلے پر چند روز بعد غزوہ بھاگی اور سرمد کی ملاقات ہوئی تو اس نے شکوہ کناں ہو کر سرمد سے کہا۔ ”سرمد! یہ تو الٹا فیصلہ ہو گیا۔ تیری اب کونجاں سے شادی ہو جائے گی اور تو مجھے بھول جائے گا۔“ سرمد مگر کہتا ہوا۔

”بھائی! تو تو میری زندگی ہے۔ میری پہلی اور آخری محبت۔ مٹھل کی دھی کونجاں سے میں شادی ضرور کروں گا مگر اس کی حیثیت ایک نوکرانی سے بڑھ کر نہیں ہوگی۔ پھر کچھ ہی روز بعد میں تجھ سے بیاہ کر لوں گا۔ تو بھی کونجاں سے جی بھر کر اپنے بھائی غلامو کا انتقام لینا۔ آخر کو تیرے بھائی غلامو کے قاتلوں کی وہ بیٹی ہوگی۔“

سرمد کی غایت جان کر بھاگی کا پڑ مردہ چہرہ یکدم کھل اٹھا اور اس کی آنکھوں میں بھی اب انتقام کے شعلے رخص کرنے لگے تھے۔ پھر چند ثانیے بعد سرمد نے اسے مزید قائل کرنے کی خاطر تسلی دی اور معنی خیز لہجے میں بھاگی کے چہرے کی طرف دیکھ کر ہوا۔

”پنگی! کیا سوچ رہی ہے۔ بے فکر رہ۔۔۔۔۔ سہاگ رات میں صرف اور صرف تیرے ساتھ ہی مناؤں گا۔ کونجاں کو محض میرے پاؤں کی جوتی ہوگی۔“ یہ سن کر بھاگی کا چہرہ شرم۔۔۔۔۔ اور خوشی سے سرخ ہو گیا۔

یہ اس معاشرے کا درد ناک المیہ تھا کہ انتقام اچھے بھلے انسان کو زہریلا بنا ڈالتا ہے۔ جس سے کئی مسائل جنم لیتے ہیں۔

◆◆◆◆◆

ماحول میں رات کی تیرگی گھٹنے لگی تھی۔ گارے مٹی کے لیپ والی اس جگہ کوٹھری میں لائین روشن تھی جس کی برق قات زور روشنی میں دیوار پر بنے دو دم بہ خود سائے لرزاں تھے۔ یہ نبی بخش کا کمر تھا۔

وہ ایک رتی بچی چار پائی پر پاؤں لٹکانے پریشان سا بیٹھا تھا اور اس کے سامنے دوسری چار پائی پر کونجاں بھی غمناک چہرے کے ساتھ سر جھکانے بیٹھی تھی۔

”نبی بخش! اب کیا ہو گیا؟“

دفعہ کوٹھری کی محدود اور ساکت فضا میں کونجاں کی لرزیدہ ہی آواز ابھری۔

نبی بخش نے کونجاں کی طرف دیکھا۔ لائین کی مدد روشنی میں اس کا خوب صورت اور معمول چہرہ پیلا پڑنا دکھائی دیا مگر اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

درحقیقت وہ دونوں اس وقت موجودہ صورت حال کے ایک دم پلٹ جانے پر فکر مند تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نبی بخش کے چاچا مٹھل یعنی کونجاں کے باپ اور بیٹیوں پر اب ”بھونکنے“ کی افتاد آن پڑی تھی۔

جس کا راجواڑ میں فیصلہ یہ ہی طے پایا تھا کہ اب کونجاں کو میر محمد کے بیٹے سرمد کی بیوی بننا تھا۔ جوان دونوں میں سے کسی کو بھی قبول نہ تھا کیونکہ کونجاں نبی بخش کی بچپن کی پسند تھی۔ دونوں بچپن سے ہی ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے۔ یہی نہیں بلکہ مستقبل قریب میں تو دونوں کی شادی بھی ہونے والی تھی۔

نبی بخش کو جو اب بدستور خاموش یا کونجاں سے رہا نہ گیا اور اس نے پہلے سے بھی زیادہ متوشل لہجے میں نبی بخش کی طرف دیکھ کر کہا۔

”دیکھ نبی بخش! میں مر جاؤں گی مگر تیرے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گی۔“

”کونجاں!۔۔۔۔۔ ذرا صبر کر، میری حالت تجھ سے مختلف نہیں ہے۔“ نبی بخش نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا وہ بھی خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ ”لیکن کونجاں! اگر ہم اس طرح روتے دھوتے رہے تو پھر کچھ بھی نہیں بچے گا۔ تو میری منگ ہے۔۔۔۔۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تجھ سے دستبردار ہو جاؤں؟“

”مگر نبی بخش! ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔“

نبی بخش نے خلا میں گھورتے ہوئے پراسرار لہجے میں جواب دیا اور جانے کیوں اس لہجے پر کونجاں قدرے چونک کر نبی بخش کا چہرہ نکٹنے لگی۔

◆◆◆◆◆

دھوپ نکل آئی تھی مگر سردی بھی کم نہ تھی۔ تھانے کے وسیع احاطے میں اس وقت انسپٹر بیکل جانوری ایک کرسی پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ ایک مخنی سا لے ایس آئی ارشد اشاری بھی اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر براجمان تھا۔ انسپٹر محمد بیکل اخبار کے مطالعے میں غرق تھا کہ اچانک ایک بدحال شخص اپنا دوڑتا اس کے قریب آیا، اس کے ہمراہ دو سپاہی بھی تھے۔

”س۔۔۔۔۔ سامیں!۔۔۔۔۔ انسپٹر سامیں قہر تھی ویو (غضب ہو گیا)“ اس نے قریب پہنچ کر ہراساں لہجے میں کہا۔ انسپٹر کی توجہ اپنی جانب مبذول کر آئی۔ بیکل نے قدرے چونک کر اخبار سے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”انسپٹر سامیں!۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ مٹھل ہاڑی کے پٹ لائقو کو قتل کر دیا گیا ہے۔“ اس اطلاع پر انسپٹر محمد بیکل جانوری۔۔۔۔۔ قدرے ٹھنکنا اور یہ غور یہ خیالنے والے مضطرب الحال شخص کا یہ غور جائزہ لیا جو پہلی ہی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔ سر پر پہلی چیکنٹ ٹوپی دھری تھی۔ عمر تیس پچیس کے آس پاس ہوئی۔ رنگت خاکستری بال سالو ٹی جی اور جسم حسرت حالی کی غمازی کرتا تھا۔

”مجھے تفصیل بتاؤ۔۔۔۔۔ اور ہاں۔۔۔۔۔ اپنا نام بھی۔۔۔۔۔“ یہ غور جائزہ لینے کے بعد انسپٹر جانوری نے کڑک دار لہجے میں کہا۔ اس کے قریب بیٹھا لے ایس آئی ارشد اشاری بھی ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”سامیں!۔۔۔۔۔ میرا نام دھڑیں بخش ہے۔“ دو سپاہیوں کے ساتھ آنے والے نووارد نے کہا۔ ”انسپٹر سامیں!۔۔۔۔۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے خانو کو لائقو کے سر پر کھڑیاں مارتے دیکھا ہے، اس ظالم نے بے چارے کا قیہ کر ڈالا۔“ یہ بتاتے ہوئے دھڑیں بخش کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ وہ کوئی کمزور دل اور حساس آدمی تھا۔ انسپٹر جانوری کے چہرے پر ایک لمحے کو پریشان تاثرات ابھرے تھے۔ اپنے قریب بیٹھے ارشد کی طرف دیکھا پھر ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ارشد نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی۔

”یہ خانو کون ہے؟ دھڑیں بخش! تجھے اس کا پورا نام بتاؤ۔۔۔۔۔ اور یہ بھی کہ یہ واردات تم نے کہاں ہوتی دیکھی

ہے؟“ انسپٹر بیکل جانوری نے گھبر لہجے میں اس سے پوچھا۔ ”سامیں! ادھر۔۔۔۔۔ بابا کوڑیل شاہ کی چکی سے ذرا پرے۔۔۔۔۔ سریں (سرسوں) کے کھتوں کے بیچ۔“ حواس باختہ ہو کے اس نے ادھورا جواب دیا تو انسپٹر بیکل اسے گھورتے ہوئے کڑک دار لہجے میں بولا۔

”میں نے خانو کا پورا نام پوچھا ہے۔۔۔۔۔ وہ کس کا بیٹا ہے؟ کون ہے؟“

”خ۔۔۔۔۔ خان محمد نام ہے اس کا سامیں!۔۔۔۔۔“ وہ باری میر محمد کا ڈاڈا پٹ (بڑا بیٹا) ہے سامیں۔“ اس نے بتایا تو انسپٹر ایک لمحے کو اس کی بات پر چونکا۔ اسے یاد آئے گا کہ یہ باری میر محمد یقیناً وہی شخص تھا جس کا مٹھل کے ساتھ پرانا تنازعہ چلا آ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ابھرا۔

”یہ لائقو نہیں مٹھل باری کا بیٹا تو نہیں؟“

”ہاؤ۔۔۔۔۔ سامیں!۔۔۔۔۔ ہاؤ۔۔۔۔۔ دھڑیں بخش نامی اس شخص نے فوراً اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ انسپٹر نے چند سپاہیوں کو ساتھ لیا اور پولیس موبائل میں سوار ہو کر جائے وقوعہ پر پہنچا۔ دھڑیں بخش بھی ساتھ تھا۔ وہاں دیگر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ وہاں موجود بیشتر لوگوں کا بھی خیال تھا کہ لائقو کو ”کادو“ (بدکار) کر کے قتل کیا گیا ہے۔ پولیس گاڑی کو دیکھتے ہی جمن کائی کی طرح چھٹا کھڑا گیا۔ گاڑی رکتے ہی انسپٹر بیکل اپنے چہرے پر ذمے دار چٹکتی لیے نیچے اترا اور سیدھا لاش کی طرف بڑھا اور بہ غور اس کا جائزہ لینے لگا۔

اگرچہ لائقو کے سر پر کھڑیاں سے وار کیا گیا تھا مگر ایک ہی بھر پور ضرب نے شدت اختیار کر لی تھی مگر لاش کا چہرہ قابل شناخت نظر آ رہا تھا۔ انسپٹر نے کھڑے کھڑے اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا کہ مقتول کی بے خبری میں ہی اچانک اس کے سر کے پچھلے حصے پر وار کیا گیا تھا۔ مزید براں ایک ہی سچے تلے وار نے مقتول کو آٹا فافا موت سے ہمکنار کر ڈالا تھا۔ اس ایک وار کے سوا مقتول کے جسم پر درست کسی ”ضرب شدید“ وغیرہ کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ تب ہی اچانک انسپٹر محمد بیکل کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ اس امدد ہناک وقوعہ کی اطلاع دینے والے دھڑیں بخش نامی شخص نے بتایا تھا کہ خانو نے لائقو کو کھڑیاؤں کے پے در پے وار کر کے اس کا قیہ بنا ڈالا تھا جبکہ مقتول پر ایک ہی وار کیا گیا تھا۔

”دھڑیں بخش!۔۔۔۔۔ تمہارے علاوہ اور کس نے خانو

کو یہ قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا؟“

انسپکٹر محمد بچل جانوری نے کسی خیال کے تحت اس سے پوچھا۔

”م..... میں اکیلا تھا سائیں! اس وقت اور کوئی نہ تھا۔“ اس نے بتایا۔

”تم تو کہہ رہے تھے کہ خانو نے لائقو کا قیمہ بنا ڈالا ہے مگر لاش کا جائزہ لینے کے بعد تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس پر کلہاڑی کا ایک ہی وار کیا گیا ہے اور وہی جان لیوا ثابت ہوا۔“ بالآخر انسپکٹر نے کہا تو ایک لمحے کے لیے دھڑکن بٹخا اور کچھ گھبرایا ہوا سا نظر آنے لگا۔ پھر فوراً بات بناتے ہوئے بولا۔

”س..... سائیں! خانو مجھے اس وقت بری طرح طیش میں نظر آ رہا تھا جب اس نے ایک وار کیا تو میں نے لائقو کو گرتے دیکھا تو یہی سمجھا کہ خانو اس پر مزید وار بھی کرے گا۔ میں نے تو سائیں! خوف زدہ ہو کر سر پٹ آپ کے پاس تھانے کی طرف دوڑ لگا دی۔“

انسپکٹر کو اس کی یہ بات ہنسنے ہوئی۔ بہ طور..... اس نے ضابطے کی کارروائی نمٹائی اور مقتول کی لاش کو پوسٹ مارٹم وغیرہ کے لیے اپنی کسٹڈی میں کرتے ہوئے دو سپاہیوں کو ارشد لاشاری کے ساتھ مقتول کے وارثوں کی طرف بھیج دیا اور خود خانو کو گرفتار کرنے اس کے گھر جا پہنچا۔ اسے حیرت ہوئی کہ مبینہ قاتل خانو (خان محمد) گھر پر ہی موجود کھانا کھا رہا تھا۔ بہ طور..... سردست کارروائی نمٹانی تھی، انسپکٹر نے اس کے ہاتھ میں پھٹکڑیاں پہنا دیں۔

”دس..... سائیں..... ام..... میرا بچپن..... بے قصور ہے۔“

خانو کے باپ میر محمد نے گڑگڑاتے ہوئے انسپکٹر بچل سے کہا۔ مگر وہ شایدان داویل کو عادی تھا لہذا انسپکٹر خانو کو پھٹکڑی ڈالے تھے نہ بچپن اور اسے لاک اپ کر دیا۔

حسب توقع خانو نے اپنے جرم سے انکار کر ڈالا۔ انسپکٹر بچل نے تین دنوں کے وارثوں کو تھانے بلایا اور ان کے بیانات قلم بند کیے۔ پھر اگلے روز ڈیرے آغل شاہ اور راجاواڑی میں کئی چند میٹر آدمیوں نے یہ سارا معاملہ باضابطہ طور پر پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس بارے میں ان سب کا یہی متفقہ کہنا تھا کہ یہ خونی واقعہ بھی دونوں فریقوں یعنی ہاری میر محمد اور مٹھل ہاری کے بیچ پرانے تنازعہ کا شاخسانہ تھا۔ اب انسپکٹر محمد بچل پوری طرح یہ یس حل کرنے میں جانتا وچو بند ہو گیا تھا۔

سب سے پہلے اس نے سسرے سے اور ذرا باہمی کے حوالے سے دونوں فریقوں یعنی ہاری میر محمد اور مٹھل ہاری کے مابین پرانے تنازعے کو کھنگالنا شروع کر دیا اور اپنے ذہن میں ان کی ترتیب وار چمن کر کے یہ غور حالات کا تجزیہ کرنے لگا۔ یعنی آج سے کچھ عرصہ پہلے میر محمد کے بڑے بیٹے خان محمد اور مٹھل کے بیٹے جی بخش کے بیچ کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا اور اشتعال میں آ کر خان محمد نے جی بخش پر کلہاڑی سے وار کر دیا جس کے نتیجے میں جی بخش زخمی ہو گیا اور مٹھل کے بیٹوں نے اپنے چچا زاد بیٹے کو مارا ہوا ظاہر کیا تاکہ خان محمد پر سنگین جرم عائد ہو سکے مگر جلد ہی یہ عقدہ کھلا کہ جی بخش مرانہیں تھا اور اس کی جگہ مٹھل ہاری کے بیٹوں، کالو، رنجیو اور لائقو نے اپنے ایک غریب اور سادہ لوح دوست غلامو کو قربانی کا بکرا بنا کر قتل کر کے اس کی لاش کو جی بخش ظاہر کرتے ہوئے دفن دیا تھا۔ بعد میں جبکہ اس جرم سے بھی پردہ اٹھ گیا اور پولس ”راجاواڑی“ فیصلے کے مطابق لٹا اب مٹھل کے بیٹوں پر دہرا بھونکا عائد کر دیا گیا یعنی مٹھل ہاری کی اکلوتی بیٹی کو جابا سنگ (رشتہ) سربد کے ساتھ دو لاکھ کی چٹی (خون بہا) غلامو کی بد نصیب ماں کو دینا قرار پایا پھر اس کے کچھ دنوں بعد یعنی ابھی بھونکے کی ادائیگی میں چند دن باقی تھے کہ چانک مٹھل کے بیٹے لائقو کو قتل کر دیا گیا۔ یہ قتل دھڑکن بٹخا نامی ایک شخص نے اپنی آنکھوں سے خان محمد کو کرتے دیکھا تھا۔

مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر میر محمد کے بیٹے خان محمد کو کیا ضرورت تھی کہ وہ لائقو کا قتل کرے جبکہ راجاواڑی میں یہ فیصلہ صادر کیا جا چکا تھا کہ لائقو کے گھر والوں نے نہ صرف غلامو کی بد نصیب ماں کو بلکہ ہاری میر محمد کو بھی بھونک دینا تھا۔ بھلا ایسی صورت میں خان محمد کو لائقو کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور حقیقت بھی یہ تھی کہ خود اس کا داغ یہ بات ماننے کو تیار نہ تھا۔

تو پھر آخر لائقو کا قتل کس نے کیا تھا؟ جبکہ دھڑکن بٹخا نامی گواہ نے بھی خان محمد کو لائقو کا قتل کرتے دیکھا تھا۔ بچل نے تمام حالات کی باریک جزئیات کو ترتیب وار ایک لڑی میں پرونے کے بعد اس بات پر غور کیا۔ اگر ذرا دیر کو یہ تسلیم کر لیا جاتا کہ گواہ دھڑکن بٹخا جھوٹ بول رہا تھا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اسے جھوٹ بولنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ وہ تو خود ایک عام سا، بے ضرر غریب آدمی تھا۔

”سائیں انسپکٹر صاحب! جب معاملہ سنگ داری

(بٹنی یا بہن کا رشتہ دینا) کا ہوا اور..... اور وہ بھی ”بھونگے“ کی صورت میں تو ایسے میں یہ لوگ کسی اپنے کو بھی ”پیارا“ کر ڈالتے ہیں۔“

یہ اسے ایس آئی ارشد لاشاری کے الفاظ تھے۔ جب انسپٹر پچل نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اس سوال کے بارے میں اس سے رائے چاہی تو اس نے بلا تصدیق و تامل اس پر ایک بے رحمانہ تبصرہ کر ڈالا تھا۔

”یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے، تمہارا مطلب ہے لائق کو اس کے بھائیوں نے ہی قتل کر ڈالا تھا۔ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ارشد! ذرا کلر بات کرو۔“ انسپٹر پچل جانوری نے اچھے ہوئے لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا تو ارشد اپنے چہرے پر پختہ کارانہ جوش کی تمنا بہت طاری کرتے ہوئے بولا۔

”سائیں! سیدی ہی بات ہے..... لائق کو قتل کرنے کے بعد ان لوگوں نے جی بھیا ہوگا کہ اب چونکہ اس کے قتل کا الزام میر محمد یا اس کے بیٹوں کے سر جائے گا اور یوں حساب برابر ہو جائے گا۔ اس طرح انہیں بھونگا بھی نہیں بھرنا پڑے گا۔ خاص طور پر کونجاں کا.....“

”میرے حلق سے یہ بات نہیں اتر رہی ہے ارشد! تم پھر دھڑیں بخش کے بارے میں کیا کہو گے، جو عینی گواہ ہے؟“

”وہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے سائیں!“ اے ایس آئی ارشد لاشاری نے بلا خوف تردید کہا۔ تو انسپٹر پچل جانوری اس کی بات پر غور کرتے ہوئے سوچنے لگا تو کسی حد تک یہ بات اسے با وزن محسوس ہونے لگی، یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اس کا اس بات کی طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا کہ دھڑیں بخش جھوٹا بھی ہو سکتا ہے مگر..... پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ انسپٹر پچل کے حلق سے یہ بات نہیں اتر رہی تھی کہ لائق کو خان محمد کے بجائے اس کے بھائیوں نے ہی اپنی جوان بہن کونجاں پر ”قربان“ کیا ہوگا تاکہ اس کا سنگ (رشتہ) مخالف دھڑ (فریق) کو نہ دینا پڑے بلکہ الٹا خان محمد پر ہی قتل کا الزام ٹھوپ کر ”سروا خان“ (خون بہا) وصول کر لیا جائے۔ جانے کیوں انسپٹر پچل جانوری کو یہ کیس اتنا پیچیدہ نہ ہوتے ہوئے بھی لائیکل سائی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بے اختیار الجھ کر اپنی پیشانی مسئلے لگا جیسے ماتھے کی شکنوں کا جال سلجھانے کی سعی کر رہا ہو..... تب آج ایک اس کے ذہن میں ایک خیال برق کی سی سرعت کے ساتھ کوندا..... اس نے فوراً اے ایس آئی ارشد کو مخاطب کر کے کہا۔

”ارشد! تم ایک کام کرو۔“

”حاضر سائیں! حکم کرو.....“ وہ مستعدی سے مؤدبانہ انداز میں بولا۔

”تم ایسا کرو..... دھڑیں بخش پر کڑی نگاہ رکھو اور اس کے معمولات، نیز وہ کون کون سے ملتا جلتا ہے اور اس کی زیادہ گہری آدک جادک کن افراد سے ہے؟“

”حاضر سائیں..... میں ابھی سادہ وردی میں اس کام میں مصروف ہو جاتا ہوں۔“ ارشد نے کہا۔

◆◆◆

مگر دو روز گزرنے کے باوجود..... اے ایس آئی ارشد لاشاری کو دھڑیں بخش کے متعلق کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی سوائے اس کے کہ اس نے ایک دن دھڑیں بخش کو نبی بخش کے ساتھ پھوک موالی کے چھپر نما ہوٹل میں ایک ساتھ دیکھا تھا۔ پہلے تو انسپٹر پچل نے سرسری انداز میں یہ سنا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اسے جیسے بچھوئے ڈنگ مار دیا ہوا دروازہ ارشد لاشاری سے پر جوش لہجے میں بولا۔

”یہ نبی بخش..... کہیں وہی تو نہیں جو مٹھل کا بیٹھا ہے اور ایک عرصے سے اسی کی زیر کفالت ہے؟“

”ہاؤ سائیں.....! میں اسی نبی بخش کی بات کر رہا ہوں۔“ ارشد نے جوابا کہا۔

”ارشد! تم اس وقت چند ماہوں کو بھیج کر ذرا دھڑیں بخش کو میرے سامنے پیش کرو۔“ ارشد نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور تھوڑی دیر بعد دھڑیں بخش اس کے سامنے تھا۔ انسپٹر محمد پچل اپنے تئیں فوراً ہی اس سچی کو اپنے ذہن رسامیں تقریباً سلجھا چکا تھا اور اسی ترتیب کے ساتھ مرحلہ وار آگے بڑھتا جاتا تھا۔

اس نے ارشد لاشاری کو چند ضروری ہدایات دینے کے بعد دھڑیں بخش کو اس کے حوالے کر دیا۔ ارشد نے تھوڑی ہی دیر میں دھڑیں بخش کو ایک خاص مگر ٹکریل زدہ کمرے میں لے جا کر اس سے مخصوص قسم کی پوچھ گچھ کی تو سارا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔

انسپٹر پچل، اے ایس آئی ارشد اور چند سہیلوں کے ہمراہ مٹھل ہاری کے گھر پہنچا۔ نبی بخش اس وقت گھر پر ہی موجود تھا، اسے فوراً جھکنے یاں ڈال دی گئیں۔

نتیجتاً مٹھل اور اس کے سب گھروالے رونے پٹنے اور دوا دیا کر رہ گئے۔ مٹھل اپنے دونوں ہاتھ جوڑنے ہوئے انسپٹر سے گڑ گڑا کر بولا۔

”سائیں! یہ کیا ظلم ہے..... بچھڑا (بیٹا) بھی میرا قتل ہوا اور..... گرفتاری بھی میرے ہی گٹھے سے تھی..... اس نے بھلا

کون سا ایسا جرم کر ڈالا۔“ انسپٹر نے گھور کر مٹھل ہاری کی طرف دیکھا اور کڑک دار لہجے میں چونکا دینے والا انکشاف کیا۔

”اسے لائق کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔“ اس کی بات پر تمام اہل خانہ کو جیسے یکدم سانپ سونگھ گیا۔ سب سے زیادہ بری حالت یاس کھڑی آنسو بہاتی سسکی کونجاں کی ہو رہی تھی۔ انسپٹر پچل نے نہ صرف ایک ہتھکڑی لٹکر کونجاں پر ڈالی اور پھر مٹھل ہاری کی طرف دیکھ کر سرسری خیز لہجے میں بولا۔

”تم کو بھی ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔“ یہ کہتے ہی وہ سب تھانے آگئے۔

نبی بخش کی حالت نہایت گرگور تھی۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ انسپٹر محمد پچل نے اسے لاگ اپ کرنے کے بعد مضطرب الحال مٹھل کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اس وقت کمرے میں ان کے علاوہ دو ہی سہیلی تھے۔ اے ایس آئی ارشد بھی موجود تھا۔ مٹھل اپنے دونوں لرزدہ ہاتھ جوڑے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ انسپٹر محمد پچل اس کی طرف جھپٹی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے اپنی کمری سے اٹھا اور اس کے قریب آکر پیچھے ہٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میرے سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔“

”حاضر سائیں!..... پوچھو.....“ مٹھل لرزتی کانپتی آواز میں بولا۔

”کیا تم اپنی بیٹی کونجاں کی شادی اپنے یتیم بھتیجے نبی بخش سے کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟“

مٹھل پہلے تو اس عجیب سوال پر ذرا گڑبڑا سا کیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاؤ..... سائیں! میں..... میں نے تو بچپن سے ہی ان دونوں کی بات کی کر رہی تھی مگر.....“

”مگر کیا.....؟ دیکھو، رو نہیں، بولتے ہو.....“ انسپٹر نے ڈنپا۔

”آپ کو تو بتایا ہی ہوگا سائیں..... کہ ہمارا باری میر محمد سے ایک پرانا بھٹڑا چل رہا تھا۔“ مٹھل نے پھر بتانا شروع کیا۔

”اب راجواڑیں فیصلے کے مطابق ہمارے کو ”بھونگے“ کی صورت میں اپڑیں کونجاں کا سنگ (رشتہ) میر محمد کے بیٹے سرد کو دینا پڑ رہا ہے۔“

”یہ سب سے تو ساری خرابی کی ابتدا ہوئی تھی۔“

انسپٹر نے فوراً کہا۔ تب پھر وہ مٹھل کو وہ ساری حقیقت بتانے لگا جو اسے نبی بخش کے بارے میں دھڑیں بخش سے مخصوص طرز کی پوچھ گچھ کے بعد معلوم ہو گئی تھی، بولا۔

”مٹھل! میری پوری بات غور سے سنو..... تمہاری بیٹی کونجاں اور نبی بخش بچپن سے ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ جب تمہارے اپنے بیٹوں کی غلطی سے الٹا بھونگا بھرنے کی نوبت آئی اور راجواڑیں فیصلے کے مطابق جب کونجاں کا سنگ (رشتہ) میر محمد کے بیٹے سرد کو دینا پڑا تو یہ بات کونجاں اور سب سے زیادہ نبی بخش کے لیے تکلیف دہ تھی۔ درحقیقت تمہارے اپنے ہی بھتیجے نبی بخش نے حساب برابر کرنے کے لیے تمہارے ہی بیٹے لائق کو قتل کر ڈالا تاکہ یہ جرم میر محمد کے کھاتے میں ڈال کر ”بھونگا“ بنخوایا۔ اس کے لیے نبی بخش نے ایک غریب آدمی کو جس نے اپنی بیار بیوی کا شہرے علاج کر دیا تھا۔ روپوں کا لالچ دے کر اپنے اس خونی منصوبے میں شریک کیا۔ اس کا نام دھڑیں بخش تھا۔ اسے لائق کے قتل کا جھوٹا عینی گواہ بنا کر یہ میر محمد کے بیٹے خانو کے سر تھوپنے کی کوشش کی۔“

”پر وہ بد بخت..... سرد کو بھی تو قتل کر سکتا تھا جس کی شادی کونجاں سے ہونے والی تھی؟“ مٹھل نے پوچھا۔

”یہی تو اس کے منصوبے کا وہ نازک پہلو تھا..... کہ اگر وہ سرد کو قتل کرتا تو سیدھا سیدھا حاشہ نبی بخش پر ہی کیا جاتا جبکہ اس کے برعکس لائق کے قتل پر کسی کو بھی اس پر شریک نہ ہوتا اور ایسا ہوا بھی۔ یہ تو دھڑیں بخش کی ایک بے وقوفی کے باعث عقدہ کھلا کہ اسے جھوٹا گواہ بنا کر قاتل کا شبہ مٹانے کی کوشش کی گئی تھی۔“

”سائیں! دھڑیں بخش سے کیا غلطی ہوئی تھی؟“

”اس نے جب تھانے آکر مجھے جو اطلاع دی تھی وہ وقوعہ پر بالکل مختلف ثابت ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ خانو نے کھڑیاں مار کر لائق کا قیہ بنا ڈالا ہے جبکہ جائے وقوعہ کا جائزہ لینے کے بعد مجھے بتا چلا کہ لائق پر صرف ایک ہی شدید کھڑیا کا وار کیا گیا تھا جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ تب مجھے دھڑیں بخش پر شبہ ہوا مگر میں نے اس پر ظاہر نہیں کیا اور چھوڑ دیا۔ بعد میں میرے ایک آدمی نے سادہ وردی میں اس پر نگاہ رکھی تو اسے نبی بخش کے ساتھ اٹھتے بٹھتے دیکھا گیا..... پھر اس سامنے گور.....“

”وجہ میری سمجھ آگئی۔“

انسپٹر نے اپنی بات ختم کی اور مٹھل اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔



ناصر ملک مسافر

قسط نمبر : 14

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زار سفر پوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود پر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خاتماں خراب، بے سپر اور ابلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے اسسورواں ہوں اور بوٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت پونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضاؤں میں طوفان چھپے ہوئے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہو جاتی ہے مگر مسافر پر موڑ ہے ایک نئی داستان رقم کر کے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہو جاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کر دینے والے واقعات اور معاشرتی سردیوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

کل دگر از سرے راہ پر خاریک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی کے سفر پر ہم سب مسافر راہ کی کشائیوں سے بے خبر رواں دواں رہتے ہیں۔ داستان سفر شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف ضروری ہے۔ ہمارا نام شہر یار ہے پیار سے شہر کہتے ہیں۔ میرا کمر اعلیٰ نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد، ام والدین عرف سوہان خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجوار چوٹی بہن پر دین پر مشتمل تھا اور جنو بی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا جب میری عمر پانچ برس کی ایک روز میرے والدین کو بے دردی سے کال کر دیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے میں اپنا لیا اور اپنے تین بچوں کی طرح ہماری تربیت کی۔ گاؤں ہی میں چھوٹی کھیتی باڑی کی جنہوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ طے کر دیا تھا۔ چچا نے مجھے تعلیم دلائی، میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ورک میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر اس کے بعد میں نور پور واپس آ گیا۔ گاؤں کے دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو گاؤں کے نبرداریات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حبابات کی خوشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام میں شریک رہتا تھا۔ میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالافا جو تعلیم یافتہ تو تھا لیکن حیات خان کی وکٹن چلاتا تھا، اسی نے مجھے ذرا نیکی سکائی تھی جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ وہ ایک سچے ہوئے قلمس، لیکن نڈر کر کے چوٹی انسان تھے۔ میں ان سے علمی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا۔ خالد عرف کھالافا درحیر خان جو کہ ایک سیاسی لیڈر تھا اور حیات خان کا سرپرست بھی تھا، کی بیٹی اسما کے کھٹورہ پیش میں بیٹا ہو گیا، میں نے اسے سمجھا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نبرداریات خان کے

[illegible]

سیمیٹ، ڈائجسٹ

کر دیکھا۔ کچھ نہ ہوا۔ پھر لکڑی اور فارمیکا کے بنے ہوئے بورڈ کو پکڑ کر ہلا جا ملا یا مگر مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں نے غیر معمولی تیز رفتاری سے اسٹور کی تمام دیواروں کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ کہیں کوئی درز، دراڑ یا چور سوچ دکھائی نہیں دیا۔ وہ کم بخت مجھے بے ہوش ہوتے ہوئے بھی ڈانچ دے گیا تھا۔ مجھے سخت غصہ آیا اور جی چاہا کہ اس کے سینے میں خنجر کا پورا پھل اُتار دوں مگر خود پر قابو پاتے ہوئے اسے جگانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ باہر سے کسی کے آنے کا راستہ روکنے کے لیے میں نے اسٹور کے اکلوتے دروازے کی چچی چڑھادی اور فرش پر آڑے ترے پڑے ہوئے پرویز کے پاس بیروں کے بل بیٹھ گیا۔ جونہی ہنڈی کے اعصاب کھینچے، درد کی تیر تیر پورے بدن میں پھرنی، منہ سے ہلکی آہ نکل گئی۔

اس بارہ بانی چودہ کے مختصر کمرے کی چاروں دیواریں ساٹ تھیں جنہیں میں نے تھپتھا کر دیکھا تھا۔ کوئی دیوار کھوکھلی نہیں تھی۔ سبھی اینٹوں کی بنی ہوئی پلستر شدہ دیواریں تھیں۔ فرش پر بکھرے ہوئے بے ترتیب سامان کے عین درمیان میں راستہ سامنا ہوا تھا جس میں پرویز پڑا تھا۔ یہ راستہ سیدھا بورڈ تک جاتا تھا۔ میں نے ذہن دوڑایا۔ سوچا، بورڈ تک سامان کے بیچوں بیچ گزر گا ہونا بے مقصد نہیں تھا۔ پرویز نے درست کہا تھا۔ بورڈ ہی کلیدی جس کا میکروم میری فہم سے بالاتر ثابت ہوا تھا۔ میں اٹھ کر دوبارہ سوچ بورڈ سے زور آزمائی کرنے لگا۔ جونہی میں نے دونوں ہاتھوں سے بورڈ کو پکڑ کر نیچے کی طرف کھینچا، وہ ٹک کی آواز کے ساتھ دیوار پر آدھا اچ نیچے ٹھکک آیا۔ میں نے تینوں اطراف گردن کھائی مگر کوئی تغیر دیکھنے میں نہیں آیا۔ میں نے نئی مرتبہ بورڈ کو اوپر نیچے کیا مگر کام نہ ہتا۔

میڈم کی حویلی میں ’سی ٹیوٹن‘ داخل کا طلسماتی نظام آنکھوں میں لہرا گیا۔ وہ اس بے کہیں مشکل تھا مگر کھولنے والی میرے آگے آگے چل رہی تھی اور جادوئی دروازوں کو کھولتی جاتی تھی۔ یہاں ’کل جاسم‘ کا ستر چمکنے والا گہری بے ہوشی میں مبتلا تھا۔ ناکام ہونے کے بعد اسے ہوش میں لانا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی ہر ممکنہ کوشش کی مگر وہ بس سے س نہ ہوا۔

ایسے ہی وقت میں جب میں جھنجھلا کر پرویز کے پیٹ میں گہرا چرکا لگانے چلا تھا، میری نظر فرش کے ایک حصے پر جا پڑی۔ حویلی کے دوسرے کمروں کی طرح یہ فرش بھی رٹڑے ہوئے پتھروں سے بنا ہوا تھا اور اس میں ایک

سوئے ہوئے ملازمین والا کمرابہ دستور بند تھا۔ وہ چونکہ عام گھریلو نوکر تھے اس لیے انہوں نے ڈر کے مارے رضائیوں سے نکلنے کی کوشش ہی نہیں کی ہوگی۔ وہ کیوٹر کی طرح آنکھیں بند کر کے سر پر آنے والے خطرے کو ٹال چکے تھے۔

میں پرویز کو دھکیلتا ہوا اسٹور میں داخل ہوا۔ یہاں پہلے ہی آیا تھا۔ کوئی تبدیلی نہ دیکھ کر مجھے پرویز کا پراعتماد جواب یاد آیا گیا۔ وہ رفتہ رفتہ اپنے حواس کھور ہا تھا۔ قناعت کے مارے گردن ادھر ادھر ڈھلک رہی تھی۔ میں نے گردن پر خنجر کا معمولی سا دباؤ بڑھایا، کہا۔ ”نہ خانے کا دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔“

وہ کٹھکباڑ سے گزر کر کمرے کے عین وسط میں ٹکا۔ میز کے اوپر پڑی ہوئی پرانی میز کے پائے کو تھام کر خود کلاہی کے سے انداز میں بولا۔ ”مجھے چکر آ رہے ہیں۔“

میں نے درستی سے کہا۔ ”اوتے حرامزادے! چکر آ رہے ہیں یا مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ دروازہ کھولو ورنہ تمہاری گردن کاٹ کر پیسک دول گا۔“

اس پر میری دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ چانک اس نے اپنا وزن مجھ پر ڈال دیا۔ میں چونکہ ہوشیار تھا، اس لیے اس کے بے جان وجود کو سنبھال گیا۔ اس کی گردن کندھے پر ڈھلک گئی اور نہایت کم بلند آواز میں بڑبڑانے لگا۔ کیا کبڑا ہوا تھا، یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اپنا بازو نکالا، اُسے کٹھا کر میز کے کنارے کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر وہ ریت کی طرح فرش کی طرف سرک گیا۔ میں نے بروقت اس کی گردن پر سے خنجر ہٹا لیا ورنہ وہ جس طرح لڑکھا تھا، اس کی گردن یقینی طور پر ٹک جاتی۔

اس کی آدھ کھلی آنکھیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ہوش و خرد سے بیگانا ہو گیا تھا۔ میں نے ایک زوردار چمچر اس کے منہ پر مارا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور بولا۔ ”اوہ..... وہ بورڈ.....“

اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور ہونٹ نیم داہو گئے۔ وہ چنچلوں کے لیے سنبھلا اور پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے خنجر کو نوک اس کے بازو میں چھوئی۔ پھر ران میں دو تین جھکے لگائے مگر اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ مجبوراً اسے وہیں چھوڑا اور اچھل کر قبضی دیوار میں نصب بجلی کے سوچ بورڈ کی طرف گیا جس پر اس کی آدھ کھلی آنکھیں مرکوز ہوئی تھیں۔ وہ عام نوعیت کا بجلی کا سوچ بورڈ تھا۔ میں نے اس پر سگے ہوئے پانچوں بیٹوں کیلے بعد دیکرے دیا

اس نے شکست تسلیم کر لی اور بغیر کچھ کہے ڈگمگاتے قدموں سے چل پڑا۔

ہماری رفتار خاصی سست تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم مین گیٹ کے قریب پہنچ گئے۔ میری آنکھیں ارد گرد جھینک رہی تھیں۔ کسی چپے ہوئے دشمن کا امکان ذہن میں تھا مگر حویلی پہلے کی طرح سکوت کی چادر اوڑھ چکی تھی۔ بیرونی گیٹ کے پار سڑک پر کوئی موجود نہیں تھا۔ اعلان سن کر دوڑے چلے آنے والے یارن خان کا حکم سن کر لوٹ گئے تھے۔ حویلی کا بڑا دروازہ بہ دستور کھلا ہوا تھا۔ دادوہا نے کوفرش پر اسی انداز میں لینے دیکھا تو میں ڈک گیا۔ ناچار پرویز بھی رک گیا۔ میں نے اس کی بے پناہ پھرتی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کی بغل سے ہاتھ نکالا، پیر اور ہاتھ کی مدد سے، جھکے بغیر، دادوہا نے کی ڈبل ہیرل گن اٹھائی اور کندھے پر ڈال لی۔ ہاتھ دوبارہ پرویز کی چھاتی پر رکھ لیا اور ارد گرد دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”نہ خانے میں خان کیا کر رہا ہے؟“ وہ خاموش رہا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو وہ بولا۔ ”علم نہیں۔“

”وہاں موجود دوسرے لوگ کیا کر رہے ہیں؟“ میرا لہجہ بے حد سفاک ہو گیا۔

”ہم سب خان کے باڈی گارڈ ہیں۔ وہ سوتا ہے، ہم جاگتے ہیں۔“ اس کی آواز قدرے بھرائی ہوئی تھی۔ ”تم کون ہو؟ کیا یارن خان کے دشمن ہو؟“ اس کا سوال احمقانہ تھا۔ اگر میں خان کا دشمن نہیں تھا تو اتنی مارا ماری کیوں کر رہا تھا۔ میں اُسے دھکیلتا ہوا اسٹور دم کی طرف بڑھا۔

وہ بولا۔ ”تم نہ خانے سے زندہ باہر نہیں نکل سکو گے۔ اس لیے وہاں جانے کا خیال دل سے نکال دو اور فوری طور پر یہاں سے جان بچا کر نکل جاؤ۔“ ”یہ مشورہ تم پہلے بھی دے چکے ہو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”نہ خانے میں باڈی گارڈ کے علاوہ کتنے لوگ ہیں؟“

”میں نے ایک لڑکی کو دیکھا ہے۔“ اس کے قدموں کی ڈگمگاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ اُسے سنبھال کر چلنا میرے لیے بتدریج مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ اسٹور دم میں پینچنے سے پیشتر ہی بے ہوش ہو کر گر جائے گا۔ اس کی ناک سے خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ میری حالت اس سے کسی طرح بھی بہتر نہیں تھی مگر مجھے پر عجیب سا جنون سوار تھا جو مجھے آگے کی طرف دھکیل رہا تھا۔

اُس گرل کی یہاں تنصیب کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اطراف میں دیکھا۔ اس جیسی کئی جالیاں دکھائی دیں۔ یقیناً یہ حویلی کے نہ خانے کی دشمنی لیز تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں بلڈنگ انجینئر کی ذہانت کو سراہا کہ اس نے جالیوں کی تنصیب اس انداز سے کی تھی کہ جب تک دیوار کی جڑ میں بیٹھنا نہ جاتا، دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ اس کی مدد سے آواز انہی جالیوں میں سے گزر کر میرے کانوں تک پہنچ سکتی تھی۔ وہ زیر زمین نہ خانے میں قیدی تھی۔ یہ عقدہ حل ہوا تو میرے حلق سے لمبی سانس برآمد ہوئی۔

پرویز کی ہمت جواب دے گئی تھی اور وہ پہلو کے بل گر گیا تھا۔ میں دیوار کے قریب آیا۔ جھک کر ایک جالی سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ تیرہ اچ چوڑی دیوار کے عین وسط میں فٹ کی گئی جالی کے پار کچھ دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ کان لگائے۔ اس کی آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔ وہ چیختے چیختے غڑحال، مایوس یا بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ کہیں میں نے آواز کو پیچھا نہ منے غلطی تو نہیں کی تھی؟..... از خود یقین سا ہوا کہ نہیں..... وہ یقینی طور پر خانزادی اسامی تھی، حیدر خان کی بیٹی جسے میں دو آہ بے کے دیران علاقے میں رگوستائی کے حوالے کر آیا تھا۔

سردی، قناعت اور دکن مجھ پر سوار ہونے لگی تھیں۔ ایک بار جی میں آیا کہ میں پرویز کا ٹیٹا نکال دوں اور حویلی سے نکل جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ آج موقع ہے، کل یارن خان چوکنا ہوگا اور مجھے وار کرنے کا موقع نہیں دے گا۔ حویلی میں داخل ہوتے ہی کیلیوں سے اڑا دے گا۔ اس لیے مجھے جونہی کرنا تھا، آج ہی کرنا تھا۔ سچی میں نے زوردار تھپڑ پرویز کے جڑے پر بڑا۔ پھر دوسرا، تیسرا..... تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آ گیا اور سر جھٹک کر اپنے اوسان بحال کرنے لگا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور کھڑا کر دیا۔ وہ اپنے بیروں پر بروقت کھڑا ہوا۔ میں اس کے عقب میں آیا۔ پہلے کی طرح زخمی باز داس کی بغل تلے سے نکال کر چھاتی پر رکھا، دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر اس کی شہرگ پر رکھا اور دبی آواز میں غرایا۔ ”بلا چوں جہاں مجھے نہ خانے میں لے چلو۔ یاد رکھنا جہاں بھی خرمستی کرو گے، وہیں ذبح کر کے پھینک دوں گا۔“

وہ اڈیل گھوڑا بہ مشکل قابو میں آیا تھا۔ جان گیا تھا کہ اس کا واسطہ عام چور اُچکے سے نہیں پڑا تھا بلکہ رات کی تاریکی میں حویلی میں قدم رکھنے والا سر پر سوار سیر تھا۔ سچی

خاص ترتیب سے شیشے کی سلاخیں ڈالی گئی تھیں۔ بورڈ کے نیچے فرش پر سلاخی کے بجائے درز تھے جس پر میری نگاہ اتفاق سے جا آئی تھی۔ درز کا بے غور جائزہ لینے پر عقدہ کھلا کہ تہ خانے کا دروازہ کسی دیوار میں نہیں تھا بلکہ فرش میں تھا۔ کمرے میں پڑے ہوئے کانٹھ کا بڑا کیڑا بے ترتیبی میں بھی زمین کی ترتیب موجود تھی جس کا احساس ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ فرش کا دایاں حصہ بائیں جانب کھسکا تھا۔ میں نے ایک دوپے میں پھنسا کر رکھی ہوئی کرسیوں کو بائیں جانب کھینچا۔ کرسیاں نہیں کھسکیں، فرش معمولی آواز پیدا کیے بغیر بائیں جانب کھسک گیا۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھیں کہ دائیں دیوار کے ساتھ دوسری فٹ چوڑا خلا نمودار ہو گیا تھا جس میں سے لوہے کے پائپ کی بنی ہوئی سیریز نیچے جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ ”سی ٹو“ کے برعکس یہ الیکٹرک سیریز نہیں تھا بلکہ سوچ بورڈ محض سادہ سے سوچ لیور کی طرح کام کرتا تھا اور گیت کو متقل اور غیر متقل کرتا تھا۔

اگر مجھے پرویز نے سوچ بورڈ کا کلیو نہ دیا ہوتا تو یقینی طور پر میں تہ خانے کا دہانہ کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکتا۔ خلا میں جھانک کر دیکھا۔ لوہے کے پتلے پائپ کی سیریز کے نیچے پائے عودی حالت میں ایک ہشت پہلوئی کمرے کے فرش میں نصب تھے۔ اس ہشت پہلوئی کمرے میں بھی کانٹھ کا بڑا اور ٹوٹا پھوٹا فرنیچر رکھا گیا تھا۔ میں نے قحط انداز میں جھپک کر دیکھا۔ تو کوئی دروازہ دکھائی دیا اور نہ ہی کوئی شخص..... میں نے مزید وقت سوچنے بجھنے میں ضائع نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور پلک بجھنے میں خلا میں اتر گیا۔ چند لمحوں بعد میں عجیب شکل کے تہ خانے کے وسط میں ٹوٹی ہوئی کرسیوں اور میزوں میں گھرا کھڑا تھا۔

ایزیوں کے بل ٹھوم کر چاروں طرف دیکھا۔ دیوار کے ساتھ دو کرسیاں رکھی تھیں جن پر آف وائٹ کلر کی اونٹ چادریں پڑی تھیں۔ ان کی حالت سے پتا چلتا تھا کہ ان میں لپٹ کر بیٹھے ہوئے ابھی بھی میں یہاں سے اٹھے ہوں۔ ایک کرسی کے پہلو میں سیاہ رنگ کی چھوٹی کے کے رافٹل کھڑی کی گئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پرویز اور بالکونی میں میرا نشانہ بننے والا شخص یہاں سے اٹھ کر میری خیر خبر لینے اور پرگئے تھے۔ میں بام منزل تک پہنچ گیا تھا۔ منزل دو چار ہاتھ آگے تھی۔ میں نے داد مہانے کی ڈبل بیرل گن ایک گرد آلود میز پر رکھی اور کے کے گن اٹھائی۔ اپنے کم وزن اور مختصر جسامت کے باعث مجھے یہ دشمن

ساختہ گن بہت پسند آئی۔ اس کی میگزین چیک کی تو دل بلبوں اچھلنے لگا۔ وہ گولیوں سے مملی تھی۔

میں نے بھرا احتیاط سے لباس میں چھپایا اور گن تانے ایک ایک دیوار کو کٹھولنے لگا۔ کمرے کی آٹھوں دیواریں سپاٹ تھیں۔ کوئی الماری یا کھڑکی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی فریم آویزاں تھا۔ اسٹونز میں سوچ بورڈ تھا، یہاں وہ بھی دکھائی نہیں دیا۔ دیواروں کے ہر اتصال پر فرش سے لے کر چھت تک بھری موجودگی جو ظاہر کرتی تھی کہ ان میں سے کوئی ایک دیوار اپنی جگہ سے ہٹ کر دروازہ بناتی تھی۔ میں اس دیوار کو تلاش کر رہی رہا تھا کہ اچانک ”سر“ کی تیز آواز کمرے میں میرے دائیں ہاتھ ابھری۔ گردن گھما کر دیکھا تو آنکھوں میں حیرانی بھر گئی۔ پوری کی پوری دیوار ٹرین کی بوکی کی طرح فرش پر پھسل رہی تھی اور نہایت ”سلو موٹن“ میں میرے سامنے دروازہ بنا رہی تھی۔ میرے اعصاب میں برق بھر گئی۔ جس طرف دیوار کھسک رہی تھی، میں نے اس طرف چھلانگ لگائی اور کباڑ کے پیچھے چھپ گیا۔ اتفاق سے ٹی وی ٹرائی اور پہلو کے بل کھڑکی کی گئی بھاری بھر کمیز کے پیچ سے کھلتے ہوئے دروازے کا منظر دکھائی دیتا تھا جس پر میری نگاہیں ثبت تھیں۔

ایک ایک لمحہ میرے اعصاب پر گراں گزر رہا تھا۔ وہ فٹ کا خلا بننے میں کم دہش پانچ منٹ لگے مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پیدا ہونے والے خلا میں سی آئی کے بجائے اسی رنگ کی دیوار دکھائی دی۔ میں نے کچھ دیر اور انتظار کیا مگر کوئی شخص برآمد نہیں ہوا۔ دس منٹ کے بعد مزید تاب انتظار نہ رہی تو میں دے پاؤں چلتا ہوا پہلو کی طرف سے خلا کے سامنے پہنچ گیا۔ جھانک کر دیکھا۔ وہ چار ضرب چھ کا باکس نما کمرہ تھا جس کی کبھی دیواریں سپاٹ تھیں۔ عیاں ہوتا تھا کہ جس طرح یہ دروازہ کھلا تھا، اسی طرح باکس کی کسی اور دیوار میں بھی سرکے کا خود کار نظام نصب کیا گیا تھا۔

میں نے بے اختیار باکس میں داخل ہونا چاہا مگر یہاں وقت پر ایک خیال برتی کوندے کی طرح ذہن میں پلکا اور میرے قدم تھم گئے۔ میں تیزی سے پلٹا اور میز کے پیچے دبک گیا۔ باکس کی دیوار ہٹانے والا سامنے نہیں تھا۔ کھولنے والے نے نہیں دور بیٹھ کر اسے آپریٹ کیا تھا۔ اگر میں باکس میں داخل ہو جاتا تو بعد نہ تھا کہ وہ سلوموشن کے بجائے چشم زدن میں اس دروازہ نما خلا کو پر کر دیتا۔ میں آگے گئے رہتا نہ پیچھے کا اور چہرے کی طرح کڑکی میں جھنسا جاتا۔

میری متذبذب نظریں باکس پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک خیال آیا اور میں نے شکستہ پائیوں والی ایک تپائی اٹھائی۔ میز کے اوپر سے جھپک کر فرش پر رکھی اور ڈھکیل کر باکس کے اندر پہنچا دی۔ چوٹی تپائی باکس کے وسط تک پھسل کر تھم گئی۔ دسٹن سیکنڈوں کے بعد میرے اندیشے کی توثیق ہو گئی کیونکہ ”کناک“ کی آواز ابھری اور خلا آہن واحد میں پھر ہو گیا۔

مجھے جھرمجھری آئی۔ قسمت نے یادری کرتے ہوئے مجھے اس قبر نما باکس میں پھنسنے سے بچایا تھا۔ چند لمحے گزرے تھے جب اسی انداز میں دوسری دیوار سرکے لگی تھی۔ مجھے آنے والے کی نظروں سے چھپنے کے لیے جگہ بدلنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ جو بھی دروازہ بنا، عام قامت کا گن بردار دکھائی دیا۔ وہ کئی سیکنڈ تک خلا کے پار کھڑا ہو کر انداز میں ہشت پہلوئی کمرے میں نگاہ دوڑاتا رہا۔ اس کا رنگ گہرا سائلا تھا، سر جھرا گرد اور کچھ زخموں کے نشانات سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے سرخ رنگ کی شرت اور سیاہ بیٹن پائین رکھی تھی جو اس پر ذرہ بھر چھج نہیں رہی تھی۔ اپنے ڈیل ڈول سے چھٹا ہوا بد معاش معلوم ہوتا تھا۔

میں نے اسے دیکھتے ہی خطرناک شخص قرار دیا اور میرے اعصاب تن گئے۔ وہ کمرے میں داخل ہوا۔ چند ساعتیں سر اٹھا کر چھت کے خلا کو کھوتا رہا پھر سیدھا اس دیوار کی طرف بڑھا جس کے پار کال کوٹھری واقع تھی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے اسے مارنے کا فیصلہ کیا، اس کی کھوپڑی کا نشانہ لیا اور ٹانگیں دو دیا۔ ہند کمرے میں فائر کی کان بھاڑ دینے والی آواز کان میں لمبی بازگشت اور خوفناک گونج چھوڑ گئی۔ مجھ شخص خلق سے کوئی آواز نکالنے اور بغیر دیوار سے نکلنا۔ اس نے دیوار پر ہاتھ جمانے کی کوشش کی مگر نامراد لہرایا اور زمین پر گر کر جھسکے لینے لگا۔ میرے ذہن میں چپان اعداد و شمار کے چارٹ کے مطابق اب یارن خان اور خان خاڑی اس کے علاوہ تہ خانے میں دو آدمی بچے تھے جن پر قابو پانا ناگزیر تھا۔

میرے اندازے کے مطابق کے کے گن کی گولی کی کان بھاڑ آواز تہ خانے کے گوشے گوشے تک پہنچی تھی۔ دوڑتے قدموں کی آوازیں سنتے ہی میں ایک مرتبہ پھر مورچہ بند ہو گیا۔ خلا کے پار قدموں کی چاپ تھم گئی اور ایک بار یک مگر تیز آواز میرے کانوں پر ڈی۔ ”اوئے پرویز! نیچے!.....“ اوسے تم چپ کیوں ہو؟ یہ فائر کی آواز کیسی تھی؟“ پوچھنے والا سامنے آئے بغیر تفتیش کرنے لگا تھا۔

جواب نہ پا کر اس نے قحط انداز میں جھانکا۔ اسے نہ میں اور نہ فرش پر آخری جھپکے لیتا تھا ہی دکھائی دیا۔ مجبوراً اسے سامنے آنا پڑا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں تھا اور میری خوش بختی کہ اس کے ہاتھ میں گن یا پتول نہیں تھا۔ جو بھی اس کی نظریں فرش پر خون میں لت پت فیتے پر پڑیں، وہ بری طرح چونک گیا۔ بے اختیار پیروں کے بل بیٹھا اور بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ”اوئے فیتے! اوئے.....“

”تمہیں کس نے گولی ماری ہے؟ بتاؤ مجھے۔“

فیقا جواب دینے کی طاقت کھو چکا تھا۔ پوچھنے والے کو جواب میں تکلیف رساں خرخراہٹ سنا دی تو وہ بری طرح گھبرا گیا۔ اٹھ کر کھینچی پھٹی آنکھوں سے ارد گرد دیکھتا ہوا حلق کے بل چچا۔ ”اوئے پرویز! کہاں سر کیا ہے تو؟“

پرویز کی طرف سے جواب نہ پا کر وہ پھر چلا یا۔ ”علی شیر! تم سب لوگ کدھر گئے ہو؟ ادھر آؤ، فیتے کو کسی نے گولی ماری ہے۔“

”کیوں چچ زبے ہو؟ کیا ہوا؟“ اس کے عقب میں ایک بھاری آواز گونگی۔ چند لمحوں بعد ایک نالے قد اور بڑی توند والے شخص نے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کی نظر فیتے پر پڑی تو وہ تیزی سے جھکا۔ میرے لیے یہ سنہرا موقع تھا۔ میں نے اٹھنے، نالے قد والے شخص کے سر کا نشانہ لینے اور فائر کرنے میں محض دو سیکنڈ کا وقت صرف کیا ہوگا۔ میرا نشانہ کارگر رہا، اٹھ دیواروں والا کرا فائر کی خوفناک آواز اور میرے شکار کی دلزدہ جتنے تھرا اٹھا۔ فیتے کے پیرا میں ابو کا بازار گرم ہو گیا۔ میں نے زائد آواز والے شخص کو جو دہشت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا، ہاتھ سر پر رکھنے کا حکم دیا۔ وہ میرے ہاتھوں مرنے والوں کی تڑپتی ہوئی لاشیں دیکھ چکا تھا، مجھ چکا تھا کہ وہ موت کے دہانے پر کھڑا تھا، بھی بلا چوں چراں ہاتھ سر پر رکھ کر بولا۔ ”کک..... کیا تہ..... تم نے پرویز کو بھی قتل کر دیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”وہ مر نہیں، اسٹور میں بے ہوش پڑا ہے۔ اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو گے تو تم بھی زندہ رہو گے ورنہ ان کوئی کی طرح حرام موت مارے جاؤ گے۔“

میں نے فرش کو کلبو سے تر کرتے ہوئے سوڑاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سخت لہجے میں اُسے دھمکا یا تاکہ وہ کسی بھی قسم کی چالاکی کا خیال دل سے نکال دے۔ چونکہ میرے لہجے میں موت کی سی کٹینی پنہاں تھی اس لیے وہ مارے خوف کے ہٹلانے لگا۔ بولا۔ ”تم کون ہو؟ تم.....“

میں کیا تعاون کر سکتا ہوں؟“

میں میز پر سے ہوتا ہوا اس کے عین سامنے پہنچ گیا۔
 سینے پر گرنے کی نال ٹکا کر غرایا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“
 ”بب..... برکت..... برکت مسیح۔“
 ایسے میں بے اختیار میری نظر اُس کے کھلے گریبان
 پر پڑی۔ سنہرے رنگ کی پٹین میں بھی سی صلیب جھول رہی
 تھی۔ ”تہ خانے میں تمہارے علاوہ کتنے آدمی ہیں؟“
 گن کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیلنے کو آئیں۔ تھوک
 نکل کر بولا۔ ”کک..... وہ..... وہ علی شش..... شیر.....
 پپ..... پتا نہیں وہ کدھر گیا۔“
 میں نے گن کو جھٹکا دیا۔ وہ ڈگدگ کر ایک قدم پیچھے
 ہٹا، بولا۔ ”شش..... شاید خان جی کے علاوہ کوئی بھی
 نہیں ہے یہاں۔“

اس نے مجھے تحفے میں ڈال دیا تھا۔ میں نے پھر تیزی
 سے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ اگر بالکونی میں گرنے
 والے کا نام علی شیر تھا تو میدان صاف تھا۔ اگر وہ کوئی اور تھا
 تو یقینی طور پر علی شیر کہیں چھپا ہوا تھا اور مجھ پر کامیاب حملہ
 کرنے کے لیے موقع کی تاک میں تھا۔ ایسے میں مجھے
 بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔
 ”خان کہاں ہے؟“ میں نے سر دلچھے میں پوچھا۔
 ”وہ..... وہ اپنے کک..... کمرے میں ہیں۔“ اس کی
 آواز لرزنے لگی۔

میں مستعدی سے گھوم کر اُس کے عقب میں آ گیا۔ کمرے
 کے گن کی نال ٹکا کر بولا۔ ”چلو اندر۔“
 اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے
 چو کس انداز میں قدم اٹھاتا ہوا ہشت پہلوئی کمرے سے نکل
 کر متصل چار فٹ چوڑی اور آٹھ فٹ لمبی گیلری میں قدم
 رنجہ ہوائی شکل کی اس گیلری میں ایک دروازہ کھلتا تھا جس
 کے سامنے رُکے بغیر ہم گیلری کے اختتام پر پہنچ گئے۔ میں
 نے اُسے روکا اور پوچھا۔ ”خان کا کمرہ کون سا ہے؟“
 اس نے دائیں ہاتھ اشارہ کیا۔ میں اُسے دھکیلتا ہوا
 یارن خان کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ میرے
 کہنے پر اُس نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ آہستگی
 سے بولا۔ ”سم..... مجھے یہیں رہنے دو۔“
 میرے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ سلگ اٹھی۔ میں سمجھ
 گیا کہ کتا اپنے مالک کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ مگر
 میں اُسے چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اس لیے
 لگا تار دھکیلتا ہوا کمرے میں گھس گیا۔ میری توقع کے برعکس
 کمرہ خالی تھا۔

میں نے دانت چٹکچٹکائے۔ ”اوئے کسی حرای کی اولاد!
 یہاں تو کوئی نہیں۔ جلدی ہو کتہار اباپ یارن خان کہاں ہے
 ورنہ تمہارا جسم چھٹی کر دوں گا۔“
 اس کی ٹھکی بندھ گئی۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔
 ”پپ..... پتا نہیں۔ میں نے شام کو خان جی کو ادھر آتے
 دیکھا تھا۔ اب پتا نہیں وہ کہاں چلے گئے۔“
 دل کو لگا کہ اُس نے سچ کہا تھا۔ میں نے اُسے دیوار
 کے ساتھ کھڑا کیا اور اس کا رخ پھیر دیا پھر اُسے نشانے پر
 رکھتے ہوئے اُس بے حد آراستہ کمرے کا جائزہ لیا۔ بیڈ کے
 نیچے، نفیس ملبوسات سے لہالب بھری وارڈ روب اور ہاتھ
 روم میں، الفرض ہر ممکنہ جگہ پر یارن خان کو دیکھا مگر وہ
 دکھائی نہیں دیا۔ یہاں مزید رُکنا فضول تھا اس لیے میں
 اُسے دھکیلتا ہوا گیلری کے دوسرے سرے پر واپس کمرے
 کی طرف بڑھا۔ اس کا دروازہ مقفل تھا۔ میں نے کہا۔
 ”اے کھولو..... جلدی کرو۔“

وہ بولا۔ ”میرے پاس اس کی چابی نہیں ہے۔“
 میں غرایا۔ ”یہاں دو کمرے ہیں۔ ایک میں یارن
 خان سوتا ہے۔ دوسرا مقفل ہے جس کی چابی تمہارے پاس
 نہیں ہے۔ تاؤ ہم لوگ کہاں سوتے ہو؟“
 ”میرا کمرہ اُس طرف ہے۔“ اس نے جلدی سے
 ہشت پہلوئی کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”پرویز اور سوتا
 ہے۔ رفیق میرے ساتھ ہوتا ہے جبکہ باقی لوگ دوسری
 گیلری میں ہوتے ہیں۔“

”چلو! مجھے اپنی مین گاہ دکھاؤ۔“ میں نے گن کی نال
 اس کی ریڑھ کی ہڈی میں چھوئی۔ وہ چپ چاپ مڑ گیا۔
 گیلری میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک چھوٹا سا دروازہ نظر
 آ گیا جسے میں نے گزرتے ہوئے بلاوجہ نظر انداز کیا تھا۔
 اس نے دروازہ کھولا۔ فریجیئر سے بے نیاز چھوٹے سے
 کمرے میں قالین پر ایک بڑا گدا اور دو لحاف پڑے
 تھے۔ ایک دیوار پر چھوٹا سا کنٹرول پنٹیل نصب تھا جس پر
 تین لیور دو بلب اور ایک بڑی سی ناب لگی ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“
 ”یہ کنٹرول پنٹیل ہے۔“ اس نے ہونٹوں پر زبان
 پھیرتے ہوئے کہا۔ ”سیمنٹ کے دروازوں کو یہاں سے
 کھولا اور بند کیا جاتا ہے۔“
 ”اچھا..... اسٹور والا دروازہ بند کرو۔“ میں نے
 پنٹیل پر نظریں جمائیں اور کہا۔ اس نے ایک لیور دبایا۔
 ”کٹاک“ کی آواز سنائی دی۔ دروازہ بند ہو گیا تھا۔ میں نے

پوچھا۔ ”باس کا گیٹ تم نے کھولا تھا؟“

وہ سہجے انداز میں بولا۔ ”ہاں! میری ڈیوٹی یہاں پر
 ہوتی ہے۔ کیا اس میں تمہارا کوئی ساکھی چھپا ہوا ہے؟“
 ”نہیں.....“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”تو پھر یہ ریڈ بلب کیوں جل رہا ہے؟“ وہ پریشان
 ہو کر بڑبڑایا۔

”کیا مطلب؟“ میں متفکر ہوا۔

”کوئی اس کمرے میں داخل ہو جائے، جب ریڈ بلب
 جلتا ہے۔ اس کے روشن ہوتے ہی میں نے چھوٹے کمرے
 کا دروازہ بند کیا تھا۔“ اس کا خوف اور حیرت سے برا حال
 تھا۔ ”اگر تمہارا کوئی ساکھی ادھر نہیں گیا تو پھر وہاں کون قید
 ہے؟ علی شیر وہاں ہے؟“

میں نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ نہیں جانتا
 تھا کہ میری چھٹی حس نے مجھے اس چوہے دان میں داخل
 ہونے سے روک دیا تھا اور میں نے اپنی جگہ پر ٹوٹی ہوئی
 تپائی ادھر دھکیل دی تھی۔

میں نے اسے کمرے سے نکالا اور بند دروازے کی
 طرف لے گیا۔ مجھے تو یقین تھی کہ اس میں یارن خان چھپا
 ہوا تھا۔ دروازے کے قریب اُسے روک کر میں نے نفل کا
 جائزہ لیا۔ عام نوعیت کا گھونٹے والا تالا تھا جسے میں نے گولی
 مار کر توڑ دیا۔ لاک پیڈل ٹوٹ گیا اور دروازہ کھل
 گیا۔ سرسری نظر دیکھنے سے یہ کمرہ یارن خان کے آراستہ بیڈ
 روم کا مکمل عکس معلوم ہوا۔

جوئی میں نے اندر قدم رکھا، مجھے کمرے کے وسط میں
 عقیق دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے جہازی ساز کے بیڈ پر
 ٹھیکس لبل میں سرمہ لپیٹ کر پڑا ہوا وجود دکھائی دیا۔ وہ
 خوف سے دیکھا تھا یا موقع کی تاک میں تھا کیونکہ فائر کی
 خونا ک آواز سننے کے بعد بھی اس کی آنکھ نہ کھل پائی تھی، یہ
 سامنے کی بات نہیں تھی۔ کمرے کے پہلو میں ہاتھ روم کا
 دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے برکت مسیح کو دیوار کے ساتھ
 کھڑا کیا اور پہلو کے بل چلا ہوا تیزی سے ہاتھ روم تک
 گیا۔ جھانک کر دیکھا، خالی تھا۔ میں نے بہ یک وقت
 برکت مسیح اور کبل میں لپٹے ہوئے شخص کو نشانے پر رکھتے
 ہوئے بیڈ کے نیچے جھانک کر پردوں کو ہلایا جلا یا مگر کچھ نہ ملا۔
 مجھے سے غلطی ہوئی تھی جس کا احساس مجھے بعد میں ہوا تھا۔
 کبل میں لیٹا ہوا شخص اگر سچ ہوتا تو وہ کبل کے اندر رہ کر
 مجھ پر آسانی سے فائر کر سکتا تھا۔

میں نے برکت مسیح کو مخاطب کیا۔ ”یہ کبل کھینچ لو۔“

ہری آپ!“

برکت مسیح اپنی مسکین سی شکل کی بدولت بے ضرر لگتا
 تھا۔ اسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ اس نے بھی بارودھا والے
 کاموں میں حصہ نہیں لیا تھا کیونکہ گن کو خود پر اٹھا دیکھ کر اس
 کی آنکھیں دہشت سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے کانپتے
 ہاتھوں سے کبل کا کونا تھا یا اور اپنی جانب بھیج لیا۔ طلوع
 ہونے والا منظر ہوش رہا تھا۔ میری آنکھیں پہلے خیرہ
 ہوئیں، پھر ایک دم شرم سے جھک گئیں۔ مگر میں دانستہ بیڈ کی
 طرف براہ راست دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ بیڈ پر کوئی
 جواں سال عورت برہنہ بدن گھڑی بنی پڑی تھی۔ اس کا
 آدھا بدن سیاہ بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ چونکہ اس نے اپنا سر
 سینے میں اور دونوں ہاتھ ٹانگوں کے بیچ ڈال رکھے تھے اس
 لیے چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ نہ صرف زندہ تھی بلکہ
 پورے ہوش و حواس میں تھی مگر شرم سے دہری ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”اے لڑکی! تم کون ہو؟“
 وہ کچھ نہ بولی۔ بری طرح کانپتی رہی۔ میں نے کن
 آنکھیں اُسے اُسے دیکھا۔ وہم دور ہو گیا۔ اس کے پاس کوئی
 گن نہیں تھی۔ کہا۔ ”برکت مسیح! اس پر کبل ڈال دو۔“
 برکت مسیح نے فوراً تعمیل کی۔ چند ہی لمحوں میں میری
 آنکھیں سنکنے لگی تھیں۔ یہ احساس بڑا اشتعال انگیز تھا کہ
 سردار یارن خان نے جوئی کے نیچے اتنا بڑا تھکانہ بخش اپنی
 سلفی ہوس کی آبیاری کے لیے لے رکھا تھا۔ اپنی تہائی کو مکمل
 اور محفوظ بنانے کے لیے کئی خوں خوار سپرے دار بھی تعینات
 کر رکھے تھے جو اپنی کابلی کے باعث مجھے اس کے میش
 کدے تک پہنچنے سے نہ روک سکے تھے۔

یارن خان گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو گیا
 تھا۔ میں گھبرا سا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ یہیں کہیں چھپا ہوا
 تھا جسے فوری طور پر کھون نکالنا بے حد ضروری تھا ورنہ وہ
 میرے خون کی بوسٹھٹھا ہوا کسی بھی لمحے قیامت بن کر مجھ پر
 ٹوٹ پڑے گا۔

میں نے برکت مسیح کو ڈرانے کے لیے اپنے لہجے کو
 مزید خوں خوار اور درشت بناتے ہوئے کہا۔ ”جلدی بولو! خان
 کہاں ہے ورنہ تمہاری چھٹی کمرہ کو اپنے طریقے سے اسے
 تلاش کروں گا۔“

وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ سر کو دائیں بائیں نفی میں ہلاتے
 ہوئے دیوانہ وار کھلے میں بھونکی ہوئی صلیب کو کھام کر ملتا جلتا
 لہجے میں بولا۔ ”قسم یسوع کی..... مجھے علم نہیں ہے۔ وہ
 اپنے کمرے میں ہی تھے جب باہر شور مچا ہوا۔ میں نے

انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔“

”ابے کتے کے بلے! پھر اُسے آسمان کھا گیا یا زمین نکل گئی۔“ آخر آپریشن ٹیکل پر بیٹھتے ہو۔ تمہیں اس راستے یا خفیہ درجے کا علم ہے جس میں وہ چھپا بیٹھا ہے۔ میرے ساتھ ڈرا سے بازی نہ کرو، سیدی طرح بول پڑو ورنہ۔۔۔۔۔“

”دشش۔۔۔۔۔ شاید ایسا راستہ ہو۔ کوئی خفیہ جگہ بھی ہو۔۔۔۔۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے۔“ اس کی آواز کچپکانے لگی اور انہیں تصدیق کرنے لگیں کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ ”مم۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ خان جی یہاں سے نکل گئے ہیں۔ ان کے کمرے میں کسی سرنگ کا دہانہ ہوگا۔ قسم یسوع کی۔۔۔۔۔“

اس کی بات میرے دل کو لگی۔ اس تہ خانے کو دیکھ لینے کے بعد یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اس نے آخری بچاؤ کے لیے یہاں ایسی بھی کوئی سرنگ بنوا رکھی ہو جس کا ماسوائے اس کے، کسی کو پتا نہ ہو۔ یہ خیال بڑا تکلیف دہ تھا کہ وہ میری آنکھوں میں دھول جھونک کر تہ خانے سے نکل بھاگے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا۔ وہ نکلنے کے بعد مجھ پر قابو پانے اور اپنے قیمتی کارندوں کا بدلہ لینے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوگا۔ اسے جتنی مہلت میرے آئے گی، اس کا وار اتنا زیادہ کاری ہوگا۔ میں نے خفیہ راستے کی تلاش میں کمرے کی دیواریں پر نگاہ ڈالی۔ بیڈ کے اوپر چھت اور عقبی دیوار کے عظیم پڑ پڑھ کسر فٹ کی نیم نظر آئی۔ اس پر جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے پرویز سے زور آزمائی کے دوران اس کی چٹج کی آواز سنی تھی۔ پھر دیوار کی جڑ میں عجیب ساخت کی جالیاں دیکھی تھیں۔ یہ اسی نوعیت کی آہنی جالیاں تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق میں اس کمرے میں پہنچ گیا تھا جہاں سے اس کی آواز گونجی تھی۔

میں نے مکمل میں لپٹی ہوئی عورت کو گرن کی نال سے چھو کر متوجہ کیا اور پوچھا۔ ”اسے لڑکی! کیا تم حیدر خان کی بیٹی اس ہو؟“

مکمل میں حرکت پیدا ہوئی۔ پھر اس کی کمزوری آواز سنائی دی۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ میں اس نہیں ہوں۔ میرا کسی حیدر خان سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔“

میں نے اس کی آواز پہچان لی۔ وہ شرم کے بارے چہرے کے ساتھ ساتھ اپنے نام و نسب کو بھی چھپا رہی تھی۔ میں نے قطعی انداز میں سر ہلایا اور برکت سچ کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کی کٹی پر گرن کی نال رکھی اور فیصلہ کن انداز

میں کہا۔ ”دیکھو برکت سچ! مجھے تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور تمہیں مار کر مجھے کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے زندگی کا چانس دیتا ہوں۔ تم اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو جو کچھ جانے ہو، سچ سچ بتا دو ورنہ تمہاری کھال اوھیز کر رکھ دوں گا۔“

”مم۔۔۔۔۔ مجھے مت مارو۔ تم جو پوچھو گے، بتا دوں گا۔“ اس کی حالت غیر ہو گئی۔ ”میں نے پہلے بھی کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“

”یہاں پر یارن خان کا قریبی آدمی کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ کون زیادہ وقت خان کے ساتھ گزارا ہے۔“

”مم۔۔۔۔۔ میں!“ اس نے حقوٹ نکلا اور چھاتی پر ہاتھ رکھ کر ترجم طلب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

”پھر تمہیں علم ہوگا کہ یارن خان نے بیٹ خیر پور سے ایک عورت اور بچے کو بھردا بھیجے کے ڈریلے اٹھوایا تھا۔“ میں خرایا۔ ”بتاؤ! خان نے انہیں کہاں رکھا ہوا ہے؟“

اس کی آنکھوں سے ایسا تاثر مترشح ہوا جیسے وہ سمجھ گیا ہو کہ اس ساری مارا ماری کا محرک کیا ہے، بولا۔ ”اوہ۔۔۔۔۔ اچھا! یہ تو میں جانتا ہوں۔ ان دونوں کو پرویز اور فیقا بچن سے وصول کر کے لائے تھے۔ خان کے حکم پر پرویز نے انہیں سائیکس ٹورن آغا کے پاس پہنچا دیا تھا۔“

میری حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ ”ٹورن آغا؟ کیا تم سائیکس جگ جیت کے دربار کے گدی نشین کی بات کر رہے ہو؟“

اس نے حقوٹ نکلا۔ ”ہاں! مجھے یقین ہے کہ وہ ابھی تک سائیکس آغا کے پاس ہی ہیں۔ کہاں؟ میں نہیں جانتا۔“

”خان نے انہیں کیوں اغوا کرایا ہے؟“

”اس بڑھوی کی بیٹی ملتان میں رہتی ہے۔ خان جی کا اس سے کوئی معاملہ چل رہا ہے۔“

”کیا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”خان جی نے دو تین مرتبہ میرے سامنے فون پر اس سے بات کی تھی۔ اسے لاہور میں بلایا تھا مگر میرا خیال ہے کہ اس نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔“

”تم جانتے ہو کہ خان نے اُسے کیوں بلایا تھا؟“

”نہیں! شاید خان جی کا اس پر دل آیا ہوا ہے۔“

”تو اس پر ہاتھ ڈالتا۔“ میں نے پھنکار کر کہا۔ ”ان معصوموں کو اُٹھانا کہاں کی مردانگی ہے؟“

”خان جی کہتے ہیں کہ وہ چٹجی چٹلی ہے۔ آسانی سے ہاتھ آنے والی نہیں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا اور خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ ”نہیں برکت سچ! کوئی اتنی معمولی بات پر اتنا بڑا جرم نہیں کرتا۔“

”یہ خان جی کے لیے معمولی بات نہیں ہے کہ وہ کسی کو بلا لیں اور وہ آنے سے انکار کر دے۔“ وہ بولا۔

”خان اس وقت کہاں ہوگا؟“

اس نے بے بسی سے کندھے اُچکائے۔ ”خداوند جانتے ہیں، مجھے نہیں علم۔“ میرا یقین کرو۔“

”یہ کیسے خان کے ہاتھ لگ گئی؟“ میرا اشارہ اس کی طرف تھا۔

”اسے خان نے لاہور کے ایک بڑے سیاست دان کے خفیہ اڈے سے اپنے آدمیوں کو بھیج کر نکلوایا تھا، بڑی مشکل سے۔ سنا تھا کہ بڑی مارا ماری ہوئی تھی۔“

”مگر کیوں؟“

اس نے جواب مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ”حق انسان! تہ خانہ دیکھ چکے ہو، خان جی کی موجودگی کی خبر پا چکے ہو اور اس سیکم بدن حسینہ کو برہنہ حالت میں بھی دیکھ چکے ہو۔۔۔۔۔ پھر بھی پوچھتے ہو کہ کیوں؟“ منہ سے کچھ نہ بولا۔

میں نے طویل سانس حلق میں اُتاری اور پوچھا۔ ”کیا اس کے باپ کو علم ہے کہ یہ یہاں ہے؟“

”سر دار حیدر خان کو اس کا علم نہیں ہے۔“ اس نے باوقوف انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

”یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟“ میں نے روانی میں پوچھا۔

”ہے تو سبھی، جس سے خان جی نکلے ہیں مگر مجھے نہیں معلوم۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

”آخری سوال۔۔۔۔۔ یارن خان کیا کرتا ہے؟ میرا پوچھنے کا مطلب ہے کہ زمیندار سے کے علاوہ۔“

اس نے ابھمن زدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ بادشاہ ہیں۔ ان کی زبان بلی ہے اور دنیا ادھر کی ادھر ہو جاتی ہے۔“

”ہیلیاں نہ بھجواؤ کھل کر بات کرو۔“ میں نے درشت رویہ اختیار کیا۔

”وہ۔۔۔۔۔ بہت تیز دماغ رکھتے ہیں۔ بادشاہ مگر ہیں۔ بڑی سیاسی پارٹیاں ان کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔ چاہیں تو کسی کو بھردنا دیں، چاہیں تو بڑو۔“ اس کی آواز بتدریج مدہم ہونے لگی۔ ”وہ اسلئے کاروبار بھی کرتے ہیں، ممنوعہ ڈرگز کا

بھی۔۔۔۔۔ اور بہت سے ایسے کام جن کا مجھے علم نہیں ہے۔“

میں نے اُس سے یارن خان کے بارے چند نئی نوعیت کے سوال کیے۔ وہ سب کچھ بتانے کے بعد رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو، میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ جو تم نے پوچھا، ٹھیک ٹھیک جواب دیا۔ اب تم اپنا وعدہ پورا کرو۔“

میرا کام ختم ہو گیا تھا اور مجھے یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہیے تھا۔ باہر کیسے حالات میرے منتظر تھے، اندازہ نہیں تھا۔ میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا کہ اس کا کیا کیا کروں؟ اسے اپنے ساتھ لے جاؤں۔۔۔۔۔ یا جنسی رندے یارن خان کے رحم و کرم پر چھوڑ جاؤں؟۔۔۔۔۔ پہلی سوچ دل کو لگی اور میں نے اُسے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بلند آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ”اسے لڑکی! تمہارا لباس کہاں ہے؟“

اس کی مدہم سی آواز سنائی دی۔ ”پپ۔۔۔۔۔ پتا نہیں۔۔۔۔۔“

”مکمل میں لپٹے رہ کر اٹھو اور کپڑے پہنو۔ جلدی کرو۔“

میری توقع کے برعکس وہ کرب آمیز انداز میں چیخنے۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔“

اگر مجھ پر کوئی احسان کرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی مار دو۔“

تاسف اور دکھ سے میرا دل بھر گیا۔ میں نے کہا۔ ”ڈرو نہیں، میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔“

”کہاناں! مجھے کہیں نہیں جانا۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“

اس کی آواز میں ہسٹریائی تاثر شامل ہو گیا۔

ایسے ہی وقت میں وینٹیلیشن والی جالیوں کے راستے گزر کر آتی ہوئی تیز آواز کانوں پر پڑی۔ ”تم لوگوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ پولیس کی بھاری نفری نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ اگر تم لوگ زندگی چاہتے ہو تو فی الفور ہتھیار پھینک کر، ہاتھ سروس پر رکھے حویلی کے مین گیٹ سے باہر آ جاؤ۔ تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو قاتون کے حوالے کرو۔“

میرا دماغ ہچکچاتا اٹھا۔ کم بخت یارن خان واقعتاً حویلی سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس نے اپنا رسوخ استعمال کرتے ہوئے پولیس کو بلوایا تھا۔ یارن خان اور پولیس والوں کو علم نہیں تھا کہ حویلی میں کشت و خون کا بازار گرمانے والا اکیلا تھا یا ایک سے زیادہ۔ انہوں نے اپنے طور پر اندازہ لگایا ہوگا کہ کئی حملہ آور حویلی میں موجود تھے۔

میں چوہے دان میں پھنس گیا تھا۔ میں نے دانت پیسے

اور چاہا کہ برکت مسیح کی چھاتی میں گولی اُتار دوں، وہ جلدی سے ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”نہیں نہیں! مجھے مت مارو۔ میں تمہیں پولیس کے کچرے سے نکال سکتا ہوں۔ مجھے مت مارو۔“ میں ٹرانسگر واپس دباتے دباتے رک گیا۔ غیر معمولی جلالت میں بولا۔ ”اوکے! اگر تم مجھے دھوکا دو گے تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ چلو! اسے اٹھاؤ۔“

میں نے اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں نے ہاتھ اٹھا کر دھوکا دیا اور جلدی سے وارڈروب کی طرف بڑھا۔ وارڈروب میں دو تین لباس دکھائی دیے۔ ایک بیٹنگ کھینچ لیا اور تیزی سے پٹا۔ دیکھا کہ برکت مسیح نے اس کو مکمل میں سے نکال کر کاغذ سے پر ڈال لیا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں بارہی کی اور اس کی گرفت سے نکلنا چاہ رہی تھی۔

چھپی ہوئی چیز پر اسرار ہوتی ہے۔ اسرار چشم طلب کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ محل کر جب آدھا چھپا ہوتا ہے، آدھا دکھاتا ہے تو دل کو اپنے سر میں جکڑ لیتا ہے۔ حادثاتی طور پر، خود ستائی کے جذبے سے معمور ہو کر ان خود اپنے ہی خول سے باہر آتا ہے تو بے توقیر ہو جاتا ہے۔ لباس کا خول انسان کو پر اسرار بناتا ہے۔ میں نے لمحہ بھر کے لیے غیر اختیاری طور پر دیکھا پھر آنکھیں پھیر لیں اور درشت لہجے میں کہا۔ ”میرے لیے پریشانی کا سبب نہ بنو اسامہ..... میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور تمہیں یہاں سے نکالنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہاری مرضی ہوگی تو اپنے گھر چل جانا۔ اگر تمہارے جانا چاہا تو جہاں بھی کوئی پہنچا دوں گا۔“

اس نے سر اٹھایا۔ مجھے دھشت زدہ نظروں سے دیکھا اور چیخی۔ ”میرا کوئی خیر خواہ نہیں ہے۔ چھوڑ دو مجھے۔“ میں نے قدم بڑھایا۔ اس کے بال مسی میں جکڑ لیے اور غرا کر کہا۔ ”اپنی زبان بند رکھو اور مسیح کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو ورنہ اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈیو گی۔“

ایسے میں ہماری نظریں ایک پل کو ٹکرائیں۔ اس کی آنکھوں میں جاگزیں دھشت نہایت دلدرد تھی۔ ڈرنے اس کی قوت فیصلہ ختم کردی اور کمزوری مزاحمت بھی دم توڑ گئی۔ یا شاید اس نے تغیر یافتہ حالات کے خوف کے مارے مفاہمت کر لی تھی۔

مجھے اس پر بے تحاشا ترس آیا۔ اس کا گلاب چہرہ مکالمایا ہوا تھا۔ تاب و نمکنت سب رخصت ہو چکی تھیں اور وہ بھی ہوئی ہرنی کی طرح مجھے دیکھ رہی تھی۔ شکاری ایک سے ہوتے ہیں۔ کوئی بڑا کوئی چھوٹا مگر کوئی پانی نہیں پلاتا۔ اس کی نظروں میں، میں بھی شکاری تھا۔ میں اسے پرہیزہ حالت میں

باہر نہیں لے جانا چاہتا تھا مگر وقت کی کمی کے باعث میں نے یہ تردید آنے والے وقت پر ڈالا اور برکت کو چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے آگے آگے چلتا ہوا کمرے سے نکل کر گیلری میں آیا۔ چند لمحوں بعد ہم ہشت پہادی کمرے میں تھے۔

برکت نے حسرت کناں نظروں سے اپنے مردہ ساتھیوں کو دیکھا اور خون آلود فرش پر احتیاط سے پاؤں رکھے ہوئے، لاشوں کو چھلا کر ایک دیوار کے سامنے جاڑا بولا۔ ”دامیں جانب والی کرسی پر بیٹھ کر کرسی کو پیچھے دھکیلو۔“ میں اس پر آنکھیں بند کر کے اعتماد میں کر سکتا تھا کیونکہ یارن خان کے اس طلسم کدے میں کوئی بھی واقعہ رونما ہو سکتا تھا۔ میں کرسی سمیت کسی اندھی گیم میں کر سکتا تھا۔ مگر اس کی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ بھی میں نے اسے نشانے پر رکھتے ہوئے عمل کیا۔ میرے وزن سے کرسی غیر روایتی انداز میں ایک انچ تک نیچے ڈب گئی۔ اگر میں محتاط نہ ہوتا تو مجھے کرسی کی یہ حرکت بالکل محسوس نہ ہوتی۔ جو بنی میں نے بیروں کی مدد سے کرسی کو پیچھے دھکیلا، میرے کانوں میں ”کنک“ کی ہلکی سی آواز کوئی۔ برکت مسیح نے اس کا کاندھے سے اُتار کر کھڑا کیا اور دونوں ہاتھوں کو دیوار پر رکھ کر پوری قوت سے دھکیلا۔ مجھے حیرانی ہوئی جب پوری دیوار دروازے کی طرح اندر کی طرف کھلتی گئی۔ ہر دیوار کے کھلنے کا انداز جدا گانہ تھا۔ یہ نہ خاندانہ تعمیر کی اور انسانی نفسیات پر دسترس کا بلاشبہ بہترین اظہار تھا۔

اس دیوار کے ساتھ لگ کر، آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی تھی اور واضح طور پر کانپ رہی تھی۔ برکت کے ہاتھ کے اشارے پر میں فوری طور پر لاشیں پھلانگتا ہوا ان کے قریب آیا۔ جب ہم تینوں نے خلا جو رکھ لیا تو برکت مسیح نے دیوار کو دھکیل کر ”کنک“ کی آواز کے ساتھ اپنی جگہ پر فٹ کر دیا۔ سرنگ میں یک نیت اندھیرا چھا گیا۔

برکت کی زانہ آواز کوئی۔ ”جلدی چلو..... یہ سرنگ ہمیں یہاں سے کافی دور لے جائے گی۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے جوتے اُتار دیے۔ مجھے بھی جوتے اُتارنے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چاہتا تھا کہ ہم کوئی آہٹ پیدا کئے بغیر یہ سرنگ نما راستہ طے کریں۔ موہوم سا خوف دل کو لاحق تھا کہ وہ مجھے کسی پتھر سے میں پھنسانے نہ مگر زندہ رہنے کے لیے اتنا خطرہ مول لینے میں ہرج نہیں تھا۔ میں نے جوتے اُتار دیے اور سڑکا آواز کا دیا۔ اس تنگ سی سرنگ میں نہ صرف اندھیرا تھا بلکہ بہت زیادہ سردی، جس اور سیکن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے

ہاتھ لہرایا۔ اس کا بازو میری گرفت میں آ گیا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔ میں نے آگے چلتے ہوئے برکت کو مخاطب کرتے ہوئے نہایت مدہم آواز میں پوچھا۔ ”برکت مسیح! یہ سرنگ کتنی لمبی ہے؟“

اس نے سرگوشی کی۔ ”مجھے علم نہیں کیونکہ پہلی مرتبہ اس میں داخل ہوا ہوں۔ کوئی آدھ میل لمبی تو ہوگی ہی۔“

”کیا یارن خان اسی سرنگ سے نکلا تھا؟“

”نہیں۔ وہ کسی اور سرنگ سے گئے ہوں گے۔ ادھر آتے تو میری نظروں میں ضرور آتے۔“ اس نے کہا۔ مجھے اس پر ایک ڈرا بھر ہوا۔ اس کیونکہ سرنگ کے اندھیرے کا فائدہ اٹھانے کی اس نے کوشش نہیں کی تھی۔ ہم بھاگنے کے سے انداز میں چل رہے تھے۔ سرنگ میں کوئی موڑ نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ہم خان کی حویلی کی چہار دیواری عبور کر چکے تھے۔

اچانک اسازگ گئی۔ مجھے بھی ناچار رکنا پڑا۔ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”کپڑے مجھے دے دو۔ یہیں پہن جاتی ہوں۔“

میں نے اس کی بات ماننے میں کوئی ہرج نہ سمجھتے ہوئے برکت کو آواز دے کر روک لیا۔ وہ بولا۔ ”جلدی نکلو۔ یہ نہ ہو کہ خان جی پولیس کو اس سرنگ کے بارے میں یا اس کے دہانے کے بارے میں بتا دیں۔ میری تو خیر ہے تم مارے جاؤ گے۔“

میں نے کہا۔ ”چند لمحوں سے فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے کہا اور بیٹنگ کر اس کا ہاتھ دیا، کہا۔ ”اسامہ جلدی سے پہن لو۔“

چند لمحوں تک سرنگ میں پڑوں کے سرسرانے کی آواز کو بجتی رہی۔ پھر اس کی آواز سنائی دی۔ ”چلو.....“

سفر ایک مرتبہ پھر جاری ہو گیا۔ اب ہم تینوں ایک قطار میں چل رہے تھے۔ اسامہ میرے اور برکت کے درمیان تھی۔ سرنگ میں جس بتدریج بڑھتا جاتا تھا جس کی وجہ سے میرا سر درد کرنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے آب تب میں تے آجائے گی۔ کان لگانے کے باوجود کوئی آواز سنائی نہیں دی تو لگا کہ یہ سرنگ ساؤنڈ پروف تھی یا ہم دور آگئے تھے۔ کوئی پانچ سات منٹ متواتر چلنے کے بعد برکت مسیح رک گیا۔ اسامہ اس سے ٹکرائی، میں اسامہ سے۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

وہ بولا۔ ”ہم سرنگ کے دہانے پر پہنچنے والے ہیں۔ میں ایک بار پھر تمہیں تمہارا وعدہ یاد دلانا ہوں۔ سرنگ سے نکلنے ہی تم دونوں اپنی راہ پکڑو گے، میں اپنی۔ تم مجھے کوئی ٹھکانا مارو گے۔ کیا تم اس وعدے پر قائم ہو؟“

اس کی آواز میں خوف اور اعتماد کی کاغذ غالب تھا۔ میں نے کہا۔ ”برکت! تم نے میری ڈیمانڈ پوری کی ہے۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ اپنے وعدے پر قائم ہوں کہ تمہیں نہیں ماروں گا۔“

اس نے بڑبڑاتے ہوئے ”خداوند! میری مدد کر.....“ کہا اور خاموش ہو گیا۔ چند گھنٹوں خاموشی میں گزر گئیں۔ میں نے پریشانی سے پوچھا۔ ”کیا کر رہے ہو برکت مسیح؟“

”ڈھکن کھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ وہ بولا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ شاید اندھیرے میں کچھ ٹپوٹ رہا تھا۔ اُسے مطلوبہ تاب یا یوٹر نہیں مل رہا تھا۔ دیر ہو رہی تھی۔ لمحہ میرے اعصاب پر گراں گزر رہا تھا۔ مجھ پر جھجھکات سوار ہونے لگی۔ ایسے ہی وقت میں اس کی آواز خاصے فاصلے سے ابھری۔ ”آگے آ جاؤ..... ادھر میرے پیچھے پیچھے۔ ادھر موڑنی ہے، خیال رکھنا۔“

میں نے اس کا ہاتھ آگے کی طرف پھیرا کر چلنے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم موڑ کر نسبتاً تنگ جگہ پر پہنچ گئے۔ ہم سے چند قدموں کی دوری پر برکت کی آواز ابھری۔ ”چلے آؤ۔ ادھر چھوٹی سی سیڑھی ہے۔ سیڑھی چڑھ کر اوپر آ جانا اور سرنگ سے نکلنے کے بعد ڈھکن رکھ دینا۔“

جونہی میں نے اس کے بعد سیڑھی پر پاؤں رکھا، اچانک اندھیرے کا تسلط ٹوٹ گیا مگر ہاتھ کو ہاتھ پھر بھی سمجھائی نہیں دیتا تھا۔ پانچ سات زینوں والی سیڑھی کا اختتام ایک کول ڈھکن دار دہانے پر ہوا جسے برکت مسیح نے ٹپوٹ کر کھولا تھا۔ جونہی میں اس کو لیے باہر نکلا، مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ پچھپھڑے ایک دم پھول گئے۔ میں نے چند زور زور کی سانسیں لیں۔ یوں لگا جیسے موت کی پگھلا سے نکال کر میں زندگی کے شاداب راستے پر اچانک گامزن ہو گیا تھا۔ سرنگ کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکلنے پر دھندلی چاندنی بھی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی تھی۔

سرنگ کا دہانہ ایک چھوٹی سی گھنی اور خاردار جھٹکی میں کھلا تھا۔ ایسی کئی جھٹکیاں نور پور کے قریب سے گزرتی ہوئی نہر پر موجود تھیں۔ میں نے برکت کی ہدایت کے مطابق بھاری ڈھکن کو کھسکا کر دہانے پر رکھ دیا۔

ایسے ہی وقت میں حویلی کی جانب سے کچی رائفل کے فائر کی تیز اور گونج دار آواز کانوں میں پڑی۔ پولیس اپنے پیشرواں نہ انداز میں مائیکروفون پر وارننگ دینے کے بعد مایوس ہوئی تھی اور اپنی دہائی ہوئی دھمکی پر عمل پیرا ہوئی تھی۔ میں نے ارد گرد دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑے جھٹکی سے

باہر آ گیا۔ بیروں میں کئی کانٹے اور سوکھی ٹہنیاں چھیں۔ اتفاق سے اس محفوظ طرعی کمی کیونکہ اس کے طلق سے کوئی سسکی نہیں نکلی تھی۔ جھنگی کے باہر کہیں برکت صبح دکھائی نہیں دیا تو میں نے تیز سرکوشی میں پکارا۔ ”برکت صبح! تم کہاں ہو؟“

اس نے جواب نہیں دیا۔ میں نے دو تین مرتبہ آواز دی مگر جواب نہاد۔ سمجھ میں آیا کہ اس نے موفتے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، مجھ پر اعتماد نہ کرتے ہوئے بھاگ نکلنے یا چھپ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ چونکہ میں نے اسے نہ مارنے کا تہیہ کیا ہوا تھا، اس لیے میرے بولوں پر بے معافی مسکراہٹ ابھری اور میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

وہ سب سے پہلے میں بولی۔ ”اب کیا ہوگا؟“

شاید برکت کے غائب ہونے پر اس کے دماغ میں یہ خوف بیٹھ گیا تھا کہ اس کے بغیر ہم آگے نہیں جا سکیں گے۔ میں نے کہا۔ ”اسے جانا ہی تھا، سو چلا گیا۔ چلو! ہمیں جلد از جلد کسی محفوظ جگہ پر پہنچنا ہے۔“

وہ بولی۔ ”تم کون ہو اور مجھے وہاں سے کیوں نکال کر لائے ہو؟“ وہ اپنا بازو چھڑائے بغیر بولی۔

”بتا دوں گا..... سب کچھ بتا دوں گا۔ تھوڑا صبر کرو۔“

میں نے کہا۔ میں اس دوران ماحول کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ ہم نور پور کی مغربی جانب سے گزرتی ہوئی نہر کی پٹری کے بالکل قریب کھڑے تھے۔ اگر اسامیرے ساتھ نہ ہوتی تو میں ایک لمبا پیکل کاٹ کر سامیں جگ جیت شاہ کے مزار کی طرف بڑھ جاتا اور پولیس کے جاتے ہی سامیں نورن آغا پر دھاوا بول دیتا۔ اب وہ میرے ساتھ تھی۔ اسے کسی محفوظ جگہ پر پہنچانا ضروری تھا ورنہ بعید نہ تھا کہ اسے نور پور کے کتے آڈیوڑ دیتے یا وہ پھر سردار یارن خان کے ہتھے چڑھ جاتی۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔

میں نے کہا۔ ”اسا! کیا تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم کہاں جاؤ گی؟“

اجانک فضا لگا تار فائرنگ کی خوف ناک آواز سے لرز اُٹھی۔ لگتا تھا کہ پولیس نے اپنا سارا زور نظر نہ آنے والے خطر ناک ڈاکوؤں کو مار ڈالنے پر صرف کر دیا تھا۔ اسانے شاید میری بات سنی ہی نہیں تھی کیونکہ اس نے اپنے دونوں کانوں پر تختی سے ہاتھ بجا رکھے تھے۔

اس علاقے کا چچا چچا میرا اچھی طرح دیکھا بھلا تھا۔ ذہن پر زور دیا تو مجھے سوچھ گیا کہ نہر کی پٹری پر چلتے ہوئے فر لاک۔ سے بھی تم فاصلے پر نور پور چوک والی پلی سڑک کو عبور کر۔ اور چار اکیڑ کے فاصلے پر رہے ہوئے نور پور کے

قدیمی قبرستان میں پہنچ سکتے تھے جہاں ہمارے چھپنے کی کافی جگہیں موجود تھیں۔ دو تین بوڑھے برگد، خانزادوں کے دو کشادہ مقبرے اور کئی گھنی بھتکیاں ہمیں یہ آسانی پولیس کی نظروں سے چھپا سکتی تھیں۔ میں نے ادھر کا قصد کیا۔ اساتیر نہیں چل سکتی تھی مگر میرے ساتھ کھینچی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ اس کی سانسیں بھی پھول گئی تھیں۔ جو میں نے دونوں اطراف، احتیاط سے دیکھ بھال کر سڑک عبور کی، حویلی سے گونجنے والی فائرنگ ختم تھی۔ پولیس والے مایوس ہو گئے تھے، سرکاری ایمونیشن کا خاتمہ بائیس ہو گیا تھا یا برکت صبح نے واپس پہنچ کر مطلع کر دیا تھا کہ میدان خالی ہو چکا تھا۔

اسا پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔ ”یہ کون سا علاقہ ہے؟“ میں چونکا۔ اس کے بے ساختہ سوال نے عقدہ کھولا کہ اسے علم ہی نہیں تھا کہ یارن خان نے اسے اپنی نور پور والی حویلی میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ”یہ تمہارا اپنا علاقہ ہے۔“ وہ ٹھٹک گئی بولی۔ ”کیا مطلب؟ کہا میں.....“

میں نے بات کاٹی۔ ”ز کے بغیر چلتی رہو۔ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر بتا دوں۔“ وہ خاموشی سے چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد ہم کانٹے دار جھاڑیوں اور قبروں سے بچ بچا کر گزرتے ہوئے سردار حیات خان کے خاندانی مقبرے میں پہنچ گئے۔ باہر جیت ہوا بدن چیری تھی۔ اندر کا ماحول قدرے گرم تھا۔ کھک کی سانس آئی۔ یہ چودہ فٹ کا مربعی کمر تھا جس میں اوپر کے ہاتھ تین جبکہ دروازے کی جانب دو پختہ قبریں تھیں۔ قبروں پر سنگ مرمر لگا ہوا تھا۔ اس کندہ والے مقبرے کی مغربی جانب والی کھڑکی سے چاندنی چمن کر اندر آ رہی تھی جس کی وجہ سے ہم نہ صرف قبروں کو بلکہ ایک دوسرے کے ہولائے ہوئے جسموں کو بھی دیکھ سکتے تھے۔ ہم ایک جگہ بیٹھ گئے۔ میں بولا۔ ”ہم اطمینان سے کچھ وقت یہاں گزار سکتے ہیں، باتیں کر سکتے ہیں۔“

وہ خوف اور سردی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اس قبرستان میں باہر کی چیزیں نہیں ہوتیں؟“ قبرستان کو مقامی لوگ ”قبر گستان“ کہتے تھے۔ باہر کی چیزوں سے اس کی مراد جن بھوت تھے۔ میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

میرا جی تو چاہا کہ اُسے بتاؤں کہ اس قبرستان میں میرا دیوانے اور کھالے کا بچپن اور لڑکپن، ”لگن مٹی“ اور چھپن چھپائی، کھینچے گز رہے..... یہاں ہم رات گئے تک بیٹھ کر

باتیں کیا کرتے تھے اور ایک ایک درخت پر چڑھ کر نور پور کا فضا کی نظارہ کیا کرتے تھے۔ لوگوں کا عام خیال تھا کہ اس قبرستان میں ناویدہ مخلوقات اور پھل پیریاں رہتی ہیں۔ لوگوں کا خوف بلا جواز اور سنی سیاتی باتوں کا تخلیق یافتہ تھا۔

زمین نے اپنی تمام تر تخیلی میرے نئے بیروں میں اتار دی تھی۔ شکر تھا کہ کوئی بڑا کانٹا یا کالج کا گلزار بیروں تلے نہیں آیا تھا ورنہ بہت گڑبڑ ہو جاتی۔ البتہ میری پنڈلی اور بازو میں تیز درد ہو رہا تھا۔ کس کر باندھی ہوئی میز پوش کی پیوں کی وجہ سے بازو اور پیر کے دوران خون میں بھی گڑبڑ پیدا ہو چکی تھی۔ حویلی میں گزرنے والے قیامت آگئیں لجات میں مجھے اپنے زخموں اور زیادہ کس کر بندھی ہوئی پٹی کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ اطمینان کی چند گھڑیاں نصیب ہوئیں تو میں نے جھک کر پنڈلی کی پٹی کھول دی۔ ایک تخت پاؤں میں پھر کا ہو گیا اور کتے کے دانتوں کے زخموں سے تپیں اٹھنے لگیں۔

میری سسکیں کر اسامولی۔ ”کیا یہاں گولی لگی ہے؟“ اس کی آواز جذبات سے عاری تھی۔

”نہیں! خان کے راھوئیں (پانٹو) کتوں نے کاٹا ہے۔“ میں نے بتایا۔ چاند کی ناکافی روشنی میں زخموں کو دیکھنے کی کوشش عبت تھی۔ اس لیے میں نے شخص ہاتھوں سے ٹٹول کر خون کے بہاؤ کا اندازہ کیا۔ تسلی ہوئی کہ جیسے ہوئے خون نے تازہ خون کا راستہ سدود کر دیا تھا۔ حوصلہ ہوا تو میں نے بازو کی پٹی بھی کھول دی۔

اسا بغور گرم تپ دلی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ چپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”تم مجھے کیوں ادھر لائے ہو؟“

میں نے سر اٹھایا اُسے دیکھا۔ چاند کی مدھم روشنی اس کے چلے دھڑ پر پڑ رہی تھی۔ اس نے پھول دار فیروز کی کرت اور پیچنگ شوار پٹی تھی۔ دوپٹا نہیں تھا۔ اندر میرے میں اس کے خدو خال اور رنگت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے بہدر انداز انداز میں جواب دیا۔ ”اسا! مجھے تم سے کچھ لینا دینا نہیں۔ میں اپنے آدمیوں کی تلاش میں حویلی گیا تھا۔ وہ نہیں ملے، تم نظر آ گئیں۔ سو جا تمہیں اس غیبت کی قید سے آزاد کرانے کا ثواب حاصل کر لوں۔ بھلا یا برا؟ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔“

اسے میرا بے پروا جواب عجیب لگا۔ الجھ کر مستفسر ہوئی۔ ”تم یہ کیوں نہیں بتاتے ہو کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں تمہاری آواز پہلے بھی نہیں سنی ہے۔“

میں ہنگامی حالت سے سرس پرکار ہونے کے سبب بھول گیا تھا کہ میں مسلسل اپنے اصل لب و لہجے میں بولتا چلا آ رہا تھا۔ میرا گیت آپ اور تھا، میرا لہجہ اور۔ میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے، تم نے مجھے کہیں بولتے سنا ہو۔ ویسے بھی دنیا میں ان گنت لوگوں کی آوازیں ملتی جلتی ہیں۔“

وہ بولی۔ ”نہیں..... میں نے تمہیں پہلے بھی نہیں دیکھا۔ تم شکل سے پٹھان لگتے ہو جبکہ ٹھیکہ سرائیکی بولتے ہو۔ سچی مجھے عجیب سے لگتے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”میں پٹھان نہیں ہوں۔ شاید ڈاڑھی اور آنکھوں کی رنگت کی وجہ سے پٹھان لگتا ہوں۔ بہر حال میری چھوڑو، اپنی کہو..... تمہیں کہاں پہنچاؤں..... گھر؟“

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ سر جھک گیا۔ بڑبڑائی۔ ”گھر.....“ پھر تھوڑے توقف کے بعد میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے سوال پوچھنے لگی۔ ”میں نے پوچھا تھا کہ یہ کون سا علاقہ ہے؟“

میں نے کہا۔ ”تمہیں جس حویلی میں یارن خان نے قید کر رکھا تھا، وہ نور پور کی مشہور حویلی تھی۔ اس حویلی کے سامنے سرکاری اسپتال واقع ہے۔ شاید تم نے دیکھا ہو؟“ میں نے ارادنا اسے یاد نہیں دلایا کہ وہ اس اسپتال میں ڈاکٹر شاہ جی کے پاس بیماری کی حالت میں لائی گئی تھی۔ ”اور جہاں ہم بیٹھے ہیں، یہ نور پور کا قدیمی قبرستان ہے۔ یہ خانزادوں کا چھوٹا مقبرہ ہے۔ بڑا اس کے عقب میں راستے کی سیدھ پر واقع ہے۔ بعید نہیں کہ یہ قبریں تمہارے باپ داداؤں کی ہوں۔“

اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ بے چین ہو گئی، بولی۔ ”نور پور؟ وہ..... تو واقعی میرا اپنا علاقہ ہے۔ قریب میں میرا گھر ہے۔ بلوچ ٹکڑ میں۔“

”میں جانتا ہوں۔ تم سردار حیدر خان کی بیٹی ہو۔“ ”تم کیسے جانتے ہو؟“

”حیدر خان کو کون نہیں جانتا۔ اسمبلی کا ممبر ہے۔ بہت بڑا زمیندار ہے۔“ میرے لہجے میں از خود ہر گل گیا کر میں نے اپنے اندر کا بہر اندیشی روک لیا۔

”تم مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“ وہ اچانک منت آمیز لہجے میں بولی۔ ”دیکھو! میں بابا سے کہہ کر تمہیں نہ صرف پولیس سے بچاؤں گی بلکہ منہ کا انعام بھی دلاؤں گی۔ پلیز!“

میرے لبوں پر نفرت آمیز مسکراہٹ تھی۔ میں نے کہا۔ ”مجھے کوئی انعام شام نہیں چاہیے۔ مگر نہ کرو، تمہیں

”ہوتا ہوگا..... تمہارا نام کیا ہے؟“

مجھے اس سوال کی توقع تھی جی جلدی سے بولا۔ ”میرا نام ظفر ہے، ظفر اقبال۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جلد از جلد اپنے بارے میں بتاؤ تاکہ میں تعین کر لوں کہ مجھے تمہارے لیے کیا کرنا ہے اور کیسے تمہیں بلوچ نگر پہنچانا ہے۔“

وہ چند لمحوں تک لب بست مجھے سختی رہی پھر لمبی سانس لے کر بولی ”ظفر! تم بہت اچھے ہو۔ تمہیں کچا اس ترغیب نہیں دیتا کیونکہ تم دوسروں کی طرح بھوکے نہیں ہو۔ میری کہانی مختصر ہے۔ مجھے ایک کتے نے اس لیے اغوا کیا کہ اُسے شبہ تھا کہ میرے بابا نے اس کی بہن کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھانے کے لیے قید کر رکھا تھا۔ تم اُس کتے کو دیکھو تو جی میری بات کا اعتبار ہی نہ کرو۔ دیکھنے میں بڑا معصوم ہے۔ اس کا نام شہر یار ہے مگر لوگ اسے ”شہر“ کہہ کر پکارتے ہیں۔ ادھر نور پور میں ہی اس کا گھر ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ اس نے درست کہا تھا مگر اس کی بہن بابا کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔“

میں نے بے اختیار اس کی بات کاٹی۔ ”جب اُس نے انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے نہیں اغوا کیا یا کرایا تو تم اُسے کتنا کس طرح کہہ سکتی ہو؟“

”کیا اُس کا انتقام مجھے بے عزت کر کے پورا ہو سکتا تھا؟ میں نے اُس کا کیا کڑا تھا؟ اگر وہ مرد تھا، غیرت مند انسان تھا تو میرے بابا کا گریبان پکڑتا۔ اُسے گلیوں میں گھسیٹتا۔ پھلے خون میں نہلا دیتا۔ میں اُسے کتا نہ کہتی۔“ اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ تازیانے کی طرح میرے دل و دماغ پر پڑ رہے تھے۔ ”ظفر! وہ بزدل کتا تھا۔ اس میں اور تم میں یہی فرق ہے کہ وہ کتا تھا، تم انسان ہو۔ اگر تم چاہو تو مجھے چند لمحوں کے عوض کئی بڑے کتے کے ہاتھ بچ سکتے ہو، جیسا کہ اُس نے کیا مگر تم مجھے کتا ہاتھ لگائے بغیر میرے گھر پہنچانے کے لیے فکر مند ہو۔ وہ ایسا نہیں تھا۔“

وہ روہاسی ہو گئی۔ کافی دیر سر جھکا کر بیٹھی رہی، پھر ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولی۔ ”اس نے اپنی مالکن کو خوش کرنے کے لیے مجھے آزاد کرانے کے بجائے ایک اور گندے کتے کے ہاتھ بچ دیا۔ یوں میں بے ہوشی کی حالت میں ملتان سے لاہور کے کسی نواحی قصبے میں پہنچا دی گئی جہاں ہر شام کو ایک بصدورت کوکرائی مجھے نہلا دھلا کر عروسی لباس پہنا کر دلہن بناتی اور رات کے اندھیرے میں میاں دلہر اپنی موچوں کو بل دیتا ہوا شیطان کی طرح آن وارو

میں اپنی زبان پر قارو رکھتا تو وہ مجھے پہچان نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ چرخانے کے پیش کردے کی روشنی میں پہچاننے میں ناکام رہی تھی۔ اس مقبرے کے کمرور اندھیرے میں کیسے پہچان سکتی تھی۔ مجھے احتیاط سے کام لینا تھا کیونکہ وہ مجھ پر کسی حد تک اعتماد کرنے کی کئی جگہ ”شہر یار“ سے شدید نفرت کرتی تھی اور اسے بھولی صورت والا کتا قرار دیتی تھی۔

اس سے زیادہ انتظار نہیں ہو پایا، بولی۔ ”بچ بولنے کے لیے سوچنا نہیں پڑتا۔ جھوٹ بولنے کے لیے دماغ میں کڑیاں جوڑنی پڑتی ہیں۔ میں مصیبت میں ہوں۔ عورت ذات ہوں۔ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ پھر میں تم بچ بولنے سے ڈرتے ہوں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں کیا بتاؤں؟ میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔ کریمنل لائف گزارتا ہوں۔ چھوٹی موٹی وارداتیں کرتا ہوں۔“ میں نے اپنے انداز میں بے ساختگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”تمہیں ایک دوسرے ملتان میں دیکھا تھا۔ تب میں یونیورسٹی میں پڑھا کرتا تھا۔ تم پہلی نظر میں مجھے اچھی لگی تھیں اس لیے تمہاری کھوج میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ تم سے محبت کرنے لگا تھا مگر جب پتا چلا تھا کہ تم بہت بڑے آدمی کی بیٹی ہو تو ڈر کر پیچھے ہٹ گیا کیونکہ غریب آدمی دیکھنے کے جرم میں پکڑا جاتا ہے۔ چاہنے کے جرم میں مارا جاتا ہے۔ اس علاقے میں اکثر آتا جاتا رہتا ہوں۔ اس لیے گلی کوچوں سے آگاہ ہوں۔ تمہارے باپ کے رب اور بد بے کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا جی تمہیں دیکھ کر منہ پھیر لیتا تھا اور اپنی محبت کو نکھلیاں دے کر سلا دیتا تھا۔“

وہ مزاحم ہو گئی۔ ”ہونہہ..... محبت! یہ بکواس ہے۔ مگر میں نے یہ تو نہیں پوچھا تھا؟“

”ہاں! تم نے یہ پوچھا تھا کہ جن لوگوں کو یارن خان نے اپنی قید میں رکھا ہوا ہے، وہ کون ہیں؟ بتاتا ہوں۔ وہ میرے کچھ نہیں لگتے۔ میرے ایک بھائی بند کے سنگے ہیں۔ ایک ماں ہے، دوسرا بھائی۔“

اس نفی میں سر ہلا یا اور باپوسی آمیز لہجے میں بولی۔ ”نہیں..... یہ کہانی جھوٹ پر مبنی ہے۔ سادہ سی بات ہے کہ کوئی اپنے کو لیک کے لیے اتنا تر دوئیں کرتا۔“

مجھے ایک ڈاڑھرا مندی ہوئی، کہا۔ ”وہ میرے کام آتا ہے اور میں اس کے۔ میں جس دنیا میں سانس لیتا ہوں، اس میں میوچل سسٹم کے تحت لین دین ہوتا ہے۔“

وہ مطمئن ہوئی یا نہیں، کدھے جھک کر بولی۔

کے پلے باندھ دیا جائے گا..... ہائے میں کیا کروں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ میں کہاں جاؤں؟..... بلوچ نگر والے مہر چپا کر مجھ پر تھوکیں گے۔ خاموش آنکھوں کے تیروں سے میرا کلیجا چھتی کریں گے۔ ہائے! میں کیا تھی؟ مجھے قسمت نے کتنا کھٹیا اور سستا کر دیا۔“

اس کی ہمت جواب دے گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اُس کے کھنٹوں پر پڑے سر کو چھوا۔ زلفوں میں انگلیاں پھیریں۔ پیار سے سنبھالیا۔ ”دیکھو! تمہیں آخراپے گھر جانا ہے۔ آج نہیں توکل، پرسوں..... اپنے بابا اور بھائی کا سامنا تمہیں کرنا ہے۔ پھر آج ہی کیوں نہ یہ مرحلہ عبور کر لیا جائے۔ ہمت کرو تم گھر سے بھاگی ہوئی نہیں ہو، اغوا کی گئی ہو، یہ بات سارا علاقہ جانتا ہے۔“

اس نے سختی سے سر کو ادھر اُدھر پھینچا، بولی۔ ”ہاں! تم شہیک کہتے ہو مگر میں تو کہیں کی نہیں رہی ناں۔ پڑجی ہوگا، دیکھا جائے گا۔ میں اپنی ماں کے لیے موبھی (آداس) ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے بابا اور بھائی کو دیکھے صدیاں گزر گئی ہوں۔ بس تم مجھے میرے گھر پہنچا دو۔“

میں نے کہا۔ ”اوکے! فکر نہ کرو، رورو کرو خود کو پکان نہ کرو اور اگر ممکن ہو تو مجھے اپنے بارے میں بتاؤ کہ تمہیں کس نے اغوا کیا تھا اور اس حال تک کیسے پہنچیں؟“

اس کے بولنے سے پہلے نور پور کی جانب سے گاڑیوں کے انجنوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے اُسے بولنے سے روک دیا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑیاں فرارے بھرتی ہوئی نور پور کی حدود سے نکل گئیں۔ قبرستان سڑک سے ڈراہٹ کروائے تھا اس لیے میں نے مقبرے سے نکل کر سڑک کی جانب دیکھنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میں جانتا تھا کہ سوائے کسی اونچے درخت پر چڑھ کر دیکھنے کے، کسی طرح بھی سڑک اور گاڑیاں نظر نہیں آئیں گی۔ میرے اندازے کے مطابق گزرنے والی گاڑیوں کی تعداد تین تھی مگر یہ طے نہیں کیا جاسکتا تھا کہ یہ پولیس کی گاڑیاں تھیں یا غیر سرکاری۔

نور پور کی فضا شانت ہو گئی۔ روانی سکوت ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تو آہا بولی۔ ”میں کچھ نہیں بولوں گی، جب تک تم اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے۔ بولو! جس عورت اور بچے کو اس بڑے کتے نے اغوا کر لیا ہے، تمہارا اُن سے کیا تعلق ہے؟“

اس کا جیس دیکھ کر میں عجیب غریب سے پڑ گیا۔ بچ بولا تو میڈم شکیلہ کے ساتھ ساتھ میرے کردار پر بڑا ہوادیز پردہ فاش ہو جاتا۔ جھوٹ بولنا تو اسے مطمئن نہ کر پاتا۔ اگر

بلوچ نگر پہنچانے کا بندوبست کیے دیتا ہوں۔ مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ میں تمہیں سردار وریام خان کی حویلی کے دروازے پر چھوڑ دوں۔ وہ تمہیں گاڑی میں بٹھا کر بلوچ نگر پہنچا دے گا یا کارڈ لیس فون پر تمہارے باپ کو بلا لے گا۔“

اس نے بے چینی سے پھلو بدلا۔ ”نن..... نہیں..... مجھے کسی پر اعتبار نہیں رہا۔ سب دھوکے باز ہیں۔ سب بھوکے کتے ہیں۔ تم مجھے بلوچ نگر پہنچا دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم پر کوئی آج نہیں آئے گی۔“

میرے ہونٹ سمجھے۔ بات لبوں پر آئی، ان سب سے بڑا اور خوفناک تو تمہارا باپ ہے..... میں نے دل کی بات بہ وقت لبوں پر روک لی، کہا۔ ”نہیں! آسا! میرا کام ادھورا ہے۔ پولیس کے نکلنے سے مجھے بھی نور پور جانا ہے۔ بلوچ نگر جاؤں گا تو دیکھ لے جانے کا خطرہ حد سے بڑھ جائے گا۔ پولیس مجھے تلاش کرتی پھرتی ہے۔ تمہیں نور پور میں کسی شخص پر تو بھروسہ ہوگا ناں؟“

اس نے سر اٹھایا۔ بولی تو پتا چلا کہ اس کا گلارہ حادہا تھا۔ نہ جانے کب سے رونا چاہ رہی تھی۔ رونے کا موقع نہیں پارہی تھی۔ کچھ کہتے کہتے سسک پڑی اور گھنٹوں پر چہرہ رکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ میں نے اسے غبار دل نکالنے کا بھرپور موقع دیا۔

کچھ دیر بعد از خود سنبھل گئی، بولی۔ ”نہیں..... سب کتے ہیں۔ ماں کا ماں کھاتے ہیں۔ بہن کو کھنٹھوڑتے ہیں۔ بیٹی کے چہرے پر اُڑاتے ہیں۔ سب بھوکے بھیرے ہیں۔ یارن خان رشتے میں میرا چاچا لگتا ہے۔ چاچا باپ جیسا ہوتا ہے مگر وہ ناہر (بھیری یا) ہے جس نے انسانوں کی کھال اوڑھ رکھی ہے۔ اور..... اور اسی نور پور میں ایک بھولی اور معصوم صورت والا کتا بھی رہتا تھا۔ میں نے غلطی سے اُسے بھی انسان سمجھ لیا تھا مگر..... نہیں..... وہ بھی کتا کتا مے سے ہو سکے تو مجھے اسپتال میں ڈاکٹر صاحب کی کٹھی پر چھوڑ آؤ۔“

میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے مجھے ہی ”بھولی اور معصوم صورت والا کتا“ قرار دیا تھا مگر میں نے اس کے ہسٹریائی بیان سے صرف نظر کیا اور اس کے بولنے کا انتظار کیا۔ وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد ہانگوں کے سے انداز میں دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔ ”مگر نہیں..... شاید وہ بھی..... ویسا نہ ہو جیسا دھتکا ہے، تم مجھے بلوچ نگر پہنچا دو۔ مگر نہیں..... بابا مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ وہ مہر کریں گے تو بھائی مار ڈالے گا۔ اگر کسی وجہ سے مجھے زندہ رکھنے کا فیصلہ کر بھی لیا گیا تو مجھے اگلا سورج طلوع ہونے سے پہلے کسی

ہوتا۔ وہ شیطان، وہ مردود، کتا..... میرے باپ کی دوستی کی مالا جیتا تھا، قہقہے لگاتا تھا اور رات بھر مجھے باڈے لے کتے کی طرح جھنجھوڑتا رہتا تھا۔“

اس کی آواز لڑنے لگی۔ ستم رسیدگی لیوں پر جرم کر لفظوں کی راہ مسدود کرنے لگی۔ بے بسی نے اُسے نڈھال کر دیا تھا۔ توقف کے بعد اپنی ہمت بیکار کرے بولی۔ ”ظفر! سن رہے ہوں؟ میں مرنا چاہتی تھی مگر اس کیلئے نے مجھے اس طرح بے بس کر رکھا تھا کہ میں زندہ رہنے پر مجبور تھی۔ مجھے اپنی سانسوں پر بھی اختیار نہیں تھا۔ پھر ایک رات اس محل نما کوکھی پر بری بری شکلوں اور غنڈوں جیسے حلیوں والے ان گنت کتوں نے دھاوا بول دیا۔ اس رات میاں دلیر اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ اُن غنڈوں نے کوکھی میں موجود بد شکل نوکرانی اور تین پہرے داروں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا۔ میں وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتی رہی جس میں چار لاشیں تڑپ تڑپ کر خون کے چھینٹے فرش پر بار رہی تھیں۔ ہائے! کتنا وحشت ناک منظر تھا۔ کاش مجھے قسمت نے یہ سب کچھ نہ دکھایا ہوتا۔“

وہ بتاتے بتاتے جھر جھری لے کر ختم مئی۔ چند لمحوں تک آنکھیں بند کئے نفی میں سر ہلاتی رہی، پھر حوصلہ کر کے بولی۔ ”وہ غنڈے مجھے ایک بڑی دیکن میں ڈال کر لاہور شہر میں لے گئے۔ میں ایک قید سے نکل کر دوسری قید میں پہنچ گئی۔ پھر ایک شام میری نس میں کوئی دو انجینکٹ کی تھی۔ میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو گئی۔ آنکھ کھلی تو اس بڈھے کے کمرے میں تھی۔ اب تک یہی سمجھتی رہی ہوں کہ میں لاہور یا اس کے مضافات کے کسی آسپتال کمرے میں پڑی ہوں۔ آج پتا چلا کہ مجھے میرے ہی علاقے میں رکھ کر بے آبرو کیا جاتا رہا ہے۔ جبروں کی تبدیلی میرے پاس کے لیے اہم نہ رہی۔ پہلے کتے نے میری مزاحمت کی دیواریں پاش پاش کر دی تھیں۔ دوسرا ہوس کا مارا ہوا بڈھا کتا تمام دن اور رات مجھے دنگا رکھتا تھا۔ لباس نہیں پہننے دیتا تھا۔ مجھے تو یہ بھی اعزاء نہیں تھا کہ میں کسی تہ خانے میں ہوں۔ زندہ رہتے ہوئے زیر زمین تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ قبر میں مردے پر عذاب اُترتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ قبر اس تہ خانے سے کم ڈراؤنی ہوتی ہے۔ نندن کا پتا چلتا تھا، نہ رات کا۔ بے غیرت نہیں کا..... مجھے ہوس بھری نظروں سے دیکھتا رہتا، بھی بھوکے دندانوں کی طرح روندنے لگتا۔ جسم تو جسم رہا، ان دونوں کتوں نے تو میری روح بھی چھید چھید کر لوہا بن کر دی ہے۔ ظفر! ج کتی ہوں، مجھے زندہ نہیں رہنا۔ میں نے کوئی

بہت بڑا جرم کیا تھا جس کی مجھے اتنی بھیا تک سزا ملی ہے۔ کاش! میں یوں بے عزت نہ ہوئی ہوتی اور مر گئی ہوتی۔ کسی ٹرک کے نیچے آکر گیلی گئی ہوتی.....“

اس پر توحی کیفیت طاری ہونے لگی تو میں نے جلدی سے اس کی ہاتھیں پکڑیں اور جھنجھوڑ دیا، کہا۔ ”دیکھو! آج ہو گیا، سو ہو گیا۔ وقت کبھی ریزوں نہیں ہوتا۔ تم پڑھی لکھی ہو۔ امید ہے کہ سمجھانے سے سمجھ جاؤ گی۔ میں کہتا ہوں کہ انسان کی عزت کوئی شخص میں لگے بیری کے درخت جیسی نہیں ہوتی کہ کوئی آ اور کاٹ کر لے گیا۔ نہ ہی بے لباس اور بدن کے سہارے سائیں لیتی ہے۔ عزت کا تعلق تو نیت اور روح سے ہوتا ہے۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا اور یقیناً تمہارا منہ کالا نہیں ہوا۔ ہاں! میاں دلیر اور یارن خان نے اپنے چہرے ضرور کالا کیے ہیں۔ ان کی عزت ان کے اپنے ہاتھوں لٹی ہے نہ کہ تمہاری۔ کیونکہ جس بڑے عمل میں تمہاری مرضی شامل نہیں ہے، وہ تمہارے کھاتے میں نہیں ڈالا جاسکتا۔ میں پورے دلوں سے کہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ تم نے ظلم نہیں کیا اور خدا ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دیتا ہے، کسی ظالم کا نہیں۔“

اس نے سر اٹھایا اور عجیب نظروں سے گھورنے لگی، بولی۔ ”تم پڑھے لکھے ہو؟“

میں نے بظنوں میں ہاتھ دالے اور ٹھنڈی آہ بھری۔ ”ہاں! تھیں ایسی باتیں کر رہا ہوں جو عام آدمی نہیں کرتا۔ میرا مشورہ مانو، فضول خدشات سے دامن چھڑاؤ اور اپنے گھر چل جاؤ۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ تم پر کوئی انگ نہیں اٹھائے گا۔ جب تک تم کسی کو نہیں بتاؤ گی کہ میاں دلیر اور یارن خان نے تمہارے ساتھ کیا کیا، تب تک کوئی تمہیں برا نہیں کہے گا۔ ڈروں پر لگے چرے کے بدن پر دکھائی نہیں دیتے۔ تمہارے باپ کا اس علاقے میں بڑا نام اور مذہب ہے۔ سادہ لوح و بہاؤ لوگ اس بات پر یقین کریں گے جو تم کہو گی۔ اسی کہانی کو صدق دل سے مائیں گے جو تم اپنی زبان سے بیان کرو گی۔ اوکے؟“

وہ اضطراب اور دکھ کے خطرناک مرحلے سے گزر چکی تھی اس لیے حقیقت کو تسلیم کر کے حالات سے مفاہمت کی راہ پر چل پڑی اور تعلیمی اعزاز میں سر ہلا کر بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی۔ نہیں اور نہیں رہ سکتی سوائے اپنے گھر کے۔ گھر والے جو بھی سلوک کریں گے مجھے بھگتا ہوا گا۔ چلو! مجھے بلوچ نگر پہنچاؤ۔ میں نے تمہاری بات مانی۔ تم میری مانو۔ میرے ساتھ چلو۔ میں پورے یقین

سے کہتی ہوں کہ کوئی تمہارا بال بچا نہیں کر سکے گا۔“ رات بہت سرد تھی۔ مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اب تب میں بخار ہونے والا ہو۔ مجھے اپنی بے بسی اور کسپہری کی وہ رات یاد آئی جو میں نے حیدر خان کی بیٹے والی حویلی سے نکل کر مین روڈ تک گزاری تھی۔ بدن کو جھر جھری سی آگئی۔ اس کو کبھی سردی لگنے لگی تھی کیونکہ اس نے نہ صرف اپنے گھٹنے اکٹھے کر لیے تھے بلکہ دونوں ہاتھ بھی بظنوں میں دبا رکھے تھے۔

میں نے یاد دلایا۔ ”میرا کام ادھر رہا ہے۔ اُسے نئے بغیر داپس جاسکتا ہوں اور نہ جہیں بلوچ نگر پہنچا سکتا ہوں۔ تم سوچ کر بتاؤ، میں تمہیں نور پور کے کسی گھر میں پہنچا کر اپنی راہ لوں؟“

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ چند منٹ سوچتی رہی پھر فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ”ادھر..... نور پور میں..... ایک آدمی رہتا ہے۔ خالد عرف کھالا۔ یارن خان کی حویلی کے پاس ہی اس کا چھوٹا سا گھر واقع ہے۔ بس تم مجھے اس تک پہنچاؤ۔“

مجھے جھٹکا لگا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کے نزدیک بھرے نور پور میں وہی ایک قابل اعتبار شخص تھا۔ بے ساختہ دریافت کیا۔ ”کیا تم بخشوں ہار کے پتہ کی بات کر رہی ہو؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر مترّد انداز میں بولی۔ ”وہ ملتان میں تھا۔ نہ جانے کھر آ گیا ہے یا نہیں۔“

میں نے اس کی بات مان لی اور کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں اس کے گھر جاتا ہوں۔ اُسے کہتا ہوں کہ وہ کسی سواری کا انتظام کر لائے۔ تب تک تم ادھر ہی بچھی رہو۔“

وہ گھبرا گئی، جلدی سے بولی ”نہیں..... مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ وہ اس وقت مجھے بلوچ نگر نہیں پہنچا سکے گا اس لیے میں باقی رات اس کے گھر گزار لوں گی۔“

میں اسے ساتھ لے کر نور پور نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے تھا کہ اس وقت پورا نور پور جاگ رہا ہوگا۔ لوگ غلغلہ داروں کے داروں پر جمع ہوں گے اور قیاس کے گونڈوں کو بیلگا رہے ہوں گے۔ اگرچہ پولیس واپس جا چکی تھی مگر اس واقعے پر تیروں کا باز ارا بھی پورے جوین پر ہوگا۔ میں نے اسے اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ وہ میری پریشانیوں کو سمجھ گئی، بولی۔ ”مگر مجھے یہاں ڈر لگے گا۔ یہ قبرستان ہے۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”ابھی تم مرنے کی خواہش کا اظہار کر رہی تھیں۔ اب تم موت سے ڈرنے لگی ہو۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر.....“

”تھوڑی دیر کی بات ہے۔ مانتا ہوں کہ تم خوب صورت ہو، جوان ہو مگر اس مردوں کے شہر میں کسی میں اتنا دم نہیں کہ قبر سے نکل کر تمہیں دیکھنے آئے۔“ اس پر میرے مذاق کا ذرہ بھر اثر نہ ہوا، سمجھایا۔ ”دیکھو! میں اسے لے کر چند ہی منٹوں میں یہاں پہنچ جاؤں گا۔ یہاں ایسا ویسا کچھ بھی نہیں ہے یعنی کوئی جن بھوت نہیں ہے۔ یہ لوگوں کی من گھڑت باتیں ہیں۔“ میرے لہجے میں یقین نہیں تھا۔ اس کا کندھا تھپتھا یا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی جلدی سے کھڑی ہو گئی، بولی۔ ”میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ تم نے..... تم نے مجھے زندہ درگور ہونے سے بچایا ہے۔“

مجھے شرارت سوجھی۔ ”اس کی قیمت مجھے مل گئی ہے۔ اس لیے زیادہ احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

وہ چونکی۔ ”کیا مطلب؟ کیسی قیمت؟“

میں نے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پالے میں لیا اور کہا۔ ”جس انسان سے زندگی میں کبھی محبت کی ہو، اسے حادثاتی طور پر پورے کا پورا دیکھ لیا جائے تو ریاضت سے چونکی قیمت ادا ہو جاتی ہے۔“

میرا مقصد شخص اُس کا ذہن بدلنا تھا۔ وہ میرا مطلب سمجھ کر ٹھکی، شرمسار ہوئی پھر میرے ہاتھوں کو تختی سے تھام کر بولی۔ ”اوہ! مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا تھا۔ میں تو تمہارا سامنا کرنے کے قابل بھی نہیں رہی۔ انف مائی گاڈ! اس کا لہجہ بڑا درد بھرا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے تل ہی اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹا دیے اور ایک جھنجھوٹا انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔“ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم کیا ہو؟ مجھے تو بس یہ یاد رہے گا کہ میری باقی زندگی تمہاری رہین ہے۔“

وہ پوری قوت سے مجھے سمجھ کر منمونا جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ مجھے اس کی حالت زار پر ترس آیا۔ اگر وہ جان جاتی کہ میں ظفر نہیں، شہر یار ہوں، وہی جو اس کی داستان میں کتا تھا، تو اس کی حالت کیا ہوتی۔ نازوں پٹی، پھولوں بڑھی خانہ زادی اس وقت کتنی عام لگ رہی تھی۔ اس کا شاہانہ رکھ رکھاؤ، ناز و ذرخہ ہوا ہو گیا تھا۔ بناوٹ کی تہیں اُتر جائیں تو انسان بڑا خوب صورت دکھائی دینے لگتا ہے۔

میں نے بڑی آہستگی سے اُسے خود سے علیحدہ کیا اور لمبی سانس پھینچوڑوں میں اتار کر کہا۔ ”اسا! تم عام نہیں ہو، خاص ہو۔ خاص لوگوں کا رو بہ عامیانہ نہیں ہوتا۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ تم مجھے فرشتہ کہو۔“

اس نے بڑے غور سے مجھے سنا۔ دیکھا بھی۔ پھر نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں! تم بہت عظیم ہو۔ مگر مجھے تمہاری آواز

کا حملہ اور پولیس کی اندھا دھند فائرنگ زبردست بحث ہوئی
برآمدے اور لان میں کوئی نہیں تھا۔ موقع اچھا تھا۔
کھالے کی ویگن اور دیوار کے بیچ لمبی کی پھرتی سے چلتا
دروازے کے قریب پہنچا۔ دستک دینے میں احتیاط تھا۔
لیے میں چھٹی مٹی کی بنی ہوئی نسبتاً کم بلند دیوار بچاند گیا۔
حب توقع خالی تھا جبکہ کھالے کے کمرے میں پتی وقت
الٹین جل رہی تھی جس کی پیلی روشنی دیسی طرز کے چر
دروازے کی درزوں سے جھلک رہی تھی۔

میں دبے پاؤں چلتا ہوا دروازے پر آیا۔ ایک بڑی
ورز سے جھانک کر دیکھا۔ کمرے میں کھالا اکیلا نہیں تھا۔
کوئی اور، شاید بلو یا غبور اس عرف پھوری، یا پھر شید و بچی
برابر کی چارپائی پر لٹاف میں دبکا ہوا تھا۔ میں نے انگلی سے
دروازہ بجایا۔ دو دین مرتبہ دم دستک دی۔ کھالا بیدار ہو کر
دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔

میں نے سرگوشی کی۔ ”کھالے! میں شہرا ہوں۔
دروازہ کھولو۔“

میری آواز اس کے کانوں تک پہنچ گئی۔ وہ جھٹانک لگا
کر بستر سے نکلا اور جھٹ سے دروازہ کھول کر شکر انداز
میں بولا۔ ”شہرے تم؟ اس وقت..... خیر تو ہے؟“

میں نے اُسے بازو سے پکڑا اور دکان میں لے گیا۔
نہایت کم بلند آواز میں بتانے لگا۔ ”خیر ہے بھی، اور نہیں
بھی۔ تم نے مجھے خانزادی کا طعنہ دیا تھا۔ آج اُس تک میرا
ہاتھ پہنچ گیا ہے اور میں یارن خان کی حویلی سے اُسے نکال
لایا ہوں۔ وہ بہت بری حالت میں ہے۔“

”کک..... کیا..... تو ہوش میں تو ہے نا؟“ وہ بوکھلا
گیا۔ ”تم نے تو کہا تھا کہ وہ میاں ولبر حسن کے پاس ہے۔“

اب یارن خان کا نام لے رہے ہو۔ یہ کیا قصہ ہے؟“
”یہ بھی کہانی ہے۔ بعد میں سناؤں گا۔ فی الحال تم اپنی بی
بی جی کو سنبھالو اور اسے اُس کی حویلی پہنچاؤ۔ راستے میں تمام
باتیں پوچھ لیما۔“ میں نے اُسے ہلکے سے ڈانٹا۔ ”میں اسے
قبرستان میں، خانزادوں کے خاندانی مقبرے میں جنوں
بجھو تو سے ڈرتا چھوڑ آیا ہوں۔ اپنی ویگن نکالو اور اُسے فی
القور اس کے گھر پہنچاؤ۔“

”اور تم؟“ اس کی شکل مارے حیرت اور گہرا ہٹ
کے بگڑ گئی تھی۔

”میں سامیں نورن آغا کی خبر لینے جاؤں گا۔ یار
کھالے! میں بڑی مشکوک میں گھر گیا ہوں، وعاکرنا۔ یہ اپنا
نور پور بڑا پر اسرار ہو گیا ہے۔ بھی مل بیٹھے تو بتاؤں گا۔“

کیوں شناسا لگتی ہے۔ پر تم نے بتایا ہے کہ تم نے مجھے ملتان
میں دیکھا تھا۔ شاید میں نے بھی تمہیں وہیں دیکھا ہو۔“
اس کا بیان خود کلائی میں بدل گیا تو میں مقبرے سے نکل
آیا۔ مگر مجھے دن چڑھنے اور اپنے مطلوبہ مقبوضوں کا ٹھکانا
بدل دیے جانے کا خوف لاحق تھا۔ سبھی تیز تر قدموں سے
پگھڑیاں ڈنکے عبور کرتا ہوا شیرے قسانی کے گھر کے پچھواڑے
پہنچ گیا۔ میں نے دانستہ اس راستے کا انتخاب کیا تھا کیونکہ اس
پردہ خوں کی تعداد قدرے زیادہ تھی تاکہ میں دور سے دیکھنا
جاسکوں۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ میری مذبح گھڑیوں سے نہیں
ہوئی تھی ورنہ وہ مجھ کو تک کر آسان سر پہ اٹھا دیتے اور نور
پور کے نیم خوابیدہ لوگوں کو خبردار کر دیتے۔

شیرے قسانی کے پچھواڑے کی زمین امان اللہ قریشی
کی ملکیت تھی۔ اس نے یہاں کماد کاشت کر رکھا تھا۔ مشرقی
آخری کھیت میں گڑ بنانے کا بیانا اور کڑاہ وغیرہ لگا رکھا تھا۔
وہ ہریزن پر کافی سارا گڑ بنوا کر کرتا تھا۔ سبھی لوگ اپنی اپنی
ضرورت کے مطابق اس سے گڑ خرید لیا کرتے تھے۔ گاؤں
کے سبھی گھروں میں گڑ کا استعمال عمومی طور پر بہت زیادہ
تھا۔ میں کماد کی خشک کھوری پر چلتا ہوا پیلے کے قریب پہنچا۔
کان لگائے۔ اندازہ ہوا کہ گاؤں جاگ رہا تھا۔ لوگوں کی
لی جلی آوازیں کھیموں کی جھنڈا بٹ کی طرح فضا میں پھیلی
ہوئی تھیں۔ یہ طے تھا کہ اگر مجھ پر کسی کی نظر پڑ جاتی تو پھر
میری خبر نہیں تھی۔

شیرے قسانی کے پچھواڑے کی کٹڑ سے جھانک کر
دیکھا۔ حیات خان کے دارے کی جتیاں روشن تھیں۔
میرے سامنے کچی سڑک تھی جس کے پار دکانوں کی قطار
تھی۔ بخشو لوہار کا سنانا چھپر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نظر
بچا کر کھالے کے دروازے تک پہنچ سکتا تھا مگر دستک دینے
کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ دستک کی آواز سے اُس
پاس کے تمام لوگ چونک جاتے اور مجھے کھالے کے
دروازے پر کھڑا دیکھ کر قیامت پھا کر دیتے۔ دیوار
بھانڈنے کے لیے بھی مجھے دروازے کی طرف ہی جانا تھا۔
اگر میں چھپر کے ذریعے دکان پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو
چھپر کے زینٹ بوس ہونے کا خدشہ تھا۔

تھوڑی دیر انتظار کے بعد میں نے موقع دیکھ کر کچھ کر
گزرنے کا فیصلہ کیا اور دوڑتا ہوا سڑک عبور کر کے چھپر کے
نیچے پہنچ گیا۔ یہاں سے حیات خان کے دارے کے اندر
جھانکا جا سکتا تھا۔ دارے کے مہمان خانے کی ٹیوب لائٹس
روشن تھیں۔ یقیناً یارن خان کی حویلی پر ہونے والا ڈاکوؤں

”کیوں؟ یہاں ایسا کیا ہے؟“ وہ آنکھیں پھاڑے ہوئے بنا پوچھنے لگا، پھر از خود جواب لیے بغیر بولا۔ ”چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ کہ وہ مقبرے میں اکیلی بیٹھی ہے..... یا اس کے پاس کوئی ہے؟“

”وہ اکیلی ہے یا ر!“ میں اکتا کر بولا۔

”کیا اسے زخمیں لگتی؟“

میں نے کہا۔ ”پہلے میں اس کے ساتھ تھا۔ اب اکیلی ہے، ظاہر ہے ڈر کے مارے کانپ رہی ہوگی۔“ یہی کہتا ہوں کہ تم فوراً وینکین لے کر ادھر جاؤ۔ سوال جواب اس سے کر لیتا۔ تم گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ تمہیں یہ نیک خبر نہیں ہوئی کہ نور پور پر یہ رات کتنی بھاری ثابت ہوئی ہے۔ کئی بندے مارے گئے ہیں۔ ایک طرف ذرا بیتی پولیس مقابلہ بھی ہوا ہے۔ یارن خان اس وقت اپنے بال نوچ رہا ہوگا یا آگ بکولہ پھرتا ہوگا اسے شیطانی عمل کی راہداریوں میں۔ پولیس مردے اٹھا کر لے گئی ہوگی۔ وہ خون آلود فرش و حلوں ہا ہوگا۔“

وہ سر کھجا کر بولا۔ ”انسان کا بچہ بن یار! یہ خوفناک فلم چلا کر میرا دل نہ دہلاؤ میں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی اور تم پر اللہ بھی پڑھ لیا تھا کہ تم نیا پر پڑ (پھنسا) بنائے آن کھڑے ہو۔ خبر! یہ بتاؤ کہ پولیس یہاں کیا کرنے آئی تھی؟ کیا وہ تمہاری تلاش میں تھی؟“

میں نے اسے مختصر خود پریشانے والی شب کے واقعات سنائے اور فوراً چل پڑنے پر مصر ہوا۔

وہ بولا۔ ”یار پھرے! تم بہت اونچا اڑنے لگے ہو۔ یقین نہیں آتا کہ تم نے یہ سب کچھ کر لیا..... ہیں؟“

”یہ باتیں پھر کسی وقت کریں گے۔ تم اپنی سیٹ پر بیٹھو۔“

”پاگل ہو گئے ہو کیا؟ میری ویگن اسٹارٹ ہوتی ہے تو پورے گاؤں کو پتا چلتا ہے۔ یارن خان ویگن کو میرے اور خانزادی سمیت آگ لگا دے گا۔ پھر..... پھر کیا، کیا جائے؟“ وہ خود کلائی کرتا ہوا، کچن کھانا ہوا سوچ میں پڑ گیا۔ ”زیادہ سڑ تو نہیں ہے۔ کیوں نہ میں اسے سائیکل پر چھوڑ آؤں؟“ اس نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا، پھر خود ہی اپنی بات کو مناسب قرار دیتے ہوئے بولا۔

”ہاں! سائیکل پر جانا مناسب ہے۔ گھنٹے گھنٹے لپھڑے لپھڑے قبرستان پہنچو۔ میں آئے کی سائیکل نکال لاتا ہوں۔“

”میں اب وہاں نہیں جاؤں گا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”کیوں؟ کیا کوئی خطرہ ہے؟“ وہ ٹھٹھا۔

”نہیں۔ مجھ سے زیادہ چلائیں جاتا۔“ میں نے اپنی پنڈلی کی طرف اشارہ کیا، کہا۔ ”تم بلو کا برقعہ بھی ساتھ لے جانا تاکہ اس کا سو کچھ کر کوئی پہچان نہ سکے۔“

اس نے مجھے گھورا۔ ”آنتی سردی میں آدمی رات کو کون سا مزک پر کھڑا ہو کر ہمیں دیکھے گا اور پہچاننے کی کوشش کرے گا؟ میرا خیال ہے کہ تم نے اپنی اوقات سے زیادہ پھرتیاں دکھائی ہیں اس لیے تمہارے دماغ نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں کھالے! پولیس والے علاقے میں چکر اترے پھر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یارن خان کے بچے کچھے کارندے بھی میری تلاش میں نکلے ہوں۔ وہ تمہیں اور اس کا کوئی کچھ کر پکڑ لیں گے اور سارا بتا دیا یا کھیل بکڑ جائے گا۔ زیادہ عقل مند نہ بنو اور جیسا کہہ رہا ہوں، ویسا کرو۔“

میں نے ہلکے مار لو اور اس کے لیے بلو کے برقعے کے بجائے ماسی کا ٹوپی والا برقعہ لے جاؤ۔ اسے پہن کر اس کا پوچھی معلوم ہوگی۔“

ایسے وقت میں حیات خان کے دارے کے باہر لوگوں کی آوازیں ابھریں۔ کھالے نے اُنھ کے دروازے کی درزوں سے جھانکنا، نظر بولا۔ ”نور پور کے کچھ تیس مارخان فاتحانہ انداز میں ڈنڈے لہراتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو جا رہے ہیں۔“

میری رہی کو دیکھ کر وہ جلدی سے اپنے کمرے میں گیا۔ تھوڑی دیر بعد پلٹا تو اس کے ہاتھ میں نہ صرف برقعہ تھا بلکہ اس نے میری ہدایت کے مطابق سوئی فیکس کی ہلکے مار رکھی تھی۔ میرے مطالعے کے بغیر اس نے مجھے پانی کا بھرا ہوا گلاس اور پیرا سینا مول کی دو گولیاں تمہیں، ششکر لپچے میں گویا ہوا۔ ”یہ لو شیر مار کر گولیاں کھا لو۔ درویش کچھ آفات ہو جائے گا۔“ (پیت کے وسطی حصے) میں لگنے والے نیلے بڑا درو کر رہے ہیں۔“

میں نے گولیاں کھائیں، پانی پیا اور کھڑا ہو گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر سائیکل نکالی، ارد گرد دیکھ کر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”شہرے! کوئی خطرے وطرے کی بات تو نہیں ناں؟“

میں نے ٹھٹھا بار لپچے میں کہا۔ ”کھالے! کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں رہا؟ اگر تم ڈر رہے ہو تو پلٹ جاؤ۔ میں جانوں اور میرا کام جانے۔ ہاں یار! ایک بات کا دھیان رکھنا۔ تمہاری بی بی جی نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں نے اسے اپنا نام ظفر اقبال بتایا ہے۔ یاد رکھنا، اسے مت بتانا کہ میں شہر یار ہوں۔ پوچھتے تو کوئی بیسی بیسی مار دیتا (اول فول بک دیتا)۔“

وہ لات گھما کر سائیکل پر بیٹھنے ہوئے ٹھٹھا آواز انداز میں مجھے گھورنے لگا۔ بولا۔ ”کیا تم نے کوئی گل کھلا یا ہے؟“

”نہیں تو.....“ میں جلدی سے بولا۔

”تو پھر تمہیں اپنا آپ چھپانے کی ضرورت کیوں پڑی؟“ اس کا انداز اچھا نہیں تھا۔

”وہی ہی یار! تم تو بال کی کھال کھینچنا شروع کر دیتے ہو۔ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ.....“

”کہ وہ تمہیں اچھا سمجھنے لگے۔ فکر نہ کرو۔ وہ تم پر صبح دوپہر شام ڈاکٹری فکے کے مطابق لعنتیں بھیجے گی۔ اوکے یار جی! تم اپنی راہ لو، میں اپنی۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔“ اس نے ارد گرد دیکھا اور اپنے پاؤں کا زور پینڈل پر ڈال کر سائیکل کو اڑا لگا دی۔

میں پچھرتے لگزی کے موئے فہم (ستون) سے چٹ کر کھڑا تھا تاکہ اچانک نمودار ہونے والے کسی شخص کی فوری نگاہ مجھ پر نہ پڑے۔ کھالے کی سائیکل کا ہر عضو ویگن کی طرح مختلف آوازیں نکالتا تھا مگر بخشوں ہمارے ٹھٹھا ٹھٹھا کی کی بدولت اسے قابل اعتماد سواری قرار دیا جاسکتا تھا۔ کھالے گھبراہٹ میں نکلتا تھا کیونکہ اسے پوری طرح معاملے کی سنگینی کو سمجھنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ اگر میری سائی ہوئی کہانی میں بی بی جی کا کلا گس شامل نہ ہوتا تو وہ کھری کھری سنا کر رضائی میں سرمنہ لپیٹ لیتا اور ہرگز اتنی سردی میں قبرستان کا رخ نہ کرتا۔

مجھے اندازہ تھا کہ اس کو سامنے پا کر اس کا دل ہلایاں توڑ کر ہار نکلتا آئے گا اور جب اس پر کھلے گا کہ میں نے اسے اس کے قرب کا کتنا بڑا اور کھلا موقع فراہم کیا تھا۔ وہ نہ صرف میرا ممنون ہوگا بلکہ اس کا قلبی شکوہ بھی آپوں آپ تحلیل ہو جائے گا۔ وہ باتوں باتوں میں اس کی بربادی کا تمام تر لمبا تجربہ بڑھاتا اور سمجھتا تھا کہ میں نے میڈم کو مالی منفعت دیتے ہوئے اس کے ساتھ سخت زیادتی کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ حق بجانب نہیں تھا مگر میرے موقف کو تسلیم کرنے کا روادار بھی نہیں تھا۔

مجھے سوچنے کے لیے چند منٹوں کے لیے کوشش غایت کی تلاش تھی۔ ویگن بڑا نگاہ پڑی تو یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ ویگن میں مٹس کیا اور فرش پر ایک سیٹ کی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ گن جموی میں رکھ کر آئندہ کال انجمن عمل ترتیب دینے لگا۔ مجھے بغیر کسی شوش وجہ کے یقین ہو چلا تھا کہ میڈم ٹھٹھا کی اتان اور چھوٹا بیانی ٹیوٹور پور میں ہی نہیں موجود تھے۔ اگر وہ نورن

آغا کی حراست میں تھے تو لامحالہ طور پر انہیں مزار کے احاطے میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ بھی بعید از امکان نہ تھا کہ نورن آغا نے انہیں کسی اور خفیہ ٹھکانے پر پہنچا دیا ہو۔ یارن خان کو اگر برکت مسیح نے خبردار کر دیا کہ اس کی حویلی پر حملہ انجمن دونوں مخفیوں کی وجہ سے کیا گیا ہے تو اس کا فوری رد عمل یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ پہلی فرصت میں ان کا ٹھکانا بدل دیتا۔ یعنی ہر سہ صورتوں میں میرے پاس مہلت کم تھی۔ جو بھی کرنا تھا، اللہ کی آس پر فی الفور کر کرنا چاہیے تھا۔ مجھے شکر ہے کی طرح سودوریاں کو مٹس پشت ڈال کر اپنے شکار پر چھٹا تھا۔

پیر سردی کے مارے شل ہوئے جاتے تھے۔ اپنی برہنہ پائی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ یاد آیا کہ کھالے نے دکان کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ میں اس امید کے سہارے ویگن سے نکل کر دکان میں مٹس گیا کہ مجھے بخشوں لوہار کا امیر جنسی جو تامل جانے گا جسے وہ بھی بھار پہنا کرتا تھا۔ میری امید برائی اور ناز کی بنی ہوئی مخصوص ساخت کی چیل ل گئی۔ پہن کا ہار نکلا اور جیتے کی سی سرعت سے دے پاؤں دوڑتا ہوا شیرے قسانی کے فنی کیمت میں سکوری پر کچھ ٹھٹھا۔ پیلنے کے قریب سے گزر کر کما دی اوٹ لیتا ہوا مولاداد کے گھر کی طرف بڑھا۔ تھوڑی دیر میں میں باسرونی محمد والی گلی عبور کر گیا۔ گلی سنسان تھی۔ اسی گلی کی سیدھ میں چاچے چراغ کا جلا ہوا گھر واقع تھا۔

مولاداد کے گھر اور مولوی کے حجرے کے عقب سے گزر کر، لمبا چکر کاٹ کر میں سامنے جگ جیت شاہ کے مزار کے پچھواڑے والے جنگل میں پہنچ گیا۔ یہیں میں نے رات کو اپنا لباس اور سامان چھپایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں سائیں نورن آغا کی رہائش گاہ کے پچھواڑے کھڑا چیل اتار رہا تھا۔ اسی دیوار کے ذریعے میں دوسرے پہلے بھی اس گھر کی چھت پر چڑھا تھا۔ ایک مرتبہ دن دل جیت کو بیدار ہوتے دیکھ کر لوٹ آیا تھا۔ دوسری مرتبہ اسے ممکن کے بال کی طرح نکال کر اپنے ڈیرے پر لے گیا تھا جہاں وہ میرے ہاتھوں اپنے اعمال کی پاداش میں بدترین انجام کا شکار ہوا تھا۔ آج پھر مجھے یہی مسافت درپیش تھی۔

تھوڑی سی کوشش سے میں چھت پر کمروں کی درمیانی منڈیر پر پہنچ گیا۔ تین اطراف کروں اور ایک طرف ہال کے درمیان صحن اور پوئل کار بڑا عدہ نظر آ رہا تھا۔ ثنائی گوشے میں سیزجیوں کے نیچے سائیں دل جیت کا کمر تھا جس میں اس وقت اس کے گدی نشین سائیں نورن آغا کو جو استراحت ہونا چاہیے تھا کیونکہ سائیں دل جیت کے بعد یہ

کے بل اترنے کی گنجائش تھی۔ میں نے اُسے نیچے اترنے کا حکم دیا۔ اس نے قبر میں اترنے میں غیر معمولی سرعت اور ہوشیاری کا مظاہرہ کیا تو میں بڑی طرح چونک گیا۔ ڈرا کر وہ کوئی چال نہ چلے دے۔ بھی میں نے آن واحد میں گن ہوا میں بلندی اور حجم زون میں اس کے سر پر دس ماری۔ وہ ’اورغ‘ کی درناک آواز نکال کر خلا کے عقبی کنارے سے نکلا یا اور نیچے ڈھس گیا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ نیچے گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا مگر میں نے اترنے میں دیر نہیں کی۔ جو بمی نمودی سیزھیاں اتر آئیں میرے پاؤں چھ سات فٹ نیچے فرش پر پڑے نورن آغا کے جسم پر پڑے۔ وہ ضرب کی تاب سے بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پچھو دیکھنے کی کوشش کی مگر تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے تیزی سے ہاتھ مارے اور نورن آغا کے لباس کی تلاش لی۔ میری توقع کے عین مطابق اور اس کے چنے کے پہلو والی جیب سے ایک پنسل نارنج برآمد ہو گئی۔ میں نے نٹول کر اس کا ٹخن تلاش کیا۔ اندھیرے کا تسلط ایک منٹ سے ڈیڑھ والٹ کے بلب نے توڑ کر رکھ دیا اور چاروں شانے چت لینا نورن آغا نظر آنے لگا۔

میں نے اس کا سرسری معائنہ کیا۔ باوجود کہ گن کی ضرب شدید نہیں تھی، وہ وقتاً بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے اثنا غفلت ہونے میں سر کی چوٹ سے قبل اچانک طاری ہونے والی میری دہشت اور موت کے ڈر کا مرکزی کردار تھا۔ میں نے نارنج کی روشنی میں قبر کو آگے کھسکانے کا میکرم تلاش کرنے کی کوشش کی مگر دیوار پر کوئی سوچ بورد یا لیور نہیں ملا۔ سمجھ گیا کہ اس میں کوئی برقی نظام کام نہیں کرتا بلکہ اُسے کھولنے اور بند کرنے کے لیے ہاتھوں کی مدد سے دھکیلا جاتا تھا۔ اس میں کوئی تنہا سالاک لگا ہوا تھا جو کھلتے وقت ’کنک‘ کی آواز پیدا کرتا تھا۔ باہر والا لاک سبز چادر کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ اندر والا لاک لیور ڈھونڈنے کے باوجود میں ملا تو میں نے قبر کو کھلا چھوڑ کر اُسے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور پلٹ کر اس سرنگ کا جائزہ لیا۔ جہاں میں کھڑا تھا، وہاں سرنگ کی بلندی چھ سات فٹ تھی۔ جنوبی جانب تین چار فٹ کے بعد فرش بلند ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے سرنگ کی اونچائی کم ہو کر محض تین چار فٹ رہ جاتی تھی۔ بھی دیواریں بے رنگ مگر پلستر شدہ تھیں۔ میں نے آغا کے بدن کو کھینچ کر تنگ راہداری میں ڈالا۔ کپٹی پر زور سے گن کا کندا مارا۔ اس نے عالم بے ہوشی میں ایک زوردار جھکا لیا، ہائے اماں!

کی صدائے بے اختیار بلندی، سر کو دائیں بائیں پچھا پھر ایک طرف گردن ڈال دی۔ اب میں اس کی طرف سے بے فکر اور مطمئن ہو کر اپنا کام سرانجام دے سکتا تھا۔ میں گھٹنوں کے بل چلتا ہوا سرنگ میں آگے بڑھا۔ دس بارہ فٹ کے بعد سرنگ میں نیچے کی جانب سیزھیاں جاتی ہوئی دکھائی دیں۔ سیزھیاں اترتے ہی میں نے سمجھ کا سانس لیا کیونکہ اب مجھے چوبائیں کی طرح چلنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ پندرہ فٹ طویل کیلری نما سرنگ کا اختتام ایک نہایت کھلے اور دس کمرے میں ہوا۔ اس زیر زمین کمرے کی اونچائی محض آٹھ فٹ یا دو چار فٹ کم رہی ہوگی۔ یہاں سردی از حد زیادہ جبکہ ٹیلن اور ٹھنک کا معمولی سا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے نارنج کی روشنی کمرے میں لٹھائی۔ یہ آٹھ ضرب پندرہ فٹ کا کمرہ تمام تر ضروری سہولیات سے مزین تھا۔ میں نے دائیں ہاتھ پر سوچ بورد دیکھ لیا جس پر رفتار میں سات آٹھ ٹن لگے ہوئے تھے۔ باری باری ٹن داتا گیا۔ کمرہ یکبارگی روشن ہو گیا۔ میری آنکھیں چند لمحوں کو چندھیا گئیں پھر روشنی کی عادی ہو گئیں۔ میرے عقب میں کیلری میں سیزھوں کے عین اوپر ایک دودھیا بلب جل آٹھا۔ تنگ راہداری میں بے ہوش پڑا ہوا نورن آغا نظر آنے لگا۔ یہ کمرہ بھی چھوٹا سا عجائب گھر معلوم ہوتا تھا۔ داہنی دیوار میں نصب شدہ چوبی دروازہ ہاتھ روم کی نشاندہی کر رہا تھا جبکہ اٹنے ہاتھ والی دیوار کے ساتھ فرش سے چھت تک مختلف سائزوں کے گتے کے کارشن اوپر نیچے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ اسی دیوار کی اوپر والی ٹکڑ میں ایک گول سوراخ تھا جس میں بے آواز ایگزاسٹ فین چل رہا تھا۔ اس کے مقابل میں داہنی دیوار پر بھی ایک ایگزاسٹ نصب تھا۔ مجھے سمجھے میں دیر نہیں لگی کہ ایک پتلا ہوا کمرے میں کھینچ رہا تھا جبکہ دوسرا اندر کی ہوا کو باہر نہیں پھینک رہا تھا۔ یقینی طور پر ان پتھکوں کے اوپر لوہے یا پلاسٹک کے پائپ نصب ہوں گے۔

داہنی ٹکڑ میں ایک چھوٹی سی چوبی سیز پڑی تھی جس پر ایک ٹیپ پلیر دھرا تھا۔ ٹیپ پلیر سے رنگ برنگی باریک تاریں نکل کر دیوار کے ایک گول سوراخ میں داخل ہو رہی تھیں۔

میرے سامنے لوہے کے پائپوں والی تین چار پائیاں پڑی تھیں جن میں سے ایک پر کوئی لحاف میں دپکا پڑا تھا۔ دوسرا بستر خالی تھا جبکہ آخری چار پائی کا بستر مخصوص دیہاتی انداز میں اداؤں پر گول لپٹا پڑا تھا۔ میں نے بے غلٹ لحاف کھینچا۔ یہ دیکھ کر میرا دل ہلچلنے لگا کہ اس بستر میں ایک بوڑھی عورت اپنی چھاتی سے ملیے چپکے سانولے سے نیچے کو چٹائے پڑی تھی۔ اپنے چلیے سے دونوں بھکاری معلوم ہوتے تھے۔ بوڑھی عورت، جو یقینی طور پر میڈم ٹیکلی کی اماں تھی، جاگ رہی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مردنی کا خوف ناک تاثر مترشح تھا۔ ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا کہ وہ مر چکی ہے مگر پھر سانسوں کی تال پر اوپر نیچے ہوتی پسلیوں کی حرکت دکھائی دی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔

”اماں! تم میڈم کی ماں ہونا؟ اور یہ سہو ہے یاں؟“ میں نے بیجا انداز میں پوچھا۔

اس کی چپٹوں نے حرکت کی۔ مجھے عجیب بے تاثر آنکھوں سے دیکھتی رہی پھر ناتواں آواز میں بولی۔ ”کے آدھیں؟“

(کیا کہتے ہو؟)

میں نے اپنا سوال دہرایا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا اور سرانگیں میں بولی۔ ”نہیں..... میں کسی میڈم میڈم کو نہیں جانتی۔“ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا تم چند ماہی کی اتال ہو؟“

اس کی آنکھوں میں بے یقینی چلی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے استخوانی وجود سے چمٹا ہوا بچہ بھی اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”اماں! جلدی سے اٹھو۔ اپنے بیٹے کو بھی اٹھاؤ۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلتا ہے۔ میں چند ماہی کے کہنے پر نہیں اس قید خانے سے نکلنے کے لیے آیا ہوں۔“

میں نے بوڑھی کے پتھر جیسے وجود کو دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ وہ شاید اٹھنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی مگر جو بمی اس کے کانوں میں میری بات پڑی، وہ غیر معمولی پھرتی سے چار پائی سے اتری۔ سیو بھی حیران آنکھوں سے مجھے اور اپنی ماں کو دیکھتا ہوا چار پائی سے اتر آیا۔

اماں بولی۔ ”چل پتر! مٹاؤ دیرھی ونجے۔“

(چل پتر! مبادا کہ دیر ہو جائے)

میں نے دیکھا کہ ان دونوں کے جسموں پر باریک اور عمومی گھریلو نوعیت کے غریبانہ لباس تھے۔ دونوں کے پاؤں ننگے تھے جبکہ باہر سردی زوروں پر تھی۔ میں نے ہمیں پا چادر کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ کمرے میں سر ہانے، کدے اور رضائیاں تھیں، چادر نہیں تھی۔ ناموسی ہوئی۔ میں نے کندھے اچکائے، جی ہی جی میں ’اللہ مالک ہے‘ کا نعرہ لگا اور تہ خانے سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ ایسے میں ٹیپ پلیر پر نظر پڑ گئی۔ چونکہ میں نے سوچ بورد کے سبھی ٹن آن کر

دے دیے تھے، اس لیے ٹیپ پلیر کا تنہا سانس بلب بھی روشن ہو گیا تھا۔ میں نے دائیں کی تاب گھما کر آواز کم کی اور ’پلے‘ کا ٹن دبا دیا۔ ٹیپ پلیر میں موجود کیسٹ چل پڑا اور زونوں زونوں کی عجیب آوازیں ٹیپ کے اسپیکر سے برآمد ہونے لگیں۔ یوں لگا جیسے زوروں کی آندھی چل رہی ہو۔ پھر آوازیں بدل گئیں اور ایک بھیانک قہقہہ اسپیکر سے ابل پڑا۔ چند لمحوں میں ہی اس ٹیپ پلیر کی یہاں موجودگی کا سبب معلوم ہو گیا۔ چاچے چراغ کے مکان کے پچھوڑے کے کھٹے جنگل میں ایندھن کاٹنے کے بہانے قدم رکھنے والے یہی آوازیں سننے تھے اور ڈر کے مارے دوڑ جاتے تھے۔ وہ گاڈوں میں جا کر جنگل سے سنائی دینے والی آوازوں کا وہ خوفناک حصار کھینچتے کہ سننے والے کانوں کو ہاتھ لگا کر دل ہی دل میں تہیہ کر لیتے کہ وہ زندگی بھر اس جنگل کا رُخ نہیں کر سگے۔

یہ تہ خانہ اس جنگل کے عین نیچے بنایا گیا تھا۔ چنداں حیرت ہوئی کہ سامنے دل جیت شاہ نے کس طرح مجھ سمیت تمام گاڈوں والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اتنا بڑا تہ خانہ تعمیر کر لیا تھا۔ نجانے درویش سامنے جگ جیت شاہ کی دفن شدہ میت اس نے کہاں نکال چھپائی تھی؟ اس تہ خانے کو کھودنے کے دوران ننگے والی مٹی کہاں چھٹی تھی؟

میں حیرانی سے تہ خانے کے بے رنگ دروازہ پر دیکھتا رہا پھر کندھے اچکا کر سرنگ میں داخل ہو گیا۔

اماں سیو کا ہاتھ پکڑ کر سیزھوں پر ٹھہری تھی۔ میں بھانپ گیا کہ وہ راہداری میں ٹم لیٹ پڑے نورن آغا کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ میں پہلو بچا کر آگے نکلا اور انہیں اپنے پیچھے راہداری میں آنے کا اشارہ کیا۔ گھٹنوں کے بل آگے بڑھا۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے میری تقلید کی۔ راہداری عبور کر کے میں نے نورن آغا کو کھینچ کر فرش پر لڑکھا دیا۔ اس کی نبض اور دھڑکن چپک کی۔ کپٹی دیکھی۔ گن کی دونوں ضربات سے اس کی جلد دو جگہوں سے پھٹ گئی تھی اور خون نکل کر بالوں میں جم گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے اندازہ کیا کہ وہ کدے میں جا پناج گھٹنوں سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔ ہمیں کسی محفوظ جگہ پر پہنچنے کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ سیزھوں پر لگے ہوئے بلب کی روشنی میں مجھے چھت میں لگا ہوا تنہا سا آہنی کنڈا نظر آیا۔ اُسے کھینچ کر دیکھا تو پتا چلا کہ وہ قبر نما دھکن کا قفل تھا۔ کوئے میں ایک تنہا سا سوچ بورد بھی آویزاں تھا جس پر صرف ایک بٹن نصب تھا۔ میں نے اُسے آن کیا، کچھ نہ ہوا، پھر آف کیا تو سرنگ

اپریل 2013ء

آیا۔ اس نے نیم خوابیدہ گن میں کو متوجہ کر کے دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا اور خود پلٹ گیا۔

میں نے گن میں کی مدد سے ٹیکری کے آخری کمرے میں دونوں ماں بیٹے کے سونے کا بندوبست کیا۔ گن میں نے باورچی کو چکا کر ہمارے لیے ناشتے کا کہا جبکہ میں نے اپنے گیسٹ ہاؤس کی وارڈز پر کھول لی۔ میرا اتارا ہوا سوٹ فینگر پر ڈنکا ہوا تھا۔ اسے لائڈری کا چکر لگوا دیا گیا تھا۔ میں ناشتے سے پہلے اپنے میک آپ سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ہاتھ دروم میں جا کر میں نے بڑی احتیاط سے ڈاڑھی اُتاری۔ بار یک اور نہ دکھائی دینے والی پھلی پر خصوصی کم لگی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ڈاڑھی اتارنے کا مرحلہ خاصا اذیت ناک تھا۔ مچھوں میں گم سے لگے ہوئے لمبے اضافی بال نیم گرم پانی کی مدد سے اُتارے۔ آنکھوں سے لینز نکال کر محفوظ کر لیے۔ زخموں کا معائنہ کیا۔ کتوں کے کانٹے سے بننے والے ننھے ننھے گزخوں میں جما ہوا خون بھرا ہوا تھا جسے میں نے کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر پر شور مارنے کے بعد جب میں ہاتھ دروم سے نکلا تو بازو اور پنڈلی میں شدید درد ہو رہا تھا جبکہ جسم نہایت ہلکا ہلکا ہو گیا تھا۔ زخموں کی نوعیت کو دیکھنے کے بعد مجھے ٹریٹ منٹ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گن میں کو بھیج کر بالائی منزل سے فرسٹ ایڈنگ سٹو کوئی۔ اس کی معاونت سے زخموں کی بیڈنگ کی۔ دو چار گولیاں پھانسیں اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔ باورچی کو میں نے ہدایت کی کہ جو بھی میڈم جاگیں، انہیں میری آمد کی اطلاع دی جائے۔ سودا دار ماں کا خصوصی طور پر خیال رکھنے کی تاکید بھی کر دی۔ بلتان سے نکلنے کے بعد مجھے اچھی اور گہری نیند نصیب نہیں ہوئی تھی۔

چونکہ خونی تنگ دود کا انجام فتح تھا، اس لیے ٹھکن عذاب جاں نہ تھی بلکہ فرحت افزا تھی۔ میڈم نے مغویوں کا کھون لگانے کا کام سونپنا تھا جو درحقیقت کاربے بار تھا۔ میرے ہاتھ میں اسکی انجھی ہوئی ڈور تھائی تھی جس کے کسی سرے پر کاسیانی کا سہرا انہیں سجا تھا مگر میں نے نہ صرف کھون نکالا بلکہ انہیں بہ سلائی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ میڈم ٹکلیڈ نے میرے علاوہ اپنے تجربہ کار گینگ کو میرد شاہ کی سربراہی میں اماں اور سیو کی بازی پر پروا نہ کیا تھا۔ چونکہ میں نے انہیں نور پور میں نہیں دیکھا تھا، اس لیے میں یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ وہ ابھی تک ٹانک ٹوئیاں مار رہے ہوں گے۔ ان کے موبائل فون بند تھے مگر نہ میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر گیسٹ ہاؤس کے فون پر ان سے رابطہ کرتا

اور ان کی کارگزاری پر استفسار کرتا۔ خانزادی آسا بوش میں ہاتھ کی تھی۔ میں جب بھی اس کے بارے میں سوچتا تو دل میں ایک ٹیس اٹھتی تھی۔ میرا ضمیر بالواسطہ طور پر اس پر بیٹنے والے غیر فطری واقعات کی ذمہ داری مجھ پر ڈالتا اور طول کر دیتا تھا۔ اس کا دھندلا چہرہ چشم تصور پر طوع ہو گیا۔ وہ ہاتھ ترتیب میڈم ٹکلیڈ میاں دلبر اور یارن خان کے عقوبت خانوں کی یا تراسے مل اتنی پشمرہ، مضحل اور شکست خوردہ نہیں تھی۔ اس کا چہرہ گل گوں تھا۔ اس کے حسن کو جس بے دردی سے پامال کیا گیا تھا، انسانیت سوز تھا۔ دکھ ہوا۔ دماغ نے بہلا دیا۔ ”ختم نہ کرو، اساکلی نہیں جس کی ذات کی غلام گردشوں میں نایاک قدم رکھے گئے ہیں۔ چونکہ وہ امیر زادی تھی، اس لیے واویلا زیادہ ہوا مگر نگر غریب زادیوں کی عصمت دری کے واقعات جیسے شمار سے باہر ہیں۔“

مجھے بخشولوہاری ضعف کے مارے جیتی چلاتی سائیکل پر سوار ہو کر اس کی طرف جانے والے کھالے کا خیال آیا تو لبوں پر سکراہٹ آن ٹھہری۔ بند آنکھوں کے پردوں پر کھالے کا سونلایا ہوا چہرہ فرط حسرت و جذبات سے سرخ ہوتا نظر آیا۔ خوشی میں وہم کا تھسا کا ٹپا چھ گیا۔ کھالاشوق و جوش میں آسا کو لے کر بلوچ ٹگر پہنچا ہوا گاتو حیدرخان نے اس کا سواگت کس انداز میں کیا ہوگا؟ کہیں بیٹی کو اجڑے حالوں دیکھ کر بہرم ہونے والے خانزادے کے تمام تر غصے کا شکار ہی نہ ہو گیا ہو؟..... اگر اس کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی تو وہ پھر مجھ پر آگ بگولا ہو کر چڑھ دوڑے گا۔ عافیت کی ایک ہی صورت باقی تھی کہ اسافوری طور پر اپنے بابا کو خود پر بیٹنے والے جملہ واقعات سے آگاہ کر دے اور کھالے کی پوزیشن خان کی نظروں میں بہتر ہو جائے۔ اسی ذہنی ادھیڑ بننے نے اپنی تمام تر تشویدہ سری غنید کی دیوی کی دلیہز پر ڈھیر کردی اور میں دنیا و دنیاہیں غافل ہو گیا۔ کوئی دوجے کا مکمل تھا جب میری آنکھ کھلی۔ میں نے دو چار بھر پور انگڑائیاں لیں، منہ ہاتھ دھویا اور چکن کاڑھ کیا۔ لک نے میرے استفسار پر بتایا کہ میڈم کو میرے آنے کی اطلاع دے دی گئی ہے جبکہ دونوں مہمانوں کو میڈم کے حکم پر جی جھ کے سپرد کر دیا تھا۔ میں یہ جان کر شدید متحیر ہوا اور میڈم کی بے اعتنائی غیر فطری لگی کہ میڈم نے ایک نظر سیو اور اماں کو دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ ٹراؤنڈ فلور پر آئی تھی، نہ اس نے ان دونوں کو اوپر بلا یا تھا۔ کجا آن کے لیے بلکان ہو رہی تھی اور کسی خطرے کو خاطر میں لانے

بغیر ویران خیلے میں جا پہنچی تھی۔ کجا انہیں قریب پا کر بھی ایک نظر دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔

میں ٹکڑے ٹکڑے سے فارغ ہونے کے بعد میڈم کے بلاوے کے انتظار میں بیٹھی آں کر کے بیٹھ گیا۔ نصف گھنٹے بعد روم انٹرکام پر زرینا نے میڈم کا پیغام دیا۔ میں چند لمحوں بعد اس کے آراستہ کمرے میں تھا۔ وہ بیڈ پر گاؤٹیکے کی ٹیک لگے نیم دراز تھی۔ اس نے سر کی خفیف جنبش سے میرے سلام کا جواب دیا اور صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا تو وہ بغور مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ”میڈم! کیا بات ہے؟ آپ پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔“ اس نے جواب دینے کے بجائے میٹرز پر بڑا ہوا موبائل فون اٹھا لیا اور کوئی ٹمبر ملانے لگی۔ میں اس کے غیر متوقع رویے کو دیکھ کر الجھ گیا۔

اس نے کریم کٹر کافیس سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ دول کی جھار والا کوٹ اس پر فٹ رہا تھا۔ چمک دار نقیش شالوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ ہلکے پھلکے میک آپ نے اس کی وجاہت کو ہمیز کر دیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی مگر اس کے چہرے پر طاری تنجید کی اور نظر دترود کی پرچھائیاں دیکھ کر مجھے شدید ٹھن کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ میری موجودگی سے بے نیاز ہو کر فون کا فون سے لگائے بول رہی تھی۔ ”فضول باشیں نہ کرو، رپورٹ دو۔“

مجھے گزبڑ کا احساس ہوا۔ وہ پیش کی جانے والی رپورٹ کو کال متانت سے سنتی رہی پھر قدرے طنز بے لچھے میں بولی۔ ”نہیں شاہجی! تم ان ہی لوگوں کو بڑھوئے ہو گئے ہو تمہارے دامغ کوڑنگ چاٹ چکا ہے۔ تمہاری ساری گفتگوں کا رآمد بات یہ ہے کہ ہمارا مطلوب مال نور پور میں ہے۔ کہاں؟ کس کے پاس؟ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ ہے ناں؟“

میں سمجھ گیا کہ وہ میرد شاہ اور بیانی کی کارکردگی سے ناخوش تھی۔ ان کے لے لے رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ”کیا ہمارے پاس میں اتنی مہلت ملتی ہے، جتنی تاخیر تم لوگوں نے کر دی ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ آریا پار والا دھندا ہے۔ وہ چھوٹا سا گاؤں، جس میں یہ مشکل سو کے قریب گھر ہیں، وہاں سے میری تیز طراریمہ اپنا مال ڈھونڈنے میں نا کام رہی ہے۔ شاہجی! تم ابھی طرح جانتے ہو کہ یارن خان کیا چاہتا ہے؟ کیا میں شکست تسلیم کرتے ہوئے اس کے آگے سر جھکا دوں، اپنا بتانا یا سیٹ آپ اس کے حوالے کر دوں اور برغلائوں سی زندگی گزاروں؟“ تھوڑے وقفے کے بعد

بولی۔ ”نہیں! تم بلتان آ جاؤ۔ تمام ساتھیوں کو لے آؤ۔ شہر یا رکلیا انہیں یارن خان کے بچوں سے نکال لایا ہے۔“ اس نے منہ بنا کر فون بند کر دیا۔ پھر دوسرا نمبر ڈائل کیا۔ نخوت سے بولی۔ ”سراج الدین! گوئی چلا کر کسی کو زمین چٹانا بڑی بات نہیں ہوئی۔ بڑی بات یہ ہے کہ سینے کی طرف آتی ہوئی گوئی کو جھکا کر دے کر خطا کر دیا جائے۔ پھر کیا ہوا کہ تم لوگ ابھی تک ایک چھوٹے سے مشن میں الجھے ہوئے ہو؟“

وہ بیانی کی کلاس لے رہی تھی۔ دور بیڈ کرکان کھینچ کر واپسی کا حکم دے رہی تھی۔ فون بند کرنے کے بعد میری طرف متوجہ ہوئی، بولی۔ ”شہر یار! تمہارے پاس بتانے کے لیے کیا کچھ ہے؟“

میں نے بیانی سے میک آپ کرانے سے لے کر سیو اور اماں کو گیسٹ ہاؤس کے آخری کمرے میں پہنچانے تک کی جملہ رداد بلا کم و کاست پیش کی۔ وہ انہماک سے سنتی رہی۔ اس دوران اس کے لبوں سے ایک کھمکہ تعریف تک نہ نکلا۔ مجھے تند نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ ”نہیں یاد ہے کہ میں نے تمہیں کیا مشن سونپا تھا؟“

”آپ نے مجھے نور پور میں اماں اور سیو کا سراغ نکالے بیجا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”پھر؟“ وہ سپاٹ لچھے میں بولی۔

”میں نے اپنا کام مکمل کر دیا۔“ مجھے اس کا رویہ پسند نہیں آ رہا تھا۔

”یعنی؟“

”یعنی میں نے نہ صرف ان دونوں کو نہ صرف ڈھونڈ لیا بلکہ انہیں یارن خان کے عقوبت خانے سے بہ حفاظت نکال بھی کر لیا۔“ میرے لچھے میں قفاخری نمایاں آ میزش تھی۔

”کیا میں نے تمہیں یہ کہا تھا کہ تم یارن خان پر چڑھ دوڑو اور خون کی ندیاں بہا دو؟“ اس نے کاٹ دار انداز میں پوچھا۔

کرتی ہوں اور اس رویے کو اور ایک ننگ تر اردی ہوں۔“
اس کا انداز بڑا تھیک آمیز اور آسان تھا۔ پہلی مرتبہ مجھے اپنے آپ کو اس کی مانتی میں دینے کا فیصلہ ہوا۔ لگا لگا میں نے اس کے لیے اپنی جان جھوکوں میں ڈالی تھی، شب بھر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں اور وہ سنائی دیتا تھا۔ مجھے اپنی فرم کے اصول و ضوابط بتا رہی تھی۔ شدید ذہنی اذیت نے میری زبان لنگ کر دی۔ چند لمحوں تک اُسے دیکھتا رہا، پھر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”تس میڈم! آپ نے بالکل درست کہا ہے۔ مجھے حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔“
دُکھ سے میرا لہجہ بھرا گیا اور میں نے اس سے نظریں ہٹا لیں۔

وہ ہماڑی۔ ”تم کہاں جا رہے ہو؟ تم شاید بھول گئے ہو کہ بغیر اجازت جانا یہاں کے آداب کے منافی ہے۔“
میں ملے بغیر ایک ذرا زکا، بولا۔ ”میں نہیں بھولا۔ آپ بھول گئی ہیں کہ میں ایک دیہاتی آدمی ہوں۔ میں فارمیٹور پر اتنا دھیان نہیں دیتا جتنا کام کی انجام دہی پر۔ آپ بھول گئی ہیں کہ آپ نے یہ کہہ کر کہ میں آپ کا دوست ہوں، نوکر نہیں، مجھے اوقات سے باہر کیا تھا۔ اسی ہوا میں اڑتا ہوا یارن خان کی حویلی میں داخل ہوا تھا۔ میں نے احتیاط برتی تھی کہ میرے ہاتھوں کسی کی جان تلف نہ ہو مگر مجبوراً مارا ماری کرنا پڑی۔ میں نہ کرتا تو خان کے باڈی گارڈز مجھے پھانچ لے دیتے۔ خان پر ہاتھ ڈالنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ جب مجھے پتا چل گیا کہ میرے مطلوب کہاں مقید تھے تو کیا میں آپ کے پاس رپورٹ دینے کے لیے بھاگ آتا؟ اس دوران پھر ہوا یارن خان ان دونوں کا نشانہ بن گیا یا انہیں کہیں اور لے جا کر چھپک دیتا۔ ایسا ہی ہوتا تھا؟ پھر کیا میں سر اٹھا کر آپ کو رپورٹ دیتا اور کہتا کہ جو کام میرے ذمے لگایا گیا تھا، میں نے کر دیا، یا حکم سے تجاوز نہیں کیا۔ میڈم! آپ ٹھیک کہتی ہیں کیونکہ آپ مالکن ہیں، اس فرم کی مختیار کل ہیں جس کا میں معمولی سا نوکر ہوں، کسی کا دوست نہیں ہوں، اس لیے جو کہتا ہوں، وہ غلط ہوتا ہے۔ جو کرتا ہوں، وہ غلط ہوتا ہے۔“

میری آواز جذبات سے مغلوب تھی۔ سانس لے کر دوبارہ گویا ہوا۔ ”میڈم! مجھے کسی بھی ذمے نے اتنا مضطرب نہیں کیا جتنا آپ کی زبان سے ملنے والے ذمے نے کیا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ جب آپ کا موڈ ٹھیک ہو جائے گا، تب

بلائیے گا، میں آ جاؤں گا۔“

میرا رویہ نامعقول تھا مگر اس وقت مجھے احساس نہیں تھا کیونکہ ٹھیک نے میرے حواس محل کر دیے تھے۔ میں توقع لے کر میڈم کے کمرے میں آیا تھا کہ وہ میرے کارنامے پر خوشی سے پھولے نہیں سامنے کی، وہ اٹنا ناراض تھی اور میری دانست میں اُس کی جھکی بے عمل تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر لکھنا چاہا تو میڈم کی جھکنا نہ آواز سنائی دی۔ ”شہر یار! کم بیک۔۔۔۔۔“
میں تھما، آزدگی سے بولا۔ ”نہیں پلیز! مجھے جانے دیں۔“

وہ بیڈ سے اتر کر ننگے پاؤں قالین پر چلتی ہوئی میرے عقب میں پہنچ گئی۔ شانے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑتے ہوئے بولی۔ ”جذبات انسان کو اندھا کر دیتے ہیں۔ ہر معاملے کو جذباتی نظر سے دیکھو گے تو دھوکے پر دھوکا کھاؤ گے۔ تم نے ایک نہیں، دو بھانک غلطیاں کی ہیں۔ سنو! تمہیں یارن خان کے قریب ہرگز نہیں جانا چاہیے تھا کیونکہ تم نہیں جانتے کہ وہ کتنا موزی اور خطرناک ناگ ہے۔ ڈسٹا ہے تو پانی تک پہنچتے نہیں دیتا۔ مجھے علم تھا کہ اس کی حویلی کے نیچے ایک طلسمانی دنیا آباد ہے۔ میں نے اُس میکروم سے متاثر ہو کر کسی سیریز پر تعمیر کرائی تھی۔ تم لاعلم تھے، اوپر سے خالی ہاتھ تھی۔ تم نے جو کامیابی حاصل کی ہے، یہ بہت بڑی ہے مگر ذرا یہ سوچو، کیا یہ اتفاقاً کامیابی نہیں؟ کیا تم نے دانستہ طور پر احمقانہ قدم اٹھا کر موت کے منہ میں ہاتھ نہیں ڈالا؟..... ذرا بتاؤ تو..... اگر تم مارے جاتے تو میرا کتنا بڑا نقصان ہوتا؟“

اس کی جلتی ہوئی آنکھوں میں بخ بہت جھیل کھل گئی۔ میں حیرت سے اُس پل بھر میں بدل جانے والی حید کو دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ”یارن خان اگر عام آدمی ہوتا یا دوسرے خاندانوں کی طرح باریک نگ ڈاگ ہوتا تو کب کا میرے ہاتھوں پکڑا گیا ہوتا۔“

اس نے شانے پر سے ہاتھ اٹھایا، میرا ہاتھ تھا اور کچھ کر صوفے تک لے گئی۔ ایک اداسے مسکرائی، پھر صوفے پر دھکیل کر بولی۔ ”دوسری غلطی تم نے یہ کی کہ زندقہ کی قیمت پر ہاتھ لگنے والی آسا کو تنے لکھالے کے ساتھ روانہ کر دیا۔ کیا تمہیں یاد نہیں تھا کہ میں نے آسا کو کتنی بڑی قیمت وصول کر کے میاں دلبر حسین کے حوالے کیا تھا؟ تم نے ہی وہ رقم رگوتسانی سے وصول کی تھی۔ بھول گئے تھے کیا؟..... زندہ ہاتھی لاکھ کا ہوتا ہے۔ مرا سوال لاکھ کا۔ تم اگر آسا کو میرے

پاس لے آتے تو وہ یقیناً پہلے سے کتنی قیمت دے جاتی۔ حیدر خان کو تم اتنا نہیں جانتے، جتنا میں جانتی ہوں۔ وہ اپنی بدنامی کے گواہ خالد عرف کھالے کو فوراً یاد پر گولی مروا دے گا۔ کیا سمجھے؟“

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے اس رخ سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میڈم! مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ رہی بات آسا کو یہاں لانے کی تو میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ میرا غیرتب بھی میرے عمل کو قبول نہیں کر رہا تھا جب میں اسے بے ہوشی کی حالت میں رگوتسانی کے حوالے کرنے گیا تھا مگر آپ کے حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ میں نے نئی مرتبہ سوچا، اپنے طور پر کہ میاں دلبر حسین کے تعاقب میں جاؤں اور آسا کو اس کی دلدل سے نکال لاؤں۔ پھر جب وہ مجھے نظر آئی تو مجھے اپنے ضمیر پر پڑی ہوئی بھاری بھر کم ہٹانے کا موقع مل گیا۔“

”یالی نقصان تو کیا ناں؟“ وہ اپنی بات سے ہٹے پر تیار نہیں تھی۔
”آپ کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔“ میں نے منہ بنا کر کہا۔

”اگر میرا آدمی یہی سوچ لے تو دنیا ناس اور شامی کا گہوارہ بن جائے اور ساری بھاگ دوڑی ختم ہو جائے۔“ اس کے لہجے میں طنز تھا۔ ”تمہاری نا تجربہ کاری کو مد نظر رکھتے ہوئے میں تمہاری اس غلطی کو نظر انداز کرتی ہوں۔ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ سمجھے؟“

میں نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ”نہیں میڈم! آپ کو جب بھی تکلیف میں دیکھوں گا، ایسے ہی اگلے سیدھے کام کروں گا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی، مجھے گھور کر بولی۔ ”یعنی ہر مرتبہ ایسا ہی کرو گے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے گل تھمتا اٹھے۔ آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں۔ بڑی سے بولی۔ ”اوہ لوکر بڑی مین! کیوں اپنی غلطی پر ڈٹ گئے ہو۔ ایسی حماقت پھر بھی نہ کرنا۔ کنوئیں میں گرے ہوئے آدمی کو نکالنے کے لیے کنوئیں میں اندھا دھند چھلانگ لگانے والا ذرا نقصان کر بیٹھتا ہے، فائدہ نہیں۔ تم مجھے بہت پیارے ہو اور میں تمہیں کھوتا نہیں چاہتی۔ کیا تمہیں اتنی سی بات کی بھی سمجھ نہیں آتی؟“
مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اب سمجھا تھا کہ وہ کیوں اتنی برا بھلا کہتی تھی کہ اسے میری کامیابی پر ذرہ بھر خوشی نہیں ہوتی

مسکرت

تھی۔ یہ عقدہ کھلتے ہی مجھے اس کا ختم ہوا چہرہ بڑا بھلا لگا۔ میں نے کہا۔ ”کیا آپ جذباتی انداز میں نہیں سوچ رہی ہیں؟“

وہ ایک دم تھم سی گئی۔ صوفے پر سر ڈال کر، آنکھیں موند کر ہونٹ کاٹنے لگی۔ سوچنے لگی۔ اس کے گالوں کی باریک باریک شریا میں جھلنے لگیں۔

میں نے اس کا ہاتھ تھا، تھوڑا سا کر توجہ کیا اور کہا۔ ”میڈم! آپ کی فرم کے امور میں جذبات کا عمل دخل یقیناً قابلِ برداشت نہیں ہوگا۔ پھر آپ نے مجھے کامیابی پر مبارک باد دینے کے بجائے اس نقصان کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جو ہوا ہی نہیں۔“

اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”شہر یار! اماں، سہو اور بابا بیٹیوں میرے نزدیک دنیا کے سب سے قیمتی انسان ہیں۔ انہیں مصیبت میں دیکھ کر میں باؤلی ہو گئی تھی کیونکہ میرا ان سے رشتہ ہے، تعلق ہے مگر تمہارا نہیں ہے۔ تمہیں اموشن نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دیکھو! وہ دونوں تو آگ میں گر گئے تھے۔ تم انہیں آگ سے نکالنے کے لیے گئے تھے۔ اپنے ہاتھ پاؤں بچا کر نکالنے، احمقوں کی طرح چھلانگ تو نہ لگا دیتے۔ میں مانتی ہوں کہ تم نے میری خاطر یہ قدم اٹھایا۔ تم شاید کبھی نہیں مانو گے کہ تم مجھے اتنے ہی پیارے ہو جتنا کہ سہو اور اماں مجھے پیارے ہیں۔ ہاں! جب مجھے پتا چلا کہ تم ان دونوں کو نکال لانے ہو تو مجھے ذرہ بھر خوشی نہیں ہوئی بلکہ میں یہ تصور کر کے کانپ اٹھی کہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو..... نہیں شہر یار! میں سچ کہتی ہوں کہ تم نے میرا دل دکھایا ہے۔“

اس کی آنکھیں اس کے بیان کی تصدیق میں نم ہو گئیں۔ میں مارے استغاب و مسرت کے اُسے ایک ٹک دیکھ گیا۔ وہ میری جانب کھٹک کر میرے پہلو سے لگ گئی، بولی۔ ”جب میرا شاہ میری حکم عدولی کرتا ہے، اول فول بکتا ہے، جب میں دیکھتی ہوں کہ تمہاری آنکھوں سے حیرانی جھلکتی گئی ہے۔ تم شاید سوچتے ہو گے کہ میں اس سے دیتی ہوں۔ نہیں! ایسا نہیں ہے۔ میں اس کا احترام کرتی ہوں کیونکہ مجھے اتنی بڑی سلطنت کی رانی بنانے والا وہی مضحکہ خیز حال حلیے والا میرا شاہ ہے۔ میں اس میرا شاہ کو دیکھتی ہوں جس نے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھادیا۔ اسی طرح میں اُس شہر یار کو دیکھتی ہوں جسے دیکھ کر مجھے یقین ملتا ہے کہ دنیا میں خلوص نام کا جذبہ ابھی موجود ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں کچھ ایسا سوچ رکھا ہے، جیسا

تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں۔

اس کی خسار آلود آواز ساعت میں اتر رہی تھی اور دل میں شگونی چھوڑ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ یوں سے لگایا اور منمننا بولا۔ ”میڈم! آپ بہت گہری ہیں۔ مجھے انفسوس ہے کہ میں نے آپ کو غلط سمجھا۔“

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بولی۔ ”ہاں! یہ ہوئی ناں بات..... مگر تم تو بوجھ پھلائے ہوئے بھی اچھے لگ رہے تھے۔ آدی اگر برہم ہو تو فطری صداقت یہی ہوتی ہے کہ وہ ناراض دکھائی بھی دے۔ جو شخص مجھ پر مسکراتا ہے، خوشی چھپا کر بے پروا نظر آتا ہے اور غصے کو دبا کر مسکراتا ہے، مجھ کو وہ لوگوں کی مرضی کے مطابق نظر آتا چاہتا ہے یعنی منافق ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم دہرے پن کا شکار نہیں ہو۔ آئی لو!.....“

اس نے ایک جھٹکے سے میری گود میں اپنا سر رکھ دیا، بولی۔ ”بالوں میں اٹھکلیاں پھیر دو۔“

میرا ایک ہاتھ اس کے بدن کے نیچے تھا۔ دوسرا بالوں میں رچھ گیا۔ اس کے ٹھٹھیلیں بال اٹھکیوں کی پوروں پر سرکنا جانتے تھے، دریا کی خشک ریت کی طرح۔ وہ کافی دیر تک ایسے ہی اوندھے منہ پڑی رہی، پھر بولی۔ ”کوئی بات کرو ناں!“ اس کے دل آویز رویے نے مجھ سے قوت گویائی چھین لی۔ میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔ ”میڈم! آپ سب سے مختلف ہیں۔“

”ہوں! یونو! واؤ ڈیفرنس! از سبیل آف بیوٹی؟“ وہ چبکی۔

”میں آئی نو میڈم! ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھو۔“

”کیا آپ واقعی میرے لیے پریشان تھیں؟“

”تو کیا میں جھوٹ بولتی ہوں؟“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”میرا مطلب نہیں تھا۔“ میں جھینپ گیا۔

”تمہارا مطلب کچھ بھی ہو، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”میں آپ کے بارے میں جانتا چاہتا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو وہی کہانی مکمل کر دیں جو آپ مجھے مس عالیہ کے کلینک میں سنانے لگی تھیں۔“

”چند دواہی اور بابا گائمن والی؟“ وہ ہنسی۔

”جی وی! میں نے کہا۔“ انسان جس سے محبت کرے، اس کے بارے میں سب کچھ جاننے کا خواہش مند ہوتا ہے۔“

”ہاں! تم نے ٹھیک کہا۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں

کی مگر وقت آنے پر.....“

”بابا گائمن اور اس کے خاندان کے تحفظ کی پالیسی کیا ہے؟“ ہوں.....“ اس نے میری گود سے سر اٹھایا، پھر بے ہوش کی اور بولی۔ ”بتاتی ہوں۔ تم فریج سے بوتل برف اور گلاس نکال لاؤ۔“

وہ پینا جاتی تھی۔ میں نے شکوہ کنال نظروں سے اُٹے دیکھا اور حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس کے ایما پر بیڈ پر تین چیزیں رکھ دیں۔ وہ صوف چھوڑ کر بیڈ پر آگئی۔ آتشی پانی مار کر بیٹھ گئی۔ گلاس میں آگ انڈیل کر، سفید انگارے ڈال کر گھونٹ گھونٹ حلق میں اٹھیلنے لگی، بولی۔ ”شہر یار! وہ تینوں اب بیٹ خیرہ پور میں محفوظ نہیں رہ سکتے کیونکہ وہ میرے حوالے سے منظر عام پر آ گئے ہیں۔ جب تک وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھے، زندہ اور محفوظ تھے۔ انہیں زندہ رکھنے کے لیے میں ان کی غربت کا کڑوا گھونٹ حلق میں اتار لیا کرتی تھی۔“ اس نے ایک بڑا گھونٹ بھرا اور گلاس خالی کر دیا، بولی۔ ”انسان کے پاس کروڑوں کا بینک بیلنس اور جائیداد ہو، تب بھی وہ اپنے پیاروں کو پانی پانی کو ترستا دیکھ کر صبر کرے، بہت صبر آزا ہے مگر میں نے اس عذاب سے صرف اس لیے مفاہمت کیے رکھی کہ میرا دشمن ان پر وار نہ کرے۔ اب وہ بات نہیں رہی اس لیے میں نے انہیں ملتان میں رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سچی محمدان کے ساتھ ہے۔ چند دنوں میں ان کا معقول بندوبست کر دوں گی۔“

میں نے تعجبی انداز میں سر ہلایا۔ اس نے میرے پوچھے بھانے میرے ذہن میں کھیلانے والے سوال کا جواب دے دیا تھا۔ اس نے ایک اور آتشیں جام تیار کیا۔ سر جھکا کر کچھ سوچا۔ ایسے میں اس کی انگلی نیچے ہونٹ سے کھینچی رہی۔ سر اٹھا کر بولی۔ ”اب تم گھر جاؤ۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

میں نے اس پر ایک بھر پور نگاہ ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ حسب سابق اس نے آواز دے کر دروازے میں روک لیا۔ میں نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”تم نے میری توقع سے کہیں بڑا کام کر دکھایا۔ وہ، جسے میرا وشاہ اور پیا جیسے کہا گئی آدی بھی کرنے میں ناکام رہے۔ تمہاری دل داری ضروری سمجھتی ہوں۔ یہی پوچھتی ہوں کہ تمہیں کیا انعام دیا جائے؟“

پرانے وقتوں کے بادشاہ ایسے ہی پوچھا کرتے تھے کہ بول، تجھے کیا انعام دیا جائے..... پھر بولنے والے کا منہ مچھوٹا اور ہیروں سے بھر دیا جاتا تھا۔ وہ بھی شاہانہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی۔ سوچا، آج انعام کا پوچھ رہی ہے، کل سلوک کا پوچھ گی، پھر بے ساختہ میری آنکھیں پھٹتی ہوئی اس کے سرخ اور ریلے ہونٹوں پر جا کر ٹوک گئیں، بولنے لگیں۔ ”شاہ وقت کے سوال کا جواب دیے لگیں۔“

وہ میرا جواب بھانپ گئی۔ ایک ذرا مسکرائی اور شوخ نظروں سے اجازت نامہ موٹا اٹھاتی ہوئی آنکھوں کی زباں سے بولی، ”ٹھیک ہے۔ تمہاری مراد تمہاری جھولی میں ڈال دی جائے گی۔“

مسکرا کر بولی ”ٹھیک ہے۔ اس بارے میں سوچوں گی۔ فی الحال تو میں نے تمہارے لیے ایسا تحفہ سنجال رکھا ہے جس کے بارے سن کر ہی تمہارا دل بارخ باخ ہو جائے گا، بتاؤں؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“

”پوچھو تو سہی.....“ وہ ایک ادا سے بولی۔

”بتا دیں۔ آپ کا تحفہ یقیناً نا باب ہوگا۔“

”جب تم رگوقسانی سے نوٹوں بھرا ہوا بریف کیس لائے تھے تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے ماں باپ کو قتل کرنے والا رگوقسانی ہے۔ تم نے اسے پہچانے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی اور اس سے بدلہ لینے کی اجازت چاہی تھی۔ یاد ہے ناں؟“ اس کی آواز جیس جگانے لگی۔

میں نے چونک کر کہا۔ ”جی میڈم! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پھر؟“ رگوقسانی کا خوفناک چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ہرا گیا۔

”چونکہ تم اس کے پاس اپنے کام سے نہیں گئے تھے، میرے بھیجے ہوئے گئے تھے، اس لیے اسے میزبانی کے آداب ملحوظ خاطر نہ رکھنے کی سزا دینا میرے لیے ضروری تھا۔ میرے حکم پر اس کی تلاش کا کام جاری تھا۔ کل شام اسے پورے والا کے علاقے عمر پور سے پکڑ کر سٹی میں پہنچا دیا گیا۔ میں نے سوچا کہ رگوقسانی تمہارے لیے میری طرف سے بہترین تحفہ ثابت ہوگا۔“ وہ ٹخنٹ سے بولی۔ ”کیوں؟“

”کیا خیال ہے؟“

میرا دل بلیوں اچھلا۔ بے ساختہ منہ سے نکلا۔ ”لو آ کر گریٹ میڈم! میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھلاؤں گا۔“ وہ فاخرانہ ادا سے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ”میں کسی وقت تم سے فون پر رابطہ کروں گی۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

میری بے اختیار نگاہیں اس پر ساکت ہو گئیں۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، گلاس دکھا کر بولی۔

”یہو گے؟“

میں نے جلدی سے انکار میں سر ہلایا۔

بولی۔ ”کیا تمہارے پاس سگریٹ ہے؟“

میں نے پھر سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔

وہ بے ساختگی آمیزہ مخور لہجے میں بولی۔ ”تو پھر ٹوک کیوں گئے؟ جاؤ ناں.....“

☆☆☆

شام کا کھانا تناول کرنے کے بعد میں اپنے چچا زاد موصوع دین عرف موصوع کے ہوم ورک والی کاپیاں چیک کر رہا تھا، میرے پہلو میں شانوفیسی چپک رہی تھی اور سختے درے فرزانہ پر چوٹیں کر رہی تھی جب کال بتل گئی۔ میں نے فوجی اختر کو بھیجا۔ توقع تھی کہ بیٹا جی یا میرا وشاہ آیا ہوگا۔ مگر فوجی اختر نے واپس آ کر کچھ سیت بھی کو چونکا دیا۔ ”خالد آیا ہے۔“

وہ کیوں آیا تھا؟ میرے ذہن میں کئی دوسرے کھیلانے لگے۔ میں نے اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا حکم دیا۔ فوجی اختر چلا گیا تو شانوفی بولی۔ ”یہ سویا لو ہار تمہاری جان زندگی بھر نہیں چھوڑے گا بھائی!“

اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد کھانا میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا حلیہ دیکھ کر دل کو ٹپکی ہوئی کہ خیریت یہی تھی کیونکہ وہ بن سنور کر، بال چنڈ کر آیا تھا۔ میں نے کھانے کا پوچھا تو اس نے کہا۔ ”نہیں یار! کھانا کھا چکا ہوں۔ چائے پلوا دو۔ پھر تمہیں مزے کی بات سنانا ہوں۔“

میں نے بہ آواز بلند فوجی اختر کو چائے بنالانے کا حکم صادر کیا۔ دروازے میں شانوفی جھانکا، بولی۔ ”بھائی کھالے! ہمارا گاؤں کیا ہے؟“

ہم دونوں چوٹے۔ مجھے فرش پر پڑنے والے سایوں سے اندازہ ہو گیا کہ شانوفی کے ساتھ فرزانہ اور موصوعی جہن تن گوش کھڑے تھے۔ کھالا اٹھا، دروازے میں گیا اور تینوں کے سروں پر پر داتی انداز میں ہاتھ رکھ کر پیار کرتے ہوئے نور پور کے بارے میں بتانے لگا۔ جب تینوں کی تشفی ہوئی، جب انہوں نے کھالے کی جان چھوڑی۔

چائے پینے کے بعد اس نے میرے استفسار پر بتایا۔ ”شہرے! میں نے بھی زندگی میں نہیں سوچا تھا کہ میں دلہنی بی بی جی اس طرح سائیکل پر سفر کریں گے۔ وہ بہت دلہنی تھی۔ بات بات پر رو رہی تھی۔ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ اسے نئی زندگی دینے والا نظیر اقبال کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے؟ میں اُسے ٹالتا رہا کیونکہ تم نے مجھے کہا تھا کہ میں

اس پر تمہاری حقیقت نہ کھولوں۔ پورے راستے میرا دل طلق میں اٹکا رہا۔ ڈرتا رہا کہ کوئی ہمیں روک نہ لے۔ وہ دیکھ برقعے کی وجہ سے دیکھنے میں بوزی لگتی تھی۔ بولتی تھی تو جوان آواز قلعی کھول دیتی تھی۔ جو بھی ہم بلوچ نگر کے قریب پہنچے، وہ اچھل کر سائیکل سے اتر کر اور پوچھنے لگی۔ ”خالد! تمہیں میری قسم! آج بتاؤ۔ ظفر اقبال کون ہے؟“

میں نے پوچھا۔ ”آپ کو کیا شک ہے؟“
وہ سوچ میں پڑ گئی، بولی۔ ”وہ دیکھنے میں پٹھان تھا۔ بولنے میں شیطانی سی جگہ اس کی آواز میری سنی لگتی تھی۔ چہرہ بھی دیکھا دیکھا لگتا تھا۔ وہ مجھے اور میرے خاندان کو جانتا تھا مگر میں اسے نہیں جانتی ہوں، سبھی پوچھ رہی ہوں۔“
اس نے مجھے اپنی قسم دی تو میں خود کو بچ بولنے سے روک نہ پایا اور بول پڑا۔ ”بی بی جی! وہ کوئی اور نہیں تھا، میرا یار تھا؛ شہزاد خان..... اس نے سوانگ رچایا ہوا تھا مجھی آپ کی نظریں دھوکا کھا گئیں۔“

وہ پچھنی پچھنی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ دل یقین کرتا تھا۔ دماغ مسکرتا تھا۔ مزد انداز میں بولی۔ ”مگر اس نے مجھے یارن خان کے تھانے سے کیوں نکالا؟“

میں نے اُسے تمہارے بارے میں صاف صاف بتا دیا۔ وہ رو نہ گئی۔ کہنے لگی۔ ”مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں برے بھلے کی پچان کونہ بھی ہوں۔ مجھی اُسے کتنا قرار دیتی ہوں۔ کبھی اسے فرشتہ سمجھتی ہوں۔ خالد! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ کیا میں پاگل ہو گئی ہوں؟“

مجھے اس کی حالت پر ترس آتا تھا۔ میں نے اُسے سائیکل پر بٹھایا اور اس کے اصرار پر بلوچ نگر سے کچھ فاصلے پر واقع اس کے باپ کے ڈیری فارم پر چھوڑا اور بڑے خان کے دارے پر پہنچ گیا۔ وہ زنان خانے میں تھا۔ میں نے سوئے ہوئے نوکر کو چگا کر بڑی مشکل سے خان کو چگا لانے کے لیے اندر بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد خان آنکھیں ملتا ہوا دارے پر آ گیا۔ ناوقت چگائے جانے پر خاصا برہم تھا۔ پریشان بھی تھا۔ میں نے تخلیق میں اسے بی بی جی کے بارے میں بتایا تو اس کی سستی ایک دم اُڑ چھو ہو گئی۔ عام حالات میں وہ اپنے کن مینوں کے علاوہ دارے سے نہیں لکھتا۔ بی بی جی کا سن کر میرے ساتھ ڈیری فارم پر دوڑا چلا آیا۔ دونوں باپ بیٹی کی ملاقات کا منظر بڑا دردناک تھا۔

سردار حیدر خان مجھے اور خازنہ اوی کو ساتھ لیے زنان خانے میں اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ اس نے میری موجودگی میں ہی بی بی جی سے کرید کرید کر پوچھا۔ یارن خان اور

میاں دلبر حسین کو جی بھر کر گالیاں دیں۔ بی بی جی نے کہا۔ ”بابا! میں جانتی ہوں کہ شہزاد اپنی بہن کی وجہ سے آپ کا دشمن بنا تھا۔ اس نے مجھے چھوڑا تک نہیں۔ میاں دلبر اور یارن خان آپ کے خیر خواہ تھے جنہوں نے مجھے زندہ رہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔“

باپ کو بیٹی کا چہرہ آنکھیں بن کر شہزاد ہوا تھا۔ اس نے سر ہکا لیا۔ بیٹی بولتی رہی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ آپ اس کینے میاں دلبر اور شیطان یارن خان کو زندہ رہنے کے قابل نہ چھوڑیں۔ وہ سب سب کمر میں گئے تو مجھے چین آئے گا۔“

سردار حیدر کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ ہاتھ کچپکپانے لگے تھے۔ اس نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ دونوں مردودوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا اور شہرے کو چھڑے گا نہیں۔ پھر دونوں باپ بیٹی مجھے سے تمہارے ٹھکانے کا آنا چتا پوچھنے لگے۔ میں نے انہیں ٹال دیا اور صبح ہونے سے قبل لوٹ آیا۔ آج سہ پہر کو جب میں چوک قریبی کے ہوٹل پر چائے پی رہا تھا، حیدر خان کا ایک ہرکارہ مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ وہ کار میں آیا تھا اور مجھے اپنے ساتھ حیدر خان کے ڈیرے پر لے جانے پر مہر تھا۔ چونکہ دیہاڑی ڈارڈرائو پر ہنگ پر تھا، اس لیے میں نے معذرت کر لی اور کہا کہ پھیرا لے نور پور جاؤں گا اور واپسی پر خان کے دارے کا چکر لگوں گا۔ پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ تیار شیار ہو کر دارے پر پہنچ گیا۔

بڑا خان میرا منتظر تھا..... ہنومت! وہ کھالے لوہار کے انتظار میں دارے کے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر خاص بہانوں والے کمرے میں لے گیا۔ تم سے ملنے کی ضد کرنے لگا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میرا تم سے مسلسل رابطہ نہیں ہے اور نہ ہی مجھے تمہارے شیے ٹھکانے کی خبر ہے۔ مجھے منانے میں ہر طرح سے ناکام ہونے کے بعد اُسے کچھ آئی کی میں کسی بھی صورت اسے تمہارے گھر کا پتا نہیں بتاؤں گا۔ تب اس نے پٹیترا بدلا اور مجھے کہنے لگا۔ ”کھالے! تم میرے ساتھ ملنا چلو اور اُسے تلاش کرو۔ جہاں کہیں ملے، اُسے میرے پاس لے آؤ۔ اگر نہ ملا تو واپس آ جانا۔“

میں نے مجبوراً اس کی بات مان لی اور اس کے ساتھ یہاں آ گیا۔ اس نے مجھے اپنا وزننگ کارڈ جس پر اس کا موبائل فون نمبر چھپا ہوا ہے اور دو ہزار کے کرائے کے نوٹ تھا کر تمہاری تلاش میں روانہ کر دیا۔ یوں میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔“

کھالے نے بات ختم کی اور صوفے سے پشت ٹکا دی۔ میں نے اُسے گھورا۔ ”تم تو نرے گنوار لکھے ہو۔ اس کے کارندے تمہارا پیچھا کر کے میرا دروازہ دیکھ گئے ہوں گے۔ مرداد یا ناں کو سنے کی اولاد!“

اس نے جواباً گھورا اور برہمی سے بولا۔ ”تو میکوں بدحواس تھا؟ واہ بھئی واہ..... مجھے بے ڈر تھا اس لیے میں آگے پیچھے دیکھ کر یہاں آیا ہوں۔ میں نے راستے میں کئی دیکھ بدلے۔ جب یقین ہو گیا کہ خان نے میرے پیچھے کسی کو نہیں لگایا، تب میں نے ادھر کا رخ کیا۔“

میں نے کہا۔ ”مگر وہ کینہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟“
”وہ تمہارا شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔ یار! کمال کرتے ہو تم بھی۔ ہر بات میں شک کے کیرے نکالنے بیٹھ جاتے ہو۔ بڑی بات ہے۔“ وہ ہنسنے سے اکھڑ گیا۔

”نہیں یار! اس کی خصلت بری ہے۔ وہ کسی کا احسان مند نہیں ہوتا۔ مجھے تو یہ وہم بھی ہے کہ وہ ہمیں اور آسا کو بھی ’پار‘ کر دے گا، دیکھ لیتا۔“

اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میرے سر پر سنگ نکل آئے ہیں۔ بولا۔ ”ہونہ! پار کر دے گا۔ جانتے ہو، وہ بی بی جی سے کتنا پیار کرتا ہے۔ اور وہ مجھے کیوں ’پار‘ کر دے گا؟ میں نے اُس کا کیا بگاڑا ہے، ہیں؟“

میں نے اس کی ناراضی کی پروا نہ کرتے ہوئے خان سے ملنے سے قرت اٹکا کر دیا۔ میں حیدر خان یا اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ برابر مجھے مانتا رہا۔ سمجھا تا رہا کہ حیدر خان کا دل موم ہو گیا ہے۔ اس سے بنا کر مٹنی چاہیے۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ امیروں سے ٹکراؤ ہمارے بس کی بات نہیں تھی، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اُس کا پوچھا۔ ”یار کھالے! آخر مجھ اس سے ملنے کا کیا فائدہ ہوگا؟“

”آخر تمہیں نقصان بھی کیا پہنچے گا؟“ وہ زچ ہو کر بولا۔ ”بھلے آدمی! مل کر دیکھو تو کسی کہ وہ کیا کہتا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ اگر اس کی کوئی بات دل کو لگے تو ٹھیک ورنہ تم اپنے گھر خوش، وہ اپنے گھر۔“

میں نے اُسے ڈرائنگ روم میں چھوڑا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ فون پر میڈم ٹیکلے سے رابطہ کیا۔ شکر ہوا کہ اس نے کال اٹینڈ کر لی۔ میں نے اُسے مختصر الفاظ میں کھالے کی آمد اور سردار حیدر خان کی خواہش کے بارے میں بتایا، وہ بولی۔ ”تمہارا دوست ٹھیک کہتا ہے کہ تمہیں اس سے مل لینا چاہیے۔ اُسے کہہ دو کہ تم حیدر خان سے کسی ہوٹل میں مل

شام کو ملو گے۔ اپنے گھر یا حیدر خان کی کوٹھی پر نہیں۔ ہوٹل اور جگہ کے بارے میں تمہیں بتا دوں گی اور تم کب سہ پہر میں حیدر خان یا خالد کو انعام کر دو گے۔ اوکے ایڈ بائے!“

میں تعقبات بات کرنا چاہتا تھا مگر اس نے اپنا فیصلہ سنا کر فون بند کر دیا تھا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں آ کر کھالے سے کہا۔ ”ٹھیک ہے یار! اگر تم بعد ہو تو میں ہی تمہارا ڈال دیتا ہوں۔ اسے جا کر کہہ دو کہ کل شام ملاقات ہوگی۔“

کھالے کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری، بولا۔ ”مجھے الو نہ بتاؤ۔ تم میری ضد پر ہتھیار نہیں ڈال رہے ہو بلکہ اپنی میڈم کی اجازت پر پھرک رہے ہو۔ خیر! مجھے آموں سے غصہ ہے، بیڑوں سے نہیں۔ میں اُسے جا کر خوش خبری سناتا ہوں۔“

”میں کل تین چار بجے تمہیں ہوٹل کا نام اور وقت بتا دوں گا۔ تم خان کو مطلع کر دینا۔“ میں اس کا طنز نظر انداز کر کے بولا۔ ”کیا تم ملتان میں رات گزارو گے؟“

”ہاں..... میں خان کی کوٹھی پر جاؤں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ رات میرے گھر میں رہے مگر وہ نہیں مانا اور چلا گیا۔

کھالہ مجھے نئے ٹھکانے میں ڈال گیا۔ حیدر خان سے کسی خبر کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کیونکہ اس کی سرشت میں بھلائی اور شکر گزاری کا مادہ شامل نہیں تھا۔

جب سے مجھے میڈم نے رنگو قاتی کے بارے میں بتایا تھا، طبیعت میں عجیب سا ہیجان اور اضطراب بھر گیا تھا۔ توقع تھی کہ اگلی صبح مجھے میڈم کے خفیہ اڈے ’سی ون‘ میں پہنچا دیا جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ ایک بجے کے قریب میڈم نے فون پر شہر کے ایک معروف ہوٹل کا نام بتایا اور کہا۔ ”شہزاد یار! وہاں تمہارے لیے کمر نمبر تین سو پانچ ریزرو ہے۔ تم چار بجے پہنچ جانا۔ حیدر خان کو پانچ بجے فون کر کے وہاں بلا لیتا۔ اور ہاں! یہ دھیان رکھنا کہ تمہاری پرسنلٹی ڈسٹنگ ہوئی چاہیے۔ حیدر خان دیکھے تو کھینچتا ہی رہ جائے۔“

میں تیار ہو کر، نیا اور قیمتی سوٹ پہن کر چار بجے رکشا میں بیٹھ کر ہوٹل پہنچ گیا۔ پہلی مرتبہ اس ہوٹل میں آیا تھا جس کی جدید طرز کی بلند عمارت کو دیکھتے ہی دل پر دھاک بیٹھ جاتی تھی۔ اندر کا منظر آنکھوں کو حیرہ کرنے والا تھا۔ ہال سے گزر کر استقبالی کاؤنٹر پر پہنچا۔ تعارف اور اندراج کی عمومی کارروائی کے بعد روم کارڈ لیے گاؤڈ کی رہنمائی میں لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں تھرڈ فلور پر واقع روم نمبر تین سو پانچ میں تھا۔ وال ٹوال کا پینڈ روم

کے وسط میں اسپرنگ بیڈ لگا ہوا تھا۔ ایک طرف صوفے اور ٹیبل لگی ہوئی تھی۔ ان کے پیچھے وال ٹیوال پر دھبہ لہرا ہوا تھا۔ میں مقررہ وقت پر پہنچا تھا۔ چونکہ میرے پاس ایک گھنٹا فراغت تھی، اس لیے میں کمرے کو اپنے انداز میں ٹھونک بجا کر دیکھنے لگا۔

پانچ بجے میں نے کھالے سے رابطہ کیا اور اسے ہوٹل کا نام اور کمرانمبر بتا دیا۔ اس نے قہقہے دیر بعد مجھے کال کی، بولا۔ ”خان جی سے بات ہو گئی ہے۔ وہ ٹھیک ہے۔ تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ یا شہرے ادھیان رکھنا۔ کوئی ایسی سیدی بات مت کرویتا۔“

میں نے ہنستے ہوئے دلاسا دیا۔ ”فکر نہ کرو۔ میں تمہاری کہتا عاشق بھیڑ معشوق قسم کی محبت کو ذہن میں رکھوں گا۔“

اس نے حسب توقع شایان شان جذبہ خیر سگالی پیش کیا۔ میں نے ہنستے ہوئے فون بند کیا اور میڈم سے رابطہ کیا۔ اسے رپورٹ دی، وہ بولی۔ ”شہر یار! حیدر خان سیاسی گرگٹ ہے۔ بھروسے والا آدمی نہیں ہے۔ تم اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھنا۔ ملاقات کے دوران اپنا فون سائیلنٹ موڈ پر کر دینا۔ میں کال کروں گی، تم ریسپونڈ کر کے خاموشی اختیار کر لینا تاکہ میں تم دونوں کے بیچ ہونے والی گفتگو سنتی رہوں۔ میری مشاورت کی ضرورت محسوس کرو تو ہاتھ روم میں جا کر بات کر لینا۔ اور ہاں! تم نے برابری کی سطح پر اس سے بات چیت کرنی ہے۔“

فون بند ہو گیا۔ میں ٹھنسی سی اسکرین کو گھورتا رہا۔ چھ بجے حیدر خان کو روم سرور نے میرے کمرے میں پہنچا دیا۔ میں نے میڈم کی ہدایات کے مطابق برابری کی سطح پر کھڑے ہو کر سردار حیدر خان کا استقبال کیا۔ وہ میرے ساتھ چلتا ہوا صوفے پر آن بیٹھا۔ میں نے پوچھا۔ ”آپ اکیلے آئے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”نہیں۔ گارڈز کو نیچے پارکنگ میں چھوڑ آیا ہوں۔“ اس کی بھاری اور ٹرک دار آواز کمرے میں گونجی۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب میں اس فرعون کی پیلے والی حویلی کی ایک چارپائی پر بے حس و حرکت پڑا تھا اور وہ فرعونیت بھری آواز میں مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ ”بتاؤ سنے بھئی کے بیچ! خانزادی کہاں ہے؟“

تب میں نے اسے بتایا تھا کہ وہ میاں دلبر حسین کے پاس ہے تو اس کی شکل بگڑ گئی تھی۔ شاید اس نے میری بات کا یقین بھی نہیں کیا تھا۔ مقام ملاقات کی نوعیت بدل گئی

تھی۔ اس کی شخصیت کا وہ دب دہ جہم دیہاتیوں کی سرشت میں گھلا ہوا تھا، آج بہت کمزور ہو گیا تھا۔ میں نے انٹرکام پر فاسٹ فوڈ اور ڈرنکس کا آرڈر نوٹ کرایا اور اس کے قریب صوفے پر آن بیٹھا۔ اس نے حسب معمول آف وائٹ کرڈ کی کا بہترین سوٹ اور کالے رنگ کی واسکٹ زیب تن کی ہوئی تھی۔ گرم ادنی مثال کندھوں پر مخصوص انداز میں ڈال رکھی تھی۔

مجھے دیکھتے ہوئے سرانیکی زبان میں پیار سے بولا۔ ”شہرے پتر! ڈو! ڈو! ڈو! ای ہوندائے۔ نکا ہمیش کیسے نکائی رہندائے۔ وڈا معانی سکے تان وڈا یائی، نکا من و نچے تان وڈا یائی..... ڈیکھ! میں جیڈے کو لوں معانی ممکن آیاں۔“ (شہرے پتر! بڑا بڑا ہی ہوتا ہے۔ چھوٹا ہمیشہ چھوٹا ہی رہتا ہے۔ بڑا اگر معانی مانگے تو یہ اس کی بڑائی اور چھوٹا مان جائے تو یہ اس کی بڑائی ہوتی ہے۔ دیکھو! میں تم سے معافی مانگنے کے لیے آیا ہوں)

مجھے ایک لمبے کواکونوں سے پر یقین نہیں آیا۔ ایسے ہی وقت میڈم کی کال آ گئی۔ فون میرے ہاتھ میں تھا۔ اسکرین کے ٹیک کرنے پر میں نے غیر محسوس انداز میں کال ریسپونڈ کر لی، کہا۔ ”خان جی! ان باتوں کو چھوڑیں۔ جو ہونا تھا، ہو گیا۔ آگے کیا ہوتا ہے، یہ سوچنے کی بات ہے۔“

وہ بولا۔ ”نہیں شہرے! دلوں میں میل ہوتو بیٹھنے اور باتیں کرنے کا فائدہ نہیں۔ جب مجھے خانزادی نے بتایا کہ تم نے اُسے کیسے یارن خان کی حویلی سے نکالا تو میرا سر فخر سے بلند ہو گیا کہ میرے خاندان کا جوان اپنے خاندان کی رنج سنبھالنے جوگا ہو گیا ہے۔ میں نے اسی وقت تم سے ملنے اور تمہارا شکریہ ادا کرنے فیصلہ کر لیا۔“

وہ واقعی سیاست دان تھا۔ اس نے میری بہن کو اغوا کر لیا تھا۔ اسے اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا۔ میرے چاچا اور چچی کو گھر سمیت جلا کر خاکستر کرنے والا مرکزی کردار وہی تھا جسکے اس کے نزدیک میں نے اس کو اغوا کیا تھا۔ ان سب باتوں پر پردہ ڈال کر میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ میڈم نے بیچ کہا تھا کہ وہ سیاسی گرگٹ تھا۔ رنگ بدل کر وار کرتا تھا۔

میں نے کہا۔ ”میں نے جو کچھ کیا، اس کے لیے کیا، آپ کے لیے نہیں۔ چونکہ آپ اس کے والد ہیں، اس لیے میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔“

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ میں نے اس کی بیٹی کا نام لیا تھا۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا۔ بجلی مرتبہ جب میں نے اس

کا نام اس کے سامنے لیا تھا تو اس نے پھاڑ کھانے کے سے انداز میں تنبیہ کی تھی۔ ”اپنی گندی زبان سے خانزادی کا نام مت لو ورنہ ابھی زبان کاٹ دوں گا۔“

آج اس نے یہ کڑوی گولی حلق میں اتار لی تھی، بولا۔ ”شہرے خان! مجھے تم پر فخر ہے۔ میں خانزادی کا بابا بن کر نہیں، بلوچ خانوادے کا بڑا بن کر تم سے بات کرنے آیا ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ تمہاری رگوں میں اسی غیرت مند خاندان کا خون دوڑ رہا ہے، اس لیے چل کر آیا ہوں۔ مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔“

میں چونکا۔ ”کیسی مدد؟ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ وہ میری طرف جھک آیا، راز داری سے بولا۔ ”یارن خان نے خاندان سے باہر شادی کی تھی۔ تمہیں علم ہے اس بات کا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”وہ کسی گندے خاندان کی عورت تھی۔ یہی وجہ ہے یارن خان کی آنکھوں پر بھی بے غیرتی کی چرچی چڑھ گئی ہے۔ خانزادی اسار شے میں اس کی بیٹی بھی لگتی تھی۔ دشمنی کے بغیر اس نے اپنی بیٹی کے ساتھ منہ کالا کیا۔ کیا یہ بات قابل معافی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں خان جی! خاندان کی بیٹی، سگی بیٹی جیسی ہوتی ہے۔ اس پر میلی نگاہ ڈالنا بے غیرتی ہے۔“ اس کے بدن کو جھونکا۔ یہ کڑوی گولی لگتی مشکل تھی مگر ناچار نگل گیا، بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ جو آگ اس نے خاندان میں لگا دی ہے، وہ اس کے گھر میں بھی بھڑکے۔“ ”یعنی آپ چاہتے ہیں کہ اس کی بیٹی کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے جیسا آپ کی بیٹی کے ساتھ ہوا؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں..... تاکہ اس کے پاؤں چلیں۔“ اس نے تھوک لٹکا، چہرہ متغیر ہوا مگر غصہ دبا کر بولا۔ ”اسے پتا چلے کہ کسی بھونٹیا پر ہاتھ ڈالنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔“ اس کی آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں اور سانسیں بھول گئیں۔ تھوڑے سے توقف کے بعد بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم اس کام میں میری مدد کرو۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ ہڈی ہیر جواب دینے لگے ہیں جبکہ یہ جو انوں کا کام ہے۔ تم لاہور جاؤ اور اس کی بیٹی عافہ خان کو اٹھا لاؤ۔ اس طرح کہ پتا بھی چلے کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ ادھل گئی ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

میں اس کے بل پر سرخ ہوتے چہرے کو بڑے غور

سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی امید بھری نظروں کے جواب میں میں نے نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ”نہیں خان جی! میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ آپ کو کبھی مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بھی وہ کام نہ کریں جو یارن خان نے کیا ہے۔“

اسے میرا مشورہ ایک آنکھ نہیں بھایا۔ منہ بنا کر بولا۔ ”میں نے کہا تھا کہ مجھے تمہاری مدد چاہیے، نصیحت کی بارش میرے دل میں بھڑکنے والی آگ کو نہیں بجھا سکتی۔ اس کام پر جتنا بھی خرچ آئے، میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ دس، بیس، پچاس..... جتنے لاکھ بھی لگیں، میں دینے کو تیار ہوں۔ بولو!“

اس کے دل کی بات زبان پر آگئی تھی۔ میں نے استہزاء انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا مجرم اکیلا یارن خان ہی نہیں، میاں دلبر بھی ہے جس نے یاری کی آڑ میں آپ کی پیٹھ میں چھرا کھونٹا ہے۔“

وہ ٹپ کر بولا۔ ”بے غیرت یارن کے بعد اس کی باری ہے۔ میں اس کتے کو کسے بھول سکتا ہوں۔“ میں نے ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد واش روم کا قصد کیا۔ فون پر میڈم کی کال چل رہی تھی۔ میں نے فون کان سے لگا لیا اور نہایت مدغم آواز میں بولا۔ ”میڈم! آپ نے اس کتے کی باتیں سن لیں؟“

اس کی آواز کان میں گونجی۔ ”اس سے دو کروڑ میں سودا لے کر لو۔ آدمی ادائیگی پہلے، آدمی مال کی وصولی پر۔“ میں نے مزاحمت کی۔ ”مگر میڈم.....“ ”فضول باتیں نہ کرو۔ جو کہتی ہوں، وہ کرو۔“ اس کا لہجہ سخت تھا۔

میں واش روم سے نکل کر خان کے پاس آیا، کہا۔ ”خان جی! میں آپ کی باتیں سن اور سمجھ چکا ہوں۔ میں آپ کی مشکل آسان کر سکتا ہوں۔ آپ کو انعام کی آگ ٹھنڈی کرنے کا موقع دے سکتا ہوں مگر اس کی قیمت آپ کو ادا کرنا ہوگی۔“

وہ خوش ہو گیا۔ ”ہاں ہاں بولو! مجھے منظور ہے۔“ میں نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائیں۔ ”دو کروڑ روپے.....“

اس نے دیدے پھیلانے۔ ”دو کروڑ! یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ میں اتنی رقم کہاں سے دے سکتا ہوں۔“ میں نے کندھے اچکائے۔ ”تو پھر اس معاملے پر مٹی ڈالیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

زوردار بحث کے بعد آخر اسے ہاتھ پاؤں لٹا پڑے اور دو کروڑ پر سودا ڈن کرنا پڑا۔ میں نے اگلی شرط سنائی۔

”آدمی رقم ایڈوانس، آدمی کام ہونے پر۔“ اس نے اس شرط پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور بولا۔ ”دس دن کے اندر تمہیں رقم پہنچا دوں گا۔ کام ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟“

میں نے کہا۔ ”دس دن یا ایک ماہ..... گولی مارنے سے عزت پر دھبا لگانا مشکل ہوتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔“

اس نے مجھے تاکید کی کہ میں اس ڈیلنگ کا تذکرہ خالد عرف کھالے لوہار سے ہرگز نہ کروں۔ میں نے ہاں بھری۔ اس دوران تواضع کا سامان میز پر سرد کر دیا گیا۔ اس نے ایک سیڑھ وچ اور کولڈ ڈرنک لیا۔ وہ سیاست دان تھا۔ سیاسی ہنڈیا میں جھوٹ کی ترکاری ابلانے کے ہنر میں یکساں تھا۔ اس نے خوشامد مانہ باتوں سے میرا دل موہنے کی بھرپور کوشش کی۔ خاندانی غیرت ابھاری۔ کئی بیٹھے اور سہانے خواب میری جاسی آنکھوں کے حوالے کرنے کے بعد اس نے رخصت چاہی۔ میں اُسے گیلری تک ”سی آف“ کرنے آیا۔ ایسے میں میرے لبوں پر بھی دکھاوے کی مسکراہٹ چھپی ہوئی تھی۔

میں نے کمرے میں آ کر دروازہ بند کیا۔ بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ فون کان سے لگا کر بولا۔ ”میڈم! یہ آپ نے کیا، کیا؟ کیا اب میں یارن خان کی بیٹی کو اغوا کرنے لاہور جاؤں گا؟“

اس نے ہنستے ہوئے میری بات کاٹ دی، بولی۔ ”نہیں جانم! تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا ہوگا۔ دیکھتے جاؤ، میں کیا کرتی ہوں۔“

”مگر.....“ ”اگر مگر تم نہ کرو۔ فوراً کرا چھوڑ دو اور فوراً تھک لہو کر رو تم فوراً فونوں میں آ جاؤ۔“

”کیا مطلب؟ کیا آپ بھی اسی ہوں میں ہیں؟“ میں حیران رہ گیا۔

”تو کیا میں تمہیں اکیلا چھوڑ سکتی ہوں۔ کم آن!“ اس نے کہا اور کال منقطع کر دی۔ میں کمرے سے نکلا۔ طویل راہداری کے آخر پر واقع سیڑھیاں چڑھ کر چوتھی منزل پر پہنچ گیا۔ کمرانبر چار سو آکٹا لیس تلاش کرنے میں دقت پیش نہیں آئی۔ دستک کے جواب میں میڈم نے دروازہ کھولا۔ میں اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ وہ سرخ اور زرد رنگ کے نفیس اعتراضی سوٹ میں تھی۔ سیدی دلی میں اتر گئی کیونکہ اپنے ثقافتی لباس میں وہ تباہست ڈھارہی تھی۔ میں نے اسے

اکثر چینیٹ ٹرٹ میں دیکھا تھا۔ وہ میرے انتہاک کوتاہ گئی، ایک ذرا مسکرا کر بولی۔ ”کیا باہر ہی کھڑے رہو گے۔ اندر آ جاؤ۔“

کمرے کی تزئین و آرائش دیکھی تھی جیسی نیچے فلور پر دیکھ آیا تھا۔ بے آواز چلتے ہوئے ٹی وی سے پھوٹی ہوئی مختلف رنگوں کی کریمیں فالٹین اور دیوار و در پر تھرک رہی تھیں۔ نرم دودھیائی روشنی میں، میڈم کی ہوش رہا مودگی میں کرا خواب ناک کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ وہ میرے آگے چلتی ہوئی انٹرکام تک آئی۔ مینوسل پر رنگا ہیں دوڑاتے ہوئے ریلیور کان سے لگا کر درمیں سروں کو کھانے کی ہدایات دینے لگی۔ فارغ ہو کر میری طرف ہٹتی۔ چند لمحوں اپنے مخصوص شوخ انداز میں دیکھتی رہی پھر ہوا میں اچھلی اور دونوں ہاتھیں پھیلا کر چاروں شانے چت بیڈ پر گری۔ بیڈ کے اسپرنگوں نے اسے کم دیش تین فٹ اوپر اچھال دیا۔ چند لمحوں تک اوپر بیچھے ہوئی رہی، پھر بولی۔ ”شہر یار! آج میں اپنے لیے سگریٹ لے آئی ہوں۔“

میں نے برا سامنہ بنایا، کہا۔ ”آپ سگریٹ بیٹی ہوئی اچھی نہیں لگتیں۔“

اس نے جواب مانہ بنایا۔ ”میں کب اچھی لگنا چاہتی ہوں۔“ اس نے اپنے بائیں ہاتھ بڑی تپائی پر ہاتھ مارا۔ سگریٹ کیس اور لائٹر اٹھایا۔ ایک سگریٹ منتخب کر کے نکالی اور دانتوں میں داب کر سلگالی۔ سگریٹ کے دھوئیں نے بند کمرے میں پھرائی ہوئی ازفر بشر کی خوشبو کو آن واحد میں پڑ کر لیا۔ وہ میرے چہرے کے آؤر چڑھاؤ بھانپتی ہوئی ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے کھانے لگی۔ سگریٹ والا ہاتھ ہوا میں لہرا کر بولی۔ ”سگریٹ کے ایک سرے پر آگ جلتی ہے اور دوسرے سرے پر احمق کا دل سلگتا ہے۔ ہے ناں مزے کی بات؟“

میں خاموشی سے کھڑا رہا، وہ بولی۔ ”میں بچپن میں چوری چوری حقہ پیا کرتی تھی۔ جب چلم میں گڑم ہوتا تب شدید کھانسی آتی۔ نہ جانے پھر بھی کیوں حقہ پینے میں مزہ آتا تھا۔ تم دیہاتی ہو۔ جانتے ہی ہو گے کہ حقہ پینے والا سارا دان بھوکا تو رہ سکتا ہے مگر حقے کے بغیر ایک گھنٹا نہیں گزار سکتا۔“ میں نے طویل سانس لی۔ ”ہیلز! آپ سگریٹ نہ پیا کریں۔“ وہ بولی۔ ”تم ایسے کیوں منہ بنائے کھڑے ہو۔ ادھر آؤ ناں۔ اپنی برادری کے اہم لی اے کے بارے میں بتاؤ۔ آج وہ سانپ اپنی جگہ اتر کر آیا تھا۔ کیسا لگ رہا تھا؟“

میں بیڈ کی ایک کٹ پر ٹک گیا، بولا۔ ”اس کی عیارانہ



شہر برباد کئی دھول

ڈاکٹر شیر شاہ سید

ہر قوم تاریخ میں اپنی تہذیب اور ثقافت کے حوالے سے ایک الگ شناخت قائم کرتی ہے۔ مگر اس قوم کی کوئی انفرادیت کسی ورق پر محفوظ نہیں رہتی جو اپنی تباہی کا سبب خود بن جائے اور جب انہی قصوں کو دہرانے والے دنیا سے پرہیز کرتے ہیں تو اپنے ساتھ ان داستانوں کو بھی دفن کر جاتے ہیں۔

دل سوز قصوں کی سرزمین..... جہاں ہر چہرے کی الگ کہانی ہے

بڑی سی دانشمن فلان کی ٹیکسی کے لیے چوڑے،
گورے چنے ڈرائیور نے میرا سوٹ کیس اور بیگ اٹھا کر
ڈنگی میں ڈالا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ میرے لیے کھول دیا۔
مجھے پیچھے بیٹھنے میں ہمیشہ کوفت ہوتی ہے۔ میں آگے کا دروازہ

اُس کے ساتھ کیا انسانیت سوز اور اخلاق پاش سلوک کیا گیا تھا۔ ہاں! یارن خان کی بیٹی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا اور وہ وقت گزرنے پر بھول جائے گی۔ غریبوں کی لڑکیاں خود کشیاں کرتی ہیں اور تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ خاندانیاں، اسایا عافیہ خان، باکر دار اور پارسا لڑکیاں ہیں؟ کیا ان کی راتوں میں انگارے پھینکنے والا کوئی مشتاق چاند طلوع نہیں ہوتا؟..... نہیں شہر بارا کوئی ظلم نہیں ہوگا اگر ان کی دو چار راتیں بچ کھالی جائیں گی۔“

میں اس کی باتوں میں جچی سنگین معنویت سمجھ رہا تھا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ میڈم میرے سمجھانے کے باوجود وہی کرے گی جو وہ دل میں ٹھان چکی تھی۔ بھی میں نے کندھے اُچکائے، کہا۔ ”میڈم! آپ بہتر فیصلہ کر سکتی ہیں۔“ وہ خوش ہو گئی، سگریٹ کو شیشے کی اینٹ خرابے میں ملانے ہوئے بولی۔ ”گڈ! اب ہم اس موضوع کو وقت آنے پر ڈسکس کریں گے۔“

وہ میری جانب جھکی۔ قریب آتے آتے رک گئی۔ سوچ میں پڑ گئی۔ عادتاً نچلے ہونٹ پر انگلی رکھی۔ دائیں گوشے تک دھیرے دھیرے پھسلانی، پھر گلاب کے پتوں پر پڑے اوس کے قطروں جیسے ننھے ننھے اُبھاروں کے بچ لا کر روک دی۔ آنکھیں چندھیا کر انگلی کی پور چوم لی۔ پھر بیڈ سے اتر کر ہاتھ روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد لوٹی، بولی۔ ”تمہیں سگریٹ کی بو اچھی نہیں لگتی اس لیے میں ماؤتھ واش لینے گئی تھی۔ وہ نہیں ملا تو برش کرنا پڑا۔“

میں نے نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ بولی۔ ”تمہارا منہ مانگا انعام تمہارے شایان شان تو ہونا چاہیے نا!“

وہ بیڈ پر لیٹ گئی۔ آدھ کھلی آنکھوں سے دعوت انگیز انداز میں دیکھنے لگی۔ ہونٹ نیچے وا کر کے بولی۔ ”آؤ مسٹر انگریز بندر دی کریٹ..... اپنی رنج یابی کا جشن مناؤ..... اپنا انعام وصول کرو۔“

مجھے یوں لگا جیسے میرا بدن شل ہو گیا ہو۔ اپنا منہ مانگا انعام وصول کرنے کا حوصلہ یکدم دم ٹوٹ گیا اور میں مدد طلب نظروں سے اُسے دیکھنے لگا جسے دیکھنا بھی دل گردے کا کام تھا۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لبو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

اداکاری کو دیکھ کر میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس کا منہ توڑ دوں۔ دانت نکال کر پھٹکی پر رکھ دو۔ اسے ذرہ بھر یاد نہیں رہا تھا کہ اس نے مجھ پر ناقابل معافی ظلم توڑے تھے۔ وہ احسان مندی کی رسی تھام کر مجھ تک پہنچ گیا۔ تھ ہے ایسے بے غیرت سیاست دان پر!“

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”تم نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ اس ملک کی سیاست اس طوائف کے مانند ہے جو بھوکے دالوں کے ہاتھ لگ کر گوشہ گوشہ دوڑتی ہے مگر کہیں پناہ نہیں پاتی۔ نہ صرف حیدر خان، بلکہ یہاں سبھی ایک جیسے ہیں۔ کھانے کے دانت اور، دکھانے کے اور۔ اس کینے سے کوئی مزاحم دو چار بوریاں گندم کی مانگنے چلا جائے تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہوگی۔ آج اپنی بیٹی کی ہم عمر لڑکی جو بقول اس کے، اس کی بھی بیٹی بنتی لگتی ہے، کو نوپتے کے لیے دو کروڑ دینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ دو کروڑ!..... اتنی بڑی رقم جس سے پورا ایک گاؤں نئے سرے سے بسایا جاسکتا ہے۔ مگر وہ بڑا کمینہ ہے۔ ایک طرف دو کروڑ خرچ کرے گا۔ دوسری طرف یارن خان کو نیچا دکھا کر تین کروڑ مانگے گا۔ یہی حربہ میاں دلبر پر آزمائے گا۔ اپنا انتقام بھی لے گا اور دام بھی کھرے کرے گا۔“

اس نے لمبا کش لیا اور دھواں میری طرف اچھال دیا۔ میں نے ہاتھ سے دھوئیں سے مرغولوں کو منتشر کیا، کہا۔ ”میڈم! میں اس کے ہوسیلے ٹھیل میں معاونت نہیں کرنا چاہتا۔“

وہ بولی۔ ”کیا تمہیں یارن خان سے ہمدردی ہے؟“ میں نے جھٹ سے کہا۔ ”نہیں۔ مگر میں کسی لڑکی کو پامال کرنا بزدلی اور کمینگی سمجھتا ہوں۔“

وہ اٹھ بیٹھی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، کیا وہ کمینگی نہیں؟“

مجھے ایک جھکا سا لگا۔ میں نے اُسے شکوہ باز نظروں سے دیکھا، کہا۔ ”میڈم! آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔“

”مجھے سمجھانے کے بجائے تم دو کروڑ روپے کی طاقت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ گنتے گنتے انگلیاں شل ہو جاتی ہیں۔“

اس نے مربیانہ انداز میں کہا۔ ”تم نے رات میں اساکو دیکھا۔ نہ زندہ، نہ مردہ ہے۔ دو چار دنوں کے بعد اُسے پھر دیکھنا۔ وہی، جو تمہیں فرشتہ قرار دے رہی تھی، تمہیں انسان قرار دینے سے گریزاں ہو جائے گی۔ پہلے کی طرح خوبصورت اور پاکیزہ دکھائی دینے لگے گی کیونکہ اس کی شخصیت کے عقب میں اس کے سیاست دان باپ کا کروفر چھپا ہوا ہے۔ فرعونیت چھپی ہوئی ہے۔ وہ بھول جائے گی کہ

گورے کے منہ سے الحمد للہ؟

ڈیل ایر پورٹ واٹسٹن پہنچ کر مجھے ٹیکسی پکڑنی تھی اور پراچہ کے آفس پہنچنا تھا۔ امریکا میں کلینک کو آفس کہتے ہیں۔ پراچہ ورجینیا میں آٹھوں کا ڈاکٹر تھا، مجھے اس کے پاس ہی رہنا تھا اور واٹسٹن میں ہی ایک پانچ روزہ کانفرنس میں شرکت کرنی تھی۔ یہ کانفرنس دنیا میں تہذیبوں کے عروج و زوال کے موضوع پر منعقد کی جارہی تھی۔ کانفرنس میں نسل، ذات اور زبانوں کے نام پر مل و غارت گری کے حوالے سے بھی بات ہوئی تھی۔ یہ کانفرنس واٹسٹن میں کتابوں کے ایک ادارے اور واٹسٹن یونیورسٹی کے تعاون سے ہو رہی تھی۔ نہ جانے یہ لوگ تہذیبوں کے عروج و زوال پر ماتم کر کے کیا کیسے منا چاہ رہے تھے۔ ان کی تو تہذیب بھی محفوظ تھی اور انہوں نے تو تاریخ سے سیکھا بھی تھا جس کے مطابق وہ اپنا ملک چلا رہے ہیں۔ یہ کانفرنس ہوئی تو ہمارے ہاں چاہیے تھی جہاں تہذیبیں مٹ رہی ہیں، زبانیں موت کے گھاٹ اتاری جا رہی ہیں، نسلوں کا خاتمہ ہو رہا ہے، ذاتیں، ذات کے نام پر ہی خاموشی سے مٹی چلی جا رہی ہیں۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

میں تاریخ پڑھتا تھا اور تاریخ ہی میرا اڑھنا بچھونا تھا۔ پاکستان میں تاریخ پڑھانے والے پروفیسر کی تنخواہ اتنی نہیں ہوتی ہے کہ وہ واٹسٹن میں کسی کانفرنس میں جاسکے۔ صرف ہوائی جہاز کا کرایہ ہی میری چھ ماہ کی تنخواہ کے برابر تھا۔ پھر کانفرنس میں شمولیت کی فیس، واٹسٹن میں رہنے کا خرچہ اور اگر پاکستان سے باہر نکلتا ہوتا تو کچھ نہ کچھ خریداری بھی کرنی ہی پڑتی ہے۔ ادھر یہ حال کہ یونیورسٹی کا پروفیسر دال روٹی کھا کر عزت سے گزارہ ہی کر لے تو کافی ہے۔ ہمارے جیسے ملکوں میں تاریخ کی کیا اہمیت ہے۔ اگر تاریخ کی اہمیت ہوتی تو ہمارا ہر شہر ہی کیوں ہوتا۔

تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا تھا ہم لوگوں نے، جیسی تو ملک ٹوٹ گیا تھا، جیسی تو شہر ہی ظاہر بڑھ رہے ہیں مگر اندر سے ختم ہو رہے ہیں جیسے دیکھ جاٹ جاتی ہے لکڑی کو۔ اس خطہ زمین کی تاریخ بھی عجیب تھی۔ حکمرانوں کی تاریخ الگ تھی اور جنت کی تاریخ الگ تھی۔ عوام موبہ جو دوسے پہلے بھی غلام تھے اور موبہ جو دوسے بعد بھی غلام ہیں اور حکمران طبقہ ہر دور میں حکمران ہی رہا تھا۔

پراچہ اور میں ایک ہی اسکول میں پڑھے تھے۔ کراچی کی بی آئی بی کالونی میں مل کر بڑے ہوئے تھے، مجھے کیمسٹری اور بیالوجی سے انجمن ہوئی تھی اور اسے

یورپس کے ہاتھی اور اشوک کے چکر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ میڈیکل کالج میں داخل ہو گیا اور واٹسٹن میں آٹھوں کا ایک بڑا ڈاکٹر بن گیا۔ میں نے تاریخ میں ایم اے کیا تھا، پھر صرف قسمت کا ہی چکر تھا کہ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ سے مجھے برٹنی کا اسکالرشپ مل گیا اور میں نے یورپ کی تاریخ پر برٹنی میں پی ایچ ڈی کر ڈالی۔ وہ پانچ سال میری زندگی کے خوب صورت سال تھے۔ پورا یورپ، انگلینڈ، آئرلینڈ دیکھ لیا تھا۔ میں کیونست ممالک بھی جا کر دیکھ کر آیا تھا۔ پانچ سال تک پڑھا، ملک کھوسے، بچت کچھ نہیں کر سکا پاکستان واپس آیا تو ایک چھوٹا سا مکان جو والد صاحب سے ورثے میں ملا تھا میرا کل اثاثہ تھا اور وہ بھی ایسا تھا کہ اس میں کچھ مرمت، کچھ تبدیلیاں کرنا ضروری تھیں۔ پراچہ نے ہی مجھے اس میٹنگ کے لیے بلایا تھا۔ میرا ایک بھی خریدار، کانفرنس کی فیس بھی دی اور کانفرنس کے بعد ایک ہفتے کی چھٹی کر کے امریکا گھمانے کا پروگرام بھی بنایا تھا..... ہماری بچپن کی دوستی میں اس کی مصروفیت کوئی خاص برا اثر نہیں ڈال سکی تھی۔

پروگرام بھی تھا کہ میں ڈیل ایر پورٹ سے پراچہ کے آفس پہنچ جاؤں گا پھر وہاں سے کچھ دیر کے بعد پراچہ کے گھر چلیں گے جہاں باتیں ہوں گی اور مزید پروگرام بنے گا۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ ایر پورٹ پر واٹسٹن فلائز کی ٹیکسی مل جائے گی۔ وہ خود نہیں آسکتا تھا کیونکہ اسے ایک آپریشن کرنا تھا۔

ڈرائیور کے الحمد للہ سے میں بھی سمجھا تھا کہ یہ کوئی امریکن مسلمان ہے۔ آج کل امریکا میں ہر سال ہزاروں لوگ مسلمان، بدھت، ہری راما ہری کرشنا اور چین کے مختلف مذہب اپنا رہے تھے۔ جن سماجوں میں دولت کی فراوانی ہوتی ہے اور ستنے کی برداشت ہوتی ہے، وہاں کے لوگ اپنے مذہب، اپنے اعتماد، اپنے عقیدے سے اٹکا جاتے ہیں اور ایک اقلیت مذہب تک بدل دیتی ہے یا لاندہب ہو جاتی ہے۔ امریکا، یورپ، جاپان میں یہی ہو رہا تھا۔ سائنسی ترقی اور مادی آسائشوں نے روحانی خلا پیدا کر دیا تھا جس کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ کیا وہ امریکن ہے؟

اس نے جواب دیا تھا "نہیں امریکن نہیں افغانی ہوں" میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ واٹسٹن میں افغانی ڈرائیور سے ملاقات ہو جائے گی۔ افغانستان تو ہمارا پڑوسی ملک تھا اور میں ایک بار شاہ ظاہر شاہ کے زمانے میں

افغانستان جا بھی چکا تھا اور اب جو کچھ وہاں ہو چکا تھا اور جو کچھ ہو رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ تباہی کے وہ بادل پاکستان میں بھی آئیں گے۔ ابھی بادلوں کی کمی ہے۔ وہ جمع ہو رہے ہیں آہستہ آہستہ آنکھ کھول رہے ہیں کہ چھا جائیں گے اور جب پھیں گے تو بہت بچھڑ چکا ہوگا۔

میں نے پوچھا۔ "کب آئے آپ افغانستان سے؟" میں پاکستان سے آیا ہوں اور کابل، قندھار خوب گھوم چکا ہوں۔ جب اچھے حالات تھے وہاں کے۔" میں نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے بات بڑھائی تھی۔

"میں قندھار کا رہنے والا ہوں۔ آپ پاکستان میں کہاں سے آئے ہیں؟ میں کراچی کے منو ہٹل میں رہ چکا ہوں۔ آپ جانتے ہو منو ہٹل؟" اس نے سوال کیا تھا۔ "کی مسجد کے پاس ہے۔" اس نے خود ہی جواب بھی دے دیا تھا۔

"میں کراچی کا ہی ہوں مگر اب منو ہٹل اسپتال بن گیا ہے۔ کراچی میں ہٹل، سینیما، پارک، سب ختم ہوتے جا رہے ہیں اور اب صرف باگل خانے، اسپتال اور گندی گندی عمارتیں بن رہی ہیں۔" میں نے فہم کر جواب دیا۔ ساتھ ہی ہی پوچھ لیا کہ آپ منو ہٹل میں کیا کر رہے تھے؟

"امریکا آنے سے پہلے بہت جگہ جانا پڑ گیا، کراچی بھی ایک ایسی ہی جگہ ہے۔ ہم افغانیوں کی ایسی ہی کہانی ہے۔ اب کوئی نہیں ہے ہمارا، کوئی زمین نہیں ہے۔ ہماری قوم بین الاقوامی سطح پر مفلوک الحال ہو کر رہ گئی ہے۔ اچوت جنہیں کوئی چھو بھی نہیں سکتا ہے جن سے لوگ نفرت کرتے ہیں جو خود اپنا وقار اپنی نظروں میں کھوپکے ہیں۔ یہی کہانی ہے چھوڑیں۔" اس نے جواب دیا تھا۔

"کہانیوں سے تو مجھے بڑی دلچسپی ہے۔ نہیں مجھے بتائیں کیا ہوا تھا۔" میں نے بڑی دلچسپی سے کہا۔ "مجھے ابھی تک قندھار یاد ہے۔ میں وہاں رمضان کے دوران میں گیا تھا اور توپ خانہ بازار کے پاس ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور مجھے یاد ہے رمضانوں میں سارا شہر رات پھر جاگتا تھا۔ تراویح کے بعد ہوٹلوں میں موسیقی چلتی رہتی تھی اور فغانوں میں لوگ چائے پیتے رہتے تھے۔ اب تو مجھے یاد نہیں ہے، گانے والوں کا نام مگر کچھ نام ابھی تک یاد ہیں۔ ارے ہاں میں نے وہاں کے منزل باغ سینیما میں دلپ کمار کی فلم "داستان" بھی دیکھی تھی۔ وہی میری زندگی کی پہلی ہندوستانی فلم تھی۔" وہ بیاہیہ شاہراہ پر دور نظر جمائے ٹیکسی چلا رہا تھا۔

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں کے کونے نم ہو گئے ہیں اور آنسوؤں کے قطرے ٹپک کر گالوں پر پھیل رہے ہیں۔ میں نے شاید اس کو دیکھ کر دیا تھا۔ اس نے ٹھوہیر نکال کر آنسو پونچھے تھے اور بڑی گلوگیر آواز میں بولا تھا۔ "سب ختم ہو گیا۔ اب توپ خانہ بازار اور باغ پل پر زندگی مچ چکی ہے۔ منڈی بازار میں سناٹا ہے اور منزل باغ کا سینیما ختم کر کے وہاں مسجد بنادی گئی ہے۔ سب ختم ہو گیا افغانستان میں۔ میں تو ہوں ہی قندھار شہر کا اور آپ نے جو یہ سارے نام لیے تو جیسے میرے سینے پر گولی ماری ہے۔ وہ ساری چیزیں میرے سامنے آئی ہیں اور دل رونے لگا ہے۔" اس نے بڑی ساوگی سے کہا۔ "بڑی عجیب کہانی ہے میری۔ میں کابل یونیورسٹی میں فزکس پڑھتا تھا اور اب واٹسٹن کی سڑکوں پر ٹیکسی چلاتا ہوں۔ کابل یونیورسٹی کے پروفیسر کپڑوں اور قالینوں کا بازار لگاتے ہیں، اسکول استاد برگر بیچتے ہیں اور ہوٹلوں میں ویٹر بن گئے ہیں۔ فوج کے کرنل اور جنرل اور ایر کوڈر دنیا کے شہروں شہروں میں مسافر بن کر وطنیوں پر زندہ ہیں۔"

ہماری بچیاں جو وہاں پر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں یہاں بڑے بڑے اسٹوروں میں سیلر گرل بن گئی ہیں۔ یہ ہو رہا ہے افغانستان کے ساتھ۔ دنیا کے ہر ملک میں افغانی موجود ہیں۔ وہ ہر کام کرتے ہیں، جھاڑو لگانے سے لے کر عزت بیچنے تک۔ پیٹ سب کچھ کرتا ہے۔ میرے جیسے نہ جانے کتنے لوگ کہاں کہاں پر کس طرح کیا کیا کر رہے ہیں نہ آپ کو اندازہ ہے اور نہ ہی ان لوگوں کو اندازہ ہے جو ان سب چیزوں کے ذمے دار ہیں اور افغانستان میں جو ہو رہا ہے اس کی تو مثال ہی شاید نہیں ملے گی۔"

"آپ کیسے نکلے تھے؟" میں نے انہیں سچ میں روک کر پوچھا تھا۔

"یہ سب کچھ کیا ایک ہی ہو گیا تھا۔ روسیوں کے جانے کے بعد ہم نے سوچا تھا کہ اب کچھ امن وامان ہو جائے گا۔ اب دوبارہ زندگی سانس لے گی، اب دوبارہ سڑکوں پر رونقیں بجالا ہوں گی، دوبارہ اسکول، کالج، یونیورسٹی میں تعلیم کا دور دورہ ہوگا، دوبارہ لوگ غریب ہوں گے مگر ذہن ودل کے امیر ہوں گے مگر یہ کچھ نہیں ہوا۔ ایک تیسری جنگ، ایک اور بڑی جنگ میں تبدیل ہو گئی تھی اور ایسی صورت حال ہو گئی کہ ہر پڑھے لکھے ہنرمند قابل آدمی کو افغانستان چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح سے بھاگ کر کابل سے نکلا تھا۔ کسانوں کی طرح کے کپڑے

کہن کر اپنی بیوی کے ساتھ۔ رات کے اندھیرے میں کھیتوں، وادیوں کو پھلاکتے ہوئے، ندی نالوں کو پھلاکتے ہوئے کھانڑیوں سے اور پھر کوئٹہ پہنچ گیا تھا۔ کس کس طرح سے میں نے اپنی بیوی کی حفاظت کی ہے اس کا سوچ کر بھی خوف آتا ہے۔ میرے کتنے ہی ساتھی کامل یونیورسٹی میں گولیوں کا نشانہ بن گئے ان کی بیویا طوائف بن گئیں، ان کے بچے بھکاری بن کر رہ گئے ہیں۔ قذہار جانا ضروری تھا۔ کچھ سونا تھا۔ ماں باپ کے زیورات تھے جن کا لے جانا ضروری تھا کیونکہ بغیر پیسے کے ہم لوگ کہیں بھی نہیں جاسکتے تھے۔“

وہ ذرا دیر کے لیے رکا۔ ”ساری باتیں تو بتانا مشکل ہے، مہینے گزر جائیں گے کہانیاں ختم نہیں ہوں گی۔ صرف واشٹن میں ہی تیس ہزار افغانی ہیں اور تیس ہزار کہانیاں ہیں۔ پھر آپ کی بتائی ہوئی جگہ بھی آجائے گی۔ مگر میں آپ کو بتاتا ہوں۔ آج بہت دنوں کے بعد آپ نے مجھے رلا دیا ہے۔ آج ہم افغانیوں کے پاس آسودوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ اس نے رک رک کر کہا۔

”کوئٹہ میں ہی ایک ایجنٹ عبدالولی سے ملاقات ہوئی اور اس نے کراچی میں ایک ٹریول ایجنٹ سے رابطہ کر لیا تھا اور ہم لوگ ٹرین سے کراچی آئے اور منو ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ سونے کے زیورات بیچ کر جو بھی ہمارے پاس تھا اور دوسرے رشتے داروں سے ادھار لے کر دو دو لاکھ میں ملے ہوا اور ہم لوگوں کو سونڈش پاسپورٹ مل گیا تھا اور ساتھ میں ٹکٹ بھی۔ وہ پاسپورٹ جعلی تھے، ان پر ویزا بھی جعلی تھا۔ ہم لوگ کراچی سے نکلے، ترکی پہنچے، ترکی سے اٹلی اور اٹلی سے سیدھانیو یارک۔ نیو یارک ایرپورٹ پر ہی ہم نے امریکن پوپس کو بتا دیا تھا کہ ہم لوگ سونڈش کے نہیں ہیں بلکہ جعلی دیزے پر سونڈش بن کر آئے ہیں۔ ہم لوگ افغانی ہیں اور سیاسی پناہ چاہتے ہیں۔ چھ گھنٹے کے انٹرویو کے بعد ہمیں رہنے کی اجازت ملی تھی۔ ایجنٹ نے ہی نیو یارک کے ایک یہودی وکیل کا پتا بتایا تھا جس کو ہم نے ایرپورٹ سے ہی فون کر دیا تھا۔ اس کے لوگ پہنچ گئے تھے۔ وکیل کو دینے کے لیے کچھ پیسے نہیں تھے ہمارے پاس مگر نیو یارک کا نظام بہت اچھا ہے اور یہودی وکیل اپنے کام میں پکے ہیں۔ انہوں نے ہم سے صرف یہ کہا تھا کہ ہم لوگوں کو بعد میں قسطوں میں پانچ ہزار ڈالر دینے ہوں گے جب نوکری کی اجازت ملے گی اور ایک معاہدہ بھی دستخط کرایا تھا اس نے۔

چھ گھنٹے کے بعد امریکن حکومت کے خرچے پر ہی ایک سیاسی پناہ گزینوں کی پناہ گاہ میں ہم لوگوں کو رکھ لیا گیا تھا اور اس یہودی وکیل نے تین ہفتے میں ہی ورک پرمٹ کا انتظام کر دیا تھا۔ اب ہم لوگ امریکی حکومت کے مہمان تھے، کام کر سکتے تھے، بینک سے ادھار لے سکتے تھے، ہم سب کو سوشل سیکیورٹی کا نمبر مل گیا تھا۔ اب تو سات سال ہو گئے ہیں اور گرین کارڈ بھی بن گیا ہے اور تھوڑے دنوں میں امریکن پاسپورٹ بھی مل جائے گا۔ ووٹ بھی دے سکیں گے ہم لوگ۔ ہزاروں سال میں جو حق افغانستان میں نہیں ملا تھا وہ یہاں چند سالوں میں مل گیا ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے لمبی سانس لی اور گاڑی میں لگے ہوئے فون پر کسی کو فون کر کے پراچہ کے آفس جانے کا راستہ سمجھا پھر فون رکھ کر کہا۔ ”اب ہم لوگ سب امریکن ہیں، بچے امریکن اسکولوں میں جاتے ہیں، میری بیوی نے ایم اے کیا تھا اور کامل کے دفتر خارجہ میں کام کرتی تھی، اب وہ کہ مارٹ میں کام کرتی ہے اور میں فزکس پڑھاتا تھا، واشٹن کی سڑکوں پر ٹیکسی چلاتا ہوں۔ اگر آپ کو فرصت ہو اور آپ کو افغانوں کو دیکھنا ہو تو اتوار کو مجھے ٹیکس میں آپ کو یونیورسٹی کے پروفیسر دکھاؤں گا جو پارکنگ لائٹ میں گاڑیوں کو پارک کراتے ہیں، وہ بیچ دکھاؤں گا جو ہوٹلوں کے دروازوں پر کھڑے ہیں، وہ افغانی عورتیں دکھاؤں گا جو ریلوے اسٹیشن میں ٹیکس صاف کرتی ہیں۔ اس ملک میں ڈالر کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے ڈالر چاہیے اور ڈالر درختوں پر نہیں اگتے ہیں۔ اب زیادہ دور نہیں ہیں ہم لوگ۔“ اس نے گاڑی ہائی وے سے چھوٹی سڑک پر گھماتے ہوئے کہا۔

میں بھی باتوں میں تقریباً ٹھوکیا تھا۔ ایک طرف سنا جا رہا تھا دوسری جانب ذہن نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں سوچ رہا تھا، طرح طرح کے خیالات ذہن کو جھٹکے دے رہے تھے۔ میں جو تاریخ کا پروفیسر تھا، تہذیبوں کے زوال و عروج پر کائنات میں شمولیت کے لیے واشٹن آیا تھا، میرے ملک کے برابر میں ایک اپنی تہذیب ملنی میں رہی تھی جس کے سپوتوں نے ہندوستان سے ترکی تک ہزاروں سال حکومت کی تھی، جن کی زبان میں چاشنی تھی، جن کے گلیوں میں بلا کا دروہا، جن کے شاہوں کے دربار میں علم و فضل کی رسائی تھی، جن لوگوں پر دنیا کی کوئی اور قوم حاکم نہیں ہو سکی تھی۔ وہ ریزہ ریزہ ہو کر بھڑکے ہیں۔ زمین پر پڑے ہوئے ایک پتھر کی طرح جس کی کوئی سمت نہیں ہوئی جو لوگوں کی غموں کی مرضی سے اپنے راستے کا تعین کرتا

ہے۔ مجھے ایک شدید دھچکا ساگا۔ میرے ذہن میں سوال آیا اور میں پوچھ بیٹھا کہ اگر افغانستان کے حالات صحیح ہو جائیں تو تم واپس جاؤ گے؟

اس نے کہا۔ ”ضرور جاؤں گا، فوراً جاؤں گا۔ یہ میرا ملک نہیں ہے، یہ میرا گھر نہیں ہے، یہ زمین میری نہیں ہے، یہاں میری ماں کی قبر نہیں ہے، میرے دادا کا مکان یہاں نہیں ہے، میں کیا، میرے خیال میں ساڑھے تیر فیصد سے زیادہ افغانی فوراً واپس چلے جائیں گے۔ اگر ہمارا پرانا کامل ہمیں مل جائے۔“ اس کی آواز پھر بھرا گئی۔ ”مگر حالات اب بھی صحیح نہیں ہوں گے۔ افغانستان کی موت ہو گئی ہے۔ وہاں اب ایسے لوگ ہیں جو مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے بتوں سے خوف زدہ ہیں جو پہاڑوں میں کاٹے گئے ہزاروں سالوں سے ایسا وہ تم بدھا کے غیر مرغوب سے جنگ کر رہے ہیں، جو بھوک کے عفریت سے خوف زدہ ہیں، جو غربت کے عذاب سے جنگ نہیں کرتے، جو نا انصافی کے چنگل سے نہیں ٹکنا چاہتے، جو صدیوں کی جہالت کو مستقل کرنا چاہتے ہیں، جو دنیا بھر کے خلاف ہیں مگر دنیا بھر سے ہیک لینے پر کسی قسم کا اعتراض نہیں رکھتے ہیں۔ وہاں اب ایسے لوگ ہیں جو افغانستان کو اس قبا کی دور

میں واپس لے گئے ہیں جہاں پیغمبروں کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اب پیغمبر نہیں آئیں گے اور افغانستان تباہ ہوتا چلا جائے گا۔ آپ اخبار تو پڑھتے ہوں گے، کبھی ٹی بی سی بھی سنتے ہوں گے۔ ریڈیو ایران کی آواز بھی آتی ہوئی، داکٹر آف امریکا کی آواز بھی آتی ہوئی، سب کیا کہہ رہے ہیں؟ اب وہاں کیا ہو رہا ہے؟ آپ تو پاکستانی ہیں ناں، آپ کو تو پتا ہوتا چاہیے کہ آپ کی فون نے آپ کے ملک کے ان حکمرانوں نے جو جنگ روسیوں سے شروع کی تھی، وہ کہاں ختم ہوئی ہے؟“

تھوڑی دیر وہ بھی خاموش رہا اور میں نے بھی کچھ نہیں کہا، مگر پھر پوچھا کہ آخر کیسے ہو گیا یہ سب کچھ؟ اس کے جواب نے مجھے دوبارہ چونکا دیا تھا۔ ”یہ بھی ایک لمبی کہانی ہے۔ میں نے ساری زندگی فزکس پڑھائی ہے۔ توانائی کے اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ کائنات کی ابتدا اور کائنات کی انتہا کے معنوں پر غور کرتا رہا ہوں۔ اب بھی جب ان سڑکوں پر ٹیکسی چلا رہا ہوتا ہوں تو کامل کی کوئی بیج، کوئی شام، کوئی ٹیکسی ہوئی وہ پھر یاد آ جاتی ہے جب کامل یونیورسٹی میں کوئی لڑکا یا لڑکی مجھ سے پوچھتے تھے کہ آئن اسٹائن کے ازجی کے قوانین کے مطابق کیا انرجی کے لیے

سرگزشت کا ایک اور معرکتہ الارا خاص شمارہ

بینا نابینا نمبر

بے بصارتی کے اندھیرے میں روشن ستارہ بن کر چمکنے والوں کی داستانیں۔ وہ نابینا تھا لیکن مظاہر فطرت کی تصاویر ایسے بناتا ہے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ وہ اندھا ضرور تھا لیکن اس کی بنائی ہوئی دھنیں ہندو پاک میں مقبولیت پاتیں۔ وہ پیداؤشی نابینا ہیں لیکن ان سے امریکا بھی ڈرتا ہے۔ ایسے بہت سارے دل کو دکھا دینے والے قصے سچ بیبتیاں حقیقی واقعات۔

ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ مجلد کر کر رکھیں گے

بہت جلد پیش کیا جا رہا ہے آج ہی نزدیکی بگ اسٹال پر اپنا شمارہ بک کرائیں

سورس کا ہونا ضروری ہے؟ کوئی مجھ سے پوچھتا تھا کیا زمینی کشش کی طرح دوسرے سارے کشش رکھتے ہیں؟ کیا انسان بھی چاند سے بھی اوپر جا کر دوسری دنیاؤں میں پہنچ سکے گا؟ کیا ہمیں ہول کی اصلیت کا پتا چل سکے گا؟ کامل کی وہ یونیورسٹی ویانا کی یونیورسٹی یا آکسفورڈ یونیورسٹی یا ہارورڈ کی طرح سے مالا مال یونیورسٹی نہیں تھی، مگر احساس اس تھا۔ وہاں پر تعلیم کی کشش تھی، وہاں زندہ رہنے اور زندہ رہنے دینے کی روایات تھیں۔ وہاں پر اب جہالت کا ایک بہت بڑا بلیک ہول بن کر رہ گیا ہے۔ جہل کی ہر چیز ہنچ کر چل رہی ہے اور کوئی نہیں ہے فتنے دار اس کا۔ ہم افغانی، صرف افغانی ہی فتنے دار ہیں اس کے۔" بے گناہ سڑک لگتا تھا کہ کبھی ختم نہیں ہوگی اور اس کی نظرس روڈ پر بھی ہوئی تھیں اور لگتا تھا کہ ذہن نہیں دوز بہت دور محو رہا تھا۔ میں نے کن آنکھوں سے دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ بے وطن، بے زمین آدمی کے آنسو ایسے ہی ہوتے ہوں گے، ایسا ہی کرب ہوتا ہوگا دلوں میں جس کو اگر چیخڑ دیا جائے تو چھلک جاتا ہے اسی طرح سے۔ مجھے دل ہی دل میں آنسو ساہو نے لگا تھا۔

یہ روسیوں کا کام ہے اور نہ امریکیوں کا، یہ تو ہمارا ہی کیا دھرا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر بولا۔ "اس کا فتنے دار نہ پاکستان ہے اور نہ ہی ایران، یہ افغان قوم ہی فتنے دار ہے اس کی۔ دنیا میں ایسی بہت کم قومیں ہوں گی جنہوں نے آپس میں ایک دوسرے کا اتنا خون بہایا ہوگا، پانی کی طرح۔ امیروں نے بھی، غریبوں نے بھی، بڑے لکھے لوگوں نے بھی، جاہلوں نے بھی۔ افغانیوں کی جنگ، میری جنگ، میری بیوی کی جنگ، میرے بچوں کی جنگ لڑنے والا کوئی نہیں ہے اور جس قوم کے لوگ اپنی ہی قوم کے خلاف غیروں کی جنگ لڑتے ہیں انہیں تباہی اور بربادی کے سوا کیا مل سکتا ہے؟" میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، خون کا سمندر اس کے چہرے پر موجیں مار رہا تھا۔ پھر میری منزل آگئی۔ پراچے کے کلینک کے سامنے گاڑی رک گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ابھی تک سرفی نمایاں تھی اس کے اندر کا درد ابھی تک اس کے چہرے پر عیاں تھا۔ نیکی دیکھ کر اندر سے پراچے کی سیکرٹری باہر آئی۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے نیکی کا کرایہ دے دیا۔

پانچ دن کی کانفرنس بہت اچھی تھی، ساری دنیا سے تاریخ داں آئے ہوئے تھے۔ لاطینی امریکا کے، مایا تہذیب سے لے کر ابراہام مصر کی کہانی دہرائی گئی تھی۔ لیکن

کی عمارتوں سے لے کر موجوداڑو کی تعمیرات کے معجزوں پر غور کیا گیا تھا۔ ہلاکو خان سے سکندر اعظم تک کیا ہوا تھا، نظر سے دیت نام تک ایک ہی کہانی تھی، قومیں، نسلیں، ذاتیں، ثقافتیں، تمدن، زبان، تہذیب، مذہب، اعتقاد، ایمان، یقین سب اسی وقت تباہ ہوئے جب انسانوں نے آپس میں جھگڑا شروع کیا، اپنے اندر سے فساد کا آغاز کیا۔ ہر آغاز کا نام نیا، پراجام مختلف نہیں تھا۔ قل وغارت گری، عورتوں کی پامالی، بچوں کی رسوائی، یوزھوں کی کسمپرسی اور جوانوں کے خون کا نذرانہ..... تاریخ تو بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کرتی ہے مگر نہ جانے کیوں انسان سمجھتا نہیں ہے۔ وائٹ ہاؤس سے وائٹ ہال تک، کریملن سے تن من اسکواری تک، اسلام آباد سے دہلی تک، تل ابیب سے بیروت تک اور نکاراگوا سے ہیریک تک۔ ساری کانفرنس کے دوران میں سنا رہا، سمجھتا رہا اور سوچتا رہا تھا۔

کانفرنس کے اختتام پر مجھے کامل یونیورسٹی کا وہ پروفیسر بہت یاد آیا جو واشنگٹن میں ٹیکسی چلاتا ہے۔ اس کا تو نام بھی نہیں پوچھا تھا میں نے مگر نام میں کیا رکھا ہے۔ ہزاروں لاکھوں افغان مہاجرین کے کوئی نام ٹھوڑی ہیں، مہاجر ہیں اور سب اس نیکی ڈرائیور کی طرح بے سکون، بے اطمینان، بے منزل، بے مکان۔

میں نے پراچے سے پوچھا تھا کہ واشنگٹن کی سڑکوں، محلوں، بازاروں اور مصافحاتی علاقوں کا نقشہ سمجھنے میں کتنے دن لگیں گے؟ کیا وہ مجھے ادھار پر ہی کسی ایک نیکی دلا دے گا؟ جب پڑوس کا طوفان ہمارے پاس بھی پہنچے گا، سرحد کے اس طرف پشاور سے کراچی تک، جب نیویارک کا وہ یہودی ویلک مجھے بھی سیاسی پناہ دلا کر امریکا میں کام کرنے کا ورک پرمٹ دلا دے گا تو میں اس فزکس کے پروفیسر کی طرح واشنگٹن کی سڑکوں پر اپنی قوم کی بے غیرتی کی کہانی سناؤں گا کیونکہ تاریخ پڑھنے کا وقت ختم ہو چکا ہوگا۔

پراچے نہیں بڑا، بڑے زور سے، بڑی بے یقینی کے ساتھ۔ وہ ڈاکٹر تھا آنکھوں کی بیماریوں کا ماہر، آنکھوں کے اندر جو ایک عرصہ ہوتا ہے اس کے آپریشن میں یلکا۔ اسے میری طرح سے کیمسٹری یا لوجی سے نفرت نہیں رہی تھی، اسے سکندر اعظم اور راجا پورس کی جنگ سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے تاریخ نہیں پڑھی تھی۔

اس لیے وہ ہنس رہا تھا اور میری آنکھوں میں دھول اڑ رہی تھی، لئے ہوئے قریوں کی دھول.....

چھوٹے چھوٹے قصوں میں خبریں جنگ کی آگ کی طرح بجھتی ہیں۔ ہوشن میں بھی یہ بات ہر فرد کے علم میں تھی کہ دلبر آج بستر مرگ پر ہے۔ ڈاک خانے، رستوران یا کسی دکان پر جب بھی چار آدمی جمع ہوتے دلبر کی خوبیاں اور

خامیوں پر متاسفانہ لہجے میں تبصرہ کرنے لگتے۔ بہر حال اس بات پر سبھی متفق تھے کہ دلبر نے زندگی میں جو مقام بنایا وہ اس کی بیوی میرنا کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ شادی سے پہلے دلبر نے بیسیوں نوکریاں کی تھیں اور

آخری رسم

یوسف شیرانی

دنیا عجیب و غریب قصوں سے بھری پڑی ہے۔ انہی میں ان کا شمار بھی ہوتا تھا جو ہر ایک کے لیے ایک مثالی جوڑا تھا مگر جو کچھ انہوں نے کیا اس کی بھی مثال کہیں ملنا مشکل تھی لیکن... یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے ہر حال میں اُس خاکے کو مکمل کرنا تھا جو اس اچانک پیش آنے والی صورت حال سے ادھورا رہ جاتا۔

اپنے فیملوں پر اُن ایک پُر عزم

منصف تازک کا قصہ



ہر جگہ سے نکال دیا گیا تھا کیونکہ وہ ہر جگہ تاخیر سے پہنچنے اور کام میں بے پروائی برتنے کا عادی تھا پھر اس نے ایک جگہ مزدوری کا کام حاصل کیا تو اس کی ملاقات میرینا سے ہوئی۔ میرینا لمبے چوڑے قد کاٹھ اور مضبوط ہاتھ پیر کی عورت تھی۔ اس کی آواز میں مردانہ سا گھر داریں اور بالائی لب پر ہلکا سا رواں بھی تھا۔ وہ ایک اسکول منیجر تھی۔ جلد ہی ان دونوں کی شادی ہوئی۔ میرینا عمر میں بھی دلیر سے کچھ بڑی تھی۔

اس شادی نے دلبر کی کایا پالت کر رکھ دی۔ اس کے ہر کام میں باقاعدگی آگئی۔ شادی کے چند روز بعد ہی میرینا نے اپنا اثرو رسوخ استعمال کر کے اسے قصبے کے اکلوتے بینک میں ملازمت دلوا دی۔ بینک کے صدر نے اس امید پر دلبر کو ملازم رکھا کہ آزمائشی مہینے ہی میں وہ دلبر کی فطری بے پروائی کو بنیاد بنا کر اسے نوکری سے نکال باہر کرے گا لیکن اس وقت وہ بھونچکا رہ گیا جب نوکری کے پہلے ہی دن عین صبح وقت پر دلبر نے بینک میں قدم رکھا اور سکرا کر اسے صبح بخیر کہا۔ زندگی بھر کے معمول کے برخلاف اس کے کپڑے بھی صاف ستھرے اور جوتے پالش شدہ تھے۔ اس کے بعد تیس سال گزر گئے اور دلبر ایک دن بھی اپنی ڈیوٹی پر تاخیر سے نہ پہنچا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ترقی کرتے کرتے بینک کے نائب صدر کے عہدے پر پہنچ گیا۔ لوگوں میں افواہیں شہور تھیں کہ دلبر کی بیوی نے بہ زور بازو اسے باقاعدگی سکھائی تھی۔

تیس سال کی ازدواجی زندگی میں ان کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے ایک لڑکا اور ایک لڑکی، جو اب خود بھی شادی شدہ تھے اور صاحب اولاد ہو چکے تھے۔ دلبر نے ذاتی مکان بنالیا تھا لیکن یہ زندگی جس میں انقلاب لا کر اس نے پورے قصبے کو حیران کر دیا تھا، اب اس کے ہاتھوں سے نکل رہی تھی، وہ بستر مرگ پر تھا۔

میرینا اس کے برابر والے کمرے میں افسردہ بیٹھی تھی اور بار بار ایک سفید رومال سے آنکھیں لہو لہو کر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے روئے جاری تھی۔ ازدواجی زندگی کے تیس برسوں نے اس میں کوئی خاص جسمانی تغیرات پیدا نہیں کیے تھے، سوائے اس کے کہ بالائی لب پر موجود رواں کچھ اور گہرا ہو گیا تھا اور تیس سال تک باقاعدگی سے دلبر کو ڈانٹ پھونک رہی کا نتیجہ تھا کہ دلبر جیسے ناکارہ انسان کی زندگی سنوڑ گئی تھی یہی نہیں بلکہ اس نے اچھی خاصی شدید بیمار پوں کے دوران میں بھی کبھی چھٹی نہیں لی تھی۔ بستر مرگ پر پہنچ کر ہی اس کے معمولات درہم برہم ہونے لگے۔

ڈاکٹر، دلبر کے کمرے سے باہر آیا تو میرینا اٹھ کھڑی

ہوئی۔ ڈاکٹر نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ اس کے چہرے پر وہی متانت اور براسرا سرنجیدگی طاری تھی جو اکثر ڈاکٹروں کے چہرے پر ہوتی ہے۔

”سانو ڈاکٹر، کیا کیفیت ہے؟“ میرینا نے پوچھا۔
”میں نے ہر کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔“ ڈاکٹر نے آہ بھری۔ ”جدید طبی تحقیق کا ہر نسخہ آزما کر دیکھ لیا ہے لیکن..... لیکن کوئی امید نہیں۔“

”تمہارے خیال میں اس کے پاس کتنی گھڑیاں ہیں؟“ میرینا نے گورگی میں پوچھا۔

ڈاکٹر ہچکچایا تو وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ ”خدا را ڈاکٹر! مجھے سے کچھ نہ چھپاؤ مجھے عزیز واقارب کو بھی مطلع کرنا ہے۔“
ڈاکٹر نے پُر خیال انداز میں ٹھوڑی ٹھکائی۔ ”وہ یہ رات بھی نہیں گزار سکے گا۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔
”کبھی کبھی کوئی سرفیش کچھ عرصے کے لیے اس بیماری سے جانبر ہو جاتا ہے لیکن دلبر.....“ اس نے غمی میں سر ہلایا۔
”دلبر کی یہ آخری رات ہے۔“

میرینا نے یہ بات اجڑا مندی اور بلند حوصلے سے سنی جو اس کی فطرت کا خاصہ تھا۔ اس نے رومال سے آنکھیں خشک کیں۔ سر اٹھا کر ایک گہری سانس لی اور بھوار آواز میں کہا۔ ”تب تو مجھے جلت کے ساتھ کئی کام کرنے پڑیں گے۔“

ڈاکٹر نے دوبارہ اس کا کندھا تھپتھپایا۔ ”تم ایک بلند حوصلہ عورت ہو میرینا۔“

میرینا اس سے متفق تھی اور اس کے خیال میں اس بے رحم دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے ہر انسان کے لیے اپنا حوصلہ بلند رکھنا ضروری تھا۔ سب سے پہلے تو اسے دور دراز ملکوں میں اپنے تمام عزیزوں، رشتے داروں کو فون کرنا تھے جن میں اس کا پٹا اور پتہ بھی شامل تھے۔ بنی ایک فوجی کے ساتھ بیابان بھی تھی جو جرنی میں قہقہات تھا۔ بیٹا اپنی بیوی اور اس کے کنبے کے ساتھ جنوبی امریکا میں مقیم تھا جہاں وہ تیل کی ایک کمپنی میں ملازم تھا۔ باقی بیٹیوں رشتے دار کوہ ارض پر مختلف ستوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ میرینا نے عام جذبہ بانی لوگوں کی طرح انہیں دلبر کی بیماری کی شدت سے مطلع نہیں کیا تھا کیونکہ وہ بے چارے اس معاملے میں کبھی کیا سکتے تھے۔ بہر حال دلبر کے جنازے میں تو ان کی شرکت لازمی تھی۔

ان سب کو بھرائی ہوئی آواز میں متوقع جنازے کی خبر دیتے ہوئے سہ پہر ہوگئی۔ بہر حال اس غم انگیز اور

پریشان کن وقت میں کسی نہ کسی قسم کی مصروفیت، فارغ ہونے سے بہتر تھی۔ اب میرینا کو چہر دم کے ساتھ معاملات طے کرنا تھے جو کہ قصبے میں تجیز و تکفین کرنے والی اگلوئی کمپنی کا مالک تھا۔ میرینا کے خیال میں اس قسم کے معاملات کو آخری لمحوں میں غشنا فاش غلطی تھی۔ انتقال ہونے کے بعد تو لواحقین دیر سے ہی مدد سے بے حال ہوتے ہیں۔ ایسے عالم میں تجیز و تکفین کے انتظامات کے لیے بھاگ دوڑ کرنا کہاں کی دانش مندی ہے۔

جہر دم جو کہ مرنے والوں کے لواحقین کو غم و اندوہ کی شدت سے پیدا ہونے والی نیم دیوانگی کی کیفیت میں اپنے سامنے بیٹھا دیکھنے کا عادی تھا، میرینا سے معاملات طے کرتے وقت ساری چوکری بھول گیا اور جب وہ رخصت ہوئی تو جہر دم سہرا قائم کر بیٹھا۔ کیا نہ جانے اس طرح میرینا اس سے تیسرے درجے کی تجیز و تکفین کے نرخوں میں اول درجے کی تجیز و تکفین کا معاملہ طے کر گئی تھی۔

پرسوں کا دن تجیز و تکفین کے لیے طے ہوا تھا۔ میرینا کے اندازے کے مطابق اپنی مہلت تمام عزیز واقارب کے یہاں پہنچنے کے لیے کافی تھی۔ جہر دم کے دفتر سے میرینا لمبوسات کی دکان پر پہنچی اور اپنے لیے ایک سیاہ لباس منتخب کیا۔ جس میں ترمیم و تبدیلی کی کافی نجاش تھی اور وہ آئندہ کئی برسوں تک متوقع موقعوں پر کام آسکتا تھا۔

اب جنازے کی خبر اخبار میں چھپوانے کا کام باقی تھا۔ ہوشن میں ایک ہی ہفت روزہ اخبار شائع ہوتا تھا۔ قلماس سلیک اس کا ایڈیٹر تھا۔ جنازے کے لیے جتنے کا دن طے ہوا تھا اور آج بدھ تھا۔ جمعرات کا اخبار شائع ہونا تھا اور جب میرینا قلماس سلیک کے پاس پہنچی تو اخبار کی ساری ترتیب مکمل ہو چکی تھی اور وہ چھپنے کے لیے پریس جا رہا تھا۔ بہر حال دلبر قصبے کے ممتاز افراد میں سے ایک تھا۔ ایڈیٹر نے کا پیلاں رکوا دیں۔ اس کے جنازے کی خبر تیار کروانے کے لیے آئی۔

مفتی اول پر لگا لی اور میرینا مطمئن ہو کر دفتر سے نکل آئی۔ اب چند چھوٹے موٹے لیکن اہم کام باقی تھے مثلاً پھولوں کی فراہمی کا مسئلہ۔ میرینا کے اپنے بچے اور دوسرے رشتے دار جنہیں دور دراز مقامات سے یہاں پہنچنے کے لیے جہاز اور ٹرینیں پکڑنا تھیں ان کے پاس بھلا اتنا وقت کہاں ہوگا کہ وہ پھولوں کا بندوبست کر کے آئیں۔

قصبے میں پھولوں کی ایک ہی چھوٹی سی دکان میں جسے اکثر ہنگامی ضرورت پڑنے پر قریبی شہر سے پھول منگوانے پڑتے تھے، لہذا بہتر تھا کہ پہلے ہی دکاندار سے مل کر یہ

مزاحیات

وائف۔ ”میری شادی تو اسٹری کی وجہ سے لیٹ ہوئی۔ آپ کی شادی کیوں لیٹ ہوئی؟“

شوہر۔ ”میں صدقہ بہت کثرت سے دیا کرتا تھا۔“

وائف۔ ”شادی سے صدقے کا کیا تعلق ہے؟“

شوہر۔ ”صدقہ بلاؤ گا ٹال ہے۔“

☆☆

ایک سردار اپنے بیٹے کے رشتے کے لیے لڑکی کے گھر گئے۔ لڑکی والوں نے کہا کہ ”ہماری بیٹی ابھی پڑھ رہی ہے۔ ہم اس کی شادی نہیں کر سکتے۔“

سردار نے کہا کہ ”چلو کوئی بات نہیں اُمیں پڑھنے دو ہم لوگ ایک گھنٹے بعد آئیں گے۔“

مدرسہ: عدنان یوسف، بنوں

انتظام بھی کر لیا جائے۔ میرینا نے کچھ دیر دکاندار کے پاس ٹھہر کر یہ تفصیلات بھی طے کیں۔ اب مسئلہ تھا کھانے کی فراہمی کا۔ ظاہر ہے جب پورا گھر عزیز واقارب سے کھانا بھرا ہوگا اور سب رونے دھونے میں مصروف ہوں گے تو کھانا تیار کرنے کا ہوش کسے ہوگا۔ قصبے میں ایک ریسٹوران موجود تھا۔ جوئی اور خوشی کے موقعوں پر کھانے کا بندوبست بھی کیا کرتا تھا۔ میرینا نے ریسٹوران کے مالک سے ملاقات کی اور جمعے کی شام کے کھانے کے لیے بھنے ہوئے مرغوں کا آرڈر بک کروایا۔ مہمان تجیز و تکفین کی مشقت سے فارغ ہو کر واپس آئیں تو انہیں اچھا کھانا ملنا چاہیے، میرینا نے سوچا تھا۔

اس وقت شام ہونے لگی تھی۔ جب میرینا ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر گھر واپس آئی۔ وہ خاصی تھک چکی تھی۔ رات تک دلبر کی دیکھ بھال کرنے والی نرس مسز شین دلبر کے پاس موجود تھی۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد رات کے دس بجے دوسری نرس مس ریڈنگ کو آتا تھا اور دلبر

دنیا کی تاریکی دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگ ایسے بھی پیدا کیے جو لہو و لعب سے دور ہو کر روشنی پھیلانے کا سبب بنتے رہے۔... اور اللہ کے ولی تھے۔ اس راہ کی کنھنائیوں کو عبور کرنا خاص الخاص لوگوں کا ویرہ رہا۔ آپ کا شمار بھی انہی روشن ضمیر انسانوں میں ہوتا ہے جن کا فیض مخلوق خدا کو پہنچتا رہا۔



لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوا کرتے تھے کہ شاہی خاندان کا ایک فرد عبداللہ کفلات اور تقیات شاہی سے بے نیاز بلکہ نفور، نقش کشی اور چلوں میں مشغول رہتا ہے۔ ٹاٹ کا لباس زیب تن کیے ہوئے تیس سال گزر چکے تھے۔ خاندان کے لوگ آپ کے پاس آتے اور کہتے۔ ”عبداللہ! یہیں کیسے کیا سوچا ہے؟ اللہ نے ہمیں سب کچھ دے رکھا ہے لیکن تم نے ٹاٹ کا لباس پہن رکھا ہے۔ کیا یہ کفران نعمت نہیں ہے؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”کفران نعمت یہ ہے کہ انسان اپنے اعضاء جسمانی کو اپنے معبود کی عبادت اور شکرگزاری سے

چیزیں نکالنے لگی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس بیماری میں کوئی مریض کچھ عرصے کے لیے جانبر بھی ہو جاتا ہے لیکن اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کوئی مریض دلبر بھی تو ہو سکتا ہے اور اب میرنا کوئی ایسی مثالیں یاد آ رہی ہیں جب ڈاکٹروں نے کئی مریضوں کے بارے میں حتمی فیصلہ دے دیا تھا کہ وہ زندہ نہیں بچ سکتے مگر ہوا یہ تھا کہ مریض تو بچلے جیسے ہو کر اٹھ بیٹھے اور ڈاکٹر ملک عدم کو سدھار گیا۔

میرینا نے بے دھانی کے عالم میں کچھ چیزیں الٹی سیدی تیار کر کے ٹرے میں رکھیں اور ولبر کے کمرے کی طرف چل دی۔ اس کا ذہن ان متوقع پریشانیوں میں الجھا ہوا تھا جو حالات کے اس طرح پلٹا کھانے کی وجہ سے پیش آنے والی تھیں۔ اس نے تمام انتظامات شیڈول کے مطابق بڑے نظم و ضبط سے مکمل کیے تھے مگر ولبر کی موت کی سرحد سے بے وقت واپسی نے سب کچھ خاک میں ملا دیا تھا۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ رشتے داروں کو آنے سے روکا جاسکے۔

اب تک تو وہ یقیناً اپنے گھروں سے روانہ ہو چکے ہیں۔ کل تک گھر مہمانوں سے بھر جاتا تھا۔ اب انہیں جنازے کے انتظار میں ہفتہ دو ہفتہ یا اس سے زیادہ تو نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا، ان کے کھانے پینے کا بندوبست کہاں سے ہوتا؟ اس کے بیٹے اور داماد کو اتنی لمبی چمچی کیسے ملتی؟ ادھر پھولوں کی دکان والا بیماری مقدار میں پھولوں کا آرڈر بذریعہ تاجر شہر روانہ کر چکا تھا اور تو اور اب وہ اخبار بھی چھیننے کے لیے پریس جا چکا تھا جس میں ولبر کے جنازے کی خبر شائع ہو رہی تھی۔

شدید پریشانی اور صدمے کی حالت میں وہ ٹرے اٹھائے ولبر کے قریب آئی اور ٹرے تپائی پر رکھ دی۔ ولبر اس کی طرف سادگی سے دیکھ کر مسکرایا۔ ”واقعی بڑی بھوک لگی ہے۔“

”لیٹ جاؤ ولبر۔“ میرینا نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”ابھی تم بہت کمزور ہو۔“ وہ سعادت مندی سے بچکے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

میرینا نے دوسرا انگلی اٹھایا اور اس کی گردن پر رکھ کر پوری طاقت سے دبانے لگی۔ ولبر نے کمزور سے انداز میں مزاحمت کی۔

”ہلے جلنے کی کوشش مت کرو۔“ وہ غرائی۔ ”غضب خدا کا اگر میں نہ ہوتی تو تم نے خود اپنے جنازے میں تاخیر ہی کر دینی تھی۔ ہر کام میں دیر کرنے کی تمہاری پرانی عادت ابھی تک نہیں گئی۔“

میرینا حواس باختہ ہو کر فریج سے کھانے پینے کی

کی ہمدردی اور دیکھ بھال کا فریضہ سنبھالتا لیکن آج رات مس ریڈنگ کی موجودگی ضروری نہیں تھی۔ ایک تو اس لیے کہ ولبر مسلسل بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ نرس اب اس کے سرہانے بیٹھ کر سوائے اس کی آخری سانس کا انتظار کرنے کے اور کیا کر سکتی تھی؟ یہ کام میرینا اپنی فطرت کے خلاف خود کرنا چاہتی تھی۔ ولبر کی زندگی کی آخری گھڑیوں میں وہ خود کو اس کے قریب رکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے فون کر کے مس ریڈنگ کو آج رات آنے سے منع کر دیا۔

رات گزرنے کے ساتھ ساتھ ولبر کی سانسیں مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔ میرینا تھوڑی تھوڑی دیر بعد نگاہ اٹھا کر اس کلاک کی طرف دیکھ لیتی تھی جس میں وہ ہمیشہ آدھا کھٹے آگے کا وقت سیٹ کر کے رکھ لیتی تھی۔ اس طرح ولبر کو اس کی تمام تر سستی کے باوجود وقت پر تیار کروا کر کام پر بھیجے میں آسانی رہتی تھی۔

رات گھری ہوئے پر میرینا کو بار بار ادنگھ آنے لگی۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور گردن آگے جھکے لگی تو وہ ہڑبڑا کر سنبھل جاتی۔ ایسے ہی ایک جھٹکے کے دوران میں اس نے ولبر کو اٹھائی لیے اور پھر اٹھ کر بیٹھے دیکھا۔

”ہیلو میرینا۔“ اس نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ ”میں کہاں ہوں؟“

میرینا کا منہ کھلا زندگی میں پہلی مرتبہ یہ اتفاق ہوا کہ اس کے حلق سے کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔ ولبر نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں صرف معمولی سی تقابہت نظر آ رہی تھی۔ ”اوہ مجھے یاد آیا میں بیمار تھا، ہے نا؟“

میرینا اب بھی خاموش تھی۔ ولبر پر تین دن سے مکمل سکتہ طاری تھا اور تقریباً ایک ہفتے سے اس نے بات نہیں کی تھی اور اب وہ بڑے آرام سے پٹنگ پر بیٹھا روشن آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

”تت..... تم کیا محسوس کر رہے ہو ولبر؟“ بالآخر میرینا نے بھگاتے ہوئے پوچھا۔

”میں صرف بھوک محسوس کر رہا ہوں۔ گھر میں کھانے کے لیے کچھ ہے میرینا؟“

میرینا کرسی کا سہارا لے کر بہ مشکل اٹھی تو وہ بولا۔ ”میرے لیے کچھ چائیں ٹل لاؤ اور ہاں بیڑ کی ایک بوتل بھی لے آنا۔“

میرینا کمرے سے نکلی تو عقب میں ولبر نے ہانک لگائی۔ ”دیکھنا شاید فریج میں مرغ کی ران بھی موجود ہو۔“

میرینا حواس باختہ ہو کر فریج سے کھانے پینے کی

مخروم رکھے اور میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ایسی عقل عطا فرمائی جس سے میں اپنے دنیوی اور آخری دنیوی نقصان کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔“

انہوں نے اپنے کاموں کے لیے ایک آدمی رکھ لیا تھا جو گھر کے کام کے علاوہ آپ کے کھانے کی خاص فکر رکھتا تھا۔ آپ کا حکم تھا کہ جب دن بھر کے روزے کے بعد افطار کا وقت آئے تو خادم کن کرسات منے دے دیا کرے۔ ایک عرصے تک اس پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ آپ کی صحت گرتی رہی لیکن آہ نینم شبی میں لذت محسوس ہوتی رہی۔ اس لذت نے ان کے دل سے ضعف و قناعت کا خیال تک نکال دیا تھا۔

نصف رات گزر چکی تھی۔ وہ خدا کی بارگاہ میں گرے ہوئے آہ و زاری میں مشغول تھے لیکن آج روز جمعی لذت اور کیفیت سے وہ محروم تھے۔ وہ جب بھی اپنی زبان سے ”اللہ“ کہتے تو دل میں وہ چمک اور وہ لذت نہیں پیدا ہوتی جو یہود کا خاصہ تھا۔ ان کا دل سوز درونی سے محروم ہو چکا تھا۔ عبد اللہ بہت پریشان تھے۔ ان کی تو کوئی مایہ ناس حیات ہی چھن چکی تھی۔ اب ان کا دل اللہ کی یاد میں نہیں، اس میں مشغول تھا کہ اس سقم کا پتا چلا جائے جس نے ان کی لذت و کیفیت چھین کر انہیں خالی کر دیا ہے۔ انہوں نے رات کے پچھلے پہر اپنے خادم کو طلب کیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا آپ کے سامنے آکھڑا ہوا، ادب سے عرض کیا۔ ”خلاف معمول طلبی پر یہ عاجز پریشان اور خوفزدہ ہے۔ اس ناچیز سے کوئی غلطی تو نہیں سرزد ہوگئی؟“

آپ نے دریافت کیا۔ ”میں تجھ سے ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں اور اس تین کے ساتھ کہ جو بحث نہیں ہونے لگا۔“ خادم نے عرض کیا۔ ”یہ میری مجال کہ میں جھوٹ بولوں اور وہ بھی آپ سے، مجھ میں نہ اتنی ہمت ہے نہ حوصلہ۔“

آپ نے کہا۔ ”آج رات معلوم نہیں کیوں، مجھ پر نیند غلبہ کر رہی ہے اور اعصاب آسودگی کی محسوس کر رہے ہیں۔ میں بڑی کوشش کرتا ہوں کہ ان لذتوں اور کیفیتوں کا مزہ چکھوں، جو ہر رات مجھے حاصل رہی ہیں لیکن انتہائی کوششوں کے باوجود میں ان سے محروم ہوں۔ میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ تو نے افطار میں مجھے جو منے دیے تھے، ان میں کوئی خاص فرق تو نہیں تھا، کوئی تبدیلی کوئی تغیر؟“

خادم سنائے میں رہ گیا، بڑی بے بسی سے آپ کی صورت دیکھنے لگا، بولا۔ ”میں ایک عرصے سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ حضور کی صحت روز بہ روز گرتی جا رہی ہے۔ اور ضعف و قناعت سے حضور کی آنکھیں حلقوں میں چلی گئی ہیں اور اوپر کا نصف جسم جھکتا جا رہا ہے۔ میں اس کا اور کوئی علاج تو نہیں کر سکتا تھا، فوری اور قابل عمل جو تدبیر میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ میں حضور کے منقوں کی تعداد میں نہایت ہوشیاری سے اضافہ کرتا چلا جاؤں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ منقوں کی تعداد میں ایک معتد بہ اضافہ حضور کی کمزوری اور قناعت پر غالب آجائے گا۔“

آپ نے غصے میں پوچھا۔ ”تو نے آج افطار میں مجھے کتنے منے دیے تھے؟“ خادم نے جواب دیا۔ ”آٹھ منے آج میں نے ایک کا اضافہ کیا تھا۔“

آپ نے روٹا آگیا، ہلکے آواز میں بولے۔ ”ظالم! تو نے یہ کیا غضب کر دیا؟ تو جانتا ہے اس ایک منے نے میرے جسم میں کیا فتنہ کر رکھا ہے۔ میرے اعصاب آرام طلبی میں مبتلا ہیں اور دل و دماغ سوجانے پر مائل ہیں۔ آہ! مجھ سے میری آہ نینم شبی کی لذت اور کیفیت چھن گئی۔ تو نے یہ کیا کر دیا ظالم انسان!“

خادم سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ آپ بھی بڑی دیر تک سر جھکاے کچھ سوچتے رہے، آخر فرمایا۔ ”اب جا، آرام کر میں تجھ سے منہ بات کروں گا۔ لیکن مجھ سے یہ امید ہرگز نہ رکھنا کہ میں تجھے معاف کر دوں گا۔ تو مجھے جسائی اذیت پہنچاتا تو میں تجھے معاف بھی کر دیتا لیکن تو نے میری زندگی بھر کی کئی چھین لی، میرا سوز چھین لیا، میری آہ کی لذت لوٹ لی پھر میں تجھے کس طرح معاف کر دوں گا۔“

خادم نے لاجت سے عرض کیا۔ ”میں نے جو کچھ کیا تھا آپ کی بھلائی کے پیش نظر کیا تھا۔“ آپ نے جواب دیا۔ ”وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ مجھے نادان دوست کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا ہے۔ تو نے جو کام میری فلاح کے خیال سے کیا تھا اس سے مجھے زبردست نقصان پہنچ گیا۔ کل ایسی نوع کا تو کوئی اور کام میری بہبود کی خاطر کرے گا اور اس سے میں بالکل ہی تباہ و برباد ہو گیا تو کیا ہوگا؟ میں نادان دوست کو نہیں برداشت کر سکتا۔“

خادم خوفزدہ و لرزیدہ سامنے سے ہٹ گیا اور آپ پوری قوت ارادی سے خدا سے لو لگاتے رہے لیکن اس وقت ان کی عجیب سی کیفیت تھی۔ کسی کسی لمحے سوز درونی کی شصیں جھلکائی تھیں اور پھر جھجھکتی رہی۔ انہوں نے بارگاہ ایزدی

میں عرض کیا۔ ”اے اللہ العالمین! ایک منے کی اتنی بڑی سزا نہ دے کہ میں اپنی لذت آہ نینم شبی سے محروم ہو جاؤ۔ اپنے حبیب ﷺ کے صدقے میں اس غلطی کو نظر انداز فرما دے۔ اب آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔“ صبح آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے خادم کو رخصت کر دیا اور اس کی جگہ دوسرا آدمی رکھ لیا۔ اس واقعے کے بعد لوگ آپ کو خفیف کہنے لگے۔

تو کل اور استغناء کا یہ عالم تھا کہ آپ کسی سے اپنا کوئی کام نہ کہتے تھے نہ لیتے۔ ہاں دوسروں کا کام البتہ کر دیا کرتے تھے۔ آپ نے حج کا ارادہ کیا تو قافلے والوں سے اتنی بے نظمی اختیار کی کہ صرف پیاس کا خیال رکھا اور کسی چیز کی پروا نہ کی۔ سامان سفر میں ایک ڈول اور ایک رسی ساتھ لی اور حج کی نیت سے نکل کھڑے ہوئے۔ قافلے والوں کی اتباع، بیرونی یا پابندی آپ کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ کچھ دور تک تو آپ قافلے کے ساتھ رہے اس کے بعد آپ اس سے الگ ہو گئے۔ بھوک لگتی تو چند منے کھا لیتے اور پیاس لگتی تو کسی چشمے سے اپنا ڈول بھر کر پیاس بجھا لیتے۔

دوران سفر ایک ایسا مرحلہ بھی پیش آیا کہ کافی دور تک آپ کو کوئی چشمہ نہ ملا۔ پیاس آپ کو تنگ کرنے لگی۔ آپ چشمے کی تلاش میں ادھر ادھر نظر ڈور رہے تھے۔ آخر آپ نے کافی فاصلے پر ایک ہرن کو زمین کی طرف سر جھکاے کھڑے دیکھا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ ہرن پانی پی رہا ہے۔ آپ بے چینی سے اس طرف چل پڑے۔ جب قریب پہنچے تو ہرن ان کی آہٹ محسوس کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے آگے بڑھ کر جو دیکھا تو شیف میں ایک چشمہ رواں تھا۔ پانی کی سطح اتنی بلند تھی کہ ڈول رسی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اگر کمر پیچھی ہوتی تو ہرن اپنی پیاس نہ بجھا سکتا۔ آپ نے دونوں ہاتھوں کو چلو بنا کے پانی پینا چاہا لیکن انہیں بے دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ جیسے جیسے وہ ہاتھ پانی کی طرف لے جاتے تھے، پانی کی سطح نیچے ہوتی چلی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ پانی کی طرف منہ کے بل کافی تھک گئے اور بڑی کوشش کی کہ پانی پی لیں لیکن پانی تک ان کے ہاتھ نہیں پہنچ سکے۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے اپنے ہاتھ منہ لے لیے اور چشمے کے کنارے بیٹھ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا۔ ”میرے مولا! ایک ایسا یہ کہہ کر اچھے سے ہرن نے بھی پانی پیا تھا اور اس وقت اس کی سطح اوپری تھی لیکن جب میں نے پانی پینا چاہا تو اس کی سطح حیرت انگیز طور پر نیچی ہوتی چلی گئی۔ کیا تو مجھ سے ناراض ہے؟“

یہ خاموش ہو کر روئے گئے۔ ان کے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بولے۔ ”اے اللہ! میں اپنی گریہ و زاری کا جواب چاہتا ہوں۔ مجھے صرف یہ بتا دے کہ کیا میرا مرتبہ ہرن سے بھی کم ہے؟“

انہیں اپنے قریب ہی سے جواب ملا، کوئی کہہ رہا تھا۔ ”عبد اللہ! ہرن کے پاس ڈول رسی نہیں تھی اس لیے اس کے لیے پانی کی سطح اونچی کر دی گئی تھی۔ لیکن تو نے ڈول رسی کا سہارا لیا، تو اب رو کیوں رہا ہے؟ گریہ و زاری کیوں کر رہا ہے؟ رسی میں ڈول پھنسا اور بھر لے پانی ہم سے شکوہ کیوں کر رہا ہے؟“

آپ نے بڑی ندامت محسوس کی اور ڈول رسی پیچ کر آگے روانہ ہو گئے، بولے۔ ”میں پیاسا رہا ہوں گا لیکن اب ڈول رسی کا سہارا نہیں لوں گا۔“

ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ پھر آواز سنائی دی۔ ”عبد اللہ! کہاں جاتے ہو؟ کیا ناراض ہو گئے؟“ عبد اللہ بولے۔ ”اے اللہ! کیا کسی بندے میں اتنی ہمت ہے کہ اپنے آقا سے ناراض ہو جائے۔“

آواز آئی۔ ”پھر تو پانی پے بغیر ہی کیوں چل پڑا جبکہ میں جانتا ہوں کہ تو بہت زیادہ پیاسا ہے۔“ عبد اللہ نے کہا۔ ”مجھے میری غیرت اور ندامت نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ یہ پانی ہرگز نہ پیوں۔“

جواب ملا۔ ”تو نہیں چشمے پر واپس جا اور پانی پی لے۔ اس طرح تیرے صبر کا امتحان لیا جا رہا تھا۔ چشمے پر واپس جا اور اس کے پانی سے اپنی پیاس بجھا۔“

آپ چشمے پر دوبارہ واپس پہنچے اور یہ دیکھ کر ان کا دل بھر آیا کہ پانی کی سطح اتنی ہی اونچی ہو چکی ہے جتنی ہرن کے پانی پینے کے وقت تھی۔ آپ نے ہاتھ کو چلو بنا کے پانی پینا شروع کر دیا۔ پانی پیتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ جب خوب شکم بھر ہو کر پانی پی چکے تو اس پانی سے وضو بھی کیا۔

آپ حج سے فارغ ہو کر جب بغداد واپس آئے تو آپ نے اس عہد کے سب بڑے صوفی جنید بغدادی سے ملاقات کی اور ان کے سامنے پانی والا دھڑ بھرا دیا۔ ”جنید نے جواب دیا۔ ”عبد اللہ! اگر تم ذرا صابر اور کر لیتے تو چشمہ تمہارے قدموں میں پہنچے لگتا۔“

آپ خاموش ہو گئے کچھ دیر بعد فرمایا۔ ”جنتی! اگر تمہارے جیسا مشیر اور دوست اس وقت مجھے میسر آ جاتا تو آج میں اس سعادت سے بھی ہمکنار ہو چکا ہوتا۔“

☆☆☆

کچھ دن بعد ادمیں رہنے کے بعد آپ کو کسی نے بتایا۔ ”عبداللہ! تم کیا مراقبہ کرو گے؟ میں نے مصر میں ایک نوجوان کو کچھ ایسا راتے میں دیکھا کہ حیران رہ گیا۔ اسے اپنے آس پاس کی کوئی خبر ہی نہیں۔“
آپ نے تڑپ کر پوچھا۔ ”کیا تو مجھے اس شخص اس شخص کا پتا بتا سکتا ہے؟“
اس شخص نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں؟“

اس کے بعد اس شخص نے آپ کو اس نوجوان کا پتا بتا دیا۔ آپ اسی وقت مصر روانہ ہو گئے۔ کافی دنوں بعد سفر کی صعوبتیں اور پریشانیوں جھیل کر جب آپ مصر میں اس نوجوان کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر واقعی حیران رہ گئے کہ اس کے آس پاس لوگوں کا مجمع لگا ہوا ہے مگر اس نوجوان کے خضوع و خشوع، انہماک اور مراقبے میں کوئی فرق نہیں آ رہا۔
عبداللہ اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور یہ آواز بلند سلام عرض کیا لیکن اس نوجوان نے سلام کا جواب نہیں دیا۔
عبداللہ نے اسے پھر سلام کیا اور نوجوان نے اس بار بھی کوئی جواب نہ دیا۔ آپ نے تیسری بار بھی سلام کیا مگر اس بار بھی جواب سے محروم رہے۔

آپ نے چوتھی بار سلام کیا اور ساتھ ہی کہا۔ ”اے نوجوان! ایسا بھی انہماک اور مراقبہ اس کام کا کہ میں سنت رسول ﷺ ادا کر رہا ہوں اور تو میرے سلام کا جواب تک نہیں دے رہا۔“

نوجوان نے اپنا سر اٹھا یا اور آہستہ سے جواب دیا۔ ”اے خفیف! میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس بڑا وقت ہے اور تم اپنے اہم کاموں کو انجام دے کر فرصت حاصل کر چکے ہو حالانکہ تمہیں اس حقیقت کا علم ہونا چاہیے تھا کہ دنیا بہت قلیل اور عمر بہت مختصر ہے۔ اگر تم چاہو تو اس قلت میں سے کثرت حاصل کر لو لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ تم نے میرے جیسے بے کار آدمی سے ملنے کی خاطر مصر تک کا سفر کیا اور بار بار سلام کر کے اپنا ہی نہیں بلکہ میرا بھی وقت ضائع کرنا چاہتے ہو۔“
اتنا کہہ کر اس نے عبداللہ کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور پھر مراقبے میں چلا گیا۔

جب یہ اس نوجوان کے پاس پہنچے تھے تو ان کا بھوک سے بہت برا حال تھا لیکن نوجوان کے جواب نے ان کی بھوک اڑا دی تھی۔ یہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئے اور کہنے لگے۔ ”اے نوجوان! میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ ظہر اور عصر کی نماز میں تیرے ساتھ ہی پڑھوں گا۔“

دونوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور اس کے بعد عصر کی نماز بھی ایک ساتھ ادا کی۔ آپ نے اس نوجوان کا بہت شکر یہ ادا کیا اور کہا۔ ”میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے میری خواہش پوری کی اور دو نمازیں میرے ساتھ ادا کیں۔ اب ایک آخری خواہش بھی پوری کر دے۔“

نوجوان نے پوچھا۔ ”کون سی خواہش؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”میں چاہتا ہوں تو مجھے کوئی نصیحت کرے۔“
نوجوان نے کہا۔ ”خفیف! جو شخص خود ہی گرفتار بلا ہوا، اس کی زبان اس لائق کہاں کہ کسی کو نصیحت کرے۔ میں تو خود ہی ایک عرصے سے یہ امید لگائے ہوئے ہوں کہ کوئی مجھے نصیحت کرے۔“
عبداللہ نے کہا۔ ”اے شخص! میں کوئی نصیحت سننے بغیر وہیں نہ جاؤں گا۔“

نوجوان نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”خفیف! اس وقت تمہارے اصرار پر میں ایک ہی نصیحت کروں گا وہ یہ کہ تم ہمیشہ ایسوں کی صحبت اختیار کرو، جن سے خدا کی یاد تازہ رہے اور یہ لوگ ایسے ہوں جو خدا کی یاد کی زبانی تائین نہ کرتے ہوں بلکہ صحیح معنوں میں عمل کر کے تمہیں اس کا عامل بنا دیں۔“

آپ اس نصیحت پر زار و قطار روئے اور کہا۔ ”آہ، میں ایسے دوست کہاں پاؤں گا جو اپنے عمل سے مجھے خدا کی یاد پر ڈال دیں جبکہ میں خود ابھی اس راہ کا ایک ادنیٰ ساما سفر ہوں۔“

آپ نے ادنیٰ میں ایک جھگل سے زکرتے ہوئے، ایک لاش پڑی دیکھی۔ اس لاش کے آس پاس آہستہ آہستہ لوگ آ آ کر جمع ہو رہے تھے۔ آپ ان لوگوں کے قریب پہنچے اور پوچھا۔ ”یہ کس شخص کی لاش ہے؟“

شیدخ المصالح

کسی نے جواب دیا۔ ”یہ ہمارا راہب تھا اور اس نے اپنی پوری زندگی خدا کی یاد میں گزار دی۔“

آپ نے دریافت کیا۔ ”اب اس لاش کا تم لوگ کیا کرو گے؟“

جواب ملا۔ ”اس راہب نے مرنے سے پہلے ایک وصیت کی تھی۔ ہم لوگ اسی پر عمل کرنے جا رہے ہیں۔“

آپ نے تعجب سے پوچھا۔ ”اس نے کیا وصیت کی تھی؟“

جواب دیا گیا۔ ”اس نے کہا تھا کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے دفن کرنے کے بجائے جلادیا جائے اور میری راکھ کو محفوظ کر لیا جائے اور یہ راکھ ان لوگوں کی آنکھوں میں سرے کے طور پر لگائی جائے جن کی آنکھیں خراب ہوں یا ان کی بینائی رخصت ہو چکی ہو۔“
آپ نے کہا۔ ”لیکن اس عمل کا فائدہ؟“

کسی نے جواب دیا۔ ”اس عمل کا فائدہ یہ ہوگا کہ خراب آنکھ ٹھیک ہو جائے گی اور کوڑھ چمنا ہو جائے گی۔“

آپ کو ان باتوں پر یقین نہیں آیا۔ آپ وہیں کھڑے ہو کر لاش کے جلنے کا منظر دیکھنے لگے۔ لوگوں نے واقعی راہب کی راکھ کو اپنی اپنی شیشیوں میں محفوظ کر لیا۔ آپ ان کی خوش عقیدگی پر افسوس کرتے رہے۔ آپ نے پوچھا۔ ”کیا تم لوگوں کو واقعی یقین ہے کہ اس راکھ سے خراب آنکھیں درست اور تازہ بنا دیا جائے گی؟“

ایک کٹر مسیحی نے طنز کہا۔ ”تم مسلمان ہو اس لیے تمہیں ہماری باتوں پر یقین نہیں آ رہا لیکن میں تمہیں اس کا مشاہدہ ہی کیوں نہ کر ا دوں۔“

وہ مسیحی آپ کو اپنے گھر لے گیا اور میرا بنی کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد اس نے بستی کے ان آدمیوں کو تلاش کرنا شروع کر دیا جن کی آنکھیں خراب تھیں یا ان کی بینائی رخصت ہو چکی تھی۔ بہ مشکل اس نے چار آدمی تلاش کر لیے۔

ان میں تین کی تو آنکھیں خراب تھیں اور ایک اندھا تھا۔

اس مسیحی نے ان چاروں کو عبداللہ کے سامنے کھڑا کر دیا، کہا۔ ”حضرت! ان چاروں کی آنکھیں ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں سے تین کی تو آنکھیں خراب ہیں اور ایک نابینا ہے۔ اب میں اس راکھ کا اثر آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔“

آپ خود بخیرت زدہ یہ تماشا دیکھنے لگے۔

اس مسیحی نے یکے بعد دیگرے خراب آنکھوں میں راکھ کی سلائیاں پھیریں اور انہیں ایک تاریک کمرے میں جا کر چھوڑ دیا، بولا۔ ”جب تک میں بلاؤں نہ، تم تینوں اندر رہی رہو گے۔“

یہ تینوں کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ آخر میں اس نے نابینا کی آنکھوں میں راکھ کی سلائیاں پھیر کر انہیں پٹی سے باندھ دیا اور کہا۔ ”تم یوں ہی بیٹھے رہو، یہ پٹی میں خود ہی کھولوں گا۔“

عبداللہ حیرت سے یہ سب دیکھتے رہے۔ وہ شخص آپ کو لے کر اس کمرے میں چلا گیا جہاں ان کی اقامت کا انتظام کر دیا تھا۔ آپ نے شام تک کا وقت بڑی بے چینی اور اضطراب میں گزارا۔ مغرب کے بعد آہستہ آہستہ اندھیرا پھیلنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دن کی سپیدی کورات کی چادر نے لپیٹ کر انسانی نظروں سے اوچل کر دیا۔ اس رات آسمان پر بارشوں کا چاند چمک رہا تھا اور چاند کی روشنی میں ستارے اپنی چمک دکھ کر زور کر چکے تھے۔ مسیحی، عبداللہ سے باتیں کرتے کرتے اپنی جگہ سے اٹھا اور کہا۔ ”شاید اب وقت آ گیا ہے کہ میں ان چاروں کو آپ کے پاس لے آؤں اور راہب کی راکھ کے کرشمے دکھا دوں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کیا حیرانہ خیال ہے کہ وہ فضول راکھ اپنا کام کر چکی ہوگی؟“

مسیحی نے کہا۔ ”جواب آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، اگر آپ اس مقدس راکھ کو فضول نہ کہیں۔“

آپ نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر میری اس بات نے تیرے دل کو دکھ پہنچایا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔“

مسیحی ان تینوں کو کمرے سے باہر لے آیا ان تینوں نے ابھی تک اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ مسیحی نے ایک شخص کو عبداللہ کے قریب کھڑا کر دیا اور اسے حکم دیا۔ ”اے شخص! آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول اور میرا بتا کہ اس راکھ نے کوئی اثر کیا یا آنکھیں اب بھی خراب ہیں؟“

اس شخص نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنا شروع کر دیں اور جب اس کی دونوں آنکھیں پوری طرح کھل گئیں تو وہ خوشی میں چیخ اٹھا۔ ”آہ، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میری آنکھیں بالکل درست ہو چکی ہیں۔“

آپ کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ اس شخص سے کہا۔ ”اے شخص! تو جو کچھ کہہ رہا ہے وہ درست ہے یا اپنے مذہب

اور عقائد کی طرف ذرا سی میں ایسی بات کر رہا ہے؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تو کون ہے اور ایسی بات کیوں کر رہا ہے لیکن میں اب صبح علیہ السلام کی قسم کھا کر تجھے یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، تو اس کی صداقت پر شک و شبہ نہ کر۔“

اس کے بعد دوسرے اور تیسرے شخص کی آنکھیں بھی کھلوانی لگیں اور ان دونوں نے بھی ویسی ہی باتیں کیں جیسی پہلا شخص کر چکا تھا۔ ان تینوں کی آنکھیں ٹھیک ہو چکی تھیں۔

آپ نے اس سب سے کہا۔ ”بھائی میں حیران ہوں اور مجھے ان تینوں کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا۔ بجلیا یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی مردے کی راہ کو دوا کا کام دے۔“

سبکی نے جواب دیا۔ ”اے مسلمان درویش! مردے کی راہ کھ کر ہمارے مقدس بزرگ کی بے حرمتی نہ کیجئے۔ اگر وہ مقدس نہ ہوتا تو سبکی بھی اس کی راہ میں یہ اثر نہ ہوتا۔“

آپ نے کہا۔ ”اب اس نینا کی پتی تو کھول کر دکھاؤ۔ اس اعتبار سے وہ گویا نینا ہو چکا ہوگا۔“

”بے شک۔“ سبکی نے جواب دیا۔ ”مجھے اس پر ذرا سہمی نہیں۔“

اس کے بعد وہ سبکی اس نینا کو لے آیا اور آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں پر سے پٹی ہٹانے لگا۔

ایک آنکھ پر سے ذرا سی پٹی ہٹا کر اس نے کہا۔ ”اے شخص! اپنی آنکھ کے گوشے سے دنیا دیکھنے کی کوشش کر، کیا تجھے کچھ نظر آیا؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں اپنی آنکھ کے کھلے ہوئے گوشے سے بادلوں کا جھنڈ دیکھ رہا ہوں یا پھر ایسا ہے کہ میں کبر آلود فضا میں کھڑا ہوں۔“

سبکی نے پٹی ذرا سی اور کھسکا دی، پوچھا۔ ”ادرب؟“

”بال بد دستور موجود ہے، کبر آلود فضا۔“

اس کے بعد سبکی نے پوری پٹی ہٹا دی۔ نینا کی بینائی واپس آ چکی تھی۔ عبداللہ حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا مسیحی حق پر ہیں؟ کیا ایک راہب اپنی موت کے بعد بھی مخلوق کے لیے اتنا مفید اور فائدہ رساں ہو سکتا ہے؟ یہ سوالات انہیں پریشان کرتے رہے۔ رات کو جب یہ سو گئے تو خواب میں رسول مقبول ﷺ کو دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا۔

”اے خفیف! تم انجنوں کا شمار کیوں ہو گئے ہو؟ اس راہب کی راہ کھ نے تمہیں اتنا پریشان کیوں کر دیا ہے؟ ان باتوں سے تمہیں ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہیے، صدق ریاضت سے باطل دین والوں میں بھی یہ اثر پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر دین حق والے بھی صدق ریاضت سے کام لیں تو ان میں اس راہب سے زیادہ کمالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ صدق و دیانت، ریاضت اور خلوص، یہ کہیں بھی ہوں، ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔“

آپ کے دل کو تر آ گیا اور کچھ دن اس مسیحی کے مہمان رہ کر روانہ ہو گئے۔

آپ نے ایک بار پھر رسول مقبول ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ ﷺ نے عبداللہ سے فرمایا۔ ”اے خفیف! اگر راہ طریقت کا واقف بھی اس راستہ پر گامزن نہ ہوگا تو مشر میں بھی شخص عذاب کا سب سے زیادہ مستحق قرار پائے گا۔“

آپ پر اس قول کا اتنا شدید اثر ہوا کہ آپ نے اتباع سنت ﷺ میں انگوٹھوں کے بل پر کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیابی نہ حاصل کر سکے۔ آپ نے ذرا وقت گزارتے ہوئے عرض کیا۔ ”یا رسول اللہ ﷺ! میں نے تو بڑی کوشش کی کہ آپ ﷺ کی اتباع میں انگوٹھوں کے بل کھڑے ہو کر نماز پڑھوں لیکن میں ناکام رہا۔ اب آپ ﷺ یہ فرمایے کہ میں راہ طریقت پر کس طرح چلوں کہ مشر میں مجھے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔“

آپ نے اسی رات خواب میں دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں کہ ”اے خفیف! انگوٹھوں کے بل کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا تیرے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ بات میری ذات تک مخصوص تھی۔ تجھے اس معاملے میں میری اتباع نہیں کرنا چاہیے۔“

ایک بار آپ نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہو چکی ہے۔ ہر طرف نفسانی کا بازار گرم ہے۔ لوگ حیران و سرگرداں ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ہل صراط پر لوگوں کا جھوم ہے اور اس پر سے گزرتا مشکل ہو رہا ہے۔ اس عالم میں آپ نے دیکھا ایک چھوٹا سا بچہ کس طرف سے نمودار ہوا اور ایک شخص کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ ”ابا جان! آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ ادھر آئیے میرے ساتھ تاکہ میں آپ کو ہل صراط کے اس پار پہنچا دوں۔“

شیخ المنصاح

اس شخص نے اپنا ہاتھ اس لڑکے کے ہاتھ میں دے دیا۔ لڑکے نے اسے نہایت آسانی سے ہل صراط کے اس پار پہنچا دیا۔ سامنے ہی جنت تھی، لڑکے نے کہا۔ ”ابا جان! آئیے میرے ساتھ، میں آپ کو جنت میں داخل کرادوں۔“

چنانچہ اس لڑکے نے اپنے باپ کو جنت میں پہنچا دیا اور خود بھی غائب ہو گیا۔

آپ نے بیدار ہوئے ہی کسی عورت سے نکاح کر لیا۔ دس گیارہ ماہ بعد گھر میں ایک حسین بچہ پیدا ہوا جو چند گھنٹے زندہ رہ کر چل بسا۔ بیوی تجھیں مار مار کر روئے لگی۔ آپ بھی بہت اداس تھے، آہستہ آہستہ چل کر بیوی کے پاس پہنچے اور کہا۔ ”بی بی! تم اتنا مت رو، خدا کی مشیت میں کوئی کس طرح دم رسکتا ہے۔ رضائے الہی پر تمہیں اپنا سر جھکا دینا چاہیے کیونکہ اللہ اس بات سے بہت خوش ہوتا ہے۔“

بیوی نے روتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ میرے پاس اس قسم کی باتیں کر کے دل دکھانے آئے ہیں۔ میں کس طرح صبر کر لوں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”تم کس طرح یہ کہہ سکتی ہو کہ میں نے یا میرے کسی رویے میں تمہارے لیے تکلیف اور اذیت کا محرک پایا جاتا تھا۔ میں نے تو تم سے کسی اور ہی مقصد سے شادی کی تھی۔ آج وہ مقصد پورا ہو چکا ہے اس لیے مجھے اجازت دیجئے۔ میں تمہیں اور چلا جاؤں گا۔ میں تمہیں طلاق بھی دے سکتا ہوں کیونکہ لڑکے کی پیدائش اور اس کی فوری موت نے میرے مسائل حل کر دیے۔ اب میں اس فکر سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔“

بیوی نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میں نے طلاق لینے کے لیے یہ شادی نہیں کی تھی۔ یہ طلاق کیوں لوں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اگر تم اب بھی میرے ہی ساتھ رہنا چاہتی ہو تو میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔“

بیوی کا دل گداز اور کمزور تھا۔ شوہر کو اداس اور طول دیکھ کر خود بھی رونے لگی۔

☆☆☆

آپ کے مریدوں میں دو ایسے بھی تھے جن کا نام احمد تھا۔ آپ نے ان دونوں میں تمیز کی خاطر ایک کا نام احمد کہہ اور دوسرے کا نام احمد رکھ دیا لیکن آپ کا احمد کہے بڑی اہمیت تھی۔ حالانکہ عبادت اور ریاضت میں احمد کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔ دوسرے مرید جب یہ دیکھتے کہ ایک دیندار کے مقابلے میں دوسرے کمتر رہے کہ دیندار کو زیادہ سراہا جا رہا ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔

ایک دن ایک مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں ایک بات معلوم کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اگر اس کا صحیح جواب مل جائے گا تو میں نہایت شوق و خضوع سے یاد الہی میں مشغول رہ سکوں گا۔“

آپ نے کہا۔ ”وہ کیا، پوچھو۔“

مرید نے عرض کیا۔ ”آپ کے دونوں مرید احمد کہہ اور احمد میں جو زیادہ عبادت گزار اور متقی ہے آپ اس کے مقابلے میں اسے زیادہ جاتے ہیں جو نسبتاً کم عبادت گزار ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں تیرے سوال کا جواب کسی خاص وقت پر دوں گا۔ اس کے لیے تجھے انتظار کرنا ہوگا؟“

مرید چپ ہو گیا۔ اس بات کو ایک عرصہ گزر گیا۔

آپ ایک بڑے اجتماع سے مخاطب تھے۔ آپ کے دلکش انداز و عطا گوئی نے مجمع پر سحر سا کر رکھا تھا۔ وعظ کے خاتمے پر آپ نے احمد سے کہا۔

”احمد! میرا ایک کام تو کر دے۔“

احمد نے ادب سے عرض کیا۔ ”ارشاد، ایک کیا دس کا ارشاد فرمائیے میں دل و جان اس طس کی تعمیل کروں گا۔“

آپ نے کہا۔ ”میرے اونٹ کو، جو باہر بندھا ہوا ہے، ذرا اوپر چھت پر باندھ دے۔“

احمد آپ کی صورت دیکھنے لگا، آپ نے پوچھا۔ ”میری صورت کیا دیکھ رہا ہے، میں نے جو کام تیرے سپرد کیا ہے اسے انجام دے۔“

احمد نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ”حضرت! آپ نے اس پر غور بھی فرمایا ہے کہ کیا حکم دے رہے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے تجھے جو حکم دیا ہے اچھی طرح سوچ کچھ کر دیا ہے، اونٹ کو چھت پر لے جا کر باندھ دے۔“

احمد نے کہا۔ ”حضرت! ذرا غور تو فرمائیے، اونٹ کوئی بکری یا بھیر کا بچہ تو ہے نہیں جسے میں گود میں لے کر چھت پر

آپ نے احمد کہہ کر آواز دی۔ ”احمد کہہ! ذرا میرے قریب تو آنا۔“

احمد کہہ بھاگا بھاگا آپ کے دروازے پر آکر کھڑا ہوا۔ ”ارشاد!“

آپ نے فرمایا۔ ”ذرا میرے اونٹ کو چھت پر لے جا کر باندھ تو دے۔“

احمد کہہ نے گردن جھکا کر بعد ادب عرض کیا۔ ”بہتر ہے، ابھی لے لیجئے۔“

احمد کہہ فوراً اٹھا اور اونٹ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اونٹ کو دونوں ہاتھوں میں سینے کی کوشش کی لیکن اس کا ایک ہاتھ اکر اونٹ کی پچھلی ٹانگ پر تھا تو دوسرا اونٹ کے نصف حصے تک پہنچ کر رک جاتا تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ اونٹ کو گود میں اٹھالے لیکن ناکام رہا۔

آپ اپنے چند مریدوں کو ساتھ لے کر احمد کہہ کے پاس پہنچ گئے۔ ان میں وہ مرید بھی شامل تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے یہ سوال کیا تھا کہ آپ عبادت گزار احمد کے مقابلے میں نسبتاً کم عبادت گزار احمد کہہ کو کیوں زیادہ چاہتے ہیں۔ آپ نے اپنے مریدوں کے ساتھ یہ تمنا شادیکھا کہ احمد کہہ سینے میں تربہ تراونت کو اٹھا لینے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا ہے لیکن اونٹ کو جیش تک نہیں دے پا رہا۔ آپ نے احمد کہہ سے کہا۔ ”اب بس کر اگر اونٹ تیرے اٹھائے نہیں اٹھتا تو مت اٹھا، میرا نشان پورا ہو چکا۔“ مرید حیرت سے آپ کی شکل دیکھنے لگے۔ احمد کہہ نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کا حکم بھلاؤں۔“ آپ نے کہا۔ ”میرا حکم تو بھلا یا اب مزید ہلکان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اونٹ تیرے اٹھائے نہیں اٹھے گا۔“ جس مرید نے کچھ عرصے پہلے اعتراض کیا تھا، اس نے کہا۔ ”آپ کو خود بھی اس کا پہلے یہ علم ہو گا کہ اونٹ اس کے اٹھائے نہیں اٹھے گا پھر اسے خواہ مخواہ ہلکان فرمایا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”مجھے اور تیرے جیسے دوسروں کو یہ بتانے کے لیے کہ میں عبادت گزار احمد کے مقابلے میں کم عبادت گزار احمد کہہ کو کیوں زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔“

مرید نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ”اس طرح اس ناچیز کی سمجھ میں یہ بات اب بھی نہیں آئی۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے ایک ہی حکم دونوں کو دیا۔ ان میں جو زیادہ عبادت گزار تھا، وہ اپنی عبادت پر نازاں رہا اور میرے حکم کی بجا آوری کے بجائے یہ عذر پیش کر دیا کہ اونٹ کو چھت پر لے جانا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے برعکس احمد کہہ جو تم سب کی نظروں میں احمد کے مقابلے میں کم عبادت گزار ہے، میرا زیادہ فرماں بردار ہے۔ چنانچہ جب میں نے اسے یہ حکم دیا کہ اونٹ کو چھت پر باندھ دے تو اس غریب نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ میل حکم کی کوشش میں مشغول ہو گیا۔ مجھے ایسا ہی انسان زیادہ پسند ہے جو حکم کی بجا آوری میں احمد کہہ جیسا ہو۔“

معترض مرید اور اس جیسے دوسرے مریدوں کو اپنے اپنے شک و شبہات کا جواب مل چکا تھا۔ وہ اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔

☆☆☆

ایک شخص آپ کے پاس آیا اور درخواست کی کہ میرے ساتھ کھانا تناول فرمانے کی سعادت عطا فرمائیں۔

آپ نے پہلے تو امل سے کام لیا لیکن جب اس کا اصرار بہت زیادہ بڑھ گیا تو آپ نے اس کی دعوت قبول کر لی اور ارشاد فرمایا۔ ”مجھے کھانے کے وقت اپنے ساتھ لے جانا۔“

وہ شخص چلا گیا اور کھانے کا اہتمام کرنے لگا۔ جب کھانا تک چکا تو وہ آپ کو بلائے آ گیا۔

آپ کھانا کھانے بیٹھے تو پہلے ہی لقمے پر کچھ کراہت کی محسوس ہوئی۔ آپ کو گوشت میں کچھ خرابی محسوس ہوئی۔ صاحب خانہ نے پوچھا۔ ”حضرت! کوئی خاص بات؟“

آپ نے اس کی پردہ پوشی کی۔ ”نہیں تو، کوئی خاص بات نہیں۔“

اس شخص نے نہایت عقیدت اور محبت سے عرض کیا۔ ”حضرت! میں ایک سعادت اور حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”وہ کیا؟“

اس نے عرض کیا۔ ”میں لقمے اپنے ہاتھ سے آپ کو کھانا چاہتا ہوں۔“

آپ نے اپنے ہاتھ بچھ لیے، بولے۔ ”تو اپنی یہ خواہش مجھ ہی پوری کر لے۔“

اس شخص نے اپنے ہاتھ سے آپ کو کھانا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے وہ قہقہوں کو چباتے تھے انہیں گوشت کی خرابی اور شراوند کا

احساس شدید ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ آپ کے چہرے سے نظریں ہٹاتا تو آپ کے چہرے پر کراہت کی ٹھکنیں نمودار ہو جاتیں اور جب وہ دیکھنے لگتا تو آپ مضطرب و محتاط سے کام لیتے کہ کہیں اس کی دل چھکنی نہ ہو جائے لیکن آخر کار صاحب خانہ کو اس کا احساس ہو گیا کہ گوشت صحیح نہیں ہے اور اس میں شراوند محسوس ہو رہی ہے۔ اس نے شرمندگی سے منہ چھپا لیا۔ آپ نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اسے اچھی طرح نادم ہونے کا موقع دیا۔

اسی سال آپ ایک بار پھر حج بردار نہ ہو گئے۔ آپ جس قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے، وہ قادیہ پہنچ کر راستہ بھول گیا یہ اپنے قافلے کے ساتھ بھٹکنے لگے۔ پاس کھانے کو جو کچھ تھا ختم ہوئے لگا۔ اس پاس کوئی بستی بھی نہ تھی۔ یہ کئی دن تک بھٹکنے کے بعد اپنا کھانے پینے کا سامان تک ختم کر بیٹھے اور نبوت فاقوں تک پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے کھانے کے لیے بڑی دودھوپ کی لیکن بڑی مایوسی رہی اور بھوک حد سے تجاوز کر رہی۔

آخر وہ لوگ اضطراری حالت کو پہنچ گئے جہاں حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔ بھوک نے ان سب کو جاں نہ لب کر رکھا تھا۔ قافلے کے لوگ ادھر ادھر پھیل گئے۔ وہ آبادی کی تلاش میں پریشان اور سرگرداں تھے۔

اس وقت آپ کو وہ شخص یاد آ رہا تھا جس نے آپ کی دعوت کی تھی کہ گوشت کی شراوند کا علم ہو جانے کے بعد شرمندہ اور نادم ہو کر ایک طرف جا بیٹھا تھا اور آپ نے اس کی ندامت دور کرنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی تھی۔ آپ کو اچانک احساس ہوا کہ یہ جو کچھ مجھ میں ہو رہا ہے، اس عذاب میں ہو رہا ہے۔ آپ کو اس شخص کی ندامت اور دل شکنی کا خیال ضرور کرنا چاہیے تھا۔ شاید یہ اسی بات کی سزا ہے۔

☆☆☆

آپ نے آخری عمر میں بادشاہ کے دربار میں جانا شروع کر دیا تھا۔ لوگ اس تغیر پر حیران تھے لیکن آپ بڑی پابندی سے دربار جانے لگے تھے۔ آپ کے مرید اس پر معترض تو تھے لیکن زبان سے کچھ بھی نہ کہتے تھے۔ کسی نے احمد کہہ کو آدھار کھانا چاہا کہ وہ آپ سے پوچھنے کہ آپ نے بادشاہ کی دربار داری کیوں شروع کر دی ہے؟

لیکن احمد کہہ نے صاف انکار کر دیا کہ میں یہ سوال نہیں کروں گا۔ آپ دربار جا رہے تھے اور آپ کے مرید کو گلو بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان میں ہر شخص اس تبدیلی کو بڑی ناگواری سے محسوس کر رہا تھا۔ جب آپ دربار چلے گئے تو آپ کی عدم موجودگی میں درویش نہایت دور دراز سے سفر کر کے آپ سے ملاقات کو حاضر ہوئے۔ انہوں نے پوچھا۔ ”عبداللہ خفیف کہاں ہیں؟“

کسی مرید نے جواب دیا۔ ”وہ بادشاہ کے پاس شریف لے گئے ہیں۔“

درویشوں نے حیرت سے کہا۔ ”عبداللہ خفیف اور بادشاہ؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ شامی دربار میں باقاعدگی سے حاضری دے رہے ہیں۔“

ایک درویش نے اپنے ساتھی درویش سے کہا۔ ”یہ کیسے بزرگ ہیں جو شامی دربار میں جایا کرتے ہیں۔ حالانکہ درویشوں کو شامیوں اور ان کے درباروں سے کیا تعلق؟“

دوسرے درویش نے جواب دیا۔ ”خدا عالم الغیب ہے، وہی چھپی باتوں اور دلوں کے رازوں سے واقف ہوتا ہے۔“

دونوں درویش آپس میں شورہ کرنے لگے کہ عبداللہ خفیف کا کہاں انتظار کیا جائے؟ ان کی خانقاہ میں یا کہیں اور پھر دونوں نے یہ طے کیا کہ شیراز کے بازاروں میں گھوم پھریا جائے۔ یہ طے کر کے دونوں بازار کی طرف نکل گئے۔ وہ کافی دیر تک گھومتے پھرتے رہے۔ اچانک ان کی نظر ایک درزی پر پڑی۔ ایک درویش کے خرے کی جیب بھٹی ہوئی تھی اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے وقت غنیمت ہے، کیوں نہ میں اپنے خرے کی جیب سلوا لوں۔“

دوسرے درویش نے تائید کی، بولا۔ ”بے شک، وقت غنیمت ہے۔“

دونوں درزی کی دکان پر بیٹھ گئے اور ایک درویش نے اپنا خرقد اتار کر درزی کے حوالے کیا اور کہا۔ ”اوبھائی درزی! ذرا

میری یہ بھٹی ہوئی جیب توی دے۔“

درزی نے خرقد لیا اور جب سینے لگا۔ اسی دوران اسے قہقہے کی ضرورت پیش آگئی۔ اس نے اپنے سامان میں قہقہے

گھر کابھوت

مریم کے حنا

چاہنے والوں کی جنس اور شکل چاہے جو بھی ہو مگر یہ آفاقی جذبہ بڑے بڑے سو مائٹوں کو محبوب کے قدموں کی خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جس کے سائے سے بھی اس کی جان نکل جاتی تھی رفتہ رفتہ دل کے نہاں خانوں میں اترتا چلا گیا۔ اس موڑ پر جذبہ رقابت نے وہ رنگ اختیار کیا کہ زندگی کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا۔

پراسرار محبت کی قید سے راہ فرار پانے والوں کا ماجرا

لان جس میں سوکھی گھاس اُگی ہوئی تھی اور جاہ جاگر گٹ اور اسی نسل کے جانور بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ایک طرف فولاوی زنجیر سے دو جھولے لٹکے ہوئے تھے جن کے تختے گھاس میں غائب ہو گئے تھے۔ دو منزلہ پتھر اور لکڑی سے

مجھے یعنی میری این کو شدت سے جان پر غصہ آ رہا تھا۔ جان میرا عزیز از جان شوہر ہے لیکن اس وقت وہ مجھے زہر لگ رہا تھا کیونکہ وہ اس کھر کو خریدنے کے لیے مرا جا رہا تھا جو دیکھنے میں آسیب زدہ نظر آ رہا تھا۔ سامنے بڑا سا اجاڑ



ایک مسافر آپ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہوا کہ اس نے جو کچھ پہن رکھا تھا، سیاہ تھا۔ گویا ماتم کدے کی چلتی پھرتی تصویر تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ ”تو نے یہ سیاہ لباس کیوں پہن رکھا ہے؟“ اس نے جواب دیا۔ ”اے خفیف! میرے عکراں یعنی نفس اور ہوا، دونوں فوت ہو چکے ہیں اس لیے میں نے ماتمی لباس پہن لیا ہے۔“

آپ نے حکم دیا۔ ”اس شخص کو فوراً نکال باہر کرو۔“ مریدوں نے حکم کی تعمیل کر دی اور اس شخص کو نکال باہر کیا لیکن ڈرا دیر بعد دیکھا کہ وہ شخص پھر آ گیا ہے۔ آپ نے اسے پھر ننگو دیا اور اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تک نظر نہ آئے۔ آخر آپ نے فرمایا۔ ”اے شخص! واقعی یہ لباس تجھے زیب دیتا ہے۔ کیونکہ ستر باریک تدبیر میں ہی تجھے آرزو نہیں کر سکی۔“

آپ نے ایک بار دوران وعظ ارشاد فرمایا۔ ”لوگو! اللہ تعالیٰ نے پہلے ملائکہ اور انس و جن کو تخلیق فرمایا۔ ان کے بعد عصمت، کفایت اور جہلت کو تخلیق فرما کر حکم دیا کہ تینوں ان میں سے ایک ایک شے اپنے لیے پسند کر لیں۔ چنانچہ ملائکہ نے عصمت، اجنہ نے کفایت کو اور انسانوں نے جہلت کو منتخب کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کثرت سے حیلہ سازی سے کام لیتا ہے۔ عہد گزشتہ میں انسان اجنہ پر غالب رہتے تھے۔ لیکن پھر معاملہ الٹا ہو گیا۔“

کسی مرید نے دریافت کیا۔ ”حضرت! فکری خوبیاں بیاں فرمائیے۔“ آپ نے جواب دیا۔ ”وہ تو میں بیان کر دوں گا لیکن یہ ابھی طرح ذہن نشین کر لے کہ اظہار فقر معیوب شے ہے۔ پھر فرمایا۔ ”جو کچھ میرا آجائے کھا کر خدا کا شکر ادا کرے اور میرا نہ آئے تو صبر سے کام لے۔“

آپ نے ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔ ”لوگو! کچھ جانتے ہو، عبادت کے کہتے ہیں؟“ لوگوں نے جواب دیا۔ ”نہیں، آپ اس کی وضاحت فرما دیجیے۔“ آپ نے کہا۔ ”عبادت نام ہے دائمی غم اور خوشی کو ترک کر دینے کا۔“ پھر پوچھا۔ ”اور وصل کیا ہوتا ہے؟“

لوگوں نے جواب دیا۔ ”آپ ہی ارشاد فرمائیں، ہم نہیں جانتے۔“ آپ نے کہا۔ ”وصل نام ہے محبوب سے اس اتصال کا جس کے بعد کچھ کمی نہ یاد رہے۔“ پھر پوچھا۔ ”اور تقویٰ کیا ہے؟“ لوگوں نے پھر نفی میں جواب دیا۔ ”حضرت! اس سوال کا جواب بھی آپ ہی مرحمت فرمائیں گے۔“

آپ نے کہا۔ ”نفس، دنیا اور انیس سے بیک وقت کنارہ کشی اختیار کرنے کا نام تقویٰ ہے۔“ ”اور رہی ریاضت؟ تو اس کے معنی ہیں، عبادت الہی سے نفس کو شکست دینا۔ اسی چیز کو ریاضت کہتے ہیں۔“ آخری عمر میں جب آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ ”اے خادم! ادھر میرے پاس آؤ۔“

خادم آپ کے دربار پر آکر کھڑا ہو گیا۔ آپ نے وصیت فرمائی کہ۔ ”موت کے بعد میرے ہاتھوں میں رہی باندھ کر اور گلے میں طوق ڈلو کر قبہ رو بٹھا دینا، شاید اسی طرح میری مغفرت ہو جائے۔“ آپ کے انتقال کے بعد خادم نے اس پر عمل کرنے کی کوشش کی تو کسی نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”خبردار! بے ادب! جو تو نے خفیف کی وصیت پر عمل کیا، کیا تو ہمارے محبوب کو رسوا کرنا چاہتا ہے۔“

خادم نے خوفزدہ ہو کر آپ کی وصیت پر عمل نہیں کیا۔ آپ کے بعد کسی نے آپ کے حزار پر لکھ دیا۔ ”قابو یافتہ شے سے اعراض اور غیر قابو یافتہ شے کو طلب نہ کرنا قاعدت ہے۔ زہد نام ہے زرد مال کو نظر انداز کر دینے کا اور اپنے تمام امور کو خدا کے ہمرک کے مصائب پر صبر کرنے کا نام ہے بیہودیت۔“

آپ کو آپ کے ہم عصر بزرگوں نے مشائخین کے شیخ کا لقب دیا تھا جو آپ کے نام کے ساتھ ہمیشہ ہمیش کے لیے وابستہ ہو گیا۔

خزینہ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار۔

سیکنہ الاولیاء، شہزادہ دامرا شکوہ۔ طبقات لکبری، علامہ شعرانی۔

مریاض الراہقین، ابنی جعفر۔ سیفینہ الاولیاء، شہزادہ دامرا شکوہ

ساختات

ہے اس مکان کا رنگ وورن جگہ سے اڑ گیا تھا۔ لکڑی کا فرش بد رنگ ہو رہا تھا۔ اندر سے تمام واش و روض اور چکن کی سینیٹری بریاد ہو گئی تھی۔ عقی لان کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ سامنے والی سڑک جو گرین بیلٹ کے ساتھ تھی اس پر بہت پرانے اور اونچے درخت لگے تھے۔ بے شک یہ اس مکان سے بہت بڑا تھا جہاں اب تک ہم رہ رہے تھے لیکن اس کی حالت حد سے زیادہ خراب تھی۔

جان نے تین سال پہلے بینک سے قسطوں پر مکان لیا تھا۔ یہ بہت خوب صورت اور تمام سہولتوں سے آراستہ دو بیڈ رومز کا مکان تھا۔ اس کے نیچے ایک خوب صورت نشست گاہ ایک حصہ ڈائننگ کے لیے اور ایک بندہ ہو جانے والا گیراج تھا۔ ہماری شادی کو ابھی تین سال ہوئے ہیں۔ پندرہ سال میں جان کو پانچ لاکھ ڈالر کی رقم قسطوں میں ادا کرنی تھی۔ اس وقت مکان کی مالیت اتنی ہی تھی اور امید تھی کہ اس کی قیمت مزید بڑھے گی۔ لیکن امید کے برخلاف کساد بازاری کی وجہ سے مکانوں کی قیمت گر گئی اور پانچ لاکھ ڈالر مالیت کا مکان اب ڈیڑھ لاکھ کا بھی نہیں رہا تھا۔ ظاہر ہے کوئی اسے ڈیڑھ لاکھ کا بھی نہ لیتا کیونکہ ابھی اس پر چار لاکھ کا قرض تھا۔ ہم نے تین سال میں ایک لاکھ ڈالر سے کچھ اور رقم ادا کر دی تھی۔ پھر جان بے روزگار ہو گیا۔ وہ شیشے کے کام کا باہر تھا۔ وہ ایک کارخانے میں کام کرتا تھا اور اس کی خواہ بہت اچھی تھی لیکن اقتصادی بحران کا اثر گلاس انڈسٹری پر بھی پڑا تھا۔ کارخانے ایک ایک کر کے بند ہو رہے تھے۔ جان کا کارخانہ بھی بند ہو گیا۔ اب اسے ایک ورکشاپ میں کمیشن پر کام ملا تھا۔ یعنی وہ جتنا کام کرتا اسے اتنا ہی معاوضہ مل جاتا۔

بے شک ہم اپنے خوب صورت مکان کی قسط دینے کے قابل نہیں رہے تھے اور اب ہمیں وہ مکان چھوڑنا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جان مجھے اس بھوت بنگلے میں لا کر رکھے۔ مجھے مکان سے زیادہ اپنے پڑوسی اور علاقے کے لوگ یاد آ رہے تھے۔ کتنی ہی اچھی فیملیوں سے ہمارے تعلقات بن گئے تھے۔ ویک اینڈز کتنے اچھے گزرتے تھے۔ اکثر ہمیں نہ کہیں پارٹی ہوتی تھی۔ مینیہ میں ایک دو بار سب جاننے والے مل کر باری کیو کرتے تھے یا پھر سب مل کر کہیں پکنک منانے جاتے تھے۔ یہ تین سال جیسے خواب میں گزرے تھے اور مجھے اولاد کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ میری خواہش تھی کہ میں شادی کے بعد جلد از جلد ماں بن جاؤں مگر جان چاہتا تھا کہ ہم کچھ جمع کر لیں

پھر اولاد کو دنیا میں لانے کی کوشش کریں۔ جب یہ طے ہو گیا کہ ہمیں مکان چھوڑنا ہے تو ہم نے دوسرے مکان کی تلاش شروع کر دی۔ میری تو خواہش تھی کہ ہم اسی علاقے میں رہیں لیکن یہ علاقہ نہایت مہنگا تھا یہاں کوئی مکان ڈھائی ہزار ڈالر سے کم نہ کرائے پر دستیاب نہیں تھا۔ عجیب بات تھی کہ مکانوں کی قیمتیں گر گئی تھیں اور کرائے بڑھ گئے تھے۔

جان نے نئی ریلٹرز سے کہہ رکھا تھا کہ وہ ہمیں کوئی سستا مکان دلائیں۔ اسمتھ نامی ریلٹرز نے جو اتفاق سے جان کا بچپن کا دوست بھی تھا اور اس کا اسکول فیلو بھی۔ اس نے اس بھوت بنگلے کا بتایا۔ یہ مکان صرف اسی ہزار ڈالر میں مل رہا تھا۔ جان کا کہنا تھا کہ وہ انشورنس سے اپنی رقم وصول کر لے گا۔ بینک نے مکان اس شرط پر دیا تھا کہ ڈیفالٹ کرنے والے کو اس کی رقم واپس نہیں ملے گی لیکن جان نے قتل مندی کرتے ہوئے اپنی ادا شدہ رقم کا انشورنس پر لیا تھا اس لیے وہ ڈیفالٹ کرتا تو انشورنس کمپنی اس کی رقم دینے کی پابندی تھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمیں نقصان نہیں ہوا تھا۔ جب میں نے مکان دیکھا اور جان سے پوچھا۔ ”کیا اسمتھ سے تمہاری کسی لڑکی پر لاؤ بی ہوئی؟“

”نہیں تو... کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”میرا خیال ہے وہ تم سے بدلہ لینے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”اسمٹھ میرا بہت اچھا دوست ہے۔“ جان نے صفائی پیش کی۔

میں نے طنز کیا۔ ”یہ تو مکان کی حالت سے ظاہر ہے کہ وہ تمہارا کتنا اچھا دوست ہے۔ بھی یہ بھوت گھرو لانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”میری“ مکان اچھا ہے۔ ٹھیک ہے یہ ہمارے پہلے مکان جیسا نہیں ہے لیکن اسے ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔“

”یہ ٹھیک ہو کر بھی ویسا نہیں ہوگا۔“ میں نے چمک کر کہا۔

”اوکے میں یہ بھی مانتا ہوں۔ لیکن اسی ہزار ڈالر میں اتنا بڑا مکان کہیں نہیں ملے گا۔ یہ علاقہ بھی اچھا ہے۔ دیکھو مکان کے پیچھے کتنا شاندار جنگل ہے۔ پھر یہاں سے مجھے ورکشاپ بھی قریب پڑے گی۔ ابھی تو ایک کھٹا آنے اور اس سے زیادہ وقت جانے میں لگ جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ کیس بھی کتنی خرچ ہوتی ہے۔ یہاں سے تو میں پندرہ منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔ کیس کی بچت الگ ہوگی۔“

”اسے ٹھیک کرانے میں اچھا خاصا خرچ ہوگا۔“

”نہیں بھلے، پالش اور ضروری مرمت کے بعد دیکھنا تم اس کا حلیہ بالکل بدل جائے گا۔“

”پلیز جان... یہ جگہ مجھے آسب زدہ لگتی ہے۔“

میں نے کہا تو لان میں موجود بھولا بھولے چرچا یا جیسے کسی نے اسے ہلایا ہو میں نے بہم کر اس طرف دیکھا۔ جان نے میری طرف دیکھا۔

”میری، احقنا نہ باتیں مت کرو۔۔۔ آج کل بھوت بھی بیروزگاری سے تنگ آ کر کسی اور ملک جا چکے ہیں۔“

ایسا لگ رہا تھا جان فیلہ کر چکا تھا اور اندر سے میں بھی جانتی تھی کہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ جاننے کے باوجود میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ جان نے ڈن کیا تو اسمتھ کی ہاتھیں کل گئیں اور وہ اس وقت مجھے نہایت برا لگ رہا تھا۔ حالانکہ وہ اچھا خاصا خوش شکل نوجوان تھا۔ جان نے میری طرف دیکھا اور تنبیہ مزاح کے انداز میں بولا۔ ”اسمٹھ یہاں کوئی بھوت تو نہیں ہے، تم جانتے ہو میرا بچپن سے بھوتوں سے دم ٹھکتا تھا۔“

میں پاؤں پٹختی ہوئی باہر جانے لگی۔ اسمتھ نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”ہاں بھوت ہے تو لیکن بے ضرر ہے۔“

میں لان کے پاس سے گزری تو بھولا پھر چرچا کر ہلا۔ میرے جسم میں خوف کی لہری دوڑ گئی۔ مجھے لگا جیسے کوئی جھولے پر بیٹھا مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں جلدی سے جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ جان ٹھیک کہہ رہا تھا، آس پاس سارے اچھے مکان بنے تھے بس یہی ایک بھوتوں کا گھر لگ رہا تھا۔ جب ہم یہاں شفٹ ہو جاتے تو جان کام پر چلا جاتا اور مجھے سارا دن یہاں اکیلے رہنا پڑتا۔ اس لیے اگر یہاں کوئی بھوت تھا بھی تو میں اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ جان بھی تو اتنا خوش تھا کہ مجھے بہت نہیں ہوئی کہ اب مزید کوئی اعتراض کروں۔ وہ صبح میرا محبوب شوہر ہے۔ بس بھی بھی اس پر شہید غصہ آتا ہے۔

آنے والے دو ہفتے نہایت مصروف گزرے۔ جان نے مکان بینک کو واپس کر دیا۔ انشورنس سے معاملات طے کیے۔ اس مکان کے مالک سے بات کی۔ اس دوران میں ہم اپنا سامان بیک کرتے رہے۔ دو ہفتے بعد رقم مل گئی اور ہم نے مکان خرید لیا۔ جان نے ورکشاپ سے ایک ہفتے کی چھٹی لی۔ وہ سامان لایا۔ ہم نے اپنا سارا سامان اور فرنیچر فی الحال ایک کمرے میں بھر دیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے گھر کی حالت درست کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے تمام نا کارہ اور خراب ہو جانے والی چیزیں تبدیل کیں۔ پچرا اور کاٹھ کباڑ جو تین سوٹ اور دو چھتی میں بھرا تھا اسے نکالا۔ دمزنوں کے اوپر ایک ٹکون چھت والا کمرہ تھا جسے دو

چھتی کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ نیچے تین بیڈ رومز تھے اور گراؤنڈ پر ایک بڑی سی نشست گاہ، ایک بی وی لاونج اور بڑا سا چکن تھا جس میں ڈائننگ ٹیبل کی جگہ بھی تھی۔ اس کے علاوہ ایک کمرہ تھا جسے اسٹری یا اضافی بیڈ روم کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ کباڑ اتنا تھا کہ ایک پورا دن تو صرف اسے صاف کرنے میں گزر گیا۔ دوسرے دن جان نے سارے ٹل اور سینیٹری کا سامان تبدیل کیا۔ کھڑکیوں پر نئے شیشے لگائے اور جو بھلیں مرمت چاہتی تھیں ان کی مرمت کی۔ اس دوران میں، میں دیواروں سے نا کارہ رنگ اور وال پیپر اتارتی رہی۔

چیزوں کی تبدیلی اور مرمت کے بعد جان نے رنگ کا آغاز کیا۔ میں وال پیپر لگا رہی تھی۔ ایک ہفتے میں جا کر یہ کام مکمل ہوا۔ جان لکڑی کے لیے پالش اور مرمت کا سامان لے آیا تھا۔ آنے والا مزید ایک ہفتہ اس میں لگا۔ ہم صبح سویرے سے کام میں لگ جاتے تھے اور بغیر کے رات تک کام جاری رہتا تھا۔ چونکہ چکن بھی سیٹ نہیں تھا اس لیے کھانا باہر سے آتا تھا۔ رات گئے ہم فرش پر کدے بچھا کر سو جاتے تھے مگر نیند پوری نہیں ہوتی تھی۔ جان سارا کام جلد از جلد نٹا لیتا چاہتا تھا تاکہ اسے کم سے کم چھٹی ملنی پڑے۔ صبح سے برا حال ہو گیا تھا لیکن ابھی فرنیچر اور سامان بھی سیٹ کرنا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ بھی ختم ہوا۔ اب صرف مکان کے باہر کا رنگ وورن اور آگے پیچھے کے لان کی درستی کا کام باقی تھا۔ اسے جان نے ہفتہ وار چھٹیوں کے لیے اٹھا کر رکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اب مزید چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ پہلے ہی ایک ہفتے کا کہہ کر دو ہفتے کی چھٹی کر چکا تھا۔

جس دن جان کام پر گیا اس روز میں پہلی بار اسکی گھر میں رہی۔ جان کے جانے کے بعد مجھے ہلکا سا خوف محسوس ہوا اور میں اسے لانے کے لیے کافی کا تک لے کر باہر نکل آئی۔ لان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں وہاں جاتی اس لیے ڈرائیو دے رہنے لگتی۔ اندر سے مکان کی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی لیکن باہر سے یہ ابھی تک اجاڑ تھی۔ ہمارے پاس گھاس کاٹنے والی الیکٹرک مشین تھی، میں نے فیصلہ کیا کہ ایک دن آرام کر کے لان کی گھاس صاف کروں گی۔ کافی بی کر میں اندر آئی اور حیران رہ گئی۔ سب کال کھلا تھا اور پانی زور و شور سے بہہ رہا تھا۔ جبکہ مجھے یاد تھا کہ میں جب گئی تو ٹل بند تھا۔ میں نے اسے دوبارہ بند کر دیا۔ پھر چکن کی صفائی کرنے لگی۔ اچانک عقب سے دوبارہ آواز آئی اور ٹل پھر پر شور انداز میں بننے لگا۔ میں

چوکی، میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ تل بالکل ہاتھا اور اس میں خرابی کا امکان تھا پھر یہ خود بہ خود کس طرح حل رہا تھا؟ میں نے اسے دوبارہ بند کیا اور زیادہ زور لگا کر بند کیا۔ پھر مگر صافی اٹھانا چاہی تو وہ اپنی جگہ نہیں تھی حالانکہ میں نے میز پر صافی رکھی جبکہ وہ میز کے بجائے چولہے پر پڑی تھی اور چولہا آگ تھا۔ صافی نے جھک سے آگ پکڑ لی۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھا کر سٹک میں پھینکا اور تل کھولا تو آب پانی نہیں آ رہا تھا اور صافی سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ بدحواسی میں، میں نے دوسری صافی سے مار کر آگ بجھانی چاہی تو اس نے بھی آگ پکڑ لی اور میں نے دونوں کو چھنے کی مدد سے باہر لے جا کر پھینکا۔ اتنی دیر میں کچن دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ واپس آ کر میں نے کھڑکیاں کھولیں تاکہ دھواں نکل جائے اور پھر جان کو کال کی۔ میں نے لرنزی آواز میں اسے بتایا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اور پھر رو دینے والے لمحے میں بولی۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ گھر آسب زدہ ہے۔“
”ایزی ڈیٹر... ایزی... میرا خیال ہے تم بہت جھک گئی ہو اور جب انسان بہت جھک جاتا ہے تو اس سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔“

”مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی اور میں پہلی بار نہیں جھکی ہوں۔“ میں نے تند لہجے میں کہا۔ ”لیکن نہ مجھ سے تل کھلا رہا اور نہ میں نے صافی چولہے پر رکھی تھی۔ چولہا بند تھا اور پہلے تل بھی بند تھا پھر میں نے اسے کھولا تو پانی...“

”میری، میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ ایسا کرتا ہوں شام کو گھر آ کر بات کرتا ہوں۔“ جان نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں ہیلو ہلو کرتی رہ گئی اور پھر موبائل میز پر چڑھ دیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میرے ساتھ جو ہوا تھا اس میں کسی دوسرے فرد کا ہاتھ تھا اور وہ دوسرا فرد چونکہ نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے وہ یقیناً کوئی بھوت تھا۔ آگ نکلنے کے بعد کچھ نہیں ہوا تھا۔ چولہا بند یا گیا تھا حالانکہ میں نے اسے بند نہیں کیا تھا اور تل سے پانی آ رہا تھا۔ میں نے تھوک نکلا اور ممکن حد تک بلند آواز میں کہا۔ ”دیکھو تم جو کوئی بھی ہو یہاں سے چلے جاؤ، اب یہ گھر ہمارا ہے۔“

”لیکن میں پہلے سے رہتا آیا ہوں۔“ کسی نے میرے کان کے پاس کہا اور میں چیخ مار کر اوپر کی طرف بھاگی اور بیڈ روم میں گھس کر دروازہ اندر سے بند کیا۔ پھر بستر میں گھس کر اوپر سے چادر اوڑھ لی۔ میرا پورا بدن لرز رہا تھا اور میری متعین معنوں میں گنگی بندھی ہوئی تھی۔ بد قسمتی سے

موبائل بھی نیچے بھول آئی تھی اور یہاں کوئی ٹیلی فون بھی نہیں تھا۔ میں جان کو کیسے کال کرتی اس لیے چادر میں دیکھی کا پتہ نہ رہی اور دل ہی دل میں جان کو برا بھلا کہتی رہی کہ اسی نے یہ مکان لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ خاصی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ اس طرح بستر میں دیکھ رہے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لیے بہت کر کے بستر سے نکلی اور پھر نیچے آئی۔ ڈرتے اور کانپتے رہنے سے بہتر تھا کہ میں خود کو کسی مصروفیت میں لگا لوں اور اس طرف سے میرا دھیان ہٹ جائے۔ مجھے لان کا خیال آیا اگرچہ میں نے ایک دن کے لیے لان کی صفائی کا کام ملتوی کر دیا تھا لیکن اس وقت مجھے مصروفیت درکار تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں آج ہی لان ٹھیک کروں گی۔ مشین اور دوسرا سامان پیچھے شیڈ میں رکھا تھا۔ میں نے پہلے مشین کی مدد سے پوری گھاس صاف کی۔ اس کے بعد اس گھاس اور جھجھکے والے پتوں کے ڈھیر کو آگ لگا دی۔ جب تک آگ بجھی میں نے کٹری کی مدد سے بڑھ جانے والے درختوں کی نیچی شاخیں کاٹیں۔ پھر راکھ کو پورے لان میں پھیلا کر پانی دیا۔ دوپہر تک لان کی اچھی خاصی صورت نکل آئی تھی لیکن میری اپنی صورت دھول مٹی اور پسینے سے تل کر خراب ہو گئی تھی۔ مجھے ہاتھ کی ضرورت تھی مگر اندر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ بہر حال بہت کر کے اندر آئی۔ واش روم میں جا کر میں نے کپڑے اتارے اور شاور کے پیچھے کھڑی ہوئی۔ دھول مٹی مٹی تو سکون ملا۔ میں نے بالوں میں شپو لگا دیا اور بوتل اسٹینڈ پر رکھ دی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ شپو لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو بوتل وہاں نہیں تھی۔ وہ نیچے فرش پر گر چکی تھی۔ اس بار خوف کے بجائے مجھے غصہ آیا اور میں نے جلدی سے تو لیا لے کر لپیٹتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

”دیکھو تم جو کوئی ہو لیکن یہ نہایت غیر شریفانہ حرکت ہے، کسی عورت کے ہاتھ روم میں آتا... جب وہ تمہاری ہو بالکل بھی اچھی بات نہیں ہے۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔“
اس پر ہاتھ روم کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ گویا وہ باہر چلا گیا تھا لیکن مجھے یقین نہیں آیا تھا اور میرا غصہ بھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ مٹل کر کے ہاتھ رو بہ پہنا اور باہر آ کر غصے سے بولی۔ ”سنو تم جو بھی ہو مجھے تم سے بات کرنی ہے، دو دو... ابھی اور اسی وقت۔“

کھڑکی کے پاس رکھی کرسی تل ہوئی میں نے چونک کر دیکھا۔ اس پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ آدمی کیا تو جوان تھا اور خاصا خوش شکل تھا۔ سبزی بال اور دلکش نقوش تھے۔

جسامت ورزشی تھی۔ اس نے جینز کے اوپر نیلی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ گلے میں سنہرے رنگ کی زنجیر تھی اور ایک کان میں سنہری رنگ بڑی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک دار تھیں اور وہ کہیں سے بھی بھوت نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ یقیناً وہی بھوت تھا۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی میرا غصہ ٹھنڈا پڑنے لگا۔ حالانکہ اس نے بہت غلط حرکت کی تھی۔ ایک لمحے کو مجھے وہاں سے بھاگ جانے کا خیال آیا مگر میں اس پر عمل نہیں کر سکی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”آئی ایم ریلکی سوری...“

”تم نے صبح سے مجھے دہشت زدہ کر رکھا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر شکایت کی۔ دراصل اب مجھے شرم آ رہی تھی کہ اس نے مجھے کس حال میں دیکھا تھا اور میں اس کے منہ سے اس بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔

وہ مسکرایا۔ ”ایک تو تم زندہ انسان ذرا سی بات پر دہشت زدہ ہو جاتے ہو۔“
”ظاہر ہے۔“ میں خفگی سے بولی۔ ”اگر کوئی نظر نہ آنے والا شخص آس پاس ہو اور آپ کی چیز کو چھیڑے تو آپ خوفزدہ ہی ہوں گی۔ ویسے تم کوں ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں بھوت ہوں اور یہاں رہتا ہوں۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔
”وہ تو ظاہر ہے، میں تمہارا نام اور یہاں رہنے کی وجہ پوچھ رہی ہوں۔“

”میرا نام ایڈم ہے نام کا دوسرا حصہ نہیں بتاؤں گا اس سے میرے خاندان کی بدنامی ہوگی جواب بھی یہاں معزز شمار ہوتا ہے اور یہاں اس لیے رہتا ہوں کہ یہ گھر مجھے پسند ہے۔“

”شکریہ۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”جان اور میں نے اسے ٹھیک کرنے میں بہت محنت کی ہے۔“

”میں اب کی نہیں اس کی پرانی حالت کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت یہ بھوتوں کے رہنے کی جگہ تھی لیکن اب...“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سد آہ بھری۔ اتنی گفتگو سے میرا خوف دور ہو گیا تھا اور اب میں اس کے بارے میں پُر جس تھی۔ بلکہ مجھے انفسوس ہو رہا تھا کہ میں اتنے پیڑھے سے بھوت سے ڈر رہی تھی جو دیکھنے میں ذرا بھی خوفناک نہیں لگ رہا تھا۔ اگر وہ بھوت کی حیثیت سے سامنے نہ آتا تو میں قیامت تک اس کے بھوت ہونے کا یقین نہ کرتی۔ اس کے ادھر سے جملے سے ظاہر تھا کہ اسے مکان

کی حالت کی تبدیلی پسند نہیں آئی تھی۔
”تم کب سے یہاں ہو؟“

اس نے انگلیوں پر حساب لگایا اور جتنی مشکل سے لگایا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بھی طالب علم رہا تھا تو یقیناً خاصا غبی رہا ہو گا۔ اس نے حساب سے فارغ ہو کر بتایا۔ ”میں گزشتہ تیس سال سے یہاں ہوں۔“
”تیس سال؟“ میں حیران ہوئی۔ ”ایک جگہ رہنے کے لیے یہ مدت زیادہ نہیں ہے؟“

”زندہ انسانوں کے لیے زیادہ ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”ہم بھوتوں کے لیے تو بہت کم ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ انسانوں کے حساب سے مجھے یہاں آئے ہوئے چند سال ہی گزرے ہیں۔ میں ایسے بھوتوں سے واقف ہوں جو کئی سو سال سے ایک ہی جگہ رہتے آئے ہیں۔“

میں اس سوال کی طرف آئی جسے پوچھنے کے خیال سے مجھے خوف آ رہا تھا۔ ”تم... تم بھوت کیسے بنے؟“
”مرنے کے بعد۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔
”میرا مطلب ہے مرے کیسے؟ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ آدمی مرنے کے بعد ہی بھوت بنتا ہے۔“

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”میں نے دیت نام کی جنگ میں حصہ لیا تھا اور وہاں دو سال میں بہت خونریزی دیکھی۔ لیکن صبح سلامت واپس آ گیا۔ امریکا آنے کے چار سال بعد گاڑی کے حادثے میں مارا گیا۔ حادثہ اسی سڑک پر ہوا تھا اور اسی مکان میں رہنے والے شخص کی گاڑی سے ہوا تھا۔ میں بہت تیز رفتاری سے جا رہا تھا کہ اس نے اچانک کار سڑک پر نکالی اور میں بریک نہ لگا سکا۔ میں نے اسی مکان کے سامنے ٹوٹا ہوا تھا۔“

”اس لیے تم یہاں آ گئے۔“ میں نے بے ساختہ کہا پھر مجھے تعزیت کا خیال آیا۔ ”مجھ سے کراہوس ہوا۔“
شاید ہی کسی زندہ آدمی نے کسی مرنے والے سے خود اس کی تعزیت کی ہو۔ یہ اعزاز میرے حصے میں آیا تھا۔
”میں نے سنی کر لی تھی اور میرا بزنس بھی اچھا چل رہا تھا۔ اگر زندہ رہتا تو چند بیٹے بعد ہم شادی کر لیتے۔“
”اوہ۔“ اس بار میں نے سچ بچ انفسوس سے کہا۔ ”وہ یقیناً بہت پیاری لڑکی ہوگی۔“

ایڈم نے ایک پرس نکال کر کھولا اور اسے میری طرف بڑھا دیا۔ اس میں ایک بہت پیاری اور کم عمر لڑکی کی تصویر نکلی تھی۔ میرا انفسوس بڑھ گیا۔ اگر ایڈم زندہ ہوتا تو یقیناً اس لڑکی کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہا ہوتا۔ میں

نے پھر انہیں کیا اور اس سے بولی۔ ”اب تم جاؤ میں پہنچ کر لوں گی۔“

وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے غائب ہو گیا۔ مجھے ایک لمحے کو ڈر لگا تھا، وہ غائب ہوا تھا لیکن اس کا امکان تھا کہ وہ یہیں موجود ہو گا، میں نے کہا۔ ”ایڈم تم یہیں ہو؟“ مجھے معلوم ہے۔“ اس بار دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ میں نے ٹھکراتے ہوئے پہنچ گیا اور پہنچے آئی۔ اتنی محنت اور نہانے کے بعد میری بھوک کھل گئی تھی۔ اپنے لیے سیٹھ وچڑ اور کافی تیار کر کے بیچ کیا۔ پھر مجھے خیال آیا اور میں نے کہا۔ ”ایڈم تم یہیں ہو؟“

وہ اچانک سامنے والی کرسی پر نمودار ہوا تو میں اچھل پڑی اور کافی چٹک گئی۔ میں نے منہ کی سے کہا۔ ”یہ کیا حرکت ہے، تم اس طرح کیوں نمودار ہو جاتے ہو؟“ ”میں تو اسی طرح نمودار ہو سکتا ہوں میں پہلے سے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ تم نے پکارا تو سامنے آ گیا۔“ ”یعنی تم غائب رہ کر یہیں موجود تھے۔“ میں مزید خفا ہو گئی۔ ”ٹھیک ہے اب تم بھوت ہو لیکن بھی تم زندہ انسان تھے اور اس وقت کے منبر زنجبیں یاد ہوں گے۔ کسی کے آس پاس رہ کر اسے اس طرح دیکھنا کہ اسے خبر نہ ہو اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہے۔“

”ہم بھوتوں کا اخلاق سے تعلق نہیں ہے۔“ ”تمہیں اس گھر میں رہتے ہوئے ان باتوں کا خیال رکھنا ہو گا۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”دیکھو اگر تم نظروں سے غائب رہنا چاہو تو کسی ایسی جگہ چلے جانا جہاں ہم نہ جاتے ہوں ورنہ تم نظروں کے سامنے رہو گے۔“ اس نے سوچا اور سر ہلادیا۔ ”اوکے، میں تمہاری خاطر مان جاتا ہوں کیونکہ تم ایک خوب صورت اور اچھی خاتون ہو۔“

”میرا شوہر بھی بہت پیٹنٹ اور اچھا ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”جب تم اس سے بات کرو گے تو تم یقیناً اسے پسند کرو گے۔“ اس پر ایڈم نے جس طرح کا منہ بنایا اس سے ظاہر تھا کہ وہ پہلے ہی جان کو اپنا پسند کر چکا ہے۔ البتہ اس نے بادل نا خواستہ سر ہلایا، میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”تم ایک اچھے بھوت ہو۔ مجھے امید ہے کہ اب تم ہمارے لیے مسئلہ بنیں گے۔“ ”مسئلہ میں نہیں بنوں گا؟“ اس نے خفگی سے کہا۔ ”مسئلہ تم لوگ بن گئے ہو۔ تین ہفتے سے میرا اس گھر میں رہنا حرام کیا ہوا ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں کچھ دیر بعد

تمہارا شوہر وہاں پہنچ کر ٹھوک پٹنی کرتے لگتا ہے۔“ ”وہ بھوری تھی۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”تم نے دیکھا ہو گا، اس گھر کی حالت کیا تھی اور میں کتنا کام کرنا پڑتا۔“ ”حالت تو پہلے والی ٹھیک تھی۔“ اس نے سر آہ بھری۔ ”لیکن تمہاری خاطر میں نے اس تبدیلی کو برداشت کیا بلکہ یہ گھر بھی تمہاری وجہ سے بکاؤ نہ اس سے پہلے جو آتا تھا میں اسے بھگا دیتا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں اگر خریدار تم جیسی حسین عورت نہ ہوتی تو یہ گھر کبھی نہ بھگتا۔“ ”میں نے شرمناک کہا۔ اپنی تعریف کس عورت کو بری لگتی ہے۔“ ”تو اب سب ملے ہے نا؟“

اس نے سر ہلایا اور غائب ہو گیا لیکن فوراً ہی نمودار ہو کر معذرت کی اور اٹھ کر چلا ہوا کچن کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کچھ کام منٹائے اور پھر رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ جان صبح ناشا کرتا تھا اور پھر رات کو کھانا کھاتا تھا، اس کا کہنا تھا کہ دوپہر میں کھانے سے وہ سست ہو جاتا ہے اس لیے وہ گھر آ کر کھاتا تھا۔ جان کو اچھا کھانے کا شوق تھا اور بہت کم چیزیں اس کی ناک کے نیچے آتی تھیں اس لیے میں شام کا کھانا بہت دھیان اور محنت سے بناتی تھی۔ وہ شام کو آیا تو تھکا ہوا تھا اس لیے میں نے فی الحال اسے ایڈم کے بارے میں نہیں بتایا۔ اس نے نہادو کر ڈیر کیا اور ہم لاؤنج میں آئے تو اسے یاد آیا۔

”تم صبح فون کر کے کچھ کہہ رہی تھیں لیکن اس وقت میرا باس سر پر تھا اور اس نے مجھے وارننگ دی ہے کہ اب کام کے دوران میری کوئی کال آئی تو مجھے فائر کر دیا جائے گا۔“ ”کھٹیا شخص۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”گھر میں بیوی کو مسئلہ ہو تو وہ کسے کال کرے گی؟“

”شوہر کو۔“ جان نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”تم شاید کسی بھوت کا ذکر کر رہی تھیں جو تل کھول اور چیزیں ادھر ادھر کر رہا تھا۔“

میں نے جوش و خروش سے جان کو بتایا کہ ایسا سچ سچ ہوا تھا لیکن وہ یوں سستا رہا جیسے میں اسے کوئی فیری ٹیل سنا رہی ہوں۔ میں نے اپنی بات ختم کی اور اس نے کہنا شروع کیا۔ ”دیکھو ڈیز ہو سکتا ہے۔“

”ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن کچھ دیر بعد میری ملاقات اس شخص سے ہوئی جو ان سب باتوں کا ذمہ دار تھا۔“ جان نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ”تمہارا مطلب ہے سچ کچھ بھوت؟“

”بالکل ڈیز۔۔۔ اصلی بھوت۔“ میں نے کہا اور اسے ایڈم کے بارے میں بتایا البتہ ہاتھ روم والا واقعہ گول کر دیا کیونکہ جان میرے بارے میں نہایت حساس تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ بھوت مجھے نہاتے ہوئے دیکھ رہا تھا تو اسے یقیناً غصہ آتا۔ سب سن کر بھی جان کے تاثرات شک والے تھے۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”ایڈم تم کہاں ہو؟“

جواب میں بیرونی دروازہ کھلا اور ایڈم اندر آ گیا۔ جان نے اسے دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔ ”یہ کون ہے اور یہاں کیوں آیا؟“

”یہ ایڈم ہے۔“ میں نے تعارف کرایا۔ ”یہ بتیں سال سے یہیں رہ رہا ہے۔“ ”میری، لگتا ہے آج تم عملی مذاق کے موڈ میں ہو؟“ مجھے معلوم تھا جان اتنی آسانی سے نہیں مانے گا اس لیے میں نے ایڈم سے کہا۔ ”تم اسے یقین دلا سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور غائب ہو گیا۔ ”شٹ!“ جان کے ہاتھ سے جام چھوٹ گیا وہ لڑکھڑا کر صوفے پر گر کر اچھر چلا اٹھا۔ ”میری، یہ کیا تھا؟“

”وہی جس پر تم یقین نہیں کر رہے ہو۔ ایڈم آ جاؤ۔“ ایڈم دوبارہ نمودار ہوا۔ اس بار جان کو یقین آ گیا لیکن اب اس نے معاملے کا دوسرے پہلو سے جائزہ

لیا۔ ”ہم نے یہ مکان خریدا ہے لیکن معاہدے میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا تھا کہ یہاں ایک بھوت بھی رہے گا۔“

”اس قسم کی باتیں معاہدوں میں نہیں لکھی جاتیں۔“ ایڈم نے متانت سے کہا۔ ”کیونکہ بھوتوں کا معاملہ اس دنیا سے تعلق نہیں رکھتا۔“

”لیکن تم اس گھر میں ہو اور اس کا تعلق اس دنیا سے ہے۔“ جان نے دہل دی۔ ”یہ گھر میرا ہے۔“

ایڈم نے لا جواب ہو کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”میں تیس سال سے یہاں رہ رہا ہوں۔“

مجھے اس پر ترس آنے لگا اور میں نے جان نے کہا۔ ”اس میں کیا حرج ہے، دیکھو یہ اس گھر کو اس طرح استعمال نہیں کرتا ہے جیسے ہم استعمال کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی چیز استعمال کرتا ہے۔“

”بالکل۔“ ایڈم نے خوش ہو کر کہا۔ ”پھر میں نے میری سے معاہدہ کر لیا ہے کہ میں گھر میں کہیں غیر مرئی حالت میں نہیں رہوں گا۔ اس سے تم لوگوں کی پرائیویسی متاثر نہیں ہوگی۔“ ”پرائیویسی۔“ جان نے طنز کیا۔ ”ہمارے ساتھ

ایک بھوت رہ رہا ہے اور اس پر بھی ہماری پرائیویسی برقرار رہے گی؟“

”ڈیز یہ وعدہ کر رہا ہے کہ یہ گھر میں غیر مرئی حالت میں نہیں رہے گا۔“

جان کا موڈ مزید خراب ہو گیا۔ ”یعنی یہ اکثر لاؤنج، کچن، اسٹڈی اور شاید ہمارے بیڈ روم میں بھی نظر آئے گا۔“ ”تم کیا چاہتے ہو میں یہاں سے چلا جاؤں۔“ ایڈم کا موڈ بھی خراب ہو گیا۔ ”یہ اصل میں میرا گھر ہے اور میں چاہتا تو کوئی اسے خرید نہیں سکتا تھا۔“

اب مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ایڈم انکشاف نہ کر دے کہ اس نے صرف میری وجہ سے یہ مکان فروخت کرنے کی اجازت دی تھی اس لیے میں نے جلدی سے مدخلت کی۔ ”دیکھو آپس میں جھگڑنے کی ضرورت نہیں ہے ہر مسئلہ بات چیت سے حل کیا جاسکتا ہے۔“

”ضرور، اب ہم ایک بھوت سے مذاکرات کریں گے کہ اپنے ہی گھر میں کس طرح سکون سے رہیں؟“ جان کھڑا ہو گیا اور مجھ سے کہا۔ ”میرا خیال ہے تم ہی اس سے بات کرو۔“ میں نے جان کو روکنا چاہا لیکن وہ تھکتا ہوا اوپر چلا گیا اور مجھے معاملہ گڑبڑ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ جان سے ایڈم کی پہلی ملاقات ہی ناخوشگوار رہی تھی۔ میں نے ایڈم سے کہا۔ ”جان ابھی غصے میں ہے لیکن مجھے امید ہے جلد ہمارے درمیان تعلق خوشگوار ہو جائے گا۔“

”مجھے اس شخص کی کوئی پروا نہیں ہے۔“ ایڈم نے غصہ ور لہجے میں کہا اور چلا ہوا کچن کی طرف چلا گیا یعنی اس کا کافی الجھل مکان سے باہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں اوپر آئی تو جان بستر پر دراز تھا اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اس نے مجھے دیکھتے ہی شگہہ کیا۔ ”تم میرے بجائے اس بھوت کی حمایت کر رہی تھیں جو ہمارے گھر میں گھسا ہوا ہے۔“

”ڈیز، ہمیں اس معاملے سے سوچ بچ کر منٹنا ہو گا۔“ میں نے اس کا سر سہلایا۔ ”تم ایک بات یاد رکھو، وہ ایک بھوت ہے اور ہم اس کے خلاف کسی کی مدد نہیں لے سکتے۔“

”یعنی وہ ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے اس لیے ہمیں اس کے سامنے سرنیزہ کر دینا چاہیے۔“ جان نے طنز یہ لہجے میں کہا اور اٹھ کر ہاتھ روم چلا گیا۔ یہ اس کا انداز تھا، جب وہ کسی معاملے پر بات نہیں کرنا چاہتا تو ہاتھ روم چلا جاتا تھا۔ میں فکر مند ہوئی۔ اگرچہ میں یہ مکان لینے کی مخالف تھی لیکن اب ہم نے اسے حاصل کر لیا تھا اور بہت اچھی حالت میں بھی لے آئے تھے بلکہ مجھے امید ہو چلی تھی کہ کچھ عرصے

بعد ہم اسے تقریباً پہلے گھر جیسی حالت میں لے آئیں گے۔ تب میں یہاں بھی آس پاس والوں سے جان پچان کر سکوں گی اور اپنے گھر میں لوگوں کو بلا سکوں گی۔ میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی لیکن اگر جان، ایڈم سے بھڑا کرنا تو وہ ہمیں یہاں سے نکالنے پر تل جاتا۔

صبح بھی جان بغیر ناشتا کیے کام پر چلا گیا اور یہ اس کی ناراضی کی نشانی تھی۔ میرا دل دھکنے لگا، جان میرا شوہر ہی نہیں میرا محبوب بھی تھا اور اس کی ناراضی میرے دل پر لگتی تھی۔ میرا دل ناسٹے کو نہیں چاہ رہا تھا اس لیے میں کافی بنا کر وہیں بچن میں بیٹھ گئی۔ اچھی لکھی صبح تک سب ٹھیک تھا لیکن ایڈم کی موجودگی سامنے آتے ہی میرے گھر کا سکون رخصت ہو گیا تھا۔ اگرچہ ایڈم نے سوائے چند حرکتوں کے اور کچھ نہیں کیا تھا اور اب تو وہ دوستانہ انداز میں پیش آ رہا تھا لیکن جان کے وجود سے لگ رہا تھا کہ وہ اسے یہاں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ مرد اپنے گھر اور بیوی کے معاملے میں حساس ہوتے ہیں۔ وہ کسی صورت ایک غیر مرد کو اپنے گھر اور اپنی بیوی کے پاس برداشت نہیں کرتے۔ سوچتے ہوئے اچانک مجھے احساس ہوا کہ ایڈم وہاں موجود تھا، میں نے کہا۔ ”یہ اچھی بات نہیں ہے، تم شروع میں وعدہ خلائی کر رہے ہو۔“

وہ سامنے نمودار ہوا اور شرمندگی سے بولا۔ ”سوری... رات کو تم دونوں کا موڈ خراب ہو گیا تھا اس لیے مجھے تمہارے سامنے آتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔“

میں بے ساختہ ہنس دی۔ ”تم کو بھوت ہو کر ڈر لگ رہا تھا۔“

”ہاں مجھے ڈر تھا کہ تم مجھ سے ناراض نہ ہو۔“

”میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”بلکہ ایک طرح سے تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے زیادہ نہیں ڈرایا اور سامنے آ گئے۔ میرا خوف ختم ہو گیا ورنہ کل صبح میں اتنی ڈر گئی تھی کہ یہ گھر چھوڑ کر جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“

ایڈم نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ ”شکر ہے تم نہیں گنیں اور شکر ہے تم مجھ سے ناراض نہیں ہو۔“

”میں تو ناراض نہیں ہوں لیکن ایڈم... تم مجھے ہو کہ مردوں کو ایسی باتوں پر غصہ آتا ہے۔“

”میں وعدہ کر چکا ہوں کہ اب یہاں غیر مرئی حالت میں نہیں رہوں گا۔“

”نہیں، اسے تمہاری موجودگی پر اعتراض ہے۔“

ایڈم کی آنکھیں ایک لمحے کو دھک اٹھیں اس نے

غرا کر کہا۔ ”وہ اعتراض نہیں کر سکتا، یہ میرا گھر ہے اور میرا یہاں سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”نہیں... نہیں بات تمہارے جانے کی نہیں، اس گھر میں موجود رہنے کی ہے، وہ بھی نظروں کے سامنے... تم خود سوچو اگر تمہاری بیوی ہوتی تو کیا تم اپنے گھر میں کسی مرد کی موجودگی پسند کرتے؟“

ایڈم نے غور کیا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”بالکل بھی نہیں۔“

”اسی طرح جان کو بھی پسند نہیں ہے۔“

”لیکن میں بھوت ہوں۔“

”ہاں، مگر ایک مردانہ بھوت ہو اور جان کا اعتراض اسی پر ہے۔“

وہ مرجھا گیا۔ ”تو تم کیا چاہتی ہو میں یہاں سے چلا جاؤں؟“

مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ وہ بتیں برس سے اکیلا تھا اور شاید اسے پہلی بار ایسے لوگ ملے تھے جن کے سامنے وہ آسکتا تھا۔ ”نہیں، تم یہاں سے نہیں جاؤ گے۔“ میں نے کہا۔ ”میرے ذہن میں ایک تجویز آ رہی ہے اگر تم نا تو؟“

”مجھے تمہاری ہر بات منظور ہوگی۔“

”دیکھو دن میں بے شک تم یہاں رہا کرو اور میرے ساتھ رہا کرو، میں تم سے گپ شپ کروں گی تو میرا وقت بھی اچھا گزرے گا لیکن جب جان آئے تو تم مکان کے باہر چلے جاؤ گے۔ جان کی موجودگی میں تم یہاں نہیں آؤ گے۔ اس طرح جان کا اعتراض بھی نہیں رہے گا اور تم یہیں رہو گے۔“

ایڈم کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اسے یہ تجویز اچھی نہیں لگی ہے لیکن وہ میری خاطر مان گیا۔ اس نے کہا۔ ”میں بھی تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے یہاں سے جانے کو نہیں کہا۔“

”اگر میں تمہیں یہاں سے جانے کو کہتی تو...؟“

”تو میں چلا جاتا... میں تمہاری کوئی بات نہیں مان سکتا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا اور بچن سے باہر چلا گیا۔ میں اس کی بات پر غور کرتی رہ گئی۔ اس دن میں نے لان کا بقیہ کام نمٹایا۔ ایڈم کو باغبانی آتی تھی، اس نے مجھے کئی مفید مشورے دیے اور جہاں تک ممکن ہوا میرا ہاتھ بھی بناتا رہا۔ بلکہ کئی بار تو اسے روکنا پڑا تھا۔ ایک بار بیلچہ خود ہی خود زمین کی گودی میں گر رہا تھا اور سڑک سے گزرنے والی ایک بڑی ٹی نے یہ منظر دیکھا تو ان کی رفتار خاصی تیز ہو گئی۔ یقیناً ایڈم کا شہرہ آس پاس بھی تھا۔ جان آیا تو میں نے اسے بتایا کہ ایڈم

اب اس کی موجودگی میں گھر میں نہیں آئے گا۔ توقع کے عین مطابق اس کا رد عمل بھی نا پسندیدہ تھا۔ ”وہ یہاں رہے گا تو؟“

”ہاں مگر گھر سے باہر۔“

”اور جب میں نہیں ہوں گا تو وہ یہاں تمہارے ساتھ ہوگا۔“ جان کے لہجے میں حسد آئی۔

مجھے غصہ آ گیا۔ ”خدا کے لیے جان... وہ ایک بھوت ہے۔ وہ مجھے چھو بھی نہیں سکتا اور اگر وہ کوئی بھوت نہیں ہوتا تب بھی کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟“

جان شرمندہ ہو گیا۔ ”یہ بات نہیں ہے جان۔“ اس نے مجھے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ ”تم جانتی ہو میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں اور تمہارے معاملے میں کتنا حساس ہوں۔“

”میں جانتی ہوں لیکن یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جسے ہم صرف اپنی مرضی سے حل کر سکیں۔“

جان نے سر آدھ بھری۔ ”گو یا ہمیں ساری عمر اس بھوت کے ساتھ رہنا ہوگا۔“

”تم اسے منفی معنوں میں مت لو۔ اسی کی وجہ سے یہ مکان اتنا سستل گیا۔ اگر ایڈم یہاں نہ ہوتا اس حالت میں بھی یہ سوالا کھڈا الرز سے کم کا نہیں تھا۔“

جان نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اوہ ہاں... لان تم نے ٹھیک کیا ہے؟“

”ہاں، میں سوچ رہی ہوں اب یہاں کے لیے گھاس اور پودے لے آؤں۔ اس اتوار کو تم درختوں کی اوپری شاخیں صاف کر دینا۔ میں نے نیچے سے صفائی کر دی ہے۔“

”اس ویک اینڈ پر یہ کام نمٹا دیں گے۔“

میں خوش ہو گئی کہ بادل ناخواستہ ہی سہی لیکن دونوں حضرات نے میری بات مان لی تھی۔ اب ایڈم دن میں میرے ساتھ ہوتا تھا۔ البتہ وہ میرے معمولات میں حائل نہیں ہوتا تھا اور جب میں بیڈ روم میں جاتی تو وہ وہاں آنے سے گریز کرتا تھا۔ ہفتہ اور اتوار کو میں نے جان کے ساتھ مل کر دونوں لان درست کیے۔ درخت کی کٹنگ کر کے ان کو شپ میں لائے۔ پھر نزدیکی زسری سے اچھی قسم کی گھاس اور پودے لا کر لگائے۔ ابھی سردی کا آغاز نہیں ہوا تھا اس لیے مجھے امید تھی کہ گھاس اور پودے اچھی طرح جڑ پکڑ لیں گے۔ ساؤتھ ڈکونا میں موسم اکتوبر کے آخر تک خاصا سرد ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو برف بھی گرتی تھی اور ابھی ستمبر کا آخر تھا اس لیے موسم اتنا سرد نہیں ہوا تھا۔

آگے اور پیچھے کے لان کے کاموں میں ایڈم نے بھی چوری چھپے میرا ہاتھ بنایا تھا، اسے معلوم تھا کہ اعلا نے وہ کچھ

کرے گا تو جان کو یہ بات نا پسند ہوگی۔ اس نے میرے بہت سے کام جو سخت تھے اسی طرح کر دیے کہ جان کو پتا بھی نہیں چلا۔ وہ چپکے سے گھاس اور پودوں کو لگانے کے لیے زمین کو ہود دیتا تھا۔ جان حیران تھا کہ میں نے اتنی جلدی گھاس اور پودے لگانے کا کام کر لیا تھا۔ برسوں سے زمین استعمال نہ ہونے کی وجہ سے زرخیز تھی اور گھاس پودوں نے چند دن میں جڑ پکڑ لی۔ اکتوبر کے وسط تک دونوں لان گھاس سے ڈھک گئے تھے اور پودے بھی اترتے ہوئے گئے تھے۔ گھر پر نیا خوب صورت ایتیل وائنٹ پینٹ کر دیا تھا۔ زرخیزی چھتوں پر سی گرین پینٹ تھا۔ ساتھ ہی اس نے ڈرائیو کے ٹوٹ جانے والی اینٹوں کی مرمت بھی کر دی تھی۔ دو مہینے میں مکان کی حالت بالکل بدل گئی تھی اور اسے دیکھ کر خود مجھے بھی یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی گھر تھا جسے دیکھ کر مجھے وحشت ہوئی تھی اور اب یہ میرے خوابوں کے گھر میں بدل چکا تھا۔

اس دوران میں ایڈم اپنے عہد پر قائم رہا۔ وہ صرف جان کی غیر موجودگی میں گھر میں آتا تھا اور اس کے آتے ہی باہر چلا جاتا تھا۔ چھٹی والے دن وہ اندر نہیں آتا تھا لیکن جب ہم لان پر نکلتے تو وہ آس پاس غیر مرئی حالت میں موجود ہوتا تھا۔ عجیب بات تھی، میں اس کی موجودگی محسوس کر لیتی تھی جبکہ جان کو نہیں پتا چلتا تھا۔ اگر جان بے تکلف ہونے لگتا تو میں چپکے سے ایڈم کو وہاں سے جانے کا اشارہ کرتی اور وہ چلا جاتا تھا۔ اس دوران میں ہماری آس پاس کی کئی فیملیوں سے ہیلو ہائے ہوئی تھی۔ ان میں سے کئی ہمارے گھر آچکے تھے اور تقریباً سب نے بتایا کہ گزشتہ تین دہائیوں میں سکون سے رہنے والے ہم واحد لوگ تھے۔ سامنے رہنے والے سابق آرمی میجر بیروٹ نے کہا۔ ”یہ گھر آسیب زدہ ہے۔“

”لیکن ہمیں تو کسی آسیب سے واسطہ نہیں پڑا۔“ میں نے صفائی سے انکار کر دیا اور تصدیق کے لیے جان کی طرف دیکھا اس نے جلدی سے کہا۔

”بالکل... ہمیں تو کوئی چیز دکھائی دی اور نہ ہی کبھی خوف محسوس ہوا۔“

”جان کام پر جاتا ہے تو میں اکیلی ہوتی ہوں اور بہت مزے سے ہوتی ہوں۔“

سردیوں کے آغاز تک میری کئی پڑوسنوں سے اتنی اچھی دوستی ہو گئی تھی کہ روز کسی نہ کسی ملاقات اور گپ شپ ہوتی تھی۔ میرا وقت اچھا گزر جاتا تھا۔ قسط کی رقم اور

آنے جانے کے خرچے سے جان چھوٹی تو جان کی کم تنخواہ بھی ہمارے گزرا رہے کے لیے کافی ہونے لگی تھی۔ نومبر کے آغاز میں ہم نے گھر کی خوشی میں دعوت کی جس میں پڑوسیوں کے ساتھ اپنے سابق پڑوسیوں کو بھی مدعو کیا اور ان سب نے متفقہ فیصلہ دیا کہ یہ گھر ہمارے سابق گھر سے بہت اچھا تھا۔ اس روز جان بہت خوش تھا کیونکہ خراب اقتصادی حالات نے اس کے کئی جانے والوں اور دوستوں کو اسے برے حالوں میں پہنچا دیا تھا کہ وہ اپنے گھروں اور گاڑیوں سے محروم ہو گئے تھے جبکہ ہمارے پاس ایک خوب صورت گھر تھا اور گاڑی بھی موجود تھی۔ اس کے علاوہ جان کے پاس ملازمت بھی تھی۔ کمرس اچھا گزرا۔ میں نے ایڈم کی مدد سے پورا گھر سجا دیا تھا۔ جان نے ایک کانٹے اور ڈنر کے موقع پر اس کی موجودگی کو اہم کر لی تھی۔ ایڈم اس پر خوش تھا۔ وہ بے چارہ کچھ کھانا نہیں سکتا تھا۔ وہ انسانی ضرورتوں سے بے نیاز ہو گیا تھا لیکن ہمارے ساتھ اس نے بھی کمرس سے لطف اٹھایا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مشکل وقت گزر گیا تھا۔

مگر نئے سال کا آغاز اچھا نہیں تھا۔ جان جس درکشاپ میں کام کرتا تھا وہاں اس کا باس سے کچھ جھگڑا ہوا اور اس نے جان کو ملازمت سے نکال دیا۔ ان دنوں اس کا موڈ خراب تھا، اب وہ زیادہ پیٹنے لگا تھا۔ اکثر کام پر بھی دیر سے جاتا تھا۔ میں پینے سے روٹی تولیے لگتا۔ مجھے اسی بات کا خطرہ تھا کہ اسے ملازمت سے جواب نہ مل جائے۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا اور جان کی ملازمت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد وہ نئی ملازمت تلاش کرنے کے بجائے گھر میں بیٹھ گیا اور اس کا بیشتر وقت پینے یا شے میں دھت ہو کر سونے میں گزرتا تھا۔ میں اسے سمجھاتی کہ ایک ملازمت ختم ہونے کا مطلب دنیا ختم ہونا نہیں تھا۔ وہ نئے سرے سے کوشش کر سکتا تھا اس طرح گھر بیٹھ جانے سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ ہنرمند تھا، اسے کہیں نہ کہیں ملازمت مل جاتی مگر جان کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

دراصل اس گھر میں ایڈم کی موجودگی کے انکشاف کے بعد سے ہی جان کا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اکثر غصے میں ہوتا اور ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ جب تک گھر کے کاموں اور باب کی مصروفیات میں وہ پھر بھی ٹھیک تھا اگر کبھی غصہ کرتا تو فوراً پیار سے بھی پیش آ جاتا تھا لیکن جب چھوٹنے کے بعد وہ فارغ تھا اور اس کا رویہ ہرگز رتے دن خراب ہوتا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے گھر میں، میں ہی تھی جس پر اس کا غصہ اتر سکتا تھا۔ وہ عام طور سے ناشے کی میز پر

بوتل لے کر بیٹھ جاتا اور کھانے کی جگہ بھی شراب پیتا تھا۔ آمدنی نہیں تھی اور اخراجات برقرار تھے اس لیے جو جمع ہوئی تھی وہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہونے لگی۔ میں جان کی توجہ اس طرف کراتے ہوئے ڈرری تھی کہ کہیں اس بات پر بھی جھگڑا نہ ہو جائے۔ مگر اسے بتانا تو تھا۔ مکان سے جو ملا تھا وہ اس مکان پر لگ گیا تھا اور اب گزرا وہ جان کی تنخواہ سے تھا۔ وہ بند ہوئی تو فوری کے آخر تک بینک اکاؤنٹ میں بس چند سو ڈالرز رہ گئے تھے۔ بجلی اور دوسرے بل ادا کرنے تھے۔ کھانے پینے کے اخراجات الگ تھے۔ پھر جان کی شراب کا خرچ بھی بڑھ گیا تھا۔ اس صبح بھی اس نے ناشے کی میز پر بوتل کھولی تو میرا کئی ہفتوں سے دبا ہوا غصہ ابھر آیا اور میں نے اس سے بوتل چھین کر بند کر دی۔ جان نے مجھے گھورا۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟“

”سنو جان... گھر میں رقم ختم ہو چکی ہے۔“

”تو میں کیا کروں۔“ اس نے بے پروائی سے کہا اور بوتل اٹھالی۔

”تمہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔“ میں نے دوبارہ بوتل چھین لی۔ ”اس طرح کب تک گزارہ ہوگا؟“

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے بوتل لینے کی کوشش کی تو میں نے بوتل پیچھے کر لی۔ وہ بے قابو ہو کر زبردستی ہاتھ لگایا لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے بوتل نہیں دوں گی۔ میں نے اسے سبک میں پھینک کر توڑ دیا۔ جان کے منہ سے ایک گندی گالی نکلی اور اس نے مجھے تھپڑ مارا۔ یہ ہماری ازدواجی زندگی کا پہلا تھپڑ تھا جو مجھے لگا۔ میرا منہ گھوم گیا اور بے ساختہ پیچھنے لگی۔ جان نے دوسرا تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو اس کا ہاتھ روک گیا۔ میں سمجھی کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے لیکن جب اس نے زور لگانے کے ساتھ ایڈم کو گالی دی تب مجھے پتا چلا اس کا ہاتھ ایڈم نے روک لیا تھا۔ جان نے ہاتھ پھڑکنے کی کوشش کرتے ہوئے چلا کر کہا۔ ”چھوڑ دیرا ہاتھ۔“

ایڈم نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور خود سامنے آ گیا۔ اس نے سر دھجے میں کہا۔ ”میں تمہیں میری پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

جان آپے سے باہر ہو گیا۔ ”تم کون ہوتے ہو میرے گھر میں کچھ پر حکم چلانے والے۔ یہ میری بیوی ہے۔“ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اس پر تشدد کرو۔“ ایڈم نے غصے سے کہا تو اس کا چہرہ تباہ جیسا سرخ ہو گیا اور وہ خوفناک لگنے لگا۔ میں ڈر گئی لیکن جان ویسا ہی تن کر کھڑا ہوا تھا۔

”یہ میری بیوی ہے میں اس کے ساتھ جو چاہے۔۔۔“ جان کا جملہ احمقوارہ گیا کیونکہ وہ اڑتا ہوا لادج میں جا کر اٹھا۔ ایسا لگا کہ اسے اٹھا کر پھینک دیا ہو۔ ایڈم اپنی جگہ موجود تھا۔ کٹری کے فرش پر جان کے گرنے سے دھماکا ہوا اور اسے یقیناً چوٹ لگی تھی۔ ایڈم اسے خوفناک نظروں سے گھورا رہا تھا اور اس کا ارادہ جان کو مزید سزا دینے کا تھا کیونکہ وہ گرا اور دوبارہ ہوا میں حلق ہو گیا۔ ایڈم اسے پھینچنے جا رہا تھا۔

”ایڈم! میں بے ساختہ چلائی۔“ پلیر نہیں۔۔۔“ ایڈم نے میری طرف دیکھا تو اس کا چہرہ نارمل ہو گیا اور جان دھب سے اسی جگہ گر گیا، وہ کراہ رہا تھا۔ ایڈم نے سر دھجے میں کہا۔ ”اے بھجا دینا اب اس نے تمہیں ہاتھ لگا دیا تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔“

ایڈم باہر چلا گیا تو میں نے جان کو اٹھایا۔ دو بار گرنے سے اسے خاصی چوٹ آئی تھی اور اس کے کس بل نکل گئے تھے۔ میں اسے بیڈروم میں لے آئی۔ اگرچہ مجھے غصہ آ رہا تھا مگر ابھی اسے میری مدد کی ضرورت تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی حالت بہتر ہونے لگی اور چہرے پر اندامت کے تاثرات نمودار ہوئے۔ مجھے معلوم تھا اب وہ مجھ سے معافی طلب کرے گا لیکن میں اسے اتنی آسانی سے معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ میں نے اٹھ کر بیگ نکالا اور اپنے کپڑے اس میں رکھنے لگی۔ جان جلدی سے اٹھ کر آیا اور بیگ بند کر دیا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟“

”میں اس گھر سے جا رہی ہوں جو صرف تمہارا ہے اور میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔“

”میری، آئی ایم ریلی سوری۔“

”سوری۔“ میں نے طنز کیا۔ ”اس سوری کا کیا فائدہ جب تم کرو گے وہی جو تمہارے دل میں ہے۔“

”نہیں، میں وعدہ کرتا ہوں میں جا ب تلاش کروں گا۔ اب میں وقت ضائع نہیں کروں گا لیکن اب میں اس بھوت کا کوئی علاج کر کے رہوں گا اس نے تمہارے اور میرے معاملے میں دخل کیسے دیا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ ابھی تمہارے دل کی حسرت نکلی نہیں۔“ میں نے دوبارہ بیگ کھول لیا۔ ”تمہیں اس تھپڑ کا افسوس ہو رہا ہے جو تم میرے منہ پر رسید نہیں کر سکے تھے؟“

”ارے نہیں۔“ جان نے بولکھا کر کہا۔ ”مجھے تو پہلے تھپڑ کا بھی افسوس ہے۔ میرا مطلب ہے اسے میرے اور تمہارے درمیان میں نہیں آنا چاہیے تھا اس نے مجھے روک

کر ٹھیک کیا لیکن اسے مجھے دھماکا نہیں چاہیے تھا۔“ ”وہ ایک مرد کا بھوت ہے اور یقیناً اسے خاصا غصہ آتا ہوگا۔“ میں نے طنز کیا۔ مگر جان اب بالکل بیچ گیا تھا اور اس پر میرے طنز کا اثر نہیں ہوا۔ اس نے منت ساجت کر کے اور کچھ مردوں کے مخصوص انداز سے بالآخر مجھے منا لیا تھا۔ میں کون سا بیج جا رہی تھی۔ یہاں سے نکل کر میں کہاں جاتی۔ دنیا میں صرف باپ تھا جو کیلیفورنیا میں تھا اور خود ایک اولڈ ہاؤس میں رہ رہا تھا۔ بہر حال اس ڈبل ڈوز کے بعد جان کی حالت میں خاصی بہتری آئی تھی اور اس نے اگلے دن سے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ وہ صبح سے دوپہر تک انٹرنیٹ پر ملازمتوں کے اشتہار دیکھ کر سی ویز بھیجتا رہا تھا۔ اس دوران میں، میں نے باہر جا کر ایڈم سے بات کی۔ باہر وہ غیر مرئی حالت میں رہتا تھا کیونکہ ظاہر ہوتا تو سب کو ہی نظر آتا۔ میں نے اس سے شکوہ کیا۔

”تم نے جان کے ساتھ کچھ زیادہ ہی سخت سلوک کر دیا۔“ ”مجھے افسوس ہے لیکن اس وقت مجھے غصہ آ گیا تھا اور میں زیادہ ہی روئل دکھایا۔ اگر تم کہو تو میں اس سے معافی مانگ لیتا ہوں۔“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جان بھی شرمندہ تھا اس نے مجھ سے سوری کر لی ہے اور ملازمت کی تلاش کر رہا ہے۔“ ”کیا میں اس معاملے میں اس کی مدد کر سکتا ہوں؟“ ”نہیں، یہ دنیا کے معاملات ہیں اور تم اب ان میں دخل نہیں دے سکتے۔“

”تو ہے۔“ اس نے سر دھ آہ بھری۔ ”میں اس دنیا میں تو ہوں لیکن اس دنیا سے میرا تعلق ختم ہو گیا ہے مگر اس گھر کی حد تک میں خود مختار ہوں، یہاں میں سب کر سکتا ہوں۔“ پہلے میں بھوتوں پر یقین نہیں رکھتی تھی لیکن ایڈم سے تعلق کے بعد یقین نہ کرنے کا سوال ہی ختم ہو گیا تھا بلکہ مجھے بھوتوں سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”کیا میں بھوتوں کے بارے میں کچھ پوچھ سکتی ہوں؟“

”کیوں نہیں تم مجھ سے ہر بات پوچھ سکتی ہو۔“ ”انسان مرنے کے بعد بھوت کیسے بنتا ہے اور کیا ہر شخص بھوت بن جاتا ہے؟“

”انسان مرنے کے بعد بھوت کیسے بنتا ہے یہ تو میں بھی نہیں جانتا البتہ یہ معلوم ہے کہ ہر شخص بھوت نہیں بنتا۔ میں اب تک جتنے بھوتوں سے ملا ہوں ان سب کی موت کسی نہ کسی حادثے یا غیر فطری طریقے سے ہوئی اور اب وہ بھوت ہیں۔“ ایڈم نے وضاحت کی۔ ”میرا خیال

ہے غیر فطری موت ہی کسی انسان کے بھوت بننے کی وجہ ہوتی ہے۔

”کیا تم لوگ ہمیشہ دنیا میں رہتے ہو۔ میرا تو خیال ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح نہیں اور چلی جاتی ہے۔“

”بالکل چلی جاتی ہے لیکن بعض روحوں اسی دنیا میں رہ جاتی ہیں۔ میں ان میں سے ایک ہوں۔ ممکن ہے کچھ عرصے بعد مجھے یہاں سے جانے کی اجازت مل جائے یا ممکن ہے میں ہمیشہ یہیں رہوں۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ یہ خیال کچھ اچھا نہیں تھا کہ ایک بھوت ساری عمر اس گھر میں رہے چاہے وہ ایڈم جیسا دوستانہ رویہ رکھنے والا بھوت ہی کیوں نہ ہو۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ جب تک ہم یہاں تھے اس کے ساتھ رہتے پر مجبور ہوتے کیونکہ اسے تو ہمارے بعد بھی اس گھر میں رہنا تھا۔ بہر حال اب تم کوشش کرنا کہ جان سے سامنا نہ دو اور ہمارے کسی معاملے میں دخل مت دو۔“

اس نے میری یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ ”اگر تمہیں کوئی نقصان ہونے لگا تو میں ضرور دوں گا۔“

میں نے اسے سمجھایا۔ ”تمہارے دخل دینے سے مجھے کوئی بڑا نقصان بھی ہو سکتا ہے اس لیے میری بات مان لو، آئندہ دخل اندازی مت کرنا۔“

ایڈم نے سوچ کر کہا۔ ”ٹھیک ہے لیکن تم وعدہ کرو اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت محسوس ہوئی تو تم مجھے ضرور بلاؤ گی؟“

”مجھے منظور ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ دخل اندازی نہ کرنے کا وعدہ کر رہا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے جان سے معافی مانگنے سے روکا تھا میں

چاہتی تھی کہ جان پر اس کا خوف برقرار رہے اور وہ دوبارہ پٹری سے اترنے سے گریز کرے۔ فی الحال اس نے رویہ بدلنے کا وعدہ کیا تھا لیکن کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے

وعدے پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔ اس گھر میں آنے اور ایڈم کی موجودگی کی وجہ سے جان میں تبدیلیاں آئی تھیں۔ جانب

کی وجہ سے وہ پہلے ہی پریشان تھا۔ اوپر سے دوسری نوکری سے بھی جواب مل گیا۔ میں اس کی ذہنی کیفیت سمجھ رہی تھی

اس لیے میں نے اس کے درشت رویے کا دل سے برا بھی نہیں منایا تھا۔ ممکن ہے اگر یہاں ایڈم نہ ہوتا شاید جان کا رویہ اتنا خراب اور بے پروا نہ ہوتا۔

جان نے ملازمت کے لیے دوبارہ کوشش شروع کر دی مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ ملازمت مل کر نہیں دے رہی

تھی۔ اگر وہ دس جگہ درخواست بھیج رہا تھا تو صرف دو جگہوں سے انٹرویو کال آرہی تھی اور وہاں سے بھی بعد میں کوئی جواب نہیں آتا تھا۔ فروزی کے وسط تک حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ جان اپنی گاڑی فروخت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے دو سال پہلے ہی یہ نوڈلین چوہیں چڑا کر الزکی لی تھی اور اب بچی تو صرف پندرہ کی تھی۔ اسے بچ کر ہم نے گزارے کے لیے ایک پرانی لیکن چلتی کار لے لی۔ بل ادا کیے اور گھر میں راشن ڈلوایا تھا۔ سردیوں میں بڑ بھی زیادہ آتے ہیں، میں نے احتیاطاً دو مہینے کا راشن ڈلوایا تھا کیونکہ اب تک ایسے آجائے نظر نہیں آئے تھے کہ جلد جان کو جاہل جانے کی۔

جان ہر دوسرے تیسرے دن جاتا تھا لیکن واپسی پر اس کا منہ لٹکا ہوا ہوتا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ انٹرویو اور جانب

کی تلاش میں ہی جاتا تھا کیونکہ جب وہ واپس آتا تو اس کے پاس بے منت خانی اقسام کی شراب کی بوتلیں ہوتی تھیں اور یہ

بوتلیں تھیں کہ وہ کسی بار میں بھی جاتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے انٹرویو کا کہہ کر جاتا ہو لیکن کسی بار میں جا کر وقت گزاری

کر تا ہوا۔ مارچ میں موسم بدلنے لگا تھا۔ اگرچہ تازہ برف باری بھی ہوئی تھی لیکن سردی کی شدت میں نمایاں کمی آگئی

تھی۔ مارچ کے آخر تک ہم دوبارہ فاقوں کے خطرے سے دوچار ہو چکے تھے کیونکہ میرے پاس صرف پندرہ سوڈا الز

بچے تھے۔ ان سے زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ گزارا جاسکتا تھا۔ ایک دن میں اور جان بیٹھے بیٹھے فکر کر رہے تھے کہ اب

کیا ہوگا کہ جان نے کچھ سوچ کر کہا۔

”میری مجھے لگ رہا ہے میں یہ مکان چھوڑتا ہوں۔“

میں چونک اٹھی۔ ”چھوڑا پڑے گا۔۔۔ پھر ہم کہاں جائیں گے؟“

”ہم کوئی چھوٹا اپارٹمنٹ لے لیں گے، دو تین کمروں کا اور اس مکان کی فروخت سے جو رقم ملے گی اس

سے میں اپنا ورک شاپ کھول لوں گا۔ میں اب نوکری نہیں کر سکتا۔“

تھا۔ اب میں یہاں رہنا چاہتی تھی تو جان کہہ رہا تھا کہ ہم اسے فروخت کر دیں۔ مجھے ایڈم کا خیال بھی آیا کہ جب اسے پتا چلے گا کہ ہم یہاں سے جانے کا سوچ رہے ہیں تو اس پر کیا گزرے گی۔ اگلے دن جان سو رہا تھا میں نیچے آئی اور ناشتے کی تیاری کرنے لگی۔ ایڈم اچانک ہی سامنے نمودار ہوا تو میں چونک گئی گویا وہ پہلے سے یہاں موجود تھا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے سن کر مل گئی ہے۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے سر ہلایا۔ ”مجھے معلوم ہے جان یہ مکان چھوڑنا چاہتا ہے۔“

مجھے غصہ آیا تھا۔ ”تمہی تم چھپ کر ہماری باتیں سننے ہو۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”اگر نہ سنا تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ جان کیا منصوبہ بنا رہا ہے۔“

”یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے تم نے وعدہ کیا تھا کہ جان کے ہوتے ہوئے گھر میں نہیں آؤ گے اور نہ کبھی غائب ہو کر ہماری باتیں سنو گے۔“

”ٹھیک ہے، میں نے کہا تھا۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”لیکن ایک بات یاد رکھو میں تمہیں یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا، کیا تم مجھ پر مسلط ہونا چاہتے ہو اور تمہارا کیا اختیار ہے؟“

وہ سنجیدہ ہو رہا تھا۔ ”میں نے تمہیں خبردار کر دیا ہے۔“ وہ جانے لگا تھا کہ میں نے اسے روکا۔ ”ایک منٹ

..... یہ تم کس طرح بات کر رہے ہو۔ تمہارا مجھ پر کوئی حق نہیں ہے کہ تم مجھے روک سکو۔ دوسرے یہ کہ ہم مکان مجبوری

میں فروخت کر رہے ہیں تاکہ جان اپنا کام کر سکے اور ہم کوئی چھوٹا مکان لے کر رہ سکیں۔“

”جان کو جاہل مل سکتی ہے اگر وہ ٹھیک سے کوشش کرے لیکن وہ کوشش ہی نہیں کر رہا ہے۔“ ایڈم نے منہ

بنایا۔ ”اب وہ مکان بیچنے کی بات کر رہا ہے۔ اسے بتادینا، میری مرضی کے بغیر یہ مکان نہیں بکے گا اور نہ ہی تم دونوں

یہاں سے جاسکو گے۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم چاہتے ہو ہم یہاں سے نہ جائیں مگر تم بھول رہے ہو یہ ہماری مجبوری ہے۔“ اس پر وہ کچھ ٹھنڈا ہوا تھا۔ ”ٹھیک ہے تم مجبور ہو، تمہیں رقم کی ضرورت ہے لیکن اس کے لیے یہاں سے جانا ضروری نہیں ہے تم کوئی اور طریقہ بھی اختیار کر سکتے ہو۔“

میں نے سوچ کر کہا۔ ”کاش کہ جان کو کوئی جاہل جانے پھر ہم مجبور نہیں ہوں گے یہاں سے جانے پر۔“

”افسوس کہ اس مکان سے باہر میں انسانوں کے معاملے میں اس طرح سے دخل نہیں دے سکتا ورنہ جان کو کہیں نہ کہیں نوکری دلادیتا۔“

”میں سمجھتی ہوں۔“ میں نے سر دھڑ بھری۔ ”اگر تمہارے بس میں ہوتا تو تم ضرور ہماری مدد کرتے۔“

ایڈم سوچ میں پڑ گیا، اچانک اس نے پر جوش انداز میں کہا۔ ”لیکن میں ایک طرح سے تمہاری مدد ضرور کر سکتا ہوں۔“

”وہ کیسے؟“

”تم یہ مکان فروخت کر دو۔ میں دوبارہ اسے آدمی قیمت پر تمہیں واپس دلادوں گا۔“

مجھے اس کی بات سمجھنے میں ذرا دشواری پیش آئی تھی۔ ”تمہارا مطلب ہے تم خریدنے والے کو ڈراؤ گے اور اسے اتنا مجبور کر دو گے کہ وہ یہ مکان فروخت کر کے یہاں سے جانے پر مجبور ہو جائے؟“

”بالکل۔۔۔ میرے لیے یہ بہت آسان ہے، یوں سمجھ لو کہ یہ میری جاب ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، میں جان سے مشورہ کر کے تمہیں بتاتی ہوں۔“

”مجھے یقین ہے وہ مان جائے گا۔“ ایڈم نے یقین سے کہا۔ ”دیکھو اگر یہ مکان بک کر تمہارے پاس واپس آجائے اور تمہیں لاکھ ڈالر کا فائدہ ہو جائے تو یہ ایک سال کے لیے کافی ہوگا۔ ایک سال بعد دوبارہ فروخت کر دینا۔“

میں نے جان کے سامنے تجویز رکھی لیکن ایڈم کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس نے غور کیا اور پوچھا۔ ”میری، کیا یہ سچ ہے تمہاری تجویز ہے؟“

میں ہچکچاہتی پھر بولی۔ ”وہ اصل میں یہ تجویز ایڈم کی ہے، وہ نہیں چاہتا کہ۔۔۔“

”کہ ہم یہاں سے جائیں۔“ جان نے طنز کیا۔ ”وہ بہر صورت تمہیں یہاں دیکھنا چاہتا ہے۔“

میں تنک گئی۔ ”آخر اس میں حرج ہی کیا ہے، تم بھی تو یہی چاہتے ہو؟“

جان سوچ میں پڑ گیا۔ ”ہاں یہ تو ہے۔ لیکن دوبارہ خریدنے کا نہیں سوچنا تھا۔“

”دیکھو اگر ہم اسے دو لاکھ میں بیچ کر ایک لاکھ میں واپس لے لیں تو اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے، ہمیں مکان بھی مل جائے گا اور رقم بھی۔ کچھ عرصے بعد ہم یہی کوشش دوبارہ کر سکتے ہیں۔“ کہتے ہوئے مجھے ایک خیال آیا۔ ”سنو اگر ہم سامان سمیت فروخت کر دیں تو ہمیں قیمت بھی زیادہ مل

میں کچھ وقت لگا گئے۔“

عورت کے رویے سے مجھے بھی لگتا تھا کہ اسے مکان نہیں آگیا تھا کیونکہ اس میں استعمال ہونے والی چیزیں نئی تھیں اور ہمارا فرنیچر اور سامان بھی بہترین حالت میں تھا اور اس کی مالیت کی طرح چائیس پینٹا لیس ہزار ڈالرز سے کم نہیں تھی۔ ایک ہفتے بعد ہی اس جوڑے نے رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔ وہ دو ہفتے بعد رقم ادا کرے اور ہم سے مکان کی خرید کا معاہدہ کر لیتے۔ یہ طے ہوتے ہی جان گھر سے غائب رہنے لگا۔ وہ صبح جاتا اور شام کو واپس آتا تھا۔ میں پوچھتی تو یہی کہتا کہ وہ کوئی ٹھکانا تلاش کر رہا ہے جہاں ہم آرام سے کچھ وقت گزار سکیں، جب تک نیا مالک تنگ آکر مکان دوبارہ فروخت پر آمادہ نہ ہو جائے۔ دو ہفتے بعد خریدار نے رقم کا ڈرافٹ ہمارے حوالے کیا اور ہم نے اس سے معاہدہ کر لیا۔ ہمیں دو دن کے اندر مکان اس کے حوالے کرنا تھا۔

اس دوران میں ایڈم اور جان میں کسی قدر دوسری ہو گئی تھی کیونکہ ہمیں مل کر کام کرنا تھا۔ فروخت کی کارروائی کے دوران ہی ایڈم دھمی نظر آنے لگا تھا۔ اس نے نئی بار اس عزم کا اعادہ کیا کہ ہم جلد از جلد اس گھر میں واپس آ سکیں گے۔ صاف ظاہر تھا وہ ابھی سے نئے مالکوں کو بے دخل کرنے کے خوفناک منصوبے بنا رہا تھا بلکہ اس کے انداز سے مجھے بعض اوقات یہ خطرہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ اگر نئے مالک مکان نے مکان خالی اور فروخت کرنے میں ڈراما تیراکی تو وہ ان کا مرڈر کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ میں نے دعا کی کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے منٹ جائے اور کسی کو نقصان نہ ہو۔ اس وقت میں بھول گئی تھی کہ نئے خریدار کو لاکھ ڈالرز کا نقصان ہونے والا تھا اور ہم اس میں برابر کے شریک تھے۔ دو دن بعد ہم اپنا ذاتی سامان اور چیزیں سمیت گھر سے روانہ ہوئے تو ایڈم ڈرامائی دوسے میں موجود تھا۔ وہ اس وقت تک ہاتھ ہلاتا رہا جب تک وہ ہمیں نظر اتار رہا تھا۔ گاڑی گلی سے نکلتی تو ایڈم بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جان نے گہرا سانس لیا۔ ”شکر ہے اس سے جان چھوٹی۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

جان نے صاف لفظوں میں جواب دیا۔ ”مطلب یہ کہ میرا دل اس مکان میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے جہاں ایک بھوت ہے اور بھوت بھی وہ جس کی تم پر نظر ہے۔“

”اگرچہ اس کی مجھ پر نظر ہے لیکن وہ مجھ سے کچھ

ماتک تو نہیں رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

جائے گی دوسرے ہمیں سامان کی بار برداری سے بھی نجات مل جائے گی۔ دوسری صورت میں ہمیں مکان سے سامان لے جانا اور پھر لانا بھی پڑے گا اور دونوں صورتوں میں سامان اور ہمارا کچھ نکل جائے گا۔“

تجربہ جان کو مناسب لگی تھی۔ کچھ غور کے بعد اس نے اسے منظور کر لیا اور اسی وقت اسے کال کر دی کہ وہ مکان کے لیے کوئی مناسب کاپک تلاش کرے۔ جان نے قیمت ڈھائی لاکھ ڈالرز رکھی تھی کیونکہ اس میں سامان بھی شامل تھا۔ اگلے روز میں نے ایڈم کو بتایا تو وہ بھی خوش نظر آنے لگا۔ اس نے کہا۔ ”تم دیکھنا میں آنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔ وہ دو تین دن میں یہاں سے بھاگ نکلیں گے۔ ایک دو ہفتے بعد تم اپنا مکان واپس خرید سکتے ہو۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں، اتنی جگت کی ضرورت نہیں ہے کچھ عرصے ان کو ضرور رہنے دینا ورنہ مکان کی شہرت خراب ہو جائے گی اور آئندہ اس کا کاپک نہیں ملے گا۔“

”چلو ٹھیک ہے لیکن میں انہیں ایک مہینے سے زیادہ نہیں رکھنے دوں گا۔“ ایڈم نے وارننگ دینے کے انداز میں کہا۔ صاف ظاہر تھا وہ ہم سے بلکہ مجھ سے اس سے زیادہ دوسری برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مکان کو فروخت کرنے کی پلاننگ کے ساتھ ہی ہم نے اس کے کسی قدر خراب ہو جانے والے حصوں کی صفائی اور مرمت کا کام شروع کر دیا۔ اپریل کے آغاز میں برف پھل جانے کے بعد پودوں اور درختوں نے نئے پتوں کا لباس پہن لیا تھا اور گھاس پھوس خوش رنگ ہو گئی تھی۔ معمولی سے رنگ و روغن اور مرمت کے بعد مکان یوں جگمگانے لگا جیسے ابھی تیار ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے پہلا گاہک لے آیا۔ یہ چار آفت قسم کے بچوں والا جوڑا تھا۔ اگرچہ ان کے بچوں کو دیکھ کر مجھے اپنے مکان کی خوب صورتی خطرے میں نظر آنے لگی تھی لیکن یہ اس لحاظ سے اچھا بھی تھا کہ کسی بھوت کی موجودگی ثابت ہوتے ہی اس جوڑے کو اپنے بچوں کی سلامتی کی فکر لاحق ہو جاتی اور وہ اس مکان کو جلد از جلد چھوڑ جاتے۔ جوڑے کو مکان پسند آیا تھا کیونکہ اس میں تین منٹ بھی تھا اور تین بیڈ روم تھے جبکہ نیچے ایک کمرے کو مزید بیڈ روم میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ مگر ان کے خیال میں مکان کی قیمت زیادہ تھی۔ اگر اسے اشارہ نہ کرتا تو جان جذباتی ہو کر قیمت میں کمی کا اقرار کرنے جا رہا تھا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد اسے نہ کہا۔

”انہیں مکان پسند آ گیا ہے تم لوگ ذرا صبر سے کام لو، یہ مکان لازمی خریدیں گے بس ذہنی طور پر تیار ہونے

”وہ تم سے کچھ نہیں مانگ رہا ہے لیکن وہ ہماری ازدواجی زندگی میں دخیل ضرور ہو گیا ہے۔“ جان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”اس نے ہماری مدد بھی تو کی ہے۔“ میں نے دل کی دی۔

”ہاں لیکن اپنے مفاد کے لیے۔“ جان نے میری دلیل مسترد کر دی۔ ”وہ ہمیشہ تمہیں اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا ہے اور یہ کسی صورت مجھے گوارہ نہیں ہے۔“

”اس نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔“ میرا لہجہ کمزور ہو گیا۔

جان نے گاڑی روک لی اور تلخ لہجے میں بولا۔ ”کیا تم اس کا ایک مہینے پہلے والا رویہ بھول گئی ہو جب اس نے کچن میں تمہیں دھمکی دی تھی۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا میں نے تو بتایا نہیں کہ تم اس سے لڑنے کو تیار ہو جاتے۔“

”میں نے خود سنا تھا۔ میں کچن کی طرف آ رہا تھا اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک بار مکان بکا تو میں کسی صورت دوبارہ ادھر کارخ نہیں کروں گا۔“

”جان! ایڈم ایک شریف بھوت ہے اور پھر یہ دھوکا ہوگا۔“

”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آئندہ بھی وہ اسی طرح شریف رہے گا۔ تم بھول رہی ہو وہ بھوت ہے اور اپنی من مانی پر اتر آتا تو ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے سوائے اس کے کہ وہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں۔ جہاں تک دھوکے کا تعلق ہے تو اس نے خود ہمیں دھوکا دیا۔ تم سے وعدہ کیا اور چھپ کر ہماری باتیں سن رہا ہے بلکہ ہماری جہانی میں نہ جانے کتنا شامل ہوا ہوگا۔ اسی وجہ سے میں نے اسے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا کہ ہم ہمیشہ کے لیے یہاں سے جا رہے ہیں ورنہ امکان تھا وہ پیچھے چلا آتا۔“

”یہ خطرہ تو اب بھی ہے۔“

”نہیں، ابھی وہ مطمئن ہے کہ ہم اس کی بنائی ہوئی اسکیم پر عمل کر رہے ہیں اور وہ ہمارے پیچھے نہیں آئے گا اس لیے ہم نہیں بھی جا کر چھپ سکتے ہیں۔“

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ مجھے خیال آیا کیونکہ اب تک جان نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

”ہم یہ شہر اور یہ ریاست چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“ جان نے کہا۔ ”میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے کہ ہم کہاں جائیں گے، یہ فیصلہ ہم اس ریاست سے نکلنے کے بعد کریں گے۔ اگر تم راضی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ ہم نہیں

رہتے ہیں اور جب مکان کا خریدار اسے دوبارہ فروخت کرنے کا ارادہ کرے گا تب ہم خریدار بن جائیں گے۔ مگر اس کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ مکان فروخت ہی کرے گا۔ ہو سکتا ہے وہ صرف خالی کر کے چلا جائے اور اگر وہ فروخت کرنے پر آمادہ ہو بھی گیا تو ممکن ہے وہ بھی ڈھائی لاکھ ڈالرز ہی مانگے۔ تب ہم کیا کریں گے؟ اس لیے اس مشکل میں پھنسنے سے بہتر ہے کہ ہم یہاں سے نکل جائیں اور کہیں اور جا کر اپنی دنیا بسائیں۔ ہمارے پاس اب ڈھائی لاکھ ڈالرز ہیں۔ اس سے میں اپنا کام کر سکتا ہوں اور زیادہ کماسکتا ہوں۔“

میں نے غور کیا اور خود کو جان سے متفق پایا۔ اس کی ہر دہل میں وزن تھا۔ ایڈم کا رویہ میں دیکھ چکی تھی۔ وہ شریف تھا لیکن اس نے بھوت بن کر دھوکے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہم واپس جانے کا رسک نہیں لے سکتے لیکن بے چارہ ایڈم۔۔۔“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“ جان نے جلدی سے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ عاشق مزاج بھوت ہے اور نئے خریدار کی بیوی چار بچوں کی ماں بننے کے باوجود خامشی حسین اور اسارت ہے۔ اس کا گزرا ہوا جائے گا۔“

میں نے گھور کر جان کو دیکھا۔ ”گلتا ہے تم اسے بڑے غور سے دیکھتے رہے تھے۔“

وہ ہنسا۔ ”اب پتا چلا کہ کوئی آپ کے شریک حیات کو دیکھتا ہے اور اس میں دھچکی لیتا ہے تو آدمی کے دل پر کیا گزرتی ہے۔“

میں جھینپ گئی پھر جان کے شانے پر سر رکھ لیا۔ ”سوری ڈیز، میں نے تمہارا بہت دل دکھایا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس بھوت سے ہمدردی ہو گئی تھی۔“

”کیونکہ وہ خاصا خوش شکل اور اسارت بھوت ہے۔“ جان نے شرارت سے کہا تو میں نے کھسکا کر اس کے شانے پر مکا مارا۔ جان نے شانہ سہلایا۔ ”تو اب کیا حکم ہے؟“

”ہم یہاں سے دور کہیں جا رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہمیں کہاں ٹھکانا بنانا ہے؟ اس کا فیصلہ ریاست سے نکلنے کے بعد ہی کریں گے۔“

جان نے خوش ہو کر کار کے بڑھادی تھی۔



ہو۔ شاید کچھ شعر ہی اچانک دماغ میں آگئے ہوں اور وہ لکھنے بیٹھ گیا ہو۔

یا کمین بے اختیار اس میز کی طرف کھینچتی چلی گئی، جیسے دھات کا کوئی چھوٹا سا گلا امتنا طیس کی طرف کھینچا جاتا ہے۔
”آؤ گراف پلیز!“ یا کمین کی آواز نے عارف کو خاصا چونکا دیا تھا۔

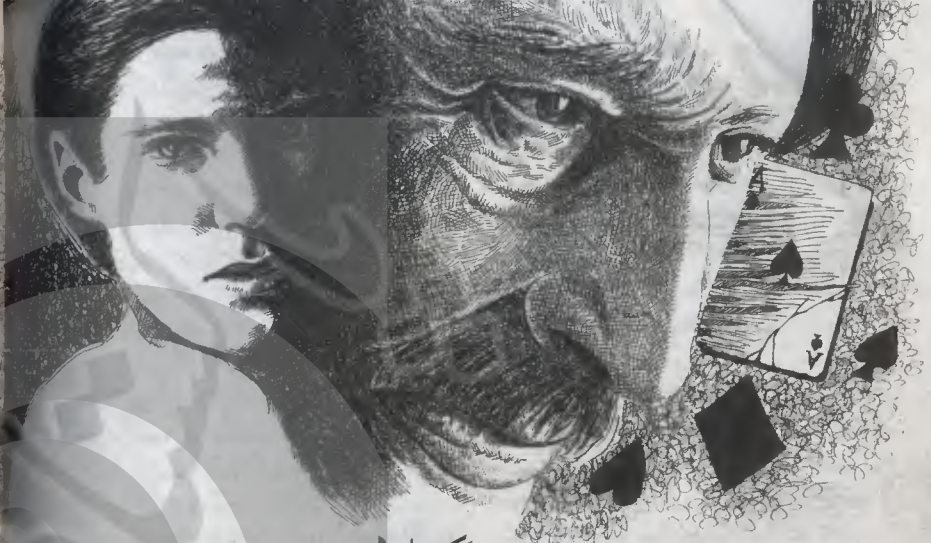
ان دونوں کی وہ پہلی ملاقات ایک ایسی محبت کا عنوان بن گئی جس نے ان دونوں ہی کو بے حد آزمائشوں میں ڈالے رکھا۔

عارف نے آؤ گراف دیتے وقت اخلاقیات یا کمین سے بیٹھنے کے لیے بھی کہا اور چائے کی دعوت بھی دی جو یا کمین نے فوراً قبول کر لی تھی۔ اس وقت اس کے سامان گمان میں نہیں تھا کہ وہ ایک ایسا دروازہ کھول رہی ہے جس سے ایک مگر جتا ہو طوفان اس کے وجود میں داخل ہو جائے گا۔

زباہ کا ہو چکا تھا۔ دو سال قبل ان کی ملاقات ایک کیفے میں ہوئی تھی۔ یا کمین نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ عارف کی شاعری بہت پسند کرتی تھی۔ دو سال قبل ہی عارف کا دوسرا مجموعہ کلام بازار میں آیا تھا۔ یا کمین وہ خریدنے کے بعد ہی چائے پینے کی غرض سے کیفے میں گئی تھی۔ عارف کے دوسرے مجموعہ کلام کے ٹائٹل کی بیک پر عارف کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی جس نے یا کمین کو سو کر دیا تھا۔

یہ تو اپنی خوب صورت نظموں ہی کی طرح خوب صورت ہے، یا کمین نے تصویر دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ مگر کیفے میں اسے دیکھ کر تو وہ چند لمحے کے لیے دم بہ خود رہ گئی اور اسے خیال آیا کہ یہ تو اپنی تصویر سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔

عارف اس وقت چائے پیتے ہوئے ایک کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا اور اس کی کیفیت یہی جیسے دنیا دانیہا سے بے خبر



شکستہ گریا

ایچ اقبال

کچھ لوگ شجر کے مانند مزاج رکھتے ہیں... زمین کے اوپر سایہ بن کر ٹھنڈک پہنچانا اور... زمین کے اندر دور تک اپنی جڑیں پھیلائے رہنا... جن پر سارے موسم اترتے ہیں مگر وہ کسی موسم کا تعاقب نہیں کرتے۔ جن کی ہریالی آنکھوں کو تازگی اور ویرانی دلوں میں درد جگاتی ہے مگر... ان کا دوسرا رخ... اپنی انا کے گنبد میں یوں قید رہنا کہ تنہائی میں اپنی ہی بازگشت سست رہنا، سلگتی یادوں سے اٹھتا دھواں کچھ تصویریں بنانا اور پھر مٹا دینا... مگر آگہی کے اس ایک لمحے نے جیسے اس کی ذات کے گرد حصار کو یوں توڑ ڈالا کہ اس کی ہر سمت رستے بکھر گئے۔ خوابوں کا تاج محل اگرچہ مسمار ہوا لیکن بنیادوں نے پھر سے تعمیر و تعبیر کی راہوں پر ڈال دیا۔ وہ جو ریت کے مانند بکھر گیا تھا، جذبات کے تلاطم نے وہ عزم عطا کیا کہ اس شمع کو محفل سے چرا کر اپنے گھر کا چراغ بنا لیا۔ یہ اور بات کہ کتنے ہی طوفان اور موسم اٹے اور گزر گئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی بھیڑ میں اگر کسی کا دلبر کھو جائے تو روگ تمام عمر پیچھا نہیں چھوڑتے مگر... وہ نہ تو کوئی روگ پالنے کا قائل تھا اور نہ ہی کسی کوراہ میں حائل کرنے کا... پھر کیسے محبت اس کی طرف مائل نہ ہوتی۔

نکست وریخت کی اذیتوں میں جتلا دو حساس دلوں کی دھڑکتوں کا احوال

یا کمین اور عارف کی کارس ایک ساتھ ہی شہر کے اس بڑے پارک تک پہنچیں جہاں لوگ تفریح یا جوگنگ کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ عارف اور یا کمین کی بیشتر ملاقاتیں اسی پارک میں ہوا کرتی تھیں۔ گزشتہ دو برسوں میں وہ بہت کم کسی اور جگہ ملے تھے۔ یا کمین کی عراب ستائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ عارف یقیناً تیس سال سے

”میرا کمرہ بلو معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔“

”نہ جانے کیوں، میں نے آج تک تمہارے کمرہ کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں چھیڑی۔ کبھی تمہارے والدین یا بھائی بہنوں کے بارے میں نہیں پوچھا، لیکن اب بات آگئی ہے تو مجھے بتاؤ۔ کیا مسئلہ ہے تمہارے کمرہ کا؟“

”میری کچھ ڈسے داریاں ہیں عارف!“ یاسمین کی آواز میں لرزش تھی۔ ”جب میرے ڈیڈی کا انتقال ہوا تھا تو.....“ وہ چپ ہو گئی۔ اسے جھوٹ بولنے میں وقت محسوس ہو رہی تھی۔

”تو؟“ عارف بے تاب ہوا۔

”پلیز عارف!..... آج اس موضوع کو یہیں ختم کر دو۔ ہم پھر کسی وقت بات کریں گے اس بارے میں!“

”ابھی میں نے کہا تھا کہ اب میں انتظار نہیں کر سکتا۔ اس کی ایک وجہ بھی ہے، وہ میں تم سے چھپاؤں گا نہیں۔ ابھی بتاؤں گا تمہیں، لیکن پہلے تم اپنے مسئلے کے بارے میں بتاؤ۔“ یاسمین نے غنڈی سانس لیتے ہوئے

جھوٹ بولنے کی ہمت کی۔ ”ڈیڈی کے انتقال کے بعد ان کا کاروبار بھی نے سنبھال لیا تھا۔ خود ڈیڈی ہی نے ان میں یہ کاروباری سوجھ بوجھ پیدا کی تھی۔ میں اس وقت سیکنڈ ایر کی طالبہ تھی لیکن می نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی پڑھائی جاری رکھتے ہوئے، کاروبار بھی میں سمجھتی بہت دیکھتی رہوں، دراصل ڈیڈی ہی کی طرح وہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ اگر انہیں کسی وقت خدا نخواستہ کچھ ہو جائے تو کاروبار کی ذمہ داری میں سنبھال سکوں۔“

”دش پر ٹھٹھے ہوئے وہ دونوں ایک بیچ کے قریب بیٹھ گئے۔

”بیچ خالی ہے۔“ عارف بول پڑا۔ ”یہاں بیٹھ جاتے ہیں، مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم تنہا محسوس کر رہی ہو۔“

لیکن حقیقت یہ تھی کہ جھوٹ بولتے ہوئے یاسمین کے اعصاب پر کچھ ایسا دباؤ پڑ رہا تھا کہ اس کی چال بھی متاثر ہو گئی تھی۔ اسی کو عارف نے اس کی تنہا سمجھا تھا۔

وہ دونوں بیچ پر بیٹھ گئے۔ یاسمین کھوٹی کھوٹی سی نظر آرہی تھی۔ عارف کے ٹوکے پر اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ”جب میں فورتحہ ایر میں تھی تو می کی صحت خاصی خراب رہنے لگی تھی۔ اسی لیے مجھے کاروباری معاملات پر زیادہ توجہ دینا پڑی۔ اس سے ایک نقصان تو میری پڑھائی کا ہوا۔ میں پاس تو ہوئی لیکن کوئی اچھی ڈیڑن نہیں لاسکی لیکن دوسری

اشاروں ہی اشاروں میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں اب تک، اور تم نا سمجھ بھی نہیں ہو۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تمہارے دل میں بھی میرے لیے وہی جگہ بن چکی ہے جو میرے دل میں تمہارے لیے ہے۔“

یاسمین چند لمحوں کے لیے لنگ کی ہو کر رہ گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دماغ میں سناٹا چھا گیا ہو۔ عارف کی زبان پر وہ بات واضح طور پر آگئی تھی جس سے اسے ہمیشہ ڈر لگا رہتا تھا۔

”کیا میں غلط کہہ رہا ہوں عدیلہ؟“ عارف کچھ توقف سے بولا۔

یاسمین نے پہلی ملاقات میں اسے اپنا نام عدیلہ ہی بتایا تھا۔ اس غلط بیانی کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس یوں ہی یاسمین کے دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ پہلی ملاقات میں کسی نوجوان کو اپنا صحیح نام نہیں بتانا چاہیے۔ عارف نے آٹو گراف دیتے وقت اس کا نام پوچھا تھا۔ اس کے بعد وہ نشست قدرے طویل ہو گئی تھی۔ اس نشست کی طوالت ہی کے باعث بعد میں یاسمین کو خیال آیا تھا کہ اس نے غلط نام بتا کر خدشہ نہیں کیا، لیکن جب غلطی ہو جائے تو اس کا ازالہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ بعد کی ملاقاتوں میں اسے کئی بار خیال آیا کہ عارف کو اپنا صحیح نام بتا دے لیکن وہ اس خیال سے تذبذب کا شکار رہی کہ جو غلط بیانی وہ کر چکی تھی، اس کے بارے میں عارف نہ جانے کیا خیال کرے۔

”جواب دو عدیلہ!“ عارف پھر بولا۔

”تم غلط نہیں کہہ رہے ہو عارف!“ یاسمین نے نظریں جھکائے ہوئے جواب دیا۔ ”دراصل میں چاہتی تھی کہ..... بس.....“ وہ چپ ہو گئی۔

”بس..... کیا مطلب! بات پوری کرو عدیلہ!“

”بس یہ چاہتی تھی میں کہ یہ بات مناسب وقت پر

ہی زبان پر لائی جائے۔“

”مناسب وقت سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”یعنی جب ان باتوں کا کوئی نتیجہ بھی نکل سکے۔“

”نتیجہ؟“

”تم میری زبان سے کیوں کہلوانا چاہتے ہو.....؟“

ابھی جو تم نے ایک واضح بات کی ہے تو کیوں کی ہے؟“

”اس لیے کہ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ اس

سے زیادہ صاف بات یہ ہے کہ اب میں تم سے جلد از جلد شادی کر لینا چاہتا ہوں۔“

یاسمین نے غنڈی سانس لی۔ ”اسی کو میں نے

مناسب وقت کہا تھا۔ میں ابھی شادی نہیں کر سکتی عارف!“

چاہتے پینے کے دوران میں یاسمین نے عارف کی کئی نظموں پر مختلف زاویوں سے اتنے بھرپور تجزیے کیے کہ عارف اس کی سخن بھی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ خود یاسمین بھی معمولی شکل صورت کی لڑکی نہیں تھی۔ اس کا رنگ تو کچھ ایسا سرخ و سفید نہیں تھا جو گولش نقش و نگار کو نکھار دیتا ہے تاہم اس کی ہر نون جیسی غیر معمولی طور پر بڑی بڑی آنکھیں، جیسے نقوش اور متناسب جسم ایسا تھا کہ وہ جدھر سے گزرتی، بہت سی نگاہیں اس پر جم کر رہ جاتی تھیں۔

اسی ملاقات میں عارف کو بھی گویا احساس ہوا کہ اس کی نظموں اور غزلوں کا تجزیاتی محبوب، انسانی جسم میں وصل کر اس کے سامنے آ گیا ہے۔ اسی ملاقات میں دونوں نے کنٹیکٹ نمبر کا تبادلہ بھی کر لیا، پھر اس کے بعد تو کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب عارف اسے فون نہ کرتا ہو۔ اس کی باتوں نے یاسمین پر ظاہر کر دیا کہ وہ بہت تیزی سے عارف کے رگ و پے میں رچتی بستی چلی جا رہی تھی۔

یہ احساس ایسا تھا کہ یاسمین کا نپ گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ عارف کی کال ریسیو نہیں کرے گی لیکن وہ اس فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی۔ اس نے محسوس کیا کہ خود اس کے مضبوط دل پر بھی عارف کا نام لکھا جا چکا ہے۔

پھر موبائل فون پر باتیں کرتے ہوئے عارف کے اصرار پر ان کی دوسری ملاقات اس پارک میں ہوئی۔ اس کے بعد وقفہ وقفہ سے ان ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان ملاقاتوں میں یاسمین کی کوشش ہوتی تھی کہ موضوع گفتگو عارف کی شاعری تک محدود رہے لیکن عارف کسی نہ کسی طرح اشاروں کنایوں میں اپنے دل کی حالت بیان کرنے کی کوشش بھی کر ڈالتا۔ ان باتوں کی یادیں یاسمین کو تنہائی میں نہ جانے کیوں رلاتی تھی۔

عارف کے مجموعوں میں شائع شدہ دیباچوں وغیرہ سے یاسمین یہ تو جان چکی تھی کہ عارف ایک بڑی کاروباری شخصیت کنور شمشاد کا بیٹا تھا۔ یہ جاننے کے بعد وہ ایک پرکشش زندگی کے خواب دیکھ سکتی تھی لیکن اس نے ایسا کوئی خواب نہیں دیکھا۔

جب ان کی ملاقاتوں کو سات آٹھ ماہ گزر چکے تو ایک ملاقات میں جب یاسمین نے عارف کی ایک غزل کو موضوع گفتگو بنایا تو پہلی مرتبہ عارف پر یکا یک جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ اب میں شاعری ہی چھوڑ دوں۔

تم گھوم پھر کر اسی کو گفتگو کا موضوع بنائے رکھتی ہو۔ میں

ایکشن کی برکتیں

ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر لیڈر حضرات اتنے ہی پیٹ کے پلکے تھے تو اب تک کیسے خاموش بیٹھے تھے؟ یہ جو اچانک انہیں ایک دوسرے کی برائیوں کا خیال آ گیا ہے اور فطرتوں اور لڑکوں کی طرح مخالفین کے لئے لینے لگے ہیں تو کیا اس سے قبل ان کی معلومات کا یہ خانہ خالی تھا یا محض انتخابات کا انتظار تھا؟ بہر صورت کچھ بھی ہو اتنی بات ماننا پڑے گی کہ یہ سب ایکشن کی برکتیں ہیں جو ہر شخص زبان دان کی میدان میں غم خشوک کر نکال آیا ہے۔ ہر ایک اپنی جگہ انوکھی بنا ہوا ہے اور اسے یہ خیال تک نہیں آتا کہ بھائی! تیرے ایک نہیں دو کندہ ہیں میں اور ان میں سے ایک اتر بھی سکتا ہے۔ اصل فیصلہ تو ایکشن کے بعد ہوتا ہے ابھی تو صرف ڈنڈو بیٹھکوں سے ہی ایک دوسرے کو دھلایا دیکھا جا رہا ہے اور محض ”بڑبڑوں“ اور جھلجھلوں پر گزرا کیا جا رہا ہے۔

سرسر

گزشتہ کچھ دنوں سے کراچی میں ایک سرس چل رہا تھا بڑے اشتہار چھپ رہے تھے اور بے شمار لوگ سرس کے فن کاروں کے کتب دیکھنے جاتے تھے۔ کئی بار رات کو وہاں سے گزر ہوا تو دیکھا، یار لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ تماشا کی ٹوٹے پڑے ہیں۔ خوب رش لے رہا تھا لیکن وہ روز پہلے وہاں سے گزرتا ہوا تو دیکھا کہ سرس کا تنو وغیرہ گرا یا جا رہا تھا اور ساز و سامان سمیٹا جا رہا تھا۔ تعجب ہوا کہ اس قدر چالو بڑس کو بند کیا جا رہا ہے؟ آگے بڑھ کر ایک صاحب سے دریافت کیا ”کیوں صاحب سرس بند کیوں کر دیا؟ یہ تو خاصا رش لے رہا تھا؟“ جواب میں انہوں نے ایک نظر دیکھا اور ڈھٹلا سامنے بنا کر بولے۔ ”صاحب! ایکشن کے دن آگئے ہیں۔ کلی کلی محلہ جلے شروع ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں ہمارا سرس کون دیکھنے آگے گا؟“

شفیع عیسیٰ کی کتاب ”سرخ سفید سیاہ“ سے اقتباس

طرف یہ بہتری آئی کہ میں نے کاروباری معاملات کو تقریباً پوری طرح سمجھ لیا۔ اس کے بعد میں نے بھی مناسب سمجھا کہ مجی کو آرام کرنے دوں۔ تمام معاملات میں نے خود سنبھال لیے۔ کوئی زیادہ پیچیدگی آجانی ہے تو گھر پر ہی سے مشورہ کر لیتی ہوں۔ مجی کے مشورے پر میں نے یہ بھی کیا ہے کہ اپنی چھوٹی بہن کو بھی کاروبار میں چھوڑا بہت انوالو کر لیا ہے۔ اب وہ بھی کرپجیشن کرنے والی ہے۔ ابھی میں اس پر زیادہ باؤ نہیں ڈال رہی ہوں۔ بنیادی معاملات میں نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھے ہیں۔

”تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ جب تک وہ کاروبار پوری طرح نہ سنبھال لے تم شادی نہیں کر سکتیں؟“ عارف بول پڑا۔
”یہ بات نہیں۔ دراصل میرا ایک بھائی بھی ہے۔ مجی نے اسے ایک کورس کرنے کے لیے باہر بھیجا ہے۔ وہ آجائے گا تو وہی سنبھالے گا سارا کاروبار۔“
”وہ کب آئے گا؟“

”لگ بھگ ایک سال بعد۔“ یاسمین نے جواب تو دے دیا لیکن اس خیال سے اس کا دل بیٹھنے لگا کہ اگر عارف مزید ایک سال انتظار کرنے پر آمادہ ہو گیا تو وہ سال بھر بعد اس کو مزید کس طرح ٹال سکے گی۔

”سال.....“ عارف بے چینی سے بڑبڑایا۔ ”اتنا انتظار میں نہیں کر سکتا عدیلہ.....! ڈیڈی اب جلد از جلد میری شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ تمہیں ڈیڈی کے انداز فکر پر تعجب ضرور ہوگا۔ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کروں گا۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ اس پر انہیں کوئی اعتراض نہیں لیکن مجھے ایک شادی ان کی خواہش کے مطابق بھی کرنا پڑے گی۔“
”کیا مطلب!“ یاسمین کے منہ سے نکلا۔

عارف دھیرے سے لیکن کسی قدر طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ”خود انہوں نے بھی دو شادیاں کی تھیں۔ ایک اس لڑکی سے جو انہیں پسند کی اور دوسری اس سے جو ان کے ڈیڈی کو پسند تھی۔“

”اوہ! تمہاری سوتیلی والدہ بھی ہیں؟“
”اب تو سبکی والدہ بھی نہیں۔“ عارف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”کئی سال ہوئے، دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے سال بھر بعد سے ڈیڈی کی خواہش ہے کہ میری شادی کر دیں، میں انہیں اس طرح ٹال رہا ہوں کہ ابھی مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں آئی۔ اب کل ڈیڈی نے مجھے فیصلہ سنا دیا ہے کہ اب وہ مجھے بھر کے اندر میری شادی

کر دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جب کوئی لڑکی مجھے پسند آجائے تو میں اس سے بھی شادی کر لوں۔“
”تمہارا خیال ہے، میں یہ گوارا کر لوں گی کہ.....“
”میں سمجھ گیا، تم کیا کہنا چاہتی ہو۔“ عارف نے اس کی بات کاٹی۔ ”میں عدیلہ! تمہیں کوئی سوتن برداشت نہیں کرنا پڑے گی۔ اتنے عرصے سے ہمارا ساتھ ہے، میں تمہیں بہت اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ تم بہت ذہین ہو۔ تم ڈیڈی کے دل میں اس طرح گھر لو گی کہ وہ میری دوسری شادی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیں گے۔“

”اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟“ یاسمین نے خواہ مخواہ کہا۔ یہ تو وہ طے کر چکی تھی کہ عارف سے شادی نہیں کرے گی۔
”تو.....“ عارف نے گھبر لہے میں کہا۔ ”تو میں تمہیں ساتھ لے کر گھر چھوڑ دوں گا لیکن دوسری شادی نہیں کروں گا۔ ڈیڈی ناراض ہوں گے تو ہو جائیں، مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ میں ان کی جاندا سے محروم ہو سکتا ہوں تو ہو جائوں! میری جاندا تو تم ہو گی عدیلہ!“

”لیکن میرے بھائی کے آئے میں تو ابھی.....“
”وہ تو تم مجھے بتا چکی ہو۔“ عارف نے اس کی بات کاٹی۔ ”لیکن اب تمہیں کوئی تدبیر کرنا ہو گی عدیلہ.....! اگر تم سے میری شادی نہیں ہوئی تو ڈیڈی نہ جانے کس سے میری شادی کر دیں۔“

”تو کر لیتا۔“ عدیلہ کے منہ سے نکلا۔
”کیا!“ عارف حیرت سے بولا۔ ”تم مجھ سے بعد میں شادی کرو گی؟ ایک سوتن برداشت کر لو گی؟“
”نہیں۔“ عدیلہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
”میں تمہیں بھولنے کی کوشش کروں گی عارف.....! تم بھی کسی طرح مجھے بھلا دینا۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ عارف جوشیلا ہو گیا۔ ”میں تمہیں نہیں بھلا سکتا۔“
”سب کچھ ممکن ہوتا ہے عارف!“ یاسمین کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔

”یہ ممکن نہیں ہوگا۔ میں نے ڈیڈی کی پسند کی شادی کر لی تو گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گا۔ تمہیں نہیں بھول سکوں گا۔ پلیز عدیلہ!..... کوئی راستہ نکالو!“
لیکن یاسمین کیا راستہ نکالے گی۔ وہ تو خود چاہتی تھی کہ عارف سے اس کی شادی نہ ہو۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے اسے خون کے آنسو رواں پڑا تاہم اسے کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تنہائی میں وہ اسی خیال سے رو پڑتی

تھی کہ وہ عارف سے شادی نہیں کر سکتی لیکن اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ عارف سے ملتی بھی رہی تھی۔
اس وقت گفتگو اس لیے آگے نہیں بڑھ سکی کہ یاسمین کے موبائل پر کل آگئی تھی۔
”جی جی!“ اس نے موبائل کان سے لگا یا۔

”کہاں ہو اس وقت؟..... خیر نہیں بھی ہو، فوراً گھر آؤ۔ ایک ضروری بات کرنا ہے۔“ دوسری طرف سے کراخت نسوانی آواز آئی۔
”آئی ہوں جی!“

یاسمین رابطہ منقطع کرتے ہوئے جلدی سے کھڑی ہوئی۔ ”مجھے آجانا ہوگا عارف! مجی نے فوراً بلایا ہے مجھے۔“
”یہ مسئلہ کب حل ہوگا؟“ عارف نے بتائی سے پوچھا۔
یاسمین نے پارک کے پچانک کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تھا۔

”ہم اس بارے میں اگلے ہفتے بات کریں گے۔“
”اگلے ہفتے کیوں؟“ عارف نے تیزی سے پوچھا۔
”ایک اہم کاروباری معاملہ ہے۔ میں کل صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد جا رہی ہوں۔ واپسی ایک ہفتے بعد ہوگی۔“

”میرے لیے تو بڑی پریشانی ہو جائے گی عدیلہ!“
عارف حواس باختہ سا ہو گیا۔ ”میں تو آج صبح ڈیڈی سے کہہ چکا ہوں کہ میں نے لڑکی پسند کر لی ہے۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن یہ معاملہ اگر طے نہ ہو گا تو پھر وہ اصرار کریں گے کہ میں ان کی پسند کی لڑکی سے شادی کر لوں۔ ایسی صورت میں میرے لیے صرف یہی ایک راستہ رہ جائے گا کہ میں گھر چھوڑ دوں۔ خواہ ڈیڈی کتنا ہی ناراض ہوں۔“
”ہرگز نہیں عارف.....! ایسا ہرگز نہ کرنا۔ تم کو میری قسم ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو عدیلہ!“ عارف پریشان ہو گیا۔
”مجھے ڈیڈی کی پسند کی شادی کرنا پڑ جائے گی۔“
”تو کر لیتا۔“

”عدیلہ!“ عارف کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔ وہ حیرت سے یاسمین کی طرف دیکھتا رہ گیا۔
”ہاں۔“ یاسمین نے نم ناک آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بھئی برا ایک بات کہی ہے میں نے.....! مانو مجھے نہیں؟“

”لیکن پھر عدیلہ، تمہیں ایک سوتن.....“
”وہ سب بعد میں دیکھا جائے گا۔“

عارف یاسمین کے ساتھ اس کی کار کے قریب جا رہا تھا۔ یاسمین چابی سے کار کا دروازہ کھولنے لگی۔
”عدیلہ! میرے لیے بہت پریشانی ہو جائے گی۔“
عارف یاگل سا ہوا جا رہا تھا۔

یاسمین نے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو تم اپنا گھر ہرگز نہیں چھوڑو گے۔“
کار حرکت میں آ چکی تھی۔

”لیکن عدیلہ!“ عارف نے ہانگوں کی طرح کار کے ساتھ دوڑنا چاہا مگر یاسمین نے آتی تیزی سے رفتار بڑھائی کہ وہ کار کے ساتھ دوڑتے ہوئے اپنی بات مکمل نہیں کر سکا۔ اسے رکتا پڑا اور وہ حسرت سے یاسمین کی کار کی طرف دیکھتا رہ گیا جو تیزی سے دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکا کہ تیز ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی یاسمین کی آنکھوں میں آنسو تیز رہے تھے۔

”کیا ہوگا؟“ وہ سوچ رہی تھی۔ ”کیا ہوگا؟“
اس کی شدید ترین خواہش یہ تھی کہ عارف اسی لڑکی سے شادی کر لے جسے اس کے باپ نے اس کے لیے پسند کیا تھا، لیکن وہ محسوس کر رہی تھی کہ ایسا نہیں ہو سکے گا۔
عارف اس لڑکی سے شادی نہیں کرے گا۔

دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے؟ یاسمین کا دماغ برابر کام کرتا رہا۔ یہ سوال اس کے دماغ میں گونجتا رہا کہ دوسری تدبیر کیا ہو سکتی ہے؟ یہ سوال اتنا پیچیدہ تھا کہ جواب میں کوئی بات اس کے ذہن میں نہیں ابھر رہی تھی، مگر پھر یکایک ہی اسے ایک ایسا خیال آیا کہ اس کے دل میں ٹپکی سی آگئی۔
پہلے تو وہ ہمیشہ یہی سوچتی رہی تھی کہ وہ زندگی بھر شادی نہیں کرے گی اور عارف کی یادوں کے سہارے زندہ رہے گی لیکن اب پہلی مرتبہ اسے خیال آیا تھا کہ وہ کسی سے شادی کر لے، کسی سے بھی.....! اس صورت میں عارف اسے بے وقاصی سے جانے کتنے نام دے ڈالتا۔

دے ڈالے! یاسمین سوچ رہی تھی۔ کوئی اور تدبیر ممکن نہیں عارف سے شادی نہ کرنے کی۔
دل میں درد اٹھاتا رہا، آنکھوں میں آنسو تیز رہے لیکن وہ اپنے فیصلے پر جچی رہی۔

کچھ دیر بعد جب اس کی کار ایک خوب صورت پینکے کے اجالے میں داخل ہوئی۔ بھانک پر ”الماس نادر“ کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی، یہ یاسمین کی ماں کا نام تھا۔
کار کھڑی کر کے یاسمین نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں

خشک کیں۔ کار سے اتر کر وہ خود کو سنبھالے رکھنے کی کوشش کرتی ہوئی پچھلے میں داخل ہوئی۔ فوراً ہی الماس نادر سے سامنا ہو گیا۔ اس کے ساتھ یاسمین کی چھوٹی بہن ریشماں بھی تھی۔

”آؤ باجی!“ ریشماں مسکراتی ہوئی بولی۔

”تمہارے لیے می کی پاس بہت اچھی خبر ہے۔“

یاسمین استنبہامیہ نظروں سے الماس نادر کی طرف دیکھنے لگی۔

”تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟“

الماس نادر نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ یاسمین کی بے حد کوشش کے باوجود اس کے چہرے نے اس کی کیفیت کی چغلی کردی تھی جسے الماس نادر جھنکی جہاں دیدہ عورت پر آسانی سمجھ گئی۔

”نہیں تو۔“ یاسمین نے مسکرائے کی کوشش کی۔

”کالج کی ایک دوست کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر نکل گئی تھی۔ بہت تھک گئی ہوں۔ جی چاہ رہا ہے، فوراً بستر پر جا کروں۔“

الماس نادر نے دو تین لمبے نیک یاسمین کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ ”رانی بیگم آئی تھی آج.....! میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا لیکن بہت دن ہوئے..... کوئی ایک مہینہ پہلے اس سے کہا تھا میں نے کہ وہ تمہارے لیے کوئی اچھا سا رشتہ ڈھونڈے۔ آج وہ بات لے کر آئی تھی مجھے اور تمہاری بہن کو تو رشتہ بہت ہی پسند آیا ہے۔“

لفظ ”رشتہ“ سنتے ہی یاسمین کا دل بڑی زور سے اچھلا تھا۔

الماس نادر کہتی رہی۔ ”تم اب پہلے جیسی رہی بھی نہیں ہو، وہ ڈھلک گئی ہو۔ اب تمہاری جگہ ریشماں سنبھال لے گی۔ لاہور سے تمہیں ایک ہفتے میں واپس آنا ہے۔ یہ تمہارا آخری کام ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔“ یاسمین نے آہستہ سے کہا۔ اگرچہ خود اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ کسی سے شادی کر لے گی لیکن غیر متوقع طور پر یہ بات اس کے سامنے آئی تھی تو اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے سینے میں اس کا دل بیٹھتا ہی چلا گیا ہو۔

”اب میں جاؤں گی؟“ وہ بولی۔ ”میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

الماس نادر اور ریشماں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ان کی حیرت کا سبب یہی تھا کہ یاسمین نے اس

رشتے کے بارے میں ذرا بھی استفسار نہیں کیا تھا۔

الماس نادر بولی۔ ”یہ نہیں پوچھو گی کہ.....“

”مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے می!“ یاسمین نے کہا۔ ”آپ جو فیصلہ کریں گی، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ پہلے بھی ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے آپ کے کسی فیصلے سے اختلاف کیا ہو..... بس اب میں جا کے آرام کرتی ہوں۔“

وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

الماس نادر اور ریشماں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

یاسمین نے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کیا اور دوڑنے کے سے انداز میں بستر کے قریب جا کے اس پر گر پڑی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اٹھ پڑا تھا۔ اس سیلاب کی شدت میں دھیرے دھیرے ہی کی آسکی۔ اس کا ہاتھ سر ہانے رکھے ہوئے عارف کے مجھ سے پر پڑا۔ وہ اس کے سر ہانے ہی رکھا رہتا تھا۔ یاسمین نے وہ اٹھا لیا اور اس میں چھپی ہوئی عارف کی تصویر پر نظریں جمادیں۔

”ہاں عارف!“ وہ قدرے توقف سے بڑبڑائی۔

اس کی بڑبڑائی ہوئی آواز میں بھی لرزش تھی۔ ”بے وقاحت سمجھ لیتا تم مجھے! جودل چاہے سمجھ لیتا، لیکن میرا دل تو جانتا ہے نا.....! میں تم سے بے وفائی نہیں کروں گی یہ شادی کر کے..... یہ تو میری وفا ہوگی جس کی چوٹ پر میں خود کو قربان کروں گی۔“

انتا کہتے کہتے یاسمین کی آواز اس کے حلق میں گھٹ گئی اور اس کی آنکھوں سے وہ سیلاب پھر اٹھ پڑا جس کی شدت میں کی آگئی تھی۔

~*~

دوسری صبح ناشتے کی میز پر عارف کے ہاتھ سے سلائس چھوٹ کر فرنی انڈے کی پلیٹ میں گر پڑا۔ اس کے باپ کنور شمشاد نے بات ہی ایسی کہی تھی کہ یوٹھلا ہٹ میں عارف سے کچھ بھی سزد ہو سکتا تھا۔

”ایک لڑکی کے لیے تمہارے رشتے کی بات شروع کرادی ہے میں نے۔“ کنور شمشاد نے کہا تھا۔ ”دو ایک دن بعد جواب دینے کے لیے کہا ہے لڑکی کی ماں نے..... اس کی طرف سے انکار کا امکان نہیں ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کی رسم ہے کہ لڑکی والے فوراً جواب نہیں دیتے۔“

”لیکن..... ڈیڈی.....“

شکستہ گویا

”اب میں مزید تاخیر برداشت نہیں کروں گا۔“ کنور شمشاد نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں اپنی اس بات پر اب بھی قائم ہوں کہ اگر تم کسی لڑکی کو پسند کرو گے تو میں اس سے بھی تمہاری شادی میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ جب تم چاہو گے، تمہاری دوسری شادی بھی ہو جائے گی۔“

”میں نے آپ سے ایک بات اور بھی کہی تھی ڈیڈی!“ عارف نظریں جھکائے ہوئے بولا۔ ”آپ شاید بھول گئے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ.....“

”مجھے یاد ہے۔“ کنور شمشاد نے اس کی بات کاٹی۔

”تم چاہتے تھے کہ تمہاری پہلی شادی تمہاری پسند کی ہو۔“

”میں اب بھی یہی چاہتا ہوں۔“

”بہت دن سے تمہاری یہ بات سنا رہا ہوں مگر تم نے اب تک کوئی لڑکی پسند نہیں کی۔“ کنور شمشاد نے کہا۔ ”آخر مجھے فیصلہ کرنا ہی پڑا۔ لڑکی ایسی ہے کہ تم بھی اسے ناپسند نہیں کرو گے۔ یاسمین نام ہے اس کا۔ اس کی ماں ایک بیوہ خاتون ہیں مگر مالی حالات اچھے ہیں۔ یاسمین کی ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔ جوان وہ بھی ہو چکی ہے لیکن اس کا تمہارا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔ وہ تم سے کافی چھوٹی ہے۔ یاسمین ہی مجھے تمہارے لیے مناسب معلوم ہوئی۔“

عارف کو اس وقت یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے جسم کی جان نکلی جا رہی ہو۔

”ناشتہ تو کرو!“ کنور شمشاد نے بیٹے کو گھورتے ہوئے کہا۔

عارف کا سلائس پلیٹ میں گر ا ہوا تھا۔ وہ اس نے اس طرح اٹھایا جیسے کوئی وزنی چیز اٹھا رہا ہو۔ اس کا دماغ بھی جیسے ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اس معاملے کو کس طرح ٹالے۔

”رانی بیگم کو تو جانتے ہو تا تم؟“ کنور شمشاد نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

”جی..... جی نہیں۔“ عارف جیسے چونک کر بولا تھا۔

”میں آپ کے زیادہ تر دوستوں یا شامساؤں کو صرف چہروں سے پہچانتا ہوں، ناموں سے واقف نہیں ہوں۔“

”نہایت کے فنکشن میں جو لوگ آتے ہیں، میں تعارف تو کر اتا ہوں ان سے تمہارا۔“

کنور شمشاد کے گھر پر سننے سال کی تقریب ہمیشہ ہوتی تھی۔

”شاید میں بھول گیا ہوں۔“ عارف نے دہمی آواز میں کہا۔

”خیر!“ کنور شمشاد نے کہا۔ ”وہ ایک اچھی خاتون ہیں۔ شوہر سے کسی اختلاف کے باعث انہوں نے طلاق کی تو اختیار کرنی ہے لیکن طلاق نہیں لی۔ ایک مرتبہ میں نے چند دوستوں کو چائے پر بلایا تھا، تب بھی وہ آئی تھیں تم شاید اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ دراصل تمہارے رشتے کی بات انہی کے ذریعے شروع ہوئی ہے کیونکہ ان کا میل جول بہت زیادہ لوگوں سے ہے اس لیے کچھ عرصہ پہلے میں نے ان سے ذکر کر دیا تھا کہ مجھے تمہارے لیے کسی اچھی لڑکی کی تلاش ہے۔ انہوں نے ہی مجھے یاسمین کی تصویر دکھائی تھی۔ اس کی ماں الماس نادر کے بارے میں بھی بتایا تھا اور گھریلو حالات کے بارے میں بھی! آسانی سے تو میں بھی صرف تصویر دیکھ کر اس رشتے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا تھا لہذا ایک دن بعد رانی بیگم نے اپنے موبائل فون سے بنائی ہوئی ان لوگوں کے گھر کی وڈیو بھی دکھائی۔ اس میں یاسمین کے علاوہ بیگم الماس اور ان کی چھوٹی بیٹی ریشماں بھی تھی۔ رانی بیگم نے مجھے بتایا کہ بیگم الماس نادر ابھی اپنی چھوٹی بیٹی کی شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ خود میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ ریشماں سے تمہارا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔ میں نے یاسمین کو تمہارے لیے پسند کر لیا اور رانی بیگم کو اجازت بھی دے دی کہ وہ سلسلہ آگے بڑھا لے چنانچہ ابھی جب میں ناشتے کے لیے اپنے کمرے سے نکلا تھا تو ان کا فون آیا تھا۔ اسی وقت انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ بیگم الماس نادر نے دو ایک دن بعد جواب دینے کے لیے کہا ہے۔“

اس وقت عارف کے کانوں میں بھی سامعین سامعین ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے باپ کی ساری باتیں ذرا بھی توجہ سے نہیں سن سکا۔ وہ تو اس سوچ میں غلغلان رہا تھا کہ اس معاملے کو کس طرح ٹالا جاسکتا ہے، لیکن کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسے اپنے والد کے مزاج سے مل آگاہی تھی۔ جب وہ کوئی بات ایک مرتبہ کہہ دیتے تو پھر اس پر اڑ جاتے تھے۔ انہوں نے اس کے اور یاسمین کے رشتے کی بات آگے بڑھا دی تھی لہذا اب وہ اس سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہو گئے۔ وہ عارف کی دوسری شادی کے معاملے میں بھی اپنا وعدہ فراموش نہ کرتے لیکن عارف دوسری شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ عدیلہ اس کے باپ کے دل میں اتنی جگہ بنائے گی کہ پھر وہ دوسری شادی کا خیال اپنے ذہن سے نکال دیتے لیکن وہ سارا معاملہ اس وجہ سے بڑبڑاتا نظر آ رہا تھا کہ عدیلہ ابھی شادی کے لیے تیار

ہی نہیں تھی۔

ناشتے کے بعد کنور شمشاد اپنے دفتر چلے گئے۔ انہوں نے عارف کو اپنے کاروبار میں نہیں لگھایا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاعرانہ مزاج رکھنے والا ان کا بیٹا کاروباری معاملات میں بالکل نیکل ثابت ہوگا۔

باپ کے جاتے ہی عارف نے موبائل پر عدیلہ سے رابطہ کرنا چاہا لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ عدیلہ کا موبائل بند تھا۔ عارف نے کئی مرتبہ کوشش کی لیکن اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ عارف نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ اس نے ایرپورٹ انکوائری سے رابطہ کیا۔ عدیلہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس دن اسلام آباد چلی جائے گی۔ انکوائری سے معلوم ہوا کہ ساڑھے سات بجے ایک فلائٹ اسلام آباد جا چکی تھی۔ دوسری فلائٹ گیارہ بجے روانہ ہوئی۔

عارف نے سوچا، شاید وہ ساڑھے سات کی فلائٹ سے نہ گئی ہو اور اب گیارہ بجے کی فلائٹ سے جائے۔ ایسی صورت میں اسے ایرپورٹ پر پکڑا جاسکتا تھا۔

کافی عرصے تک تعلقات رہنے کے باوجود وہ عدیلہ کے گھر کے پتے سے ناواقف تھا۔ یہ کسی حد تک غیر فطری سی بات تھی لیکن ہوا ایسا ہی تھا۔ اس کی طرح عدیلہ نے بھی کبھی اس کے گھر کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔

عارف دل بجے ہی ایرپورٹ پہنچ گیا اور ایسی جگہ ٹھہرا ہو گیا کہ کوئی شخص بھی اس کی نظروں سے بچ کر ایرپورٹ کی عمارت میں داخل نہ ہو سکے۔ وہ آنے والی کاروں پر بھی نظر رکھے رہا۔ اس کے خیال میں یہ امکان بھی تھا کہ عدیلہ کی چھوٹی بہن ڈرائیونگ جاتی ہو اور وہی عدیلہ کو لے کر آئے تاکہ کار واپس لے جاسکے۔

عارف نے اس دوران میں متعدد بار موبائل پر عدیلہ سے رابطہ کرنے کی کئی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔ یہ بات بھی اس کے ذہن کو الجھائے ہوئے تھی کہ عدیلہ نے اپنا موبائل بند کیوں کر رکھا تھا۔ اس الجھن کے ساتھ اس کے دماغ میں یہ سوال بھی تھا کہ عدیلہ کی گئی تو وہ اس سے کیا بات کرے گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ عدیلہ کو صورت حال سے آگاہ کر دیتا۔ وہ یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ عدیلہ پر اس کا کیا رد عمل ہوگا مگر اس کے باوجود خوش گمانیوں میں مبتلا تھا۔ ان حالات کی وجہ سے عدیلہ شاید فوری طور پر اس سے شادی کے لیے آمادہ ہو جائے! ایسی صورت میں وہ اپنے باپ سے یہ

منوانے کی کوشش کر سکتا تھا کہ یاسمین نامی لڑکی سے اس کی شادی کچھ عرصے کے لیے ملتوی کر کے پہلے اس کی اور عدیلہ کی شادی کروادی جائے۔

انہی خیالات میں وقت گزرتا رہا۔ پونے گیارہ بجنے والے تھے جب اس کی مایوسی کا غلیہ شدید ہو گیا۔ اس کے اندازے کے مطابق اسلام آباد جانے والی فلائٹ کے مسافروں کو اس وقت ڈیپارچر لاؤنچ میں تو ہونا ہی چاہیے تھا۔

پھر گیارہ بج بھی گئے۔ اسلام آباد کی فلائٹ چلی گئی۔ حد درجہ مایوسی کے عالم میں عارف نے سوچا کہ ابھی کوئی اور فلائٹ بھی ہوگی جس سے عدیلہ نے اسلام آباد جانے کا فیصلہ کیا ہو۔ اس خیال کے باعث اس نے انکوائری سے رابطہ کیا معلوم ہوا کہ ساڑھے چار بجے بھی ایک فلائٹ اسلام آباد جائے گی۔

عارف دل برداشتگی کے عالم میں گھر روانہ ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ساڑھے تین بجے پھر ایرپورٹ آئے گا۔ اس نے اپنے اس فیصلے پر عمل بھی کیا لیکن نتیجہ وقت کے زیاں کے علاوہ کچھ نہ نکلا۔ عدیلہ اسے نہیں مل سکی۔

اس نے موبائل پر بھی عدیلہ سے رابطہ کرنے کی کوششیں جاری رکھی تھیں لیکن عدیلہ کا موبائل بند ہونے کی وجہ سے رابطہ ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔

پھر دو دن گزر گئے۔ عارف ان دو دنوں میں ایک بار بھی گھر سے باہر نہیں نکلا۔ اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اسے عدیلہ کے علاوہ کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ بھوک بھی جیسے مر گئی تھی۔ دوپہر کا کھانا اس نے کسی دن بھی نہیں کھایا۔ سب کا ناشتا اور رات کا کھانا بھی اسے اس لیے کھانا پڑا کہ اس وقت کنور شمشاد عمو نا گھر پر ہی ہوتے تھے۔

”کیا بات ہے!“ تیسری صبح ناشتے کی میز پر کنور شمشاد نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”کیا حالت بنا رہی ہے تم نے اپنی؟“ اس دن کے بعد غالباً شیونک نہیں بنایا ہے تم نے.....! یہ میں نے کل ہی محسوس کر لیا تھا لیکن نظر انداز کر گیا۔ آخر بات کیا ہے؟“

”جانے کیا بات ہے ڈیڈی!“ عارف نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ”ان دنوں دل نہ جانے کیوں بہت اداس ہے۔“

”اداس کی وجہ؟“

”وہ میری کچھ میں بھی نہیں آ رہی ہے۔“ عارف اس کے علاوہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔

”یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم شاعر ہو، لیکن شاعر مجھوں تو نہیں بن جاتا..... سچ بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟“

”سچ بات!“ عارف کو کچھ خیال آیا تو وہ باپ کا چہرہ ہلکنے لگا۔

”ہاں، بالکل سچ۔“

”سچ بات یہ ہے ڈیڈی کہ میں ایک لڑکی کو پسند کر چکا ہوں۔“

کنور شمشاد نے چونک کر کہا۔ ”پہلے کیوں نہیں بتایا تم نے؟ میں اس لڑکی سے تمہاری شادی میں رکاوٹ تو نہیں بنتا۔“

”بات کچھ اور ہے ڈیڈی.....! وہ لڑکی فی الحال شادی کے لیے تیار نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”اس کی کچھ گھریلو مجبوریات ہیں۔“

”ایسی کیا مجبوریات ہیں کہ وہ شادی ہی نہ کر سکے!..... نہیں ایسا تو نہیں کہ وہ تم سے شادی کرنا ہی نہ چاہتی ہو۔“

”ایسا نہیں ہے ڈیڈی..... وہ مجھے اتنا ہی چاہتی ہے جتنا میں اسے چاہتا ہوں۔“

”پھر مجبوریات کیسی..... کہیں ملازمت کرتی ہے وہ..... اسے کھری کھری لگتی ہے؟“

”نیکل تو وہ ہے لیکن ملازمت نہیں کرتی۔ اس کے والد اچھا خاصا کاروبار چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔“

عارف نے وہ سب کچھ بیان کر دیا جو اسے عدیلہ نے بتایا تھا۔ یہ بھی بتا دیا کہ کسی کاروباری معاملے ہی میں وہ ان دنوں اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔

کنور شمشاد نے کہا۔ ”اس کا پتا بتاؤ۔ میں خود جا کر اس کی ماں سے مل لیتا ہوں۔ جب تک اس لڑکی کا بھائی پڑھ کر واپس آنے کے بعد کاروبار نہیں سنبھالے گا، وہ کاروبار سنبھالے رہے۔ شادی سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ مجھے اس کی اس مصروفیت پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ صرف ایک سال کی بات ہے، یہ کوئی طویل مدت نہیں..... اگر وہ فوری طور پر تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور اس کی ماں کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تو میں یاسمین سے تمہاری شادی چند ماہ کے لیے موخر کر دوں گا۔“

”عدیلہ کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا ڈیڈی!“

”کیوں؟ یہ کیوں ضروری ہے.....؟ اس کی ماں سے

میلنے کے لیے میں آج ہی جانے کے لیے تیار ہوں۔ رانی بیگم کو فون کر دوں گا۔ وہ بھی میرے ساتھ چلی جائیں گی۔ میں ان پر اس معاملے میں بھی اعتماد کر سکتا ہوں۔“

”مجھے عدیلہ کا گھر نہیں معلوم ڈیڈی!“ عارف نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”کیا!“ کنور شمشاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، پھر جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم اسے اتنا چاہتے ہو اور تمہیں اس کے گھر کا علم نہیں..... کیا شاعر ہونے کے بعد آدمی پاگل بھی ہو جاتا ہے۔“

عارف چپ رہا۔ وہ اس کے علاوہ کبھی کیا سکتا تھا۔ کنور شمشاد ڈرا دیر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑاتے رہے، پھر عارف کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”ایک بات میں تمہیں بتا دوں۔ یاسمین کی ماں نے شادی کے لیے آدمی کا اظہار کر دیا ہے۔ شادی کی تاریخ دن بعد طے کی جائے گی۔ اگر عدیلہ تین چار دن بعد واپس آ جاتی ہے اور تم اسے شادی پر آمادہ کر لیتے ہو تو میں یاسمین سے تمہاری شادی چند ماہ کے لیے موخر کر دوں گا۔ اگر تم ضروری سمجھو تو میں بھی جا کر عدیلہ کی ماں سے مل لوں گا، لیکن اگر وہ دونوں فوری شادی پر رضامند نہیں ہوتیں تو پھر میں یاسمین سے تمہاری شادی کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔“

عارف کی کچھ امید بندھی تو وہ کسی قدر جوش سے بولا۔ ”میں پوری کوشش کروں گا ڈیڈی! آپ کو اس کی کاروباری مصروفیت پر اعتراض نہیں ہے تو وہ ضرور شادی کے لیے تیار ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے، لیکن تمہاری اس بات نے میرا موڈ بہت خراب کر دیا ہے کہ تم اس کے پتے سے بھی ناواقف ہو۔ کیا شاعری آدمی کو حق بھی بنا دیتی ہے۔“

عارف کچھ نہیں بول سکا۔ اس کے بعد کنور شمشاد کوئی بات نہیں کی۔ ان کا موڈ واقعی بہت خراب ہو گیا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد بھی وہ کچھ کہے بغیر میز سے اٹھ گئے۔

یاسمین پورے ایک ہفتے بعد اسلام آباد سے لوٹی۔ اس کی بہن ریشماں اسے لینے کے لیے ایرپورٹ پر موجود تھیں۔ یاسمین کے ساتھ ایک چھوٹے سے اپنی کپس کے علاوہ کسی قسم کا سامان نہیں تھا۔ وہ کار کی ڈکی میں رکھوا دیا گیا، پھر کار ایرپورٹ سے روانہ ہوئی۔ ڈرائیونگ سیٹ ریشماں ہی نے سنبھال رکھی تھی۔

”یہ عارف کیا بہت اچھا شاعر ہے باجی؟“ ریشماں

نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔
 ”کیوں؟“ یاسمین چوکی۔ ”یہ چانک تجھے عارف کا خیال کیوں آگیا؟“
 ”مجھیں اس کی شاعری بہت پسند ہے نا.....! تمہارے کمرے میں بھی اس کی کتاب رہتی ہے۔ کار میں بھی ہے۔“ ریشماں نے ڈیش بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔
 ”ہاں۔“ یاسمین نے اپنا دست بیک کھولتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس کی شاعری بہت پسند ہے۔“
 ”مجھے تو شاعری سے کوئی دلچسپی ہے نہیں.....! کار میں تھی اس کی کتاب تو میں نے تھوڑی سی پڑھی تھی۔“ یاسمین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے دست بیک سے دو موبائل فون نکالے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک کو ”پاور آف“ کیا اور دوسرا جو بند پڑا تھا، اسے کھولا۔
 ”اس مرحلہ پر دوسرے نمبر کا موبائل کیوں لے گئی تھیں!“ ریشماں بولی۔ ”پہلے تو میں ایسا نہیں کیا تم نے!“
 اس سے پہلے کہ یاسمین کوئی جواب دیتی، اس موبائل کی کھنٹی بجنے لگی جو اس نے ابھی کھولا تھا۔ یاسمین نے وہ اٹھایا اور اسکرین پر نظر ڈالی۔ کال کرنے والا اس کی توقع کے مطابق عارف ہی تھا۔ یاسمین نے موبائل کان سے لگایا۔ ”ہیلو!“ وہ بہت سنجیدہ تھی۔
 ”شکر ہے کہ تم نے کال ریسیو کی۔“ دوسری طرف سے عارف نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”اس ایک ہفتے میں کم از کم سو مرتبہ تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ کیا تم اپنا موبائل بند کر دیتی ہو جو بھر سے کہیں باہر جاتی ہو؟“
 ”ہاں، کہیں جاتی ہوں تو دوسرا نمبر استعمال کرتی ہوں۔“ یاسمین نے جھوٹ بولا۔
 ”کیوں؟..... اچھا خیر، مجھے دوسرا نمبر بتا کے تو جاتیں۔ بہت پریشان رہا ہوں اس ہفتے میں۔ اب فوراً مجھ سے ملو۔ کہاں ہو اس وقت؟“
 ”ابھی کچھ ہی ہوں کر اپنی!..... ایر پورٹ سے گھر کی طرف جا رہی ہوں۔“
 ”کیسی میں؟“
 ”نہیں۔“ یاسمین نے جواب دیا۔ ”ریشماں آئی تھی مجھے لینے۔“
 ”ریشماں؟“ چونک کر کہا گیا۔ ”یہ کون ہے؟“
 یاسمین کو یاد نہیں تھا کہ اس نے پہلے بھی عارف کو اپنی بہن کا نام بتایا تھا یا نہیں لیکن عارف کے چونکنے سے

اس نے بھی سمجھا کہ اس نے عارف کو اپنی بہن کا نام نہیں بتایا ہوگا۔
 ”میری چھوٹی بہن ہے یہ۔“ یاسمین نے جواب دیا۔
 ”عجب بات ہے، اس کی چھوٹی بہن کا نام بھی..... اچھا خیر چھوڑو۔ یہ باتیں ملاقات پر ہی ہوں گی۔ تم فوراً مجھ سے ملنے آؤ، ابھی دوپہر ہے۔ پارک میں ملنا تو اچھا نہیں رہے گا۔ اسی کینے میں آؤ جہاں ہم پہلی مرتبہ ملے تھے۔“
 ”فوراً آجیگا!“ یاسمین بولی۔ ”ابھی تو ریشماں کے ساتھ گھر جا رہی ہوں۔ پھر کچھ دیر تو گھر پر رکوں گی۔“
 ”تم سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے میرے اعصاب ٹوٹنے لگے ہیں۔ میں تم سے جلد از جلد ملنا چاہتا ہوں عدیلہ!“
 ”آخر بات کیا ہے؟ اتنی بے تابی؟“
 ”بات کچھ ایسی ہی ہے کہ مجھیں بتانا بہت ضروری ہے لیکن اتنی مختصر بات نہیں ہے کہ فون پر بتا دوں۔ تمہارے ساتھ تمہاری بہن بھی تو ہے نا.....! فون پر بات نہیں ہو سکے گی۔“
 ”مجھے اب پندرہ منٹ تو لگیں گے گھر پہنچنے میں!“ یاسمین نے کہا۔ ”کچھ دیر تو روکنا ہوگا نا! اس کے بعد مجھے پہنچنے میں بیس منٹ تو لگیں گے۔“
 ”ٹھیک ٹھیک وقت بتاؤ پلیز..... میں بہت بے چین ہوں۔“
 ”یاسمین نے گھڑی دیکھی۔ ”اتنی بے چینی ہے تو میں گھر پر دس منٹ سے زیادہ نہیں رکوں گی۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ عارف نے کہا۔ ”پہنچنا بیس منٹ بعد میں کینے میں تمہارا انتظار ہوں گا۔“
 ”اچھا۔“ یاسمین نے رابطہ منقطع کیا۔
 اس دوران میں ریشماں چپ رہی تھی۔ بس کبھی کبھی یاسمین پر ایک اچھٹی سی نظر ڈالتی تھی۔ وہ اس وقت بولی جب یاسمین نے موبائل بند کیا تھا۔
 ”کون تھا جی؟“
 ”میری ایک دوست ہے۔“ یاسمین نے جواب دیا۔
 ”کسی وجہ سے پریشان ہے، مجھ سے مشورہ کرنا چاہتی ہے۔ جانا تو پڑے گا مجھے!“
 ”اگر وہ تمہاری کوئی بہت اچھی دوست ہے تو تمہیں فوراً اس سے ملنے جانا چاہیے نا جی.....! تم کار لے جاؤ، میں ٹیکسی کر کے چلی جاؤں گی۔“

”نہیں نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔“ می کی ڈانٹ پڑ جانے کی وجہ پر۔
 ”می گھر پر نہیں ہیں۔ کہہ کر گئی تھیں کہ دو تین گھنٹے بعد واپسی ہوگی ان کی۔ ابھی انہیں گئے ہوئے مشکل سے ایک گھنٹہ گزرا ہے۔ وہ اسی وقت گئی تھیں جب میں انہیں لینے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔“
 ”پھر بھی یہ ٹھیک نہیں ہے کہ تم ٹیکسی کرو۔ گھر پہنچ کر تم گاڑی سے اتر جانا۔ میں فوراً چلی جاؤں گی۔“
 ریشماں نے اس معاملے میں ٹکرا کر غیر ضروری سمجھی۔ یاسمین کا ذہن عارف میں الجھا رہا ہے۔ یہ اس نے بھی عارف کے سچے سے محسوس کر لیا تھا کہ بات کچھ زیادہ ہی غیر معمولی تھی۔
 ریشماں کو گھر پر اتار کے یاسمین نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور روانہ ہوئی۔ اس نے موبائل پر عارف سے رابطہ کر کے اسے بتایا کہ وہ گھر پر ایک منٹ بھی رکے بغیر کینے کی طرف روانہ ہو چکی ہے۔
 ”میں خود راستے میں ہوں۔ اگر تم گھر پر رکتی تو مجھے دس بارہ منٹ انتظار کرنا پڑتا تھا۔“
 ”اب تو بتا دو کیا بات ہے!..... ریشماں اب میرے ساتھ نہیں ہے۔“
 ”اب تم آہی رہی ہو تو آئے سانسے بیٹھ کر ہی بات ہوگی۔“
 ”خاصی الجھن میں ڈال دیا ہے تم نے.....! اچھا خیر! میں آ رہی ہوں۔“
 یاسمین نے رابطہ منقطع کر کے کار کی رفتار میں اضافہ کیا۔ وہ واقعی بہت زیادہ الجھ گئی تھی۔ معاملہ جو کچھ بھی ہو، اس کے بارے میں کوئی قیاس کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔
 جب وہ کینے میں داخل ہوئی تو سانسے ہی کی میز پر عارف دکھائی دیا۔ غالباً وہ جان بوجھ کر ان کی میز پر بیٹھا تھا کہ یاسمین کینے میں قدم رکھتے ہی اسے دیکھ لے۔
 یاسمین قریب جا کر اس کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ یہ اس نے فوراً محسوس کر لیا تھا کہ عارف کے چہرے پر پریشانی کے اثرات خاصے کھڑے تھے۔
 ”میں تم سے باج منٹ پہلے پہنچ گیا تھا۔“ عارف بولا۔
 ”اصل بات کی طرف آؤ۔ تم نے میرے دماغ پر بہت دباؤ ڈال دیا ہے۔ میں کوئی اندازہ لگانے سے قاصر ہوں کہ بات کیا ہو سکتی ہے۔“
 ”یقیناً وہ ایسی ہی بات ہے۔“ عارف نے کہا۔ ”میں شکستہ گویا

نے یہ ہفتہ شدید اذیت میں گزارا ہے۔ اگر فون پر بات ہو جاتی تو میں اتنی اذیت میں نہیں رہتا۔“
 ”اب بات تو بتاؤ!“
 ”ڈیڈی کہیں میری شادی کر رہے ہیں۔ بات چھیڑ دی ہے انہوں نے!“
 اگرچہ یاسمین خود چاہتی تھی کہ عارف کی لڑکی سے شادی کر لے مگر عارف کے منہ سے یہ بات سن کر اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا تاہم اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے افسردہ سی اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”مبارک ہو عارف!“
 عارف اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا۔
 یاسمین سنجیدہ ہو گئی۔ ”کیا مجھے مبارک باد نہیں دینا چاہیے؟“
 ”میں تم سے یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ تم میرے زخموں پر نمک چھڑکو گی۔“ عارف کی آواز بھر مائی۔
 ”مجھیں اپنے والد کی بات تو ماننا ہی ہوگی نا عارف!“
 ”ضروری نہیں ہے، اگر تم مجھ سے فوری طور پر شادی کے لیے تیار ہو جاؤ۔“
 ”یہ تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟“
 ”ڈیڈی سے بہت تفصیلی بات ہو چکی ہے۔ وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ اگر میں اپنی پسند کی لڑکی سے فوری طور پر شادی کر لوں تو وہ دوسری شادی موخر کر دیں گے اور مجھے یقین ہے کہ تم ان کے دل میں اپنے لیے اتنی جگہ بنا لو گی تو پھر وہ میری دوسری شادی کا ارادہ ترک ہی کر دیں گے۔“
 یاسمین چند لمبے خاموش رہی، پھر بولی۔ ”میں تم کو کیسے سمجھاؤں کہ میں ابھی شادی نہیں کر سکتی۔“
 ”اپنی کاروباری مصروفیت کی وجہ سے؟“
 ”ہاں۔“
 ”شادی کے بعد ڈیڈی کو تمہاری کاروباری مصروفیت پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“
 ”کیا مطلب!“ یاسمین حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
 ”ہاں عدیلہ!“ عارف نے کہا۔ ”میں نے ڈیڈی کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔“
 ”اوہ!“
 ”اب بتاؤ!“ عارف بے تابی سے بولا۔ ”اب تو کوئی رکاوٹ نہیں ہونا چاہیے تمہارے سامنے۔“
 یاسمین نہ صرف خاموش رہی، بلکہ اس نے نظریں بھی

وہاں گے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گمریٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ گزشتہ

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیمت مالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ تم اسی حساب سے ارسال کریں، ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے چے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل، بیجینا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے دیے جانے والے بہترین تحفہ ہو سکتا ہے

بہرون ملک سے قارئین صرف وڈیشن یونین یا ممبر گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں، کسی اور ذریعے سے رقم بھیجیے پر ہماری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: عمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز ٹیٹن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگ روڈ، کراچی

فون: 35895313 فکس: 35802551

اب پہلے سے زیادہ کڑے امتحان میں پڑ گئی تھی، اچانک اس کے دماغ میں ایک بات آئی اور اس نے اس بارے میں کچھ سوچے سمجھے بغیر اپنا وہ موبائل اٹھا یا جس کا نمبر عارف کے پاس نہیں تھا۔ وہ اس پر پہنچ ٹائپ کرنے لگی۔ ٹائپ کرنے کے بعد اس نے ایک بار اسے پڑھا۔ اس نے ٹائپ کیا تھا۔

”عارف صاحب!..... آپ کو حیرت ہوگی کہ میں ”یاسین“ آپ سے مخاطب ہو رہی ہوں۔ وہی یاسین جس سے آپ کی شادی طے ہو رہی ہے۔ میں آپ سے ایک التجا کرنا چاہتی ہوں جو آپ کو بہت عجیب لگے گی۔ آپ اس شادی سے انکار کر دیجیے۔ آپ مرد ہیں، ایسا کر سکتے ہیں لیکن میں لڑکی ہوں، میں ہمت نہیں کر سکتی۔ کوئی وجہ ہے کہ ہماری شادی نہ ہونا ہی بہتر ہوگا۔ آپ ایک اچھے شاعر ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ایک اچھے انسان بھی ہوں گے اس لیے میری التجا نظر انداز نہیں کریں گے“

یاسین نے دو مرتبہ عبارت پڑھی اور پھر وہ پیغام عارف کے موبائل نمبر پر پہنچ دیا۔ عبارت کے آخر میں اس نے اپنا نام لکھنا غیر ضروری سمجھا تھا۔ وہ پیغام کی ابتدا ہی میں لکھ چکی تھی کہ وہ کون ہے.....

پیغام تو اس نے بھیج دیا لیکن شک کر رہی۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر یہ قدم اٹھا ڈالا تھا لیکن اب سوچ رہی تھی کہ کیا اس کا یہ اقدام درست ثابت ہوگا؟

یہ یقین اسے بہر حال تھا کہ عارف یہ پیغام پڑھ کر خوش ہو جائے گا اور اسے فون کر کے بتائے گا بھی لیکن چندہ میں منٹ گزر گئے۔ عارف کی کال نہیں آئی۔ تب اچانک یاسین کو خیال آیا کہ اس نے اپنا موبائل فون تو عارف سے بات کرنے کے بعد ”پار آف“ کر دیا تھا۔ اوصالی تناؤ اور ذہنی خلقتا رہی اتنا تھا کہ وہ کوئی بات بھی بھول گئی تھی۔ اس نے موبائل اٹھا کر اسے ”آن“ کیا۔ اسے یقین تھا کہ عارف کو اس کا نمبر بدلا ہوگا تو وہ ممبر نہیں کرے گا، بار بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

یہ خیال درست ثابت ہوا۔ پانچ منٹ بعد عارف کی کال آ گئی۔

”کیا کرتی ہو تم!“ اس کے لہجے میں قدرے جھنجھلاہٹ تھی۔ ”تم نے بتایا تھا کہ تم شہر سے باہر جاتی ہو تو اپنا یہ موبائل بند کر دیتی ہو لیکن اب تو تم کراچی ہی میں ہونا“ ”سوری“ یاسین نے آہستہ سے کہا۔ ”تم سے بات کرنے کے بعد میں نے خیال ہی میں فون بند کر بیٹھی تھی۔ دو

یاسین میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ الماس نادر کے سامنے اس رشتے سے انکار کرتی۔ اگر ہمت ہوتی بھی تو اس کے انکار کے بعد یہ بحث چھڑ جاتی کہ جب وہ عارف کو اتنا پسند کرتی ہے تو انکار کا سبب؟ اس کا انکار الماس نادر اور ریشماں، دونوں ہی کو حیران کرتا۔

ڈراؤ پر بعد جب وہ اپنے کمرے میں لوٹی تو اس نے بڑی تیزی سے اپنا موبائل اٹھا یا۔ الماس نادر کے کمرے میں جاتے وقت وہ دونوں ہی موبائل ساتھ لے جانا بھول گئی تھی۔

رابطہ قائم ہوتے ہی دوسری طرف سے عارف کی آواز آئی۔ ”شکر ہے کہ تم نے ابھی فون کر لیا، رات تک کا انتظار میری سرے لیے کچھ کم اذیت ناک نہیں ہوتا۔“ ”تمہارے والد نے تمہاری شادی کہاں طے کی ہے یا کر رہے ہیں؟“ یاسین نے کسی تمہید کے بغیر وہ سوال کر ڈالا جو اس کے دماغ میں گردش کر رہا تھا۔

عارف حیرت سے بولا۔ ”یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا؟“

”ہاں۔“

”کیوں؟“

”بس جانا چاہتی ہوں۔“

”کیا جانا چاہتی ہو؟“

”ان لوگوں کے نام وغیرہ۔“ یاسین نے کہا۔

”جس سے میری شادی کی بات چلائی ہے ڈیڈی نے اس کا نام یاسین ہے۔ اسے اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کی چھوٹی بہن کا نام وہی ہے جو تمہاری بہن کا ہے۔ ماں کا نام الماس نادر ہے۔“

”کون لوگ ہیں یہ؟“

”مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم! میں نے ڈیڈی سے کوئی سوال نہیں کیا۔“

”اچھا! ابھی تو مجھے بھی معلوم کرنا تھا۔ اب رات ہی کوفون کروں گی۔“ یاسین نے کہا اور رابطہ ختم کرنے کے ساتھ ہی موبائل ”پار آف“ بھی کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ عارف بے تاب ہو کر اسے فون کرے گا اور اس سے معلوم کرنا چاہے گا کہ اس نے وہ پوچھ کچھ کیوں کی تھی اور یاسین اسے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکتی تھی۔

موبائل فون ایک طرف ڈال کر وہ بستر پر نیم دراز حالت میں سر پکڑے سوچتی رہی کہ اب کیا کرے.....! وہ

کہ ابھی آئی ہو۔ کپڑے بدل کر آؤ گی۔ یہ تو میں نے کہہ دیا تھا ان سے کہ اگر پورٹ سے آنے کے بعد تم اپنی کسی دوست سے ملنے چلی گئی نہیں۔“

یاسین کچھ کے بغیر ہاتھ روم میں داخل ہو گئی۔ اس نے واش سین کے اوپر لگے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ ریشماں نے جو کچھ کہا تھا، غلط نہیں تھا۔ یاسین نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور واٹن سین میں منہ دھوئے لگی۔

کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا، پھر الماس نادر کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

ریشماں وہیں تھی اور ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی، الماس نادر بستر پر نیم دراز تھی اور کسی سوچ میں ڈوبی نظر آ رہی تھی۔

یاسین کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ”میں نے شیک ہی فیصلہ کیا کہ تمہاری شادی کر دینا ضروری سمجھا۔ لاہور سے تمہاری شکایت آئی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ تمہاری جگہ ریشماں لے لے۔ تم اب..... اچھا خیر!..... ابھی ریشماں نے بتایا کہ تم پہلے ہی سے عارف کو پسند کرتی ہو۔“

یاسین نے نظریں چمکائیں۔

”اس نے بتایا نہیں تمہیں!“ الماس نادر نے پوچھا۔

”دوسرے ہی دن صبح ساڑھے سات کی فلائٹ سے

میں اسلام آباد چلی گئی تھی۔“

”فون پر بھی رابطہ نہیں ہوا؟“

”میں ایسے موقعوں پر آپ کے اور ریشماں کے علاوہ کسی سے رابطہ نہیں کرتی۔ ڈسٹریکشن ہوتی ہے۔ اسی لیے میں نے اپنا فون بدل لیا تھا۔ عارف ضرور فون کرتا۔ اسے نہیں بتایا تھا میں نے اپنا نمبر!“

”عجیب سی بات کہہ رہی ہو تم!..... ریشماں بتا چکی ہے مجھے کہ تمہاری کیا حالت تھی، جب تم اسے اتنا چاہتی ہو تو نیا نمبر بھی بتانا چاہیے تھا۔“

”عارف کو میرے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔ بات یہاں تک پہنچی کیسے!“

”میں نے تمہیں بتایا تھا شاید کہ رانی بیگم پڑی ہیں بیچ میں!“

”مجھے یاد نہیں رہا شاید۔“

”تین دن بعد تمہاری شادی کی تاریخ طے کرنا ہے، میں کوشش کروں گی کہ زیادہ دیر نہ لگے۔ دس بارہ دن کی تاریخ طے ہو جائے۔“

”جی۔“

تین منٹ پہلے اسے کھولا ہے۔ کیا تم نے فون کیا تھا؟“
”تیسری مرتبہ کر رہا ہوں۔ دوسرے تو فوراً کوشش کی تھی۔“

”فورا کیا مطلب؟“

”یاسمین نے مجھے ایس ایم ایس کیا ہے۔ وہ پڑھتے ہی میں نے تم سے رابطے کی کوشش کی تھی۔ فی الحال تو میرا دماغ ہلکا ہو گیا ہے۔ یاسمین مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

”کیا مطلب؟“ یاسمین انجان بن گئی۔

”بعد میں بات کر سگے۔ پہلے تم اس کا ایس ایم ایس پڑھ لو۔ میں تمہیں بھیج رہا ہوں۔“ دوسری طرف عارف بہت بے تاب تھا۔ اس نے فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا تاکہ ایس ایم ایس بھیج سکے۔

ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کا ایس ایم ایس آگیا۔ وہی ایس ایم ایس جو یاسمین نے اسے بھیجا تھا..... یاسمین کے ہونٹوں پر ہلکی سی افسردہ مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہو گئی۔

پھر دو منٹ اور گزرے تھے کہ عارف کی کال بھی آگئی۔

”ل کیا ایس ایم ایس؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔ پڑھ لیا میں نے.....! ہو سکتا ہے یہ یاسمین کسی اور کو پسند کر رہی ہو، اس سے شادی کرنا چاہتی ہو۔“

”کچھ بھی ہو، میری بلا سے.....! فی الحال میری جان تو چھوٹ جائے گی۔ میں نے ڈیڈی کو فون پر بتا دیا ہے۔“

”کیا؟“ یاسمین چونکی۔

”بلکہ وہ ایس ایم ایس بھی نہیں بھیج دیا ہے۔“

یاسمین قدرے بوکھلا گئی۔ اس نے کہا۔ ”تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا عارف!..... اس بے چاری نے تم پر اعتماد کیا تھا۔ تم نے اس کے اعتماد کو نہیں پہنچایا ہے۔“

”میرے لیے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا عدیلہ!..... میں ڈیڈی کو یہ ایس ایم ایس دکھائے بغیر اپنی جان نہیں چھڑا سکتا تھا۔“

”چھا اب تم اس کا ایس ایم ایس ڈیڈی کو کر دو!“ یاسمین نے تیزی سے کہا۔

”کیوں؟“ عارف نے تعجب سے پوچھا۔

”اس کو موبائل نمبر ہو گا نا ایس ایم ایس کے ساتھ.....! تم نے اس کا ایس ایم ایس اپنے ڈیڈی کو بھیجا ہو گا تو اس کے ساتھ اس کا نمبر تو نہیں گیا ہو گا۔ بعد میں تم اپنے ڈیڈی سے کہہ دینا کہ تم غلطی سے وہ ایس ایم ایس

ڈیڈی کر چکے ہو۔ اس طرح اس بے چاری کی جان بچ سکتی ہے۔ وہ اپنے گھر والوں سے کہہ سکتی ہے کہ وہ ایس ایم ایس اس نے نہیں کیا۔“

دوسری طرف خاموشی رہی۔

”ہیلو!“ یاسمین قدرے بلند آواز میں بولی۔ ”تم چپ کیوں ہو گئے؟“

”میں ڈیڈی کو وہ نمبر بھی بھیج چکا ہوں۔“

یہ جواب سنتے ہی یاسمین کو اپنا دماغ چکراتا ہوا محسوس ہوا۔

عارف کہہ رہا تھا۔ ”ایس ایم ایس ملنے کے بعد ہی ڈیڈی نے فون پر مجھ سے کہا تھا کہ میں وہ نمبر بھی نہیں بھیجوں چنانچہ میں نے بھیج دیا۔ میں نے تو تمہیں فوراً فون کرنا چاہا تھا۔ اگر اس وقت تم سے بات ہو جاتی تو شاید میں تمہاری یہ بات مان لیتا۔ شاید کال فون میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ نمبر نہ ہونے کی وجہ سے ڈیڈی شے میں پڑ جاتے کہ اس شادی سے بچنے کے لیے ایس ایم ایس کی چالاکی خود میں نے کی ہے۔ ڈیڈی اس ایس ایم ایس سے بہت الجھ گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ وہ ابھی دفتر سے واپس گھر پہنچ رہے ہیں حالانکہ عمو با وہ اتنی جلدی نہیں آتے۔“

عارف کی آواز یاسمین کو کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایس ایم ایس کر کے اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ اب یہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہو سکتا تھا۔

”عدیلہ! عارف کے لہجے میں اس مرتبہ کچھ افسردگی تھی۔“ کیا تمہیں اس بات سے ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی کہ میں اس شادی سے بچ گیا۔“

یاسمین نے طویل سانس لی۔ ”اب دیکھنا ہو گا کہ تم اس شادی سے بچ سکو گے یا نہیں۔“

”اب کیوں نہیں بچ سکوں گا.....! اب تو جواز ہے میرے پاس..... میں ڈیڈی سے کہہ سکتا ہوں کہ جب وہ لڑکی خود ہی مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تو میں زبردستی اس سے شادی کیوں کروں۔“

یاسمین جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ ریشماں تیزی سے دروازہ کھولتی ہوئی اندر آئی، پھر یاسمین کو موبائل پر کسی سے بات کرتے دیکھ کر خشک جانے والے انداز میں دروازے کے قریب ہی رک گئی۔

”کوئی آگیا ہے۔ میں تم سے بعد میں بات کروں گی۔“ یاسمین نے دھیمی آواز میں کہا کہ رابطہ منقطع کیا اور

شکستہ گویا

تو تم پہلے ہی سے سوچ لو کوئی بہانہ.....“

”چل تو سہی! دیکھتی ہوں کیا بات ہے۔“

ریشماں ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا کر اس کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ یاسمین محسوس کر رہی تھی کہ اس کے قدم بوکھل ہو رہے تھے۔ اس کی کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ اگر وہی بات ہوئی جس کا اسے خیال آیا تھا تو اب وہ کیا کہہ سکے گی۔

جب وہ دونوں الماس نادر کے کمرے میں داخل ہوئیں تو یاسمین کی نظر فوری طور پر ماہر پر پڑی۔

ماما نجیب خان الماس نادر سے دو چار سال چھوٹا تھا۔ اس کا قد خاصا نکلتا ہوا تھا۔ چوڑے پانچوں کا پاجامہ، شیردانی، سلیم شامی جوتی اور سر پر قرآنی ٹوپی میں وہ ٹھیک مشرقی شخص نظر آتا تھا۔ اسلام آباد میں لوگ اسے نواب زادہ نجیب خان کے نام سے جانتے تھے اور مشہور تھا کہ وہ رام پور کے نواب کی فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔

وہ اس وقت بھی نبل رہا تھا۔ الماس نادر بیٹھی ہوئی اس طرح اپنی پیشانی سہلارہی تھی جیسے سر میں درد ہو لیکن یاسمین کو دیکھتے ہی وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور یاسمین کو گھورنے لگی۔ نجیب خان بھی غلطے غلطے رک کر یاسمین کی طرف دیکھنے لگا۔

ریشماں کچھ گہرائے ہوئے سے انداز میں بولی۔

”کیا میں جاؤں گی؟“

”ضروری نہیں! تمہاری موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ الماس نادر نے کہا، پھر یاسمین کو گھورتی ہوئی بولی۔ ”کیا میں تمہیں پاگل سمجھ لوں؟“

یاسمین خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”یہ دیکھو!“ الماس نادر نے اپنا موبائل فون اس کی طرف بڑھایا۔

یاسمین کو چند قدم آگے بڑھ کر موبائل لینا پڑا۔

”کیا ہے؟“ اس نے موبائل لیے ہوئے پوچھا تھا۔

”خود دیکھ لو، کیا ہے اسکرین پر!“

الماس نادر کے بولنے سے پہلے ہی یاسمین کی نظر موبائل اسکرین پر پڑی اور اسے اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی۔

اسکرین پر اسی ایس ایم ایس کی ابتدائی سطریں دکھائی دے رہی تھیں جو اس نے عارف کو بھیجا تھا۔

”رانی بیگم کو عارف کے والد نے فون کیا تھا اور یہ ایس ایم ایس بھی بھیجا تھا۔“ الماس نادر ترش لہجے میں بولی۔

”رانی بیگم نے مجھے فون کیا اور یہ ایس ایم ایس بھی بھیج دیا۔“

سوالیہ نظروں سے ریشماں کی طرف دیکھا۔

”مہی بلا رہی ہیں تمہیں!“ ریشماں نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”تو اتنی پریشان کیوں نظر آ رہی ہو!“ یاسمین کھڑی ہوئی ہوئی بولی۔

”باجی!“ ریشماں غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم نے کوئی ایسی حرکت کی ہے کیا باجی کہ مجھے غصہ آئے۔“

یاسمین کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے خیال آیا تھا کہیں ایسا تو نہیں کہ عارف کے والد نے اس کی می سے بات کی ہو اور انہیں وہ ایس ایم ایس بھیج دیا ہو جو اس نے عارف کو بھیجا تھا؟

”نہیں تو.....!“ یاسمین یہ مشکل بول سکی۔ ”مجھے کچھ نہیں معلوم کہ میری کیا بات بری لگی ہوگی۔“

”جانے کیا بات ہے پھر!“ ریشماں اٹھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”وہ بھی غصے میں ہیں اور ماہر بھی.....“

”ماما!“ یاسمین چونکی۔

”ہاں.....“ ریشماں نے جواب دیا۔ ”ابھی چند منٹ پہلے تو آئے ہیں اسلام آباد سے.....! میں اس وقت برآمدہ میں تھی۔ بالکل ٹھیک موڈ تھا اس وقت ان کا۔ مجھ سے دو ایک باتیں کر کے وہ می کے کمرے کی طرف چلے گئے۔“ ریشماں نے اپنی بات دہرائی، پھر بولی۔ ”میں اس وقت مالی کولان کے پودوں کے بارے میں کچھ سمجھا رہی تھی۔ اس سے باتیں کر کے میں می کے کمرے کی طرف گئی کہ ماما سے باتیں کروں۔ میں نے وہاں قدم رکھا ہی تھا کہ می نے مجھ سے کہا۔ ”اچھا ہوا تم آگئیں، ذرا بلا کے تولاؤ اسے، اپنی باجی کو.....!“ ان کے بچہ سے غصہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ یہی حالت ماما کی تھی، وہ تو غصے میں نبل رہے تھے۔ جانے کیا بات ہوئی ہے کہ وہ انہوں نے شاید ماما کو بھی بتائی اور انہیں بھی غصہ آگیا۔ میں ابھی کہہ چکی ہوں باجی کہ وہ جب آئے تھے تو بالکل ٹھیک تھے۔ مجھ سے ہنس کر بات کی تھی۔ می کے کمرے میں جانے کے بعد پتا نہیں کیا ہوا۔“

”چلو۔“ یاسمین نے آہستہ سے کہا اور دروازے کی طرف قدم بھی اٹھائے۔

”سوچ لو باجی!“ ریشماں بولی۔

”کیا سوچ لوں؟“

”اگر تم نے کوئی ایسی بات کی ہے جومی کو بری لگی ہے

عارف کو یہ ایس ایم ایس اسی نمبر سے بھیجا گیا ہے جو تم اسلام آباد سے مجھے فون کرتے ہوئے استعمال کیا کرتی تھیں۔“

یاسمین خاموش کھڑی رہ گئی۔

”تمہارا وہ موبائل کہاں ہے؟“ الماس نادر نے پوچھا۔

یاسمین کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بہ مشکل بول سکی۔ ”میرے کمرے میں۔“

”جاؤ!“ الماس نادر نے ریشماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کے کمرے سے وہ موبائل لے کر آؤ۔“

ریشماں دروازے کی طرف مڑنے ہی والی تھی کہ یاسمین بول پڑی۔ ”کیا کریں گی وہ گنگوا کئی؟“

”اگر تم نے یہ ایس ایم ایس اپنے موبائل سے اڑایا نہیں ہے تو وہ اب بھی موجود ہوگا اس میں!“

”جی ہاں۔“ یاسمین نظریں جھکائے ہوئے بولی۔

”وہ ہے اس میں۔“

”کیوں؟“ الماس نادر نے کڑے تیور کے ساتھ کہا۔ ”تم تو اس سے محبت کرتی ہو۔۔۔۔۔۔ جب تمہیں یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ تمہاری شادی اسی سے جاری ہے تو تم اس کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ ریشماں نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری کیا حالت تھی۔“

یاسمین چپ رہی۔

”جواب کیوں نہیں دیتیں!“ نجیب خان لکا لکا کرچا۔

یاسمین سہمی گئی۔ وہ نجیب خان سے بہت ڈرتی تھی۔

”میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی ماما!“ یاسمین کی آواز میں لرزش تھی۔

”کیوں؟“ نجیب خان اس مرتبہ حیرت سے بولا۔

”اس سے محبت کرتی ہو لیکن اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

”جی ماما!“ یاسمین کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

”کیا عارف اس بات سے پریشان نہیں کہ تم اس سے محبت کرنے کے باوجود اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔۔۔۔۔۔ کیا تمہاری محبت ایک طرف ہے؟۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، کیا عارف تمہیں نہیں چاہتا؟ تمہارا جو یہ ایس ایم ایس ہے، یعنی جو تم نے عارف کو بھیجا، اس سے بھی شہہ ہوتا ہے جیسے عارف تم سے واقف نہیں۔“

”جی ہاں۔ مجھ سے واقف نہیں ہے وہ۔“ یاسمین کا یہ جواب ایک اعتبار سے سچ ہی تھا۔ عارف اسے عدیلہ کے نام سے جانتا تھا۔

نجیب خان کی ان باتوں کے دوران میں الماس نادر جو خاموش رہی تھی، لکا لکا کر بول اٹھی۔ ”ریشماں نے مجھے بتایا تھا کہ تم اس کی تصویر دیکھ کر رو رہی تھیں اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ کاش تم اس سے نہ ملے ہو تھیں۔ کیوں ریشماں!“

”جی۔“ ریشماں نے آہستہ سے کہا۔ وہ پریشان سی ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔

الماس نادر پھر یاسمین کو گھورنے لگی۔ نجیب خان کی نظریں بھی یاسمین پر جمی ہوئی تھیں۔

یاسمین بولی۔ ”اس سے میری ملاقات ایک کینے میں ہوئی تھی۔ میں نے اس سے آؤگراف لیا تھا۔ اس سے ایک مراح کی حیثیت سے ملی تھی۔“

”اس کے بعد بھی نہیں ملیں؟“

”نہیں ہوں۔“

”ابھی تم نے کہا تھا کہ۔“ نجیب خان بول پڑا۔

”عارف تم سے واقف نہیں۔“

”وہ مجھے یاسمین کے نام سے نہیں جانتا۔“

”کیا مطلب؟“

”میں نے اسے اپنا نام عدیلہ بتایا تھا۔ وہ مجھے عدیلہ کے نام سے جانتا ہے۔“

”کیوں؟“ الماس نادر چونک کر بولی۔

”پہلی بار ملی تھی اس سے۔۔۔۔۔۔! مناسب نہیں سمجھا تھا کہ اسے اپنا اصلی نام بتاؤں۔ پھر بعد کی ملاقاتوں میں مجھے ہمت نہیں ہوئی کہ اسے اپنی غلط بیانی کے بارے میں بتاؤں۔“

”کیا تم سے۔۔۔۔۔۔ یعنی عدیلہ سے بھی محبت نہیں کرتا؟“

اب جانے کیوں یاسمین کے لیے جھوٹ بولنا مشکل ہو گیا تھا۔ ”کرتا ہے۔“ وہ یہ مشکل بول سکی۔

”لیکن یاسمین نامی لڑکی سے بھی شادی کے لیے تیار ہو گیا۔۔۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ تیار نہ ہوتا تو اس کے باپ کو یہ بات چھپانے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔“

”وہ اس شادی کو ٹال سکتا ہے اگر میں۔۔۔۔۔۔ یعنی عدیلہ اس سے شادی کے لیے آمادہ ہو جائے۔“

”تو تم آمادہ کیوں نہیں ہو؟“

”میں اس سے محبت کرتی ہوں۔“ یاسمین لرزیدہ آواز میں بولی۔ ”میں اسے دھوکا نہیں دینا چاہتی۔“

”کیسا دھوکا؟“

”میں نے اسے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

”آئندہ بھی نہ بتانا۔۔۔۔۔۔“

”وہ جان لے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ شادی کے بعد

کوئی مرد۔۔۔۔۔۔“

”اس کی پروا مت کرو تم!“ الماس نادر بول پڑی۔

”اس کا بندوبست ہو جائے گا۔“

”میرے ضمیر میں تو کھٹک رہے گی۔“ یاسمین دہلی زبان سے بولی۔

”نیو اس مت کرو۔“ نجیب خان پھر گرچا۔ ”تمہاری شادی اسی سے ہوگی۔ فضول قسم کی دلیلیں مت دو۔“ پھر وہ الماس نادر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم رانی بیگم کو فون کر کے اسے کہہ دو کہ وہ ایس ایم ایس یاسمین نے نہیں بھیجا تھا۔ یہ اس کی ایک دوست کی شرارت ہے۔ یاسمین کو اس شادی سے انکار نہیں۔“ اس کے بعد وہ پھر یاسمین سے مخاطب ہوا۔ ”اب تم جاؤ، یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دو کہ تم اس سے شادی نہیں کرو گی۔ اگر تم چاہو تو اس سے ملاقات کر کے اسے بتا دو کہ تم عدیلہ نہیں، یاسمین ہی ہو اور اگر نہ بتانا چاہو تو بھی کوئی حرج نہیں۔ شادی کے بعد جب وہ یاسمین کے بجائے عدیلہ کو دیکھے گا تو حیران رہ جائے گا۔ اسے خوشی بھی ہوگی اور۔۔۔۔۔۔ اچھا خبر! اب تم جاؤ اور تم رانی بیگم کو فون کر دو الماس!“ وہ عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود الماس نادر کو اس کے نام ہی سے مخاطب کرتا تھا۔

یاسمین رو ہنسی ہو گئی تھی۔ اسی کیفیت میں وہ اپنے کمرے سے نکلی۔ اس کے پیچھے ریشماں بھی نکل آئی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبی ہوئی تھیں۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے آئینے سے اپنی آنکھیں خشک کیں۔

اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ریشماں اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

”تم جاؤ ریشماں!“ اس نے پلٹ کر ریشماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اس وقت تمہاری چاہتی ہوں۔ پلیز!“

”لیکن باجی، میں تم سے اسی معاملے میں تو باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ آخر تم۔۔۔۔۔۔“

”پلیز!“ یاسمین نے اس کی بات کاٹی۔ ”وہ پھر کسی وقت کر لیتا۔ اس وقت مجھے ایلا چھوڑ دو۔ میرا دماغ چکرا رہا ہے۔“

”اچھا باجی!“ ریشماں نے ٹھنڈی سانس لی۔

یاسمین نے اس کے واپس جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سی تو مڑ کر دروازہ بند کیا وہ کھوٹی کھوٹی سی اپنے بستر کی طرف بڑھی۔ بستر پر لیٹ کر وہ چھت کو تکتے لگی۔ وہ چند لمحوں میں بالکل بدل گئی تھی۔ کہاں تو کمرے میں داخل ہوتے وقت اس کی آنکھیں ڈبڈبی ہوئی تھیں لیکن پھر اسے جانے

کیا خیال آیا تھا کہ یکا یک اس کا چہرہ بالکل سیاہ ہو گیا تھا۔ ہر قسم کے تاثرات سے عاری، جیسے وہ پتھر اگئی ہو۔

ایک ڈیڑھ گھنٹا اس طرح گزر گیا کہ وہ بستر پر لیٹی چھت کو تکتی رہی۔ اس عرصے میں اس کی پلکیں بھی معمول سے کم جھپکیں۔ بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکراتے رہے تھے۔ آخر اس کے جسم نے حرکت کی۔ اس نے اپنا دوسرا موبائل فون اٹھا یا جس سے وہ عارف کو ایک مرتبہ ایس ایم ایس کر چکی تھی۔

اب وہ ایک اور ایس ایم ایس کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ٹائپ کرنا شروع کیا۔

”عارف صاحب!۔۔۔۔۔۔ میں، یاسمین آپ سے ایک بار پھر مخاطب ہو رہی ہوں۔ مجھے بالکل خیال نہیں تھا کہ میں نے آپ کو جو ایس ایم ایس بھیجا تھا، وہ آپ کی ذات تک محدود نہیں رہے گا۔ وہ سب کچھ میری والدہ تک پہنچ گیا۔ میں بڑی مشکل میں پھنس گئی۔ میں نے کہا تھا کہ میں ایک لڑکی ہوں، شادی سے انکار کی ہمت نہیں کر سکتی۔ مجبوراً مجھے یہ بھانہ بنانا پڑا کہ میرا موبائل کچھ دیر کے لیے میری ایک دوست کے پاس رہا تھا۔ وہ ایس ایم ایس بھیجتا اس کی شرارت ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بات آپ تک پہنچ گئی ہو۔ اگر نہیں پہنچی تو جلد ہی پہنچ جائے گی۔ میں چاہتی ہوں کہ انکار آپ ہی کی طرف سے ہو۔ اب میں مجبور ہو گئی ہوں کہ آپ سے مل کر آپ کو بتا دوں کہ میں شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی۔ کل آپ مجھ سے مل لیجئے۔ میری درخواست ہے کہ یہ ایس ایم ایس آپ اپنی ذات تک محدود رکھیے گا۔ مجھ سے ملنے کے بعد آپ کو اختیار ہوگا کہ آپ کو کیا قدم اٹھانا چاہیے۔“

یہ تحریر ٹائپ کرنے کے بعد یاسمین نے اسے دوسرے مرتبہ پڑھا۔ پھر اس میں اضافہ کیا کہ دوسرے دن کس وقت اور کس جگہ ملاقات ہوگی۔

عارف کو یہ ایس ایم ایس کرنے کے بعد اسے یہ پریشانی لاحق نہیں تھی کہ عارف اس کے بارے میں بھی اپنے والد کو بتا دے گا۔ اس کی وجہ اس کے ذہن میں تھی وہ سامنے بھی آگئی۔ اس کے اس موبائل کی کھنٹی بجنے لگی جس کا نمبر عارف کے علم میں تھا۔ یاسمین نے وہ فون اٹھا یا۔ کال واقعی عارف کی تھی۔ یاسمین کو یہی یقین تھا کہ وہ ایس ایم ایس ملنے کے بعد عارف فوری طور پر اسی کو فون کرے گا۔

”ہاں عارف!“ یاسمین نے موبائل کان سے لگا کر کہا۔

ریٹورنٹ کے سامنے پارک ہو چکی تھی لیکن اس نے کار سے اترنے میں تین منٹ لگا دیے۔ پھر کار سے اتر کر ریٹورنٹ کی طرف بڑھی جو ادھر پر منزل پر تھا۔ وہ عارف کے مزاج کو جانتی تھی اس لیے اسے یقین تھا کہ عارف وقت سے پہلے ہی ریٹورنٹ پہنچ چکا ہوگا۔

اس کا یقین درست ثابت ہوا۔

”تم!“ عارف اسے دیکھ کر چونک پڑا۔

”ہاں۔“ یاسمین اپنا دہشتی بیگ گود میں رکھتے ہوئے عارف کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تمہیں نہیں آتا چاہے قاعدہ یہ!“ عارف پہلو بدل کر بولا۔ ”دعمن ہے کہ وہ تمہارے سامنے مجھ سے بات نہ کرنا چاہے اور تمہیں دیکھ کر واپس لوٹ جائے۔“

”اکیسی صورت میں وہ تمہیں ایس ایم ایس ضرور کرے گی۔ اگر ایسا ہوا تو میں چلی جاؤں گی۔“ یاسمین نے اپنی گود میں رکھا ہوا دہشتی بیگ کھولتے ہوئے کہا۔

”لیکن۔“ عارف بولا۔ ”تم نے اس وقت آنا کیوں ضروری سمجھا؟“

”اکیسی بتاتی ہوں۔“ یاسمین نے جواب دیتے ہوئے دہشتی بیگ سے اپنا وہ موبائل نکالا جس سے وہ عارف کو ایس ایم ایس کرتی رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ گود میں ہی رکھے تاکہ عارف وہ موبائل نہ دیکھ سکے۔

عارف ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

یاسمین نے ایس ایم ایس ٹائپ کیا۔ ”عارف!..... میں یعنی یاسمین تمہارے سامنے بیٹھی ہوئی ہوں۔“

یہ ایس ایم ایس اس نے عارف کے موبائل پر بھیجے کے بعد اپنا موبائل دہشتی بیگ میں رکھا اور سیدھی ہو کر عارف کی طرف دیکھنے لگی جو اس وقت اپنی کلائی پر بندھی ہوئی کھڑی میں وقت دیکھ رہا تھا۔

”تین منٹ زیادہ ہو گئے۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”وہ ضرور تمہیں دیکھ کر واپس چلی گئی ہوگی۔“

اسی وقت عارف کی جیب میں پڑے ہوئے موبائل کی ”سیج ٹون“ سنائی دی۔ عارف نے جلدی سے موبائل نکالا اور اس کی اسکرین پر نظر ڈال کر یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے بولا۔ ”اس کا ایس ایم ایس ہے، میں نے کہا تھا نا کہ وہ تمہیں دیکھ کر واپس چلی گئی ہوگی۔“

”کوئی لڑکی یہاں آئی ہوئی دکھائی تو نہیں دی۔ تم دیکھو تو، اس نے کیا میسج کیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے یاسمین کی

ابھی، ایک کھٹے کے اندر اندر مل لو، اسی جگہ جو تم نے تجویز کی ہے، میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اگر تم نہیں آئیں تو میرے لیے مشکل ہوگا کہ یہ ایس ایم ایس اپنی ذات تک محدود رکھوں۔“

یاسمین نے پیغام پڑھنے کے بعد عارف کو یہ ایس ایم ایس بھیجا۔

”اچھا! میں ایک کھٹے میں پہنچ جاؤں گی۔ میں آپ کو پہچانتی ہوں اس لیے آپ کی میز تک پہنچنا میرے لیے مشکل نہیں ہوگا۔“

یاسمین نے ملاقات کے لیے ایک ایسے ریٹورنٹ کا نام تجویز کیا تھا جہاں بہت کم لوگ جاتے تھے حالانکہ وہ ریٹورنٹ برائیں تھا۔

وہاں پہنچنے میں یاسمین کو آدھے کھٹے سے زیادہ نہیں لگتا اس لیے وہ فوراً بستر سے نہیں اٹھی۔ اس کے چہرے سے اب قدرے پریشانی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اس نے دوسرے دن تک کی مہلت اس لیے چاہی تھی کہ عارف کو سب کچھ بتانے کے لیے خود کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کر سکے۔ جو کچھ اسے بتانا تھا، وہ زبان پر لانا اس کے لیے آسان نہیں تھا لیکن وہ اس خیال سے فوراً اٹھنے پر آمادہ ہوئی تھی کہ عارف واقعی دوسرے دن تک ضبط نہیں کر پاتا اور ایس ایم ایس کی بات اس کے ڈیڈی سے ہوتی ہوئی الماس نادر تک پہنچ جاتی۔

باتھ روم میں جا کر یاسمین نے منہ پر پانی کے چھپکے بارے۔ اس طرح وہ خود کو تازہ دم کرنا چاہتی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ کر اس نے اپنا میک اپ بھی درست کیا، پھر اپنے کمرے سے نکلی۔

ریشماں اپنے کمرے میں تھی۔ یاسمین نے وہاں جا کر اس سے کہا۔ ”میری دوست کی طبیعت پھر کچھ زیادہ خراب ہوئی ہے۔ اس کی بہن کا فون آیا تھا ابھی!..... میں اسی کے گھر جا رہی ہوں، می کو بتا دینا۔“

”اچھا۔“ ریشماں نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

یاسمین مڑی اور تیزی سے چلتی ہوئی پٹیلے سے نکل آئی۔ وہ اس وقت الماس نادر یا نجیب خان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ عارف سے بات کرنے کے لیے اپنی ہمت جمع کرنے میں کوشاں رہی۔ طے شدہ وقت سے پانچ منٹ پہلے ہی اس کی کار

اچھی بات یہی ہوگی کہ پہلے تم اس سے مل لو۔ جان تو لو کہ وہ بے چاری آخر کس مصیبت میں گرفتار ہے۔“

”تمہارے اس مشورے سے میں ایک ہی مطلب اخذ کر سکتا ہوں۔“

”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تم کیا مطلب اخذ کر سکتے ہو۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ مجھے جس عارف سے محبت ہے، وہ ایک اچھا انسان ہونے کا ثبوت دے۔ اس لڑکی نے تم سے درخواست کی ہے، التجا کی ہے، اسے نظر انداز کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہوگی عارف!“

عارف نے جواب میں فوراً کچھ نہیں کہا۔ یاسمین نے ایسی آواز سی جیسے عارف نے ایک طویل سانس لی ہو۔

”کیا میں کچھ غلط کہہ رہی ہوں عارف؟“ یاسمین بولی۔ ”چھوڑو اس بحث کو..... میں کل لیتا ہوں اس سے..... اس کے بعد ہی فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے بلکہ میں ابھی اسے فون کرتا ہوں۔ کل تک انجمن میں پڑا رہوں گا۔ اگر وہ مجھ سے آج ہی مل لے تو بہتر ہوگا۔ کل تک کی انجمن سے توجہ جاؤں گا۔“

”اگر تم آج ہی ملنا چاہتے ہو تو مجھے ایس ایم ایس ہی کرو۔ وہ تم سے بات کرنے میں پہنچا ہوا محسوس کر رہی ہوگی، ورنہ ایس ایم ایس کیوں بھیجتی، فون کر لیتی تھیں!“

”کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ اگر اس نے کال ریسیو نہیں کی تو پھر ایس ایم ایس ہی کروں گا۔“

”ایسا کرو۔“

”اس سے بات کر کے میں تمہیں پھر فون کروں گا۔“

”اچھا۔“

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

یاسمین انتظار کرنے لگی۔ جلد ہی اس کے دوسرے موبائل کی کھٹنی بجی۔ یاسمین کو یقین تھا کہ کال عارف ہی کی ہوگی، تاہم اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ اسکرین پر عارف ہی کا نمبر تھا۔ یاسمین نے کئی گھنٹیاں بچنے کے باوجود کال ریسیو نہیں کی۔

آخر گھنٹیاں بجنا بند ہو گئیں۔ پھر کچھ وقفے سے ایس ایم ایس آیا۔

عارف نے لکھا تھا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ تم مجھ سے بات کرتے ہوئے کیوں پہنچا رہی ہو۔ خیر!..... میں تمہاری یہ بات مان رہا ہوں کہ تم سے ملاقات کرنے تک یہ ایس ایم ایس اپنی ذات تک محدود رکھوں لیکن کل تک انجمن میں پڑے رہنا میرے لیے مشکل ہوگا۔ تم مجھ سے

”عجیب صورت حال بن رہی ہے۔“ دوسری طرف سے عارف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”اب کیا ہوا؟“ یاسمین نے ساٹ لہجے میں پوچھا۔

”میں تمہیں تفصیل بتانے کے بجائے وہ دوسرا ایس ایم ایس تمہیں بھیج دیتا ہوں جو یاسمین نے مجھے ابھی ابھی بھیجا ہے۔ اس سے تم خود ساری بات سمجھ لو گی۔“

”پھر آیا ہے ایس ایم ایس؟“ یاسمین نے سادگی سے پوچھا۔

”ہاں، وہ میں بھیج رہا ہوں تمہیں۔ وہ پڑھنے کے بعد تم مجھے فون کرنا۔ میں تم سے اس بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

یاسمین کے کچھ بولنے سے پہلے ہی دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جا چکا تھا۔ یاسمین نے بھی اپنا موبائل بند کیا اور انتظار کرنے لگی۔ اس کا چہرہ اب بھی ساٹ تھا۔

جلد ہی اس کے موبائل پر وہ ایس ایم ایس آ گیا جو اس نے عارف کو بھیجا تھا۔

ایک منٹ بعد اس نے عارف کے موبائل.... رابطہ کیا۔

”پڑھ لیا؟“ عارف نے بے تابی سے پوچھا تھا۔

”ہاں۔“ یاسمین نے کہا۔ ”جائے کیوں نہیں چاہتی یہ لڑکی تم سے شادی کرنا..... بات میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی ہے۔“

”وہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی ہے لیکن اب کام بن جائے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”میں تم سے کہہ چکا ہوں نا کہ میں خود اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اب مجھے ڈیڈی سے بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔ میں ان سے کہہ سکتا ہوں کہ جو لڑکی شادی سے پہلے ہی مجھ سے اس قسم کا لچر مذاق کر رہی ہو، اس سے میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔“

”یعنی تم یہ ایس ایم ایس بھی اپنے ڈیڈی کو.....“

”ہاں۔“ عارف نے بات کا تھتے ہوئے کہا۔ ”یہ مجھے بہت اچھا موقع مل گیا ہے۔“

”مجھے افسوس ہوگا اگر تم نے ایسا کیا۔“

”کیوں؟“ عارف کے لہجے میں حیرت تھی۔

”وہ بے چاری نہ جانے کس پتا میں گرفتار ہے۔ تمہیں اس سے ہمدردی ہونا چاہیے۔ وہ تم سے ایک مرتبہ ملنا چاہتی ہے۔ مل لو گے تو کیا فرق پڑے گا.....؟ ملنے کے بعد بھی تم جو چاہو، کر سکتے ہو۔ اپنی مرضی کے مالک ہو تم! لیکن

آواز میں لرزش آگئی تھی۔

عارف نے ایس ایم ایس پڑھا۔ عبارت مختصر تھی۔ عارف نے چونک کر یاسمین کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر بھی تھا۔

”کیا مطلب!“ اس کے منہ سے نکلا۔ ”یاسمین کا ایس ایم ایس یہ ہے کہ وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔“
”ہاں۔“ یاسمین نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ”ایس ایم ایس میں کچھ غلط نہیں ہے۔“
”لیکن..... لیکن.....“ عارف ہلکانے سا لگا۔
”میرے سامنے تو تم بیٹھی ہو۔“

”میں ہی یاسمین ہوں۔“ اس مرتبہ یاسمین نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے معاف کر دینا عارف!..... میں نے تمہیں غلط نام بتایا تھا اپنا..... میرا نام عدیلہ نہیں، یاسمین ہے۔“
عارف ہولقوں کی طرح اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

”کیفے میں ہماری وہ پہلی ملاقات..... یاد ہے نا!“
یاسمین نے نظریں جھکا لیں۔ ”جب تم نے آٹو گراف دینے کے لیے میرا نام پوچھا تھا تو کیا ایک میرے دماغ میں خیال آیا کہ مجھے پہلی ہی ملاقات میں کسی مرد کو اپنا نام نہیں بتانا چاہیے۔ آٹو گراف لینے کا مقصد تو یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے نام پرایا جائے مگر جب میرے دماغ میں یہ خیال آیا تو میں بے اختیار تمہیں ایک غلط نام بتا بیٹھی۔ فوری طور پر وہی نام میرے ذہن میں ابھرا تھا۔“

عارف اب بھی کچھ نہیں بول سکا۔ وہ اب بھی یاسمین کو اس طرح تنکے جارہا تھا جیسے اس کے سامنے کوئی عجوبہ ہو۔
یاسمین نے ایک بار نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا دیا۔ ”لیکن جب تم سے باتیں شروع ہوئیں تو ملاقات ختم ہونے تک مجھے احساس ہو چکا تھا کہ غلط نام بتا کر میں نے غلطی کی ہے۔ اس احساس ہی کی وجہ سے میں نے تمہیں اپنا موبائل نمبر غلط نہیں بتایا۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ بعد میں تمہیں بھی کسی وقت اپنی غلطی کے بارے میں بتا دوں گی لیکن بعد میں یہ ہوا کہ میں تذبذب کا شکار ہو گئی۔ بار بار یہ خیال ذہن میں آ جاتا تھا کہ جب میں تمہیں یہ بات بتاؤں گی تو میرے بارے میں تم نے جانے کیا سوچو۔ اس تذبذب میں زیادہ دن گزر گئے اور پھر میں نے فیصلہ کیا کہ تم سے اپنے تعلق کو عدیلہ ہی کے نام سے چلنے دیا جائے۔“

عارف اب بھی خاموش رہا۔ ان باتوں نے یقیناً اس کو دماغی طور پر اتنا پکڑا دیا تھا کہ اسی کی طرح شاید اس کی زبان بھی پتھرا سی گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا کہ وہ

ان باتوں پر اپنا رد عمل کن الفاظ میں ظاہر کرے۔

”تم کچھ نہیں بولو گے عارف!“ یاسمین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس مرتبہ اس کی آواز کچھ بھراکتی تھی۔
عارف کے ہونٹ پہلے تو لرزے، پھر وہ بدقت بول سکا۔ ”میں..... میں کیا بولوں۔“ اس کا لہجہ سوالیہ نہیں تھا۔
ایسا معلوم ہوا تھا جیسے اس نے جو کچھ کہا تھا، خود سے کہا تھا۔
یاسمین افسردہ سی مسکرائی۔ ”مجھے برا بھلا ہی کہو۔“
عارف کے ہونٹ پھر لرزے اور اس مرتبہ لرزہ زدن ہی رہ گئے۔ وہ کچھ بول نہیں سکا۔ یاسمین نے پھر نظریں جھکا لیں۔
اب اس کے چہرے پر اپنا تاثر تھا جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔

اس وقت دیران کے قریب آ گیا۔ پہلے تو اس بے چارے نے انتظار ہی کیا کیا ہوگا کہ اسے قریب آنے کا اشارہ کیا جائے۔

عارف نے اس سے جانے لانے کے لیے کہا لیکن اس طرح جیسے اسے خود بھی معلوم نہ ہو کہ اس نے ویٹر سے کیا کہا تھا۔

یاسمین سر جھکائے ہوئے بولی۔ ”میں تمہانوں میں رو یا کرتی تھی عارف کہ مجھے تم سے محبت تو ہو گئی ہے لیکن میں تم سے شادی نہیں کر سکوں گی۔ پھر چانک مجھے معلوم ہوا کہ ممی کسی سے میری شادی طے کر رہی ہیں۔ میں نے ان سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ میری شادی کہاں کر رہی ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ اچھا ہے، میری شادی کہیں ہو جائے۔ تم مجھے بے وفا اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے لیکن مجھے وہ سب کچھ قبول تھا۔“

”عدیلہ!“ عارف کے منہ سے بے اختیار وہی نام نکلا جو اسے پہلی مرتبہ بتایا گیا تھا۔ ”یعنی۔“ وہ قدرے رک کر بولا۔ ”میرے علاوہ کسی سے شادی کرنے پر تمہیں کوئی اعتراض.....“

”ہاں۔“ یاسمین نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”کسی اور سے شادی ہونے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ تم سے تو میں اس لیے شادی نہیں کرنا چاہتی کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ کوئی بھی اس شخص کو دھوکا نہیں دے سکتا جس سے وہ محبت کرتا ہو۔“

”دھوکے سے کیا مراد ہے تمہاری!“ دیرے دیرے عارف بولنے کے قابل ہو گیا تھا۔

”وہ..... وہ.....“ یاسمین نے اپنی بات مکمل کیے بغیر پھر نظریں جھکا لیں۔ ”میں..... میں کیا بتاؤں عارف!..... تمہیں کیا بتاؤں کہ مجھ پر اس وقت ایسی قیامت گزر رہی تھی

یاسمین خاموش رہی۔

”چلو اب اٹھیں جہاں سے۔“ عارف پھر بولا۔

یاسمین کچھ کہے بغیر کھڑی ہوئی۔ رینو نوٹ سے باہر نکل کر یاسمین اپنی کار کی طرف بڑھی۔ عارف اس کے ساتھ چلا ہوا بولا۔

”تمہیں کار تک تو چھوڑ دوں۔“

یاسمین اب بھی خاموش رہی۔ کار کے قریب پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا۔ عارف کار کی کھڑکی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ یاسمین نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ اس وقت اس کی پلکیں پھر جھپکنے لگی تھیں مگر اس سے پہلے کہ اس کے آنسو ڈھلک جاتے، وہ کار حرکت میں لائی اور تیزی سے اس کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ اس نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ عارف جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا اس کی کار کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ یاسمین کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دو آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھر پہنچی۔ اس دوران میں اس نے اپنے جذبات پر قابو پایا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر کا کوئی فرد اس کی بیٹکی ہوئی آنکھیں دیکھے۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ وہی لاؤنج سے ریشماں نکلی۔ ”دیکھ آئیں اپنی دوست کو باجی..... کیسی ہے اب؟“

”ٹھیک ہو جائے گی۔ زیادہ تشویش کی بات نہیں ہے۔“

”اسی لیے آتی جلدی واپس آئیں۔“ ریشماں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔

”ہوں۔“

”تم اس وقت بھی پریشان نظر آ رہی ہو۔ کیا اپنی دوست کی وجہ سے ہاؤس شادی کی وجہ سے۔“

یاسمین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ ریشماں اب بھی اس کے ساتھ تھی۔

”کیا بات کرنا چاہتی ہے تو مجھ سے!“ یاسمین بولی۔

”تم اس شادی کی وجہ سے کیوں پریشان ہو باجی

جبکہ تم ان سے محبت بھی کرتی ہو۔“

”اسی لیے پریشان ہوں کہ محبت کرتی ہوں۔ میں

عارف کو دھوکا نہیں دینا چاہتی۔ شادی کے بعد اسے پتا چل

جائے گا۔“

”تمیں پتا چلے گا باجی.....! می نے کہا تو تھا تم

سے..... انہوں نے ڈاکٹر فیروزہ سے بات کر لی ہے۔“

چائے میز پر موجود تھی لیکن اس کا خیال نہ یاسمین کو آیا تھا، نہ عارف کو!

یاسمین نے ایک بار پھر ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں خشک کیں۔ عارف کی طرح اس نے بھی نظریں جھکا لی تھیں۔ وہ اس وقت چونکی جب اس نے برتنوں کی کھٹک سنی۔ اس نے دیکھا کہ عارف چائے بنانے کے لیے

پیالیاں سیدھی کر رہا تھا۔

”میں بناتی ہوں۔“ یاسمین جلدی سے بولی اور

ٹرے اپنی طرف کھکانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا ئے۔

عارف نے اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔

یاسمین نے دونوں پیالیوں میں چائے بنانے کے بعد

ایک پیالی عارف کی طرف بڑھاتی جواب بھی اس کی طرف

نہیں دیکھ رہا تھا اور کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”چائے پیو۔“ یاسمین دسمی آواز میں بولی اور خود بھی

اپنی پیالی اٹھا لی۔

ان دونوں نے چائے اس طرح پی جیسے کوئی فرض

ادا کر رہے ہوں۔ اس دوران میں دونوں ہی خاموش

رہے۔ چائے ختم کرنے کے بعد ویٹر کو اشارہ کیا۔ ویٹر بل

لے آیا۔ عارف نے بل کی اداسگی کی، پھر ویٹر کے جانے

کے بعد یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے جان لیا

کہ تم عدیلہ نہیں، یاسمین ہو، لیکن..... کیا اس ملاقات کا

مقصد اتنا ہی تھا؟“

یاسمین کوئی جواب نہیں دے سکی۔

کچھ خاموشی کے بعد عارف پھر بولا۔ ”ایک بات کہی

تھی تم نے..... کل تک کی مہلت چاہتی تھیں تم!..... کل تک تم

ہمت کر لو کہ مجھے شادی نہ کرنے کی سچ وجہ بتا سکو۔“

”موشش کروں گی مگر ابھی یہ خیال تو تم اپنے داغ

سے نکال ہی دو کہ پہلے کسی سے میری شادی ہو چکی ہے۔“

عارف نے طویل سانس لی۔ ”چلو ٹھیک ہے، نکال

دیتا ہوں یہ خیال اپنے ذہن سے..... میں کل تک تمہارے

جواب کا انتظار کروں گا۔ ہاں ایک خدشہ مجھے ضرور ہے۔ کل

تک تم نے ہمت کر بھی لی تو میرے سامنے آ کر تمہاری ہمت

شاید پھر جواب دے جائے لہذا.....“

”لہذا؟“ یاسمین نے سوالیہ نظروں سے اس کی

طرف دیکھا۔

”کل ہم ملیں گے نہیں۔“ عارف نے کہا۔ ”تم مجھے

فون پر بتا دینا۔ میرا خیال ہے کہ فون پر تمہاری ہمت جواب

نہیں دے گی۔“

کہ..... کہ..... لیکن تم نے آج ہی ملنے کی بات کی۔ تمہاری وجہ سے میں یہ سوچ کر گھر سے چل پڑی تھی کہ ہمت کر لوں گی لیکن..... لیکن..... میں کیسے بتاؤں عارف! مجھے ہمت نہیں ہو رہی ہے۔“

”کیا پہلے کسی سے تمہاری شادی ہو چکی ہے؟“

عارف بول پڑا۔

یاسمین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ خیال

تمہیں کیوں آیا؟“

”سوچتا جو رہا ہوں۔ مسلسل سوچتا رہا ہوں کہ تم مجھ

سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں۔ اب اس وقت یہی بات

ذہن میں آئی۔ تمہیں یہ خیال ہو گا کہ شادی کے بعد مجھے اس

کا علم ہو جائے گا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے اور.....“

عارف کا ایک خاموش ہو گیا۔ اس نے ویٹر کو دیکھ لیا

تھا جو چائے کی ٹرے سنبھالنے کی میز کے قریب آچکا تھا۔

یاسمین کی پلکیں بھی اب جھپکنی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

اس نے جلدی سے اپنا رخ دوسری طرف کیا تاکہ ویٹر اس

کی جھپکی ہوئی آنکھیں نہ دیکھ سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس

نے جلدی سے ٹشو پیپر نکال لیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں

خشک کر لیں۔

ویٹر بڑے رکھ کر چلا گیا۔

”بتاؤ..... عدیلہ..... یاسمین!..... پلیز!.....

بتاؤ!..... میرا خیال صحیح ہے؟ تمہاری کبھی کسی سے شادی

ہو چکی ہے؟“

یاسمین نے اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں

جھکا لیں۔

”پلیز یاسمین!“ عارف بولا۔ ”بتاؤ..... پلیز

بتاؤ!..... کیا یہی بات ہے؟ پہلے کسی تمہاری شادی ہو چکی

ہے؟..... بتاؤ!“

”کیا بتاؤں عارف..... مجھے ہمت نہیں ہو رہی ہے۔

اگر میں تمہاری بات کے جواب میں نہیں کہوں گی تو تم پوچھو

گے کہ پھر کیا بات ہے اور اگر میں کہوں گی تو بھی تم سوالات کر

گے کہ وہ شادی ختم کیوں ہوئی۔ پلیز عارف! یہاں ہوں

میں مجھے اتنا جذباتی نہ کرو کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے

لگوں۔ میں ہمت نہیں کر پا رہی ہوں کہ تمہیں کچھ

بتاؤں..... پلیز!..... پلیز عارف! میں رو پڑوں گی اگر.....“

اس کی آواز بھرا اور اس نے پھر ڈبڈبائے لگے۔

”اچھا!“ عارف نے طویل سانس لی اور پہلی مرتبہ

یاسمین کے چہرے سے نظریں ہٹا کر میز کی طرف دیکھنے لگا۔

جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ میری شادی تمہارے ساتھ طے کی جا رہی ہے۔ میرا داغ جیسے شکل ہو گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ می سے یہ کہنا میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں یہ شادی نہیں کروں گی۔ اسی لیے میں نے تم کو ایس ایم ایس بھیجا۔ میرا خیال تھا کہ تم میری بات مان لو گے اور شاید یہی سوچو کہ یاسمین نامی یہ لڑکی کسی اور سے محبت کرتی ہے اس لیے تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ تم خود بھی میرے علاوہ..... یعنی عدیلہ کے علاوہ کسی سے شادی کے لیے تیار نہیں ہو۔ ایس ایم ایس بھیجنے کا خیال میرے دماغ میں آچکا تھا اور میں کچھ غور کیے بغیر یہ قدم اٹھا بیٹھی تھی۔ اگر میں سوچ جیتی تو یقیناً میری سمجھ میں آ جاتا کہ تم اس شادی سے بچنے کے لیے میرے ایس ایم ایس ہی کا سہارا لو گے، اپنے والد کو دکھا دو گے..... اور اس طرح بات بڑھے گی، میری می تک پہنچے گی اور وہی ہوا۔“ یاسمین نے غصنی سانس لی۔ ”اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں تم سے ملوں، تمہیں بتا دوں کہ میں..... یعنی عدیلہ ہی دراصل یاسمین ہوں اور یہ بھی بتا دوں کہ میں تم سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی جبکہ میں تمہیں اپنی زندگی سے بھی زیادہ چاہتی ہوں۔ تمہاری خاطر اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔“

عارف نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھتے ہوئے مضامین پڑھنے لگے اور بولا۔ ”مگر کیوں؟ کیوں عدیلہ! ہاں! میں اب بھی تمہیں عدیلہ ہی کہوں گا۔ مجھے کچھ وقت لگے گا اپنی یہ عادت چھوڑنے میں!..... مجھے بتاؤ!..... تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟“

”اب لیے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“ یاسمین کی

آنکھوں میں می آگئی۔ ”میں تمہیں دھوکا نہیں دے سکتی۔“

”کیسا دھوکا؟“ عارف نے تیزی سے پوچھا۔

”وہ..... وہ..... دراصل.....“ یاسمین پھر چپ

ہوئی۔

”بتاؤ! پلیز!“ عارف شدید سے شدید تر جذباتی ہوتا

چلا جا رہا تھا۔ ”مجھے ذرا دیر پہلے بھی تم وہ کہ کر کے بات

مثال مٹی تھیں۔ مجھے صاف صاف بتاؤ۔ پلیز!“

”کیسے بتاؤں!“ یاسمین کی آواز اس کے گلے میں

چھپنے لگی۔ ”راستے بھر ہمت جمع کرتی رہی کہ تمہیں بتا دوں

گی لیکن میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اسی لیے میں نے ایس ایم

ایس میں لکھا تھا کہ میں تم سے کل ملوں گی۔ میرا خیال تھا کہ

میں کل تک خود کو اتنا مضبوط کر لوں گی کہ تمہیں بتا سکوں

اس وقت اپنی اچانک طلبی پر عارف کو تعجب ہوا، تاہم وہ کنور شمشاد کے کمرے میں پہنچا اور یہ دیکھ کر چونک گیا کہ وہاں ایک عورت بھی موجود تھی۔ پختہ عمر کی اس عورت نے خود کو اس حد تک ”مین ٹین“ کہا تھا کہ وہ اس عمر میں بھی خاصی دلکش اور پروقار نظر آ رہی تھی۔ عارف کو یہ خیال آیا کہ وہ اس عورت کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی عارف کو یہ بہت عجیب معلوم ہوا تھا کہ وہ عورت اس کے باپ کی خواب گاہ میں تھی اور وہ بھی رات کے وقت!

”یہ رانی بیگم ہیں۔“ کنور شمشاد نے فوراً تعارف کرایا۔ اب عارف کو خیال آیا کہ اس نے رانی بیگم کو اپنے ہی گھر میں دیکھا ہوگا۔ کنور شمشاد نے اسے بتایا تھا کہ وہ نیو ایر کے فنکشنر میں ان کے گھر آیا کرتی تھی اور اسی نے یاسمین سے اس کی شادی بھی طے کرانی تھی۔ گویا وہ کنور شمشاد کی خواتین دوستوں میں سے ایک تھی۔

عارف کو یہ بھی اچھا نہ لگا کہ ایک خاتون دوست کو اس کے باپ نے رات کے وقت اپنی خواب گاہ میں بٹھا رکھا تھا۔

”حیران ہو گئے تم کہ میں نے تمہیں اس وقت کیوں بلایا ہے۔“ کنور شمشاد نے تعارف کرانے کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی۔ ”بیٹھے جاؤ، دراصل رانی بیگم ہی کا اصرار تھا کہ میں جو فرض تمہاری شادی کے بعد ادا کرنا چاہتا تھا، وہ شادی سے پہلے ہی ادا کر دوں۔“

عارف بیٹھ گیا اور اب بھی ہوئی نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھا کہ اس کا باپ اپنا کیا فرض ادا کرنا چاہتا تھا۔ نیز یہ کہ رانی بیگم کی ایسی کیا حیثیت تھی کہ وہ کسی فرض کی ادائیگی کے سلسلے میں اس کے باپ سے اصرار کرے۔

رانی بیگم سے تعارف کے وقت عارف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو خفیہ سی جنبش دی تھی اور جواباً رانی بیگم نے بھی نہ صرف سر ہلایا تھا بلکہ مسکرائی بھی تھی۔

”میں کوئی تمہید نہیں باندھنا چاہتا عارف!“ کنور شمشاد نے عارف کے بیٹھنے ہی کہا تھا۔ ”ابھی چند منٹ کے

اندر اندر میرے کاروبار کے لیگل ایڈوائزر ایڈووکیٹ ظفر علی یہاں آئے والے ہیں۔ میں نے انہیں کل شام ہدایت کر دی تھی اور ایک گھنٹہ قبل انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے کاغذات تیار کر لیے ہیں، تمہیں آج ہی..... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ابھی ان کاغذات پر دستخط کرنا ہیں۔“

اتفاقی طور پر بند ہو گیا ہوگا اس کا موبائل، یا یاسمین نے سوچا۔

پندرہ منٹ بعد اس نے دوسری مرتبہ رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی۔ موبائل پر دستور بند تھا۔ شام ہوتے ہوتے یاسمین نے متعدد کوششیں کر ڈالیں مگر عارف سے بات کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ یہ ایسی صورت حال تھی جس نے یاسمین کو بے حد پریشان کر دیا تھا۔ اب جبکہ وہ عارف کو حقیقت بتانے کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہو گئی تھی تو اس سے رابطہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔

اس سے اگلا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ پھر اس سے اگلا دن بھی اور یاسمین کی پریشانی مسلسل بڑھتی رہی۔ اب دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ عارف سے ملاقات کرے لیکن اسے عارف کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔ وہ ریشماں سے اس بارے میں معلوم کر سکتی تھی لیکن اسے خیال تھا کہ عارف کے سامنے بیٹھ کر اپنی زبان کھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

ایک دن اور گزر گیا۔ عارف کا موبائل پر دستور بندل رہا تھا۔ پھر اس دن اس وقت یاسمین کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی جب اسے ریشماں سے معلوم ہوا کہ شادی کی تاریخ طے پا چکی تھی۔

پانچ دن بعد شادی ہونا تھی۔ اس دن وہ اتنی روٹی جتنا وہ ساری زندگی میں کبھی نہیں روٹی تھی۔



عارف نے اپنا موبائل اس لیے بند کیا تھا کہ وہ شادی نہ کرنے کے سلسلے میں یاسمین کی کوئی وجہ سننے کے لیے اب تیار ہی نہیں تھا۔ وہ کہہ چکی تھی کہ پہلے اس کی کسی سے شادی نہیں ہوئی، لیکن اگر وہ بھی سچی ہوئی تو عارف اسے خاطر میں نہیں لاتا۔ یاسمین سے اس کی محبت اتنی ہی شدید ہو چکی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس سے شادی نہ کرنے کے سلسلے میں یاسمین کا کوئی بھی مسئلہ ہو، وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کچھ بھی کر گزرے گا لیکن شادی یاسمین ہی سے کرے گا۔

اپنا نیا نمبر اس نے صرف اپنے والد کنور شمشاد کو بتایا تھا۔ اس کے باپ نے نمبر بدلنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہہ دیا تھا کہ اس کا پہلا نمبر بہت زیادہ لوگوں کو معلوم ہو چکا ہے اور موبائل کی وقت بے وقت کی گھنٹی اسے بور کر دیتی ہے لہذا

”ڈاکٹر فیروزہ کون؟“
”گائیکو لوجسٹ ہیں۔ وہ سب ٹھیک کر دیں گی۔“
یاسمین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
”ہاں باجی!..... مجی تیار ہی نہیں کہ وہ بہت ماہر ہیں۔“
”یہ بھی تو خود کا دینا ہی ہوگا عارف کو!“
”جب تم ان سے محبت کرتی ہو تو انہیں پانے کے لیے تمہیں اتنا تو کرنا ہی پڑے گا باجی!“
”میں نہیں کر سکتوں گی۔ میں تو چاہتی ہوں کہ عارف کو پہلے ہی سے سب کچھ بتا دوں۔“ یاسمین نے اپنے دل کی بات ریشماں پر اس لیے ظاہر کر دی کہ وہ اس پر بھروسہ کر سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ بات ریشماں کی زبان سے الماس نادریک نہیں پہنچے گی۔
ریشماں چوکی۔ ”انہیں بتانا چاہتی ہو؟“
”ہاں۔“
”پھر تو..... شاید وہ..... شادی نہ کریں تم سے!“
”عارف کو دھوکا دینے سے اچھا ہے کہ میں زندگی بھر اس کے لیے تڑپتی رہوں۔“ یاسمین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ریشماں اس کا منہ کھلتی رہ گئی۔
یاسمین اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لیے بولی۔ ”ماما کہاں ہیں؟“
”اپنے کمرے ہی میں ہوں گے، جب سے آئے ہیں کہیں گئے تو نہیں۔“
گھر میں نجیب خان کے لیے ایک کمر مخصوص تھا۔ وہ جب بھی اسلام آباد سے دو چار دن کے لیے آتا تھا، اسی کمرے میں رہتا تھا۔
”اچھی طرح سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا باجی!“ ریشماں نے کہا اور یاسمین کے جواب کا انتظار کیے بغیر جانے کے لیے اٹھ گئی۔

یاسمین نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس وقت بھی محسوس کر رہی تھی کہ عارف کو حقیقت سے آگاہ کرنا اس کے لیے ایک ٹھن انجان ہے۔
لیکن دوسرے دن دوپہر تک وہ ہمت مجتمع کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اس نے اپنے موبائل پر عارف سے رابطہ کرنا چاہا لیکن اسے عارف کا موبائل بند ملا۔ اسے تعجب ہوا۔ اسے یقین تھا کہ عارف اس کا جواب سننے کے لیے بے چین ہوگا اور اس کے کان اسے اپنے موبائل کی گھنٹی سننے کے لیے بے چین رہیں گے۔

”کیسے کاغذات ڈیڈی!“ عارف حیرت سے بولا۔
 ”میں نے اپنا کاروبار، بلکہ بھی کچھ تمہارے نام
 کر دیا ہے۔ میرا جودانی اکاؤنٹ ہے، وہ بہر حال.....
 ظاہر ہے کہ میرے ہی نام رہے گا لیکن باقی سب کچھ آج
 سے قانونی طور پر تمہارا ہو جائے گا۔“

”اس کی کیا ضرورت تھی ڈیڈی!.....! آپ کا جو کچھ
 ہے، وہ میرے علاوہ کس کا ہو سکتا ہے۔“ عارف باپ کی
 بات سے متعجب ہوا تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں قانونی طور پر تمہارے نام
 سب کچھ اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ اب تمام کاروباری
 معاملات میں تمہارے ہی دستخط ہوں گے۔ صرف دستخط ہی
 نہیں ہوں گے بلکہ اب سارا کاروبار سنبھالنا بھی تمہاری
 ذمہ داری ہوگی۔“

عارف نے فوراً کچھ بولنا چاہا لیکن کنور شمشاد نے
 ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا اور اپنی بات جاری
 رکھی۔ ”اپنے شاعرانہ مزاج کی وجہ سے تمہیں بھی کاروباری
 معاملات سے دلچسپی نہیں رہی اور میں نے تمہی تم پر زور نہیں
 ڈالا کہ تم میرا ہاتھ بناؤ لیکن اس طرح ہمیشہ تو میں چل سکتا
 عارف! میرے بعد تمہی کو سب کچھ دیکھنا ہوگا لہذا.....“

”اب ایسی بات بھی اپنی زبان پر نہ لائیں۔“
 رانی بیگم بول اٹھی۔ ”یہ کہنا کوئی ضروری تو نہیں کہ آپ
 کے بعد۔“

”جی ڈیڈی!“ عارف بھی بول پڑا۔ ”آپ کو یہ کہنے
 کی کیا ضرورت تھی!“

”انسان کو حقیقت سے نظریں نہیں چراتا جائیں۔“
 کنور شمشاد نے کہا۔ ”ہم تینوں ہی میں سے کسی نہ کسی کو کسی
 وقت اس دنیا سے رخصت تو ہونا ہے، خیر.....! میں یہ کہنے
 جا رہا تھا کہ شادی کے بعد تمہی ہنسی مومن کے لیے جہاں چاہو
 چلے جاؤ لیکن واپس آنے کے بعد سارا کاروبار بھی کو سنبھالنا
 ہے۔ میں اب بہت تھک چکا ہوں۔“

”لیکن میں تو کاروبار کی الف ب سے بھی واقف
 نہیں ڈیڈی!“

”تمہیں الف ب سے واقف کرانا میری ذمہ داری
 ہے۔ میں فوری طور پر خود کو الگ تھک نہیں کر لوں گا تمہاری
 رہنمائی کے لیے میں چند ماہ تمہارے ساتھ دفتر جاتا رہوں
 گا۔ بے شک تمہارا مزاج شاعرانہ ہے لیکن تم پڑھے لکھے
 ہو۔ یہ ممکن نہیں کہ تم کاروبار کے طریق جلد ہی نہ سمجھ لو، اور
 پھر یہ کہ..... وہی بات زبان پر آ رہی ہے میرے..... کسی نہ

کسی دن یہ سب کچھ سنبھالنا تو تمہیں ہی پڑیگا۔ اب اس
 معاملے میں تمہیں کوئی بحث چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں
 جو فیصلہ کر چکا ہوں، اس میں اب کسی بھی قسم کی تبدیلی کی کوئی
 گنجائش نہیں ہے۔“

عارف کو چپ ہو جانا پڑا۔
 ”ظفر صاحب! ابھی تک نہیں آئے۔“ کنور شمشاد
 نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز
 میں کہا، پھر وہ عارف کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”ابھی
 وہ نہیں آئے ہیں تو میں ایک بات سے اور آگاہ کر دوں، یہ
 رانی بیگم تمہاری بی بی ہیں۔“

”جی!“ عارف اچھل ہی پڑا۔
 ”ہاں۔“ کنور شمشاد سنجیدہ رہے۔ ”رانی بیگم سے
 میری شادی کو دو سال گزر چکے ہیں۔ اب تک میں نے یہ
 بات مصلحتاً چھپائے رکھی۔ لوگ باتیں بناتے کہ بیٹے کی اب
 تک شادی نہیں کی اور خود شادی کر کے بیٹھ گیا۔ تمہاری
 شادی کے سلسلے میں غلط جگہ اس لیے بھی گئی۔ آخر تک
 یہ بات چھپائے رکھوں..... ویسے اب بھی کچھ دن تو یہ بات
 پوشیدہ ہی رہوں گا۔ یہ سب لوگوں پر افشا میں اس وقت
 کروں گا جب کاروبار تم پوری طرح سنبھال لو گے۔“
 عارف نے رانی بیگم کی طرف دیکھا جو خاموش بیٹھی
 بس مسکرا رہی تھی۔

”اور ہاں!“ کنور شمشاد پھر بولا۔ ”میں نے تمہیں
 غالباً یہ بتایا تھا کہ رانی بیگم کی اپنے سابق شوہر سے ذہنی ہم
 آگئی نہیں ہو سکتی تھی اس لیے دونوں ایک دوسرے سے الگ
 رہنے لگے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی طبعیت کی قانونی
 طور پر ہو چکی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ان سے شادی کیسے
 کر سکتا تھا۔ اب تمہیں ایک بات اور بتا دوں۔“

لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتے، ملازم نے
 آکر اطلاع دی کہ ان کا لیگل ایڈوائزر آگیا ہے جسے
 ڈرائنگ روم میں بٹھادیا گیا ہے۔

”چلو، ہم دونوں وہیں چلتے ہیں۔“ کنور شمشاد نے
 کھڑے ہوتے ہوئے عارف سے کہا۔ پھر رانی بیگم کی
 طرف دیکھا۔ ”تم یہیں روکو.....“

رانی بیگم نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
 عارف اور کنور شمشاد ڈرائنگ روم میں پہنچے۔
 ایڈووکیٹ ظفر کو عارف جانتا بھی تھا۔

کاغذات پر دستخط ہونے کے بعد ایڈووکیٹ نے
 عارف سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”مبارک ہو کہ آج سے

آپ قانونی طور پر بھی اپنے سارے کاروبار وغیرہ کے
 مالک بن گئے ہیں۔“
 عارف مسکرایا لیکن اس کی مسکراہٹ جبری تھی۔
 غیر متوقع طور پر جو کچھ ہوا تھا، اس نے عارف کو خاصا
 الجھنا دیا تھا۔ خاص طور پر ذہنی جھکا اسے اس بات سے لگا تھا
 کہ رانی بیگم اس کی سوتیلی ماں تھی۔

البتہ اس انکشاف سے یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی
 تھی کہ اس کے باپ کو اس کی دوسری شادی پر اعتراض
 کیوں نہیں تھا۔ کنور شمشاد کی یہ تیسری شادی تھی۔ پہلے جو
 ان کی دو شادیاں ہو چکی تھیں اور دوسری شادی ان کی پسند
 کی شادی تھی اور وہ سب کچھ عارف کے علم میں تھا لہذا کنور
 شمشاد اس کی دوسری شادی پر مستعرض ہونے کا کوئی جواز
 ہی نہیں رکھتے تھے۔

ایڈووکیٹ ظفر کو رخصت کرنے کے بعد وہ عارف
 سے بولے۔ ”جاؤ! اب تم آرام کرو۔“
 غالباً وہ بھول ہی گئے تھے کہ عارف کو انہیں کوئی
 دوسری بات بھی بتانا تھی۔ ایڈووکیٹ کی آمد کی اطلاع کے
 باعث ان کی وہ بات ادھوری ہی رہ گئی۔

خود عارف کا ذہن بھی اتنا الجھ گیا تھا کہ اسے بھی کسی
 ”دوسری بات“ کا خیال نہیں آیا۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچ
 کر بستر پر لیٹ گیا۔ رانی بیگم کی وجہ سے تو اس کا ذہن الجھا
 ہوا تھا ہی لیکن اس خیال سے اس پر گھبراہٹ بھی طاری تھی
 کہ اب اسے کاروباری ذمہ داریاں بھی سنبھالنا ہوں گی۔
 دوسری صبح ناشتے کی میز پر اس کے ساتھ صرف کنور
 شمشاد تھا۔ عارف کو اس پر کوئی غصہ نہیں ہوا۔ وہ سمجھ گیا تھا
 کہ رانی بیگم کو کنور شمشاد نے رات ہی کو کسی وقت رخصت
 کر دیا ہوگا۔ خود کنور شمشاد ہی نے کہا تھا کہ ابھی وہ کچھ
 عرصے تک اپنی اس شادی کو منظر عام پر نہیں لانا چاہتا۔
 رانی بیگم کے رہنے کے لیے کنور شمشاد نے اسے
 دوسرا گھر دلایا ہوگا۔

کنور شمشاد ناشتہ کرنے کے بعد دفتر چلا گیا۔ عارف
 اپنے کمرے میں آگیا۔ یاسمین سے ملاقات کے بعد وہ کسی
 دن بھی کمرے نہیں نکلا تھا۔ اپنے کمرے ہی میں پڑا یاسمین
 کے بارے میں سوچتا رہتا یا اس کی شاعری جاری رہتی۔
 اس نے یاسمین اور اپنی محبت پر اچھی خاصی غم کی نظم کہہ ڈالی
 تھی جو وہ شادی کی پہلی رات یاسمین کو سنانا چاہتا تھا۔

اس نے اپنا موبائل بند ہی رکھا۔ یہاں تک کہ شادی
 کا دن آگیا۔ پھر شادی بھی ہو گئی۔ رات گئے وہ یاسمین کو

شکستہ گویا

بیاہ کر گھر لے آیا۔ مہمان رخصت ہوتے رہے۔ اسی
 دوران میں رانی بیگم نے اسے الگ تھک لے جا کر شفقت
 آمیز مسکراہٹ اور لہجے میں کہا۔ ”اب تم اپنے کمرے
 میں جاؤ۔ ذہن کو زیادہ انتظار نہ کرو۔“

عارف خود بھی اپنے کمرے میں جانے کے لیے بے
 چین تھا۔ اس دن اس کے کمرے کی خاص آرائش رانی بیگم
 اور دو تین خواتین نے کی تھی جو کنور شمشاد کی دوست تھیں۔

عارف نے دھڑکنے والے دل کے ساتھ اپنے کمرے کا
 دروازہ کھولا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا موبائل بند ہونے کی
 وجہ سے یاسمین خفا تو ضرور ہوگی لیکن اسے یہ اطمینان بھی تھا
 کہ وہ اسے متا لے گا۔

بستر پر یاسمین اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھے بیٹھی تھی۔
 اس کا رخ دروازے کی طرف نہیں تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز
 اسے یقیناً سنائی دی ہوگی لیکن اس نے اس وقت بھی
 دروازے کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کے خفا ہونے کی یہ
 دلیل عارف کے لیے کافی تھی لیکن وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے
 ساتھ بستر کے قریب پہنچ گیا۔

”زیورات ابھی سے اتار ڈالے تم نے!“ عارف
 اس طرح بولا جیسے اسے یاسمین کی خفگی کا کوئی خیال نہ ہو۔
 ”ہوں۔“ یاسمین نے نہ تو منہ کھولا، نہ اس کی
 طرف دیکھا۔

”یہ سب کچھ تو مجھے کرنا تھا یاسمین!“ عارف شوخ
 لہجے میں کہتے ہوئے بستر پر بیٹھ گیا، پھر بستر کی دونوں سائڈ
 ٹیبلز پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”کسی دروازے میں رکھ دیے؟“
 اس مرتبہ یاسمین نے سر کی جنبش سے واڈ روپ کی
 طرف اشارہ کیا۔

”اوہو!“ عارف ہنس۔ ”اتنی احتیاط؟“
 یاسمین خاموش رہی۔

”بہت ناراض ہو؟“ عارف نے بڑی محبت سے
 یاسمین کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ یاسمین نے
 نظریں چاٹیں کیں اور اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

”واقعی بہت ناراض ہو اور ناراضی اسی لیے ہو سکتی
 ہے کہ میں نے اپنا موبائل بند کرنا تھا۔ ہے نا؟“

یاسمین نہ کچھ بولی، نہ اس نے نظریں اٹھا کیں۔
 ”میں ابھی تمہارا غصہ ختم کر دوں گا۔“ عارف نے

اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔ ”میں نے
 تمہارے لیے بڑی خوب صورت نظم لکھی ہے۔“

عارف نے اس کی ٹھوڑی چھوڑ دی اور نظم سنانا شروع

کی۔ یاسمین نے اپنا چہرہ گفتوں میں چھپا لیا۔
نظم عمل ہوگئی تو بھی یاسمین کا چہرہ گفتوں میں چھپا رہا۔
عارف نے ایک طویل سانس لی۔ ”اتنی اچھی نظم سن کر
بھی تمہارا غصہ دور نہیں ہوا؟ کتنے اچھوتے استعارے
استعمال کیے ہیں میں نے تمہارے حسن کے لیے!“ یہ کہتے
ہوئے عارف نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کا چہرہ بھی اوپر اٹھایا
اور چونک پڑا۔ یاسمین کا چہرہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔
”یہ کیا!“ عارف کے منہ سے نکلا۔ ”آج کی رات تم
رو رہی ہو۔“

یاسمین نے ایک سسکی لی اور پہلی مرتبہ بولی۔ ”اس
خیال سے رو پڑی ہوں کہ تم نے اس نظم میں جو کچھ لکھا ہے،
اس کے برعکس بھی نظم لکھو گے۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ عارف کہتے ہوئے
ایک رومال سے اس کا چہرہ خشک کرنے لگا جو آنسوؤں میں
ڈوبا ہوا تھا۔ ”اب اگر ایک بھی آنسو بہا یا تو میری ناراضگی
شروع ہوجائے گی۔ دیکھو تو..... تمہاری موجودگی کے باعث
اس کمرے کا منظر کتنا حسین ہو گیا ہے۔ اس منظر کو اپنے
آنسوؤں سے دھندلا نہ کرو۔“

”یہ منظر۔“ یاسمین یاس انگیز لہجے میں بولی۔ ”کچھ
ہی وقت جاتا ہے کہ یہ منظر یکسر بدل جائے گا۔“
”تمہاری موجودگی میں تو یہ ممکن نہیں میری جان!“
”میری ہی وجہ سے تو بدلے گا۔“

یاسمین نے جو کچھ کہا تھا، وہ درست ثابت ہوا۔ کچھ
دیر بعد اس کمرے کا منظر اس حد تک یقیناً تبدیل ہو گیا تھا
کہ یاسمین اور عارف ایک دوسرے سے بالکل لائق نظر
آ رہے تھے۔ اگرچہ دونوں ہی بستر پر لیٹے ہوئے تھے مگر
ان کے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔ چروں کے تاثرات بھی
بدلے ہوئے تھے۔ یاسمین کم صبر اور جیت لینی صحت کو تک
رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی چھلی ہوئی تھی۔ عارف
اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ اس کا رخ یاسمین کی مخالف سمت میں
تھا۔ چہرے پر کسی بھی قسم کے تاثرات نہیں تھے، جیسے وہ
پتھر کیا ہو۔ اس کی پالکیں بھی کم کم جھپک رہی تھیں۔
یہ بوجھل سکوت عارف ہی کی آواز سے ٹوٹا۔ اس نے
یاسمین کی طرف کروٹ لیے بغیر بھرائی ہوئی آواز میں کہا
تھا۔ ”مجھے یہ دھوکا تم نے کیوں دیا یاسمین؟“
”میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا۔“ یاسمین کی
نظریں صحت پر جمی رہیں۔

”تم پھر جھوٹ بول رہی ہو۔“ عارف بولا۔ ”شوہر
سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی کہ اس کی بیوی کی شادی پہلے
بھی ہو چکی ہے۔ اگر تم مجھے بتا دیتیں تو اس سے کوئی فرق
نہیں پڑتا۔ میرے جذبات کو جھکا تو اب لگا ہے۔ میرے
پوچھنے پر بھی تم نے کہہ دیا تھا کہ تمہاری شادی نہیں ہوئی۔“
”میں اب بھی قسم کھا کر کہوں گی کہ میری شادی
نہیں ہوئی۔“

اب عارف کے پتھر اٹے ہوئے چہرے پر تغیر آیا۔
اس نے کروٹ لی اور یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ
حیرت سے بولا۔ ”تم اب بھی یہی کہہ رہی ہو..... میں تو اب
بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری وہ شادی کئی سال
پررار بھی رہی ہوگی۔“

”ہرگز نہیں۔“ میں قسم کھا چکی ہوں عارف!“ یاسمین
نے جواب دیتے ہوئے اس کی طرف نہیں دیکھا، چھت ہی
کوکتی رہی۔

عارف اس مرتبہ کچھ تلخ لہجے میں بولا۔ ”تمہاری
قسمیں مجھے یقین نہیں دلا سکتیں کہ میں تمہاری زندگی میں
آنے والا پہلا مرد ہوں۔“

”یہ جھوٹ تو میں بولنا بھی نہیں جانتی۔“
”کیا!“ عارف نہ صرف چونکا بلکہ اس کی حیرت میں
بھی اضافہ ہوا۔ ”تم جانتی ہو؟ تمہاری اس بات کا
کیا مطلب ہوا؟“

”جانتی ہوں۔“ اس مرتبہ یاسمین کی آواز کانپ گئی۔
”تم سے پہلے میری زندگی میں بہت سے مرد آچکے ہیں۔“
اس مرتبہ عارف کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اب
یاسمین کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کسی دوسری دنیا کی مخلوق کو
دیکھ رہا ہو۔

”تم مجھے طوائف بھی کہہ سکتے ہو عارف!“ یاسمین کی
آواز رندہ گئی اور آنکھوں میں آنسو ترنے لگے۔ ”اسی لیے
میں تم سے شادی نہیں کرنا جانتی تھی لیکن تمہیں یہ سب کچھ
بتانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ آخر میں نے تمہیں موبائل
فون پر سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن تم نے اپنا
موبائل مستقل بند رکھا۔ میں تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں
عارف کہ تمہیں دھوکا نہیں دینا جانتی تھی، دے ہی نہیں سکتی
تھی۔ آج بھی تمہیں کچھ معلوم نہ ہو پتا اگر میں تمہیں دھوکا
دینا جانتی۔ اس شہر کی بعض گنا کو بوسٹ گناؤں کا کام بھی
کرتی ہیں۔ ان گنا کو بوسٹ کی وجہ سے نہ جانے کتنی
لڑکیاں اپنے شوہروں کو دھوکا دیتی ہوں گی۔ وہ لڑکیوں کو

بالکل دو شیرہ بنا دیتی ہیں۔ میں چاہتی تھی کہ تم اس تلخ
حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ۔ اس کے بعد تم مجھے قبول کر سکتو
کر دیا مجھے شوکر مار دو۔“

”مائی گاڈ!“ عارف کے منہ سے نکلا اور وہ اپنی
پیشانی مسلتے لگا۔

”میں تو مئی کے لیے سو نے کی چڑا تھی عارف!“
یاسمین نے اپنی رندی ہوئی آواز سنبالنے کی کوشش کرتے
ہوئے کہا۔ ”لیکن اب نہیں رہی تھی۔ ڈھلک چکی ہوں نا
اب..... گاؤں کو شکایت رہنے لگی تھی۔ اسی لیے مئی نے
میری شادی ہی کر دی۔ اب میرے بجائے میری چھوٹی
بین ان کے لیے سو نے کی چڑیا بنے گی۔“

یہ ایسے انکشافات تھے کہ عارف کا سر جھکانے لگا۔
اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ وہی سب کچھ سن رہا ہے جو
یاسمین اسے بتا رہی تھی۔ اس کے خیال میں شاید یہ ناممکن تھا
کہ کوئی ماں اپنی بیٹیوں سے اس طرح پسیا مکائے۔

عارف نہیں جانتا تھا کہ یاسمین کی ماں الماس ناور
خود ایک طوائف تھی، لیکن اس نے جسے فروشی کا یہ کام نجیب
خان کی مدد سے اس طرح کیا تھا کہ کبھی کسی کو اس کے
بارے میں ایسا کوئی شک بھی نہ ہو۔ نجیب خان اس کے
لیے ایسے گا ہک تلاش کرتا تھا جن کا تعلق عرب ریاستوں
سے ہو۔ وہ کسی ریاست کے شہزادے نہ ہوتے ہوئے بھی
شہزادوں ہی کی طرح مال دار ہوتے تھے اور جب الماس
ناور اس قابل نہ رہی تو اس نے اپنی بیٹی یاسمین سے یہ کام
کروانا شروع کیا۔

یاسمین اور ریشماں کی بچپن ہی سے ایسی تربیت کی گئی
تھی کہ وہ سمجھ لیں کہ انہیں جوان ہونے کے بعد کیا کرنا ہے۔
دونوں بہنوں کو اچھی تعلیم اسی لیے دلائی گئی تھی کہ
انہیں بڑے بڑے لوگوں کی آغوش کی زینت بننا تھا اور
انہیں یہ بات بھی بتادی گئی تھی کہ ان کی ماں نے بھی اپنی
جوانی میں یہی سب کچھ کیا تھا۔

یاسمین نے عارف کو یہ سب کچھ بتا دیا اور عارف کی
اس دوران میں یہ حالت رہی جیسے وہ کوئی گڑھی ہوئی کہانی
سن رہا ہو۔

”نجیب خان میرا ماما ہے یا نہیں، میں نہیں جانتی۔“
یاسمین مشینی انداز میں بولے جارہی تھی۔ ”یہ تو مجھے اور
ریشماں کو مئی نے بتایا ہے۔ وہ بہت عیار خصل ہے عارف.....!
مستقل طور پر وہ اسلام آباد میں رہتا ہے۔ اسے عرب
ریاستوں کے ایسے لوگ دیکھتے ہیں جنہیں عیاشی کے لیے

شکستہ گویا
کسی لڑکی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان لوگوں سے نجیب خان کا
میل جول برسوں پرانا ہے، جب وہ مئی کے لیے گا ہک تلاش
کیا کرتا تھا۔ بات صرف اس حد تک نہیں ہے عارف.....!
ایک لڑکی کے ذریعے اپنی دولت نہیں کمائی جاسکتی جو مئی کے
پاس ہے اور خود نجیب خان بھی ایک شوگر مل کا مالک بن گیا
ہے۔ اپنی دولت بلیک میلنگ سے جمع کی گئی ہے۔“

ایک مرتبہ پھر عارف کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اب
یاسمین نے مرگھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر
اداسی اب بھی چھائی ہوئی تھی۔ بولی۔ ”ہاں عارف! بلیک
میلنگ.....! جب نجیب خان اسلام آباد میں کوئی گا ہک تلاش
کر لیتا اور میں اسلام آباد بلائی جاتی تھی تو مئی ایک لاکھ مجھے
ضرور پہناتا کرتی تھیں۔ ان کی نہایت سخت تاکید تھی کہ مجھے
جس وقت وہ لاکھ اپنے گئے سے اتارنا پڑے تو وہ میں
قریب ہی کسی جگہ رکھ دیا کروں۔ مجھ پر اس لاکھ کا راز
بہت دن بعد نکلا۔ اتفاق تھا کہ میں نے مئی اور نجیب خان کی
باتیں سن لی تھیں۔ اس لاکھ میں کوئی چیز لگی ہوئی ہے جو
آوازیں ٹرانسمٹ کر دیتی ہے۔ میں گا ہک کے ساتھ عموماً
کسی ہوٹل میں ہوتی تھی۔ ہوٹل کے باہر کسی جگہ نجیب خان
موجود رہتا تھا۔ میری اور گا ہک کی آوازیں لاکھ میں گئے
ہوئے آئے سے ٹرانسمٹ ہوتی تھیں جو نجیب خان کے پاس
موجود ایک ریسپور کے ذریعے ریکارڈ کر لی جاتی تھیں۔ بعد
میں اسی ریکارڈنگ کے ذریعے اس شخص کو بلیک میل کیا جاتا
تھا۔ شاید وہ لوگ مسلسل بلیک میل ہوتے رہتے ہیں۔ میں
نہیں جانتی کمری تمہیں کس طرح بلیک میل کریں۔“

”کیا مطلب!“
”میں نے جو زیورات الماری میں رکھے ہیں، ان
میں وہ لاکھ بھی ہے۔ وہ میں نے خود سے دور الماری میں
اسی لیے بند کر دیا تھا کہ ہم دونوں کی اس وقت کی باتیں
نجیب خان نہ سن سکے، نہ ریکارڈ کر سکے۔ کل مجھے وہ لاکھ
مئی کو واپس کرنا ہے۔ غالباً اب وہ ریشماں کو پہناتا جایا
کرے گا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی ہے کہ نجیب
خان ہماری آج کی باتیں ریکارڈ کر لیتا تو وہ یا مئی تمہیں کس
طرح بلیک میل کرتے۔“

عارف تیزی سے بستر سے اٹھا۔ اس کی نظر الماری کی
طرف تھی۔ اس کے انداز سے یہ بات صاف ظاہر ہوگئی کہ
وہ الماری سے لاکھ نکال کر دیکھنا چاہتا تھا۔
”پلیز عارف!“ یاسمین جلدی سے بول پڑی۔ ”ابھی
وہ لاکھ نہ نکالو۔ پہلے میرے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کرو۔“

”تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے عارف!“ یا سیمین جذباتی انداز میں زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی۔
”کل تم کیا کرو گی؟“ عارف نے پوچھا۔ ”اپنے گھر..... میرا مطلب ہے، الماس نادر کے پاس توجاؤ گی؟“
”ہر تو ایک رسم ہے۔ دنیا دکھاوے کے لیے مجھے جانا ہی ہوگا لیکن کل کے بعد میں وہاں بھی نہیں جاؤں گی۔ فون پر ہی کہہ دوں گی کہ اب وہ لوگ مجھ سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔“
”تم نے لاکٹ الماری میں رکھ دیا ہے۔ نجیب خان ہماری اس وقت کی باتیں ریکارڈ نہیں کر سکا ہوگا۔ الماس

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعہ مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چاہتے ہیں وہ۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا سہیل فون نمبر

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگرتش

C-63 فیروز ٹرسٹ ہاؤس افٹن انٹرنیشنل ٹریڈنگ کمپنی

ممبر ہونے والے قارئین کو ہر دو ہفتے ایک نیا پرچا ملے گا

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

کوئی نہیں تھا۔ اب تم تو میرے ہو۔ تم سے پہلے تو میرا سہارا کوئی نہیں تھا۔ میں نے..... اور میں نے ہی کیا، ریشماں بھی اپنی آنے والی زندگی سے دُکھی ہے۔ میں بھی اسے اپنی قسمت کا جبر سمجھ کر برداشت کرتی رہی ہوں اور ریشماں بھی برداشت کرتی رہے گی۔ ہوش سنبھالتے ہی ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ میں کیا کرتا ہے۔ عام طور پر ایسی لڑکیاں اس انداز کی سوچ نہیں رکھتیں جو میری اور ریشماں کی ہے۔ وہ اس زندگی کو خوشی خوشی قبول کر لیتی ہیں لیکن میں ساری زندگی بس کڑواہٹ نکلتی رہی ہوں۔ قدرتی طور پر مجھے شاعری سے لگاؤ تھا۔ میں کچھ سوچنے کے بجائے خود کو اس میں الجھائے رکھتی تھی۔ شاید ہی کوئی شاعر ہو جسے میں نے نہ پڑھا ہو، لیکن تم سے ملنے کے بعد میں نے کسی اور شاعر کو نہیں پڑھا۔ صرف تم کو پڑھتی رہی ہوں۔“

”تو یہ طے ہے کہ تمہیں ان دونوں سے کوئی لگاؤ نہیں!“
”ہرگز نہیں عارف!“

”تو پھر ان دونوں کو اس کا خیال نہ بھگتا پڑے گا۔ میں انہیں معاف نہیں کر سکتا جنہوں نے میری کڑیا کو پہلے ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔“

”تم کیا کرو گے عارف؟“ یا سیمین سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”مجھے میرے دماغ میں صرف اتنا ہی آیا ہے کہ میں ان سے انتقام لوں گا۔“

”پلیز عارف!“ یا سیمین پریشان نظر آئی۔ ”کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا جس سے تمہیں بھی کوئی دک پہنچے۔ میں نے اپنی زندگی صرف برداشت کرنے میں گزاری ہے لیکن یہ میں برداشت نہیں کر سکتی گی کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچ جائے۔“

عارف کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”ریشماں بھی اپنی آنے والی زندگی سے خوش نہیں ہے؟“

”بالکل خوش نہیں ہے۔“
”اور ابھی اس نے اس زندگی میں قدم نہیں رکھا؟“
”نہیں۔“ یا سیمین نے جواب دیا۔ ”وہ تو جب نجیب خان اسلام آباد واپس جائے گا تو کوئی گا ہک تلاش کرنے کے بعد ریشماں کو وہاں بلا لیا جائے گا۔“

”تو پھر میں اسے بھی اس خاردار سے بچاؤں گا۔“
”مگر کیسے عارف؟“ یا سیمین بے چین ہوئی۔

”میں نے ابھی کہا تھا تم سے..... میں نے ابھی کوئی تدبیر نہیں سوچی۔ بس اتنا ہی آیا ہے میرے دماغ میں کہ مجھے ان لوگوں سے انتقام لینا ہے۔“

خالم ہے تمہاری ماں، تمہارا ماما!..... کیسا ظلم توڑا ہے انہوں نے مجھ پر..... میری پیاری کڑیا کو انہوں نے پہلے ہی توڑ پھوڑ ڈالا۔ کیسی قیامت توڑی ہے انہوں نے مجھ پر..... ٹوٹی ہوئی کڑیا دے دی ہے انہوں نے مجھے..... لیکن میں اس ٹوٹی ہوئی کڑیا کو بھی اپنے پیچھے سے لگا کر رکھوں گا۔“

عارف کے آخری فقرے کا مطلب بالکل واضح تھا۔ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

یا سیمین پاگلوں کی طرح بستر سے اتر کر عارف سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آنسو عارف کے بھی بہتے رہے اور ہونٹوں میں شدید لرزش رہی۔ وہ یا سیمین کو اپنے سینے سے لگائے رہا۔

نہ جانے کتنا وقت اسی طرح گزر گیا۔ پھر انہیں یہ بھی احساس نہیں ہو سکا کہ وہ فرش سے کب اٹھ کر بستر پر اس طرح لیٹ گئے جیسے ایک جان، دو قاب ہوں۔ اتنی دیر تک انہوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا تھا۔ بستر پر لیٹنے کے بعد بھی دونوں خاموش ہی رہے۔ ان دونوں کے چہرے اتنے قریب تھے کہ وہ ایک دوسرے کی سانسیں اپنے چہروں پر محسوس کر رہے تھے، ان کے چہروں پر غم ناک تاثر جیسے مجھد ہو کر رہ گیا تھا۔

پھر یکا یک عارف کے تاثرات میں تبدیلی آئی۔ وہ غضب ناک سا نظر آنے لگا۔

”یا سیمین!“ وہ بولا۔ ”جس عورت کو تم می کہتی ہو، میں اب اس کے لیے یہ مقدس لفظ اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتا۔ میں اسے اب الماس نادر ہی کہوں گا۔ تمہیں اس سے اور نجیب خان سے کتنا لگاؤ ہے؟ مجھے بالکل سچ سچ پتا نا یا سیمین!“

”میں تم سے کوئی جھوٹ بول ہی نہیں سکتی عارف!..... اگر یہ میرے لیے ممکن ہوتا تو تمہیں میرے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا اور نہ ہی میں تمہیں وہ سب کچھ بتاتی جو بتا چکی ہوں۔ تمہیں دھوکا دینا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اسی لیے تم سے شدید محبت کے باوجود میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں اسے مجبوجب کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ اس سے کوئی جھوٹ نہیں بول سکتی۔“

”تو میرے سوال کا جواب دو۔ تمہیں ان دونوں سے کتنا لگاؤ ہے؟“

”ذرا بھی نہیں عارف..... ذرا بھی نہیں۔“
”پھر تم نے ان کے ساتھ..... خاص طور سے الماس نادر کے ساتھ اتنی زندگی کیسے گزار دی؟“
”میں اور کیا کرتی عارف؟ کہاں جاتی؟ دنیا میں میرا

”کیسا فیصلہ؟“
”تم مجھے اپنے گھر سے کب نکالو گے۔“ یا سیمین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

عارف چند لمحوں کی طرف دیکھتا رہا، پھر لیٹ گیا۔

کچھ توقف سے یا سیمین بولی۔ ”میرے دماغ پر بہت بوجھ ہے عارف! اپنا فیصلہ جلدی سنا دو۔“

”میرا دماغ تو پتھر ہو کر رہ گیا ہے یا سیمین!“ عارف کا لہجہ بھی اس مرتبہ پتھریا ہوا سا تھا۔ ”جو کچھ میں نے ابھی جانا ہے، اس کے بعد میں کچھ سوچنے بجھنے کے قابل نہیں رہ گیا ہوں۔ میں ابھی تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے دماغ پر بوجھ ہوگا لیکن اسے برداشت کر دتا کہ میں کوئی درست فیصلہ کر سکتی۔“

یا سیمین چپ رہی۔ عارف بھی پھر کچھ نہیں بولا اور یہ خاموشی طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئی۔

یا سیمین کے دماغ میں ماضی چکراتا رہا، بچپن سے جوانی تک کے واقعات، پھر عارف سے ملاقات، ملاقات کے بعد جذباتیت اور بے بسی کی کیفیت! عارف کے وہ اشعار بھی اسے یاد آتے رہے جو اسے بہت پسند تھے۔ مختلف النوع خیالات کی وجہ سے اس کے چہرے کے تاثرات بھی بدلتے رہے۔ بھی اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں، کبھی چہرہ بالکل سپاٹ ہو جاتا۔ اسی عالم میں اس پر غنودگی طاری ہوئی لیکن اسے غنودگی کا احساس بھی نہیں ہوا اور کسی وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔

پھر وہ اس وقت کلبلائی جب اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ پر بوندیں گر رہی تھیں۔ نیند ہی کے عالم میں اس نے اپنا ہاتھ ہٹا جاتا تو فوراً ہی اپنی کلائی پر گرفت محسوس کی۔ فوراً اس کی آنکھ کھل گئی۔ جو کچھ اس نے دیکھا، وہ فوری طور پر تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ سکا اور جب سمجھ میں آیا تو اس کے منہ سے کسی کی صورت میں عارف کا نام نکلا۔

عارف بستر سے لگا ہوا فرش پر بیٹھا تھا، اس نے یا سیمین کی کلائی پکڑ لی تھی اور اس کی آنکھوں سے کھینچنے والے آنسو یا سیمین کے ہاتھ پر گر رہے تھے۔ جذبات کی شدت سے یا سیمین کے ہونٹ کاٹنے لگے۔

”عارف!“ دوبارہ اس کے منہ سے آواز نکلتی ہوئی نکلتی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں میں بھی آگئے تھے۔
”یا سیمین!“ عارف کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔ ”کیسی

کر سکے۔ تم تیار ہو۔ میں ذرا باہر کا..... میرا مطلب ہے گھر
ہی میں..... ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔“
وہ یاسمین کے کچھ بولنے سے پہلے ہی تیزی سے چلتا
ہو اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

یہ بات یاسمین کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ فوری طور پر
عارف نے اپنے کسی دوست کو کیوں بلایا تھا..... اس کا
ذہن الجھا رہا لیکن اسی دوران میں وہ تیار ہوئی۔ تیار ہونے
کے بعد اسے عارف کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔
”میرا اندازہ تھا کہ تم تیار ہو چکی ہو گی۔“ عارف نے
اندر داخل ہوتے ہوئے خوشگوار موڈ میں کہا۔ اس کے
چہرے سے یہ بات قطعی ظاہر نہیں ہو رہی تھی کہ گزشتہ رات
اسے ایک شدید ذہنی جھٹکا لگ چکا تھا یا شاید وہ یاسمین کو یہ
تاثر دینا چاہتا ہو کہ جو کچھ اس کے سامنے آیا ہے، وہ سب
اس نے سچے دل کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ ڈرائنگ
نیل پر اس وقت کنور شمشاد کے ساتھ رانی بیگم بھی موجود
تھی۔ عارف کو تعجب ہوا۔ وہ پہلی مرتبہ رانی بیگم کو اتنی صبح
اپنے گھر پر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر میں یہ بات نہیں آسکی کہ
یاسمین رانی بیگم کو دیکھ کر چونک گئی تھی۔
”آؤ ذہن!“ رانی بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”لیکن یہ تم نے زیورات کیوں نہیں پہنے؟“

”اچھا خاصا بوجھ ہوتا ہے، زیورات کا۔“ یاسمین
سے پہلے عارف بول پڑا۔ ”میں نے ہی کہا تھا کہ جب
ریشما لینے آئے تو ہمیں لینا زیورات۔“

پھر وہ دونوں سلام کر کے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
ابھی ناشاپوری طرح نہیں کیا کیا تھا کہ ایک ملازم
نے آکر عارف کو اطلاع دی کہ اس کا دوست شکیل فاروقی
آیا ہے اور اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا ہے۔

عارف جلدی سے اٹھا۔ ”سوری ڈیڈی..... میں نے
ہی اسے بلایا تھا۔ ایک بہت ضروری کام ہے۔“
”آج تو تمہیں بالکل فارغ ہونا چاہیے تھا۔“ کنور
شمشاد نے منہ بنایا۔

”اٹنی ایم دیری سوری ڈیڈی.....! دراصل کام
بہت ضروری تھا۔ میں ناشا بعد میں کر لوں گا۔“

عارف تیزی سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل جانا
چاہتا تھا کہ کنور شمشاد بول پڑے۔ ”سنو!“ عارف ٹھٹکا۔
کنور شمشاد نے اپنی بات مکمل کی۔ ”ابھی میں یاسمین بیٹے کو
اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔ کچھ باتیں کروں گا، تم اپنے

اگر تم دونوں الماس نادر کی ناجائز اولاد ہو تیں تو بھی میرے
لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لوگ ناجائز اولاد کے لیے
اچھے خیالات نہیں رکھتے لیکن میری سوچ ان سے مختلف
ہے۔ اگر کوئی کسی کی ناجائز اولاد ہو تو اس میں اس کا نہیں،
اس کی ماں کا قصور ہوتا ہے۔“

”عارف! میرے اچھے عارف!“ یاسمین جذباتی
انداز میں اس سے لپٹ گئی۔ ”میرے بہت ہی اچھے
عارف..... تمہارے ان خیالات کا اندازہ مجھے پہلے سے
تھا۔ تمہاری دو نظموں کا موضوع یہی ہے۔ تم اپنے ان
خیالات کا اظہار ان نظموں میں کر چکے ہو۔“

”اور ان نظموں کو ادبی حلقوں میں سراہا بھی جا چکا ہے
لیکن اب یہ باتیں چھوڑو۔ بہت کچھ سوچنا ہے مجھے، لیکن
اس سے پہلے میں ایک مرتبہ پھر۔“ عارف نے بات ادھوری
چھوڑ کر اپنی دو نظموں سے یاسمین کے ہونٹوں کو چھیڑا۔

یاسمین نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکا لیں۔
دوسری صبح اس کی آنکھ کچھ دیر سے ہی کھلتی اگر عارف
اسے جگانا دیتا۔ وہ غسل کر کے بمشاش بیاں نظر آ رہا تھا۔

”بس اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ عارف نے کہا۔
”آج ڈیڈی کو دفتر نہیں جائیں گے۔ انہوں نے کل ہی بتا دیا
تھا۔ اس وقت عمو ناٹھے کی میزنگ جاتی ہے لیکن خاص طور
سے آج کے لیے ڈیڈی نے ناٹھے کا پروگرام ایک گھنٹے بعد
کار کھا ہے۔“

یاسمین اٹھ کر ہاتھ روم میں چلی گئی۔ جب وہ غسل
کر کے نکلی تو عارف موبائل فون پر دھیمی آواز میں بات
کرتے ہوئے کمرے میں ہل رہا تھا۔ بات اختتام پر گئی۔
یاسمین نے عارف کو کہتے سنا۔ ”شک ہے، تم آدھے گھنٹے
میں پہنچ جاؤ۔ میں بے چینی سے انتظار کروں گا۔“

اس نے رابطہ منقطع کر کے یاسمین کی طرف محبت
بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”گلاب کی طرح
کھڑ آئی ہو۔“

”موبائل پر کس سے بات کر رہے تھے؟“ یاسمین
نے پوچھا۔ ”اس وقت کسے بلایا ہے؟“

”ایک دوست ہے میرا۔ جلدی جلدی سے تیار ہو جاؤ اور
ہاں! زیورات ابھی نہ پہنا۔ تمہاری بہن اپنی کچھ دوستوں
کے ساتھ تمہیں جب لینے آئے گی، اسی وقت پہن لینا۔“
”اس لاکٹ کی وجہ سے کد رہے ہو؟“

”ہاں۔ میں نہیں چاہتا کہ اگر اس وقت بھی آس پاس
کہیں نجیب خان موجود ہو تو ہماری باتیں سن سکے، نہ ریکارڈ

نادر تم سے اس بارے میں پوچھنے کی تو!“
”میرے دماغ میں صرف ایک ہی بات ہے۔ میں
کہہ دوں گی کہ تم نے کمرے میں آکر مجھ سے کوئی بات کیے
بغیر میرے زیورات کر کہیں رکھے تھے، پھر..... پھر.....“
یاسمین کی زبان لڑکھرائی۔ ”میں کہہ دوں گی کہ اس کے بعد
ہی عارف نے بولنا شروع کیا تھا۔“

”کیا الماس نادر یقین کر لے گی؟“
”نہ کرے۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔“

”سوچنا پڑے گا اس بارے میں۔“ اس مرتبہ عارف
کا انداز بڑبڑانے کا سا تھا اور اس نے گھڑی پر بھی نظر ڈالی۔
”چھ بجنے والے ہیں۔ سوچنے کے لیے وقت بہت کم ہے۔“
یاسمین کچھ نہیں بولی۔ وہ بھی سوچ میں پڑ گئی تھی۔
”ایک بات نہیں کی تم نے عارف!“ وہ کچھ توقف
سے بولی۔

”کیا؟“

”تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میرا یا ریشما کا باپ کون
ہو سکتا ہے۔ تم ہم بہنوں کی پیدائش کو ناجائز سمجھ رہے ہو گے
جبکہ ایسا نہیں ہے۔ تمہاری وجہ سے میں بھی اب اس عورت کو
الماس نادر ہی کہوں گی۔ یہ بات ہم دونوں کے علم میں ہے
کہ الماس نادر نے ایک غریب شخص سے شادی کی تھی۔ شاید
اس کے ماں باپ بھی غریب ہی ہوں گے اس لیے اس کی
شادی کسی غریب شخص سے ہی ہو سکتی تھی۔ ہم دونوں اس
غریب شخص ہی کی بیٹیاں ہیں۔ الماس نادر کی دوسری زندگی
ہمارے باپ کی وفات کے بعد کی ہے۔“

”تب تو ایک معاملہ ہو گیا۔“ عارف نے ہلکی سی
مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
”کیسا معما؟“

”تمہارا غریب باپ یقیناً کوئی بہت شریف انسان
ہو گا۔ تم دونوں بہنوں کی رگوں میں اسی شریف باپ کا خون
دوڑ رہا ہے۔ اسی لیے تم نے اس زندگی کو خوشی سے قبول نہیں
کیا اور ریشما بھی اسی لیے اپنی آنے والی زندگی کو خوشی
سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔“

یاسمین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”ہاں
عارف.....! یہی بات ہے۔ میں خود تم سے یہ بات کہتے
ہوئے ہنچکا رہی تھی کہ ہم بہنیں کسی کی ناجائز اولاد ہیں۔
مجھے یقین ہے کہ تم مجھے جھوٹا نہیں سمجھتے۔ اب یہ مشکل خود کو
آبادہ کر کے کہیں یہ بات بتائی دوں۔“
”تمہارے بتانے سے ایک بات صاف ہو گئی لیکن

ایک لڑکا برتنے والی کو چھیڑتے ہوئے۔
”جہاں سبزی وہاں ڈالٹا کسی ہومیری خالہ؟“
برتنے والی نے کہا۔ ”غور سے دیکھ نہ میں
خالہ نہ ڈالٹا۔ میں ہوں تیری والدہ!“
لڑکے نے کہا۔ ”اوہ امی جان! جہاں ناشا

☆☆☆

دوست سے مل کر ادھر ہی آ جانا۔“

”جی بہتر۔“ عارف نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔
یاسمین نظریں جھکاتے ناشا کرتی رہی۔ اس کے ذہن
میں یہ سوال نہیں اٹھا کہ کنور شمشاد اس سے کیا باتیں کرے
گا۔ یہ سوال اس کے دماغ میں اٹھنا فطری بات ہوتی لیکن
اس کا دماغ پہلے ہی اتنا الجھا ہوا تھا کہ اس نے کنور شمشاد کی
بات بھی ٹھیک سے نہیں سنی۔ اس پر شدید دباؤ تو اس بات کا
تھا کہ رانی بیگم کی وہاں موجودگی کیا معنی رکھتی ہے۔

رانی بیگم نجیب خان کی بیوی تھی۔ اپنے کسی منصوبے
کے تحت انہوں نے عام طور پر تو یہ ظاہر کر رکھا تھا کہ ان
دونوں میں علیحدگی ہو گئی ہے لیکن حقیقت یہ نہیں تھی۔ ویسے تو
رانی بیگم کا قیام ایک پینٹنگ میں تھا لیکن یاسمین کے علم کے
مطابق نجیب خان اس کے پینٹنگ سے بھی نہیں جانتا تھا۔ ان کی
خفیہ ملاقاتیں خود یاسمین کے گھر میں ہوتی تھیں جب نجیب
خان اسلام آباد سے آتا تھا۔

ایسی صورت میں رانی بیگم کی وہاں موجودگی یاسمین
کے لیے حیرت کا سبب بننا ہی چاہیے گی۔

ڈرائنگ نیل پر زیادہ تر گفتگو کنور شمشاد اور رانی بیگم
میں ہوتی رہی۔ ان باتوں سے یاسمین کو یہ اندازہ بھی ہوا کہ
رانی بیگم رات کو شادی میں بھی شریک رہی تھی۔ یاسمین نے
رات کو اسے اس لیے نہیں دیکھا تھا کہ وہ مستقل نظریں
جھکائے رہی تھی۔

ان باتوں سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ رانی بیگم کنور
شمشاد کے نہ صرف تجارتی بلکہ گھریلو معاملات میں بھی خاصی
دخیل تھی۔

یاسمین کا ذہن الجھا رہا اور ناشا کر لیا گیا۔ اس کے
بعد کنور شمشاد اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ رانی بیگم اس
وقت بھی ساتھ رہی۔ بیٹھنے کے بعد کنور شمشاد نے یاسمین کو
عارف کے مزاج کے بارے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ

ہے تو تم یہ آسانی اسے اپنی انگلیوں پر چسپاں کر رہی ہو۔ تم اس سے لاکھوں کی فرمائش کرو گی تو بھی وہ تمہیں نہیں ملے گا۔ بس یہی اندازہ لگانا ہے ہمیں کہ تم اس سے ہمارے لیے کتنی رقم اکٹھا کر سکتی ہو۔“

اب یاسمین کی سمجھ میں آیا کہ عارف کے گرد گھیرا ڈالنے سے ان لوگوں کا مقصد کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی آیا کہ رانی بیگم نے شادی کے نام پر کنور شمشاد سے تعلقات کس لیے قائم کیے ہوں گے۔ اسی نے کنور شمشاد کو اس کے لیے تیار کیا ہوگا کہ وہ عارف کی شادی یاسمین سے کروادے اور کیا جب کہ اسی کے کہنے سے کنور شمشاد نے اپنا سب کچھ ابھی سے عارف کے نام کر دیا ہوتا کہ یاسمین اپنی فرمائش آسانی سے پوری کر داسکے۔

یاسمین نے یہ سب کچھ سمجھنے اور اندازے لگانے کے بعد اپنے رویے میں تبدیلی لا نا ضروری سمجھا۔ اسی طرح وہ الماس نادر سے کچھ اور باتیں بھی اگلا سکتی تھی۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”اچھا!..... اگر آپ عارف سے بھی دولت گھٹنا جانتی ہیں تو عارف سے محبت کی خاطر میں اسے گوارا کروں گی۔ بہت دولت ہے عارف کے پاس..... اگر آپ میرے ذریعے ایک آدھ کروڑ بھی حاصل کر لیں گی تو اس سے عارف کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، معاف کیجیے گا، اب جو آپ اتنے پیسے انداز میں بائیں کرنے لگی ہیں، یہ معنوی ہے۔“

آپ جانتی ہیں کہ جس طرح عارف مجھے چاہتے ہیں، اسی طرح میں بھی ان کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“

الماس نادر چوگی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت نجیب خان کی بھی ہوئی تھی۔ ریشماں اس دوران میں نظریں جھکائے ایک طرف خاموشی سے بیٹھی رہی تھی۔ لیکن یاسمین اس کی بات پر اس نے بھی تیزی سے سر اٹھا کر یاسمین کی طرف دیکھا تھا۔

یاسمین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”آپ جانتی ہیں کہ جس طرح عارف مجھے چاہتے ہیں، اسی طرح میں بھی عارف کو شدت سے چاہتی ہوں۔ اگر میں آپ لوگوں کی بات نہیں مانوں گی تو جس طرح رانی بیگم نے عارف کی مجھ سے شادی کرنے کے لیے ان کے والد کو آمادہ کیا ہے، اسی طرح آپ ان کے ذریعے عارف پر ان کے والد کا یہ دباؤ بھی ڈال سکتی ہیں کہ وہ مجھے طلاق دیدے۔“

”ارے نہیں۔“ الماس نادر نے پھر اداکاری کی اور یاسمین کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”اب ایسا بھی نہیں ہے کہ میری بیٹی میری بات نہ مانے تو میں اس سے اس

طرح انتقام لوں۔ ہاں البتہ تمہاری عارف سے شادی کے لیے رانی بیگم ہی نہ کوشش کی تھی۔“

یاسمین نے نجیب خان کی طرف دیکھا۔ ”آپ کو اس بات پر شرم بھی نہیں آئی ہوگا ماما کہ آپ نے اپنی بیوی کو کنور شمشاد کو سوئپ دیا ہے۔ شاید انہیں آپ نے اور لوگوں کے پاس بھی بھیجا ہوگا جب وہ جوان ہوں گی۔“

”ہمارا پیشہ ہی یہ ہے۔“ نجیب خان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم بھی جانتی ہو۔ خود میں ایک طوائف کی اولاد ہوں۔“

”مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ میں ان کی ناجائز اولاد نہیں ہوں۔“ یاسمین نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میرا باپ وہی ہوگا جس سے می نے شادی کی تھی۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹی! الماس نادر نے اپنے لب و لہجے کی نرمی برقرار رکھی۔ ”تم اور ریشماں، دونوں ہی میرے اس شوہر کی اولاد ہو سکتی ہو بہت غریب آدمی تھا۔ میرے لیے تو بہت اچھا ہوا کہ وہ جلد مر گیا۔ تم دونوں بہنوں نے اس وقت ہوش بھی نہیں سمجھا لیا تھا۔ اس کے بعد ہی میں نے یہ پیشہ اختیار کیا جس کی بدولت میں نے ہی نہیں، تم دونوں بہنوں نے بھی عیش و عشرت کی زندگی گزاری ہے، لیکن اب تنہا یہ تم ختم کرو۔ یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دو کہ میں تمہیں عارف سے طلاق دلوانے کے بارے میں سوچوں گی۔ اب میں یہ تمہاری مرضی پر چھوڑتی ہوں کہ تم عارف سے ہمیں کچھ دلوانا چاہو گی یا نہیں۔“

”کیسے چھوڑ رہی ہو ہم یہ بات اس پر۔“ نجیب خان بگڑ کر بولا۔ ”اے وہ سب کچھ کرتا ہی پڑے گا جو ہم چاہتے ہیں۔ تم اسے طلاق نہیں دلوانا چاہو گی تو نہ چاہنا۔ میں رانی بیگم کے ذریعے اسے طلاق دلوا کر رہوں گا اگر یہ ہماری بات نہیں مانے کی تو۔“

”تم بہت ضدی ہو نجیب!“ الماس نادر نے سنجیدگی سے کہا، پھر نجیب خان کو آنکھوں سے کچھ اشارہ بھی کیا۔

”ہاں ضدی ہوں میں.....! آخر اس لڑکی نے اتنی عیش و عشرت کی زندگی گزاری ہے تو ہماری ہی وجہ سے گزاری ہے۔ اب اسے ہمارے کام بھی آنا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ یاسمین نے سچ لہجے میں کہا۔ ”میں تم لوگوں کی ڈیمانڈ پوری کرتی رہوں گی۔“

سوجھ سچائی تھی۔

نجیب خان بولا۔ ”دونوں تک یہ لاکھ تم سے دور نہیں ہونا چاہیے۔ میں اچھی طرح اندازہ لگا لیتا چاہتا ہوں کہ تم دونوں کے تعلقات میں کتنی گہرائی ہے۔ گہرائی جاننے کے بعد ہی میں یہ فیصلہ کر سکوں گا کہ تم اس کو کس حد تک بچا سکتی ہو۔“

یاسمین بولی۔ ”میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ ایک آدھ کروڑ سے بھی عارف کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔“

”بس تو پھر وہی کرنا جو میں ابھی کہہ چکا ہوں۔ دونوں تک یہ لاکھ تم سے دور نہیں ہونا چاہیے۔“

اس وقت الماس نادر بول پڑی۔ اس نے یاسمین سے پوچھا۔ ”تمہیں واپس کب جانا ہے؟“

”رات کو لیوہ ہے۔“ یاسمین نے جواب دیا۔ ”پانچ بجے تک عارف خود آئیں گے مجھے لینے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ عارف کو تمہارے ماضی کے بارے میں کوئی شرت نہیں ہوا؟“

”نہیں۔“ یاسمین نے جواب میں صرف اتنا ہی کہنا مناسب سمجھا۔

”ٹھیک ہے، مجھے اطمینان بھی تھا۔ جس لہڈی ڈاکٹر سے میں نے سب کچھ کر دیا تھا وہ اس کا کام کی ماہر بھی ہے۔ اچھا خیر! جاؤ، اب آرام کرو تم جا کر۔“

شکستہ گویا

بعد کی چلنی ریاست سے کوئی آنے والا ہے جسے بڑی آسانی سے چھانچا جاسکے۔“

”تو؟“

”ماما نے پرسوں رات اسلام آباد جانے کا پروگرام بنالیا ہے۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھی کہ تم فکر مند کیوں ہو؟“

”فکر مند نہیں ہوں باجی!.....! بس سوچ رہی ہوں تمہارے بعد اب مجھے مردوں کا کھلونا بننا پڑے گا۔“

یاسمین نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم نہیں جانتا چاہتیں؟“

”میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔“

ریشماں اب کچھ اداس نظر آنے لگی۔ ”تمہاری طرح میرا بھی کوئی سہارا نہیں ہے۔ ماما کے اشاروں پر ناچنا تو پڑے گا۔ یہ جاننے کے بعد مجھے ان دونوں سے نفرت ہو گئی ہے کہ میں ایک شریف باپ کی بیٹی ہوں اور ابھی۔“

”اسی بارے میں مجھ سے مشورہ کرنے آئی ہو؟“

”آپ بھی کیا مشورہ دے سکتی ہیں باجی!“ ریشماں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”میں تو بس اس لیے آئی کہ آپ سے باتیں کر کے شاید کچھ دھماں بنے۔“

”لیکن تم چاہتی ہو کہ جو زندگی میں نے گزاری، وہ تمہیں نہ گزارنا پڑے؟“

”میں نے ابھی کہا نا باجی کہ میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

اس وقت یاسمین کے دماغ میں یہ سوال ابھرا کہ عارف اگر ان لوگوں کے خلاف کوئی ایکشن لے سکا تو کیا یہ بھی ممکن ہوگا کہ ریشماں کو بھی ان لوگوں کی گرفت سے نکالا جاسکے؟

یاسمین کے دماغ میں عارف کا جملہ گونجا۔ ”تو پھر میں اسے بھی اس خازن سے بچاؤں گا۔“

عارف نے یہ بات ریشماں ہی کے لیے کہی تھی لیکن یاسمین کے لیے اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ عارف یہ سب کچھ کس طرح کر سکے گا۔

شام کے پانچ بجے تھے جب یاسمین نے اپنے موبائل پر عارف کی کال ریسیڈی۔ ”میں آ رہا ہوں یاسمین! آدھا گھنٹا لگے گا، تیار ملنا؟“

”تیار کیا کرنا ہے مجھے! جیسی آئی تھی، ابھی تک اسی حالت میں ہوں۔ تم آؤ گے تو اٹھ کر چل پڑوں گی۔“

”میک اپ تو خراب ہو ہی گیا ہوگا۔ خیر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے میں جانے سے پہلے نہیں بیوی پارلو تو جانا ہی ہوگا۔ بس الماس نادر کو بتادو کہ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔“

”تم خود فون کر دو۔ میں تو اس وقت سے اب تک کمرے سے نہیں نکلی۔ کھانا بھی یہیں کھا یا تھا ریشماں کے ساتھ۔ باہر نکلنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا ہے۔ ان لوگوں کی شکلوں سے نفرت ہو گئی ہے مجھے..... سب کچھ جان بھی چکی ہوں کہ یہ لوگ مجھ سے اور کیا کر دانا چاہتے ہیں۔“

”اچھا!“

”ہاں۔“ یاسمین نے کہا۔ ”جب میں یہاں سے تمہارے ساتھ چلوں گی تو تمہیں وہ سب کچھ بتادوں گی۔“

”بتا دینا۔ اچھا میں الماس نادر کو فون کیے دیتا ہوں۔ بس آدے سے گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔“

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

یاسمین کو عارف کے اس انداز پر تعجب ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ یہ بتائے گی کہ اس نے سب کچھ جان لیا ہے تو عارف تجسس ہو کر کچھ سوال ضرور کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ ”کیوں؟“

اس سوال نے یاسمین کو الجھن میں ڈالا، مگر اس کی یہ الجھن عارف سے باتیں کر کے ہی ختم ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود الجھن کی وجہ سے وہ اٹھ کر کمرے میں چلنے لگی۔

چلنے ہوئے آدھا گھنٹا گزر گیا لیکن اسے وقت کا کچھ احساس ہی نہیں تھا۔ وہ اس وقت چوکی جب ریشماں کمرے میں آئی۔

”چلیے باجی!“

”عارف آگئے؟“ یاسمین نے جلدی سے پوچھا۔

”آتے ہی ہوں گے۔ مگر کون کیا تھا انہوں نے۔“

مٹی اور ماڈرائٹنگ روم میں ہیں، تمہیں بلا یا ہے۔“

یاسمین سر ہلا کر ریشماں کے ساتھ کمرے سے نکلی۔ جب وہ دونوں ڈرائٹنگ روم میں پہنچیں تو وہاں عارف بھی تھا اور غالباً اسی وقت پہنچا تھا۔ نجیب خان اسے بڑی شفقت کے ساتھ سینے سے لگا رہا تھا۔

شریف زادہ بن رہا ہے، یاسمین نے جلد سے انداز میں نجیب خان کے بارے میں سوچا۔

”آؤ!“ الماس نادر نے یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”تمہارے دلہا میاں آگئے تمہیں لینے!“

پھر وہ ریشماں سے بولی۔ ”جن سے کہہ دیا تھا؟“

”جی ہاں، وہ دیکھیے!“

ریشماں کے اشارے پر الماس نادر نے اندرونی دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے ملازم جن ایک بڑی سی ٹرائی کو دھکیلتا ہوا اندر آ رہا تھا۔

نجیب خان نے بڑی محبت سے عارف کو اپنے قریب بٹھایا اور کہا۔ ”تم نے فون پر کہا تھا نا کہ تم بہت جلدی میں ہو گئے اس لیے تمہاری خاطر تو وضع کے لیے تیاری پہلے ہی کر لی گئی تھی۔“

”ارے اس کی کیا ضرورت تھی۔“ عارف نے کہا۔

”ارے واہ!“ الماس نادر بول پڑی۔ ”پہلی مرتبہ سسرال آئے ہو، کچھ کھائے بے بغیر کیسے چلے جاؤ گے۔“

”ہمیں جلدی ہے اما!“ یاسمین بول پڑی۔ ”عارف نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ ابھی مجھے بیوی پارلر بھی جانا ہے، وہاں خاصا وقت لگتا ہے۔“

”اب ایسی بھی جلدی نہیں ہے یاسمین!“ عارف نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اور پھر بڑوں کی بات ماننا ضروری ہے۔ اسی بہانے مجھے اما سے کچھ باتیں کرنے کا موقع مل جائے گا۔“

یاسمین نے تعجب سے عارف کی طرف دیکھا لیکن پھر کچھ بولی نہیں اور ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

ملازم جن ٹرائی قریب کھڑی کر کے چلا گیا۔ اسے جانے کا اشارہ خود ریشماں نے کیا تھا۔ وہ ٹرائی سے پلیٹیں اٹھا کر درمیانی تپائی پر رکھنے لگی تھی۔

”مجھ سے تمہیں کیا باتیں کرنا ہیں برخوردار!“ نجیب خان ہنس کر بولا۔

”یاسمین نے بتایا تھا کہ آپ زیادہ تر اسلام آباد میں رہتے ہیں۔“

”ہاں، میرا کاروبار وہیں ہے۔“

”عورتوں کا کاروبار!“

عارف کی اس بات پر الماس نادر اور نجیب خان ہی نہیں، یاسمین اور ریشماں بھی چونک پڑی تھیں۔

”عجیب بات کی ہے تم نے!“ نجیب خان نے عارف کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”کیا مطلب ہے اس سے تمہارا؟“

”مطلب تو وہی ہے جو آپ نے سمجھا ہے۔“ عارف نے سنجیدگی سے کہا، پھر یاسمین کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”ذرا یہاں آؤ!“

یاسمین شدید ذہنی الجھن کے عالم میں صوفے سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عارف نے کس قسم کی منصوبہ بندی کر ڈالی ہے کہ اسی وقت

ایسی باتیں شروع کر دیں جن کے لیے خاصی تیاری کی ضرورت تھی۔

عارف اور نجیب خان بڑے صوفے پر بیٹھے تھے۔ عارف نے یاسمین کو اپنے اور نجیب خان کے بیچ میں بٹھالیا۔

نجیب خان اب بھی ٹھیکسی نظروں سے عارف کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

عارف نے اس کی طرف توجہ دے بغیر یاسمین کے گلے سے لاکٹ اتارا۔ اس وقت نجیب خان اور الماس نادر پھر چونکے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا بھی تھا۔

ریشماں ٹرائی سے پلیٹیں اٹھا کر تپائی پر رکھنا بھول گئی تھی اور کھڑے کھڑے سب کچھ دیکھ کر جا رہی تھی۔

”اما صاحب!“ عارف بڑی سنجیدگی سے بولا۔

”آپ نے اس لاکٹ میں جو سم لگا رکھی نا، وہ اس وقت اس میں نہیں ہے، بالکل اسی جیسی دوسری سم ہے۔“ عارف نے لاکٹ میں پوشیدہ سم نکال کر نجیب خان کو دکھائی۔ ”تم نے جو سم لگا رکھی تھی، وہ میری الماری میں پڑی ہوئی ہے۔ رات کو لاکٹ بھی اسی الماری میں تھا۔ اسی لیے تم میری اور یاسمین کی باتیں ریکارڈ نہیں کر سکے۔“

نجیب خان اور الماس نادر کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔

”اس میں یہ دوسری سم میں نے لگا رکھی ہے۔“ عارف کہتا رہا۔ ”اس سم سے شرکی جانے والی آوازیں جس ریسپور پر سنی جاسکتی تھیں، وہ ریسپور میری کار میں ہے۔ یاسمین جب سے یہاں آئی تھی تو میں اپنی کار میں تمہارے گھر کے قریب ہی تھا۔ یہاں یاسمین سے جو باتیں تم لوگوں نے کی تھیں، وہ میں نے ریکارڈ کر لی ہیں، سنو تا ہوں تمہیں!“

عارف نے گوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال کر اپنے گھٹنے پر رکھا۔

یاسمین کی حالت اس وقت ایسی تھی جیسے دم پہ خود رہ گئی ہو۔ اس کے دماغ نے جیسے کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا وہ نہ کچھ جانتی کہ جب اس نے فون پر کہا تھا کہ وہ سارا مکمل سمجھ چکی ہے تو عارف نے اس سے کوئی استفسار اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ پہلے ہی ان سب باتوں سے واقف ہو چکا تھا۔

عارف ٹیپ ریکارڈر آن کر چکا تھا اور اس میں سے آوازیں ابھرنے لگی تھیں۔ وہ وہی باتیں تھیں جو یاسمین کے آتے ہی الماس نادر اور نجیب خان نے اس سے کی تھیں۔

ریشماں کھڑے کھڑے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

نجیب خان اور الماس نادر کے چہرے بار بار رنگ بدل رہے تھے۔

دو منٹ بعد عارف نے ٹیپ ریکارڈر بند کیا اور بولا۔

”ساری باتیں سنائے گی، میرا خیال ہے کہ ضرورت نہیں ہے نجیب خان!..... تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ اس میں ساری باتیں موجود ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ نجیب خان نے سنبھالا لیا اور بولا۔ ”تم یہ سب کچھ جان ہی گئے ہو تو اب چاہتے کیا ہو.....؟“ پھر اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر یاسمین کو گھورتے ہوئے زہر پیلے انداز میں کہا۔ ”لاکٹ کے بارے میں تو ہی نے بتایا ہوگا۔“

یاسمین میں کچھ بولنے کی سکت ہی نہیں تھی۔ جواب عارف نے دیا۔ ”ہاں یاسمین نے ہی مجھے بتایا تھا کیونکہ یہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ اس کے زیورات میں نے نہیں رکھے تھے الماری میں، خود اسی نے رکھے تھے۔ اسے اندازہ تو نہیں تھا کہ تم ہم دونوں کی باتیں کیوں سننا چاہتے ہو لیکن اسے غالباً شبہ ہو گیا ہوگا کہ تم مجھے بھی کسی قسم کے حال میں پھانسا چاہتے ہو۔ اب میں نے جو باتیں ریکارڈ کی ہیں، اس سے ظاہر ہو گیا ہے کہ تم مجھے پھانسا نہیں بلکہ صرف کچھ اندازہ لگانا چاہتے تھے کہ تم یاسمین کو آلاکار بنا کر مجھے لونہا چاہتے تھے۔ مجھے اس ریکارڈنگ سے اہم بات صرف یہی معلوم ہو سکی ہے کہ پہلے تم نے میری محبوب بیوی کو لوگوں تک پہنچایا تھا اور اب وہی کام تم معصوم ریشماں سے بھی لینا چاہتے تھے لیکن اب ایسا نہیں ہو سکے گا۔ یاسمین نے خود ہی مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے باوجود میرے دل سے اس کی محبت ختم نہیں ہو سکی۔ یہ میری ہے اور میری رہے گی۔“ پھر وہ ریشماں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم نے آج اپنی باجی سے جو باتیں کی تھیں نا ریشماں، وہ بھی اب اس ٹیپ میں موجود ہیں۔ تمہاری خواہش ضرور پوری ہوگی۔ جو کچھ تم چاہتی ہو، وہی ہوگا۔ تم اب ان سوداگروں کے ساتھ نہیں، میرے گھر میں اپنی بہن کے ساتھ رہو گی۔“

”تمہارا مطلب کیا ہے ان باتوں سے!“ نجیب خان تیز لہجے میں بولا۔

”مطلب بالکل صاف ہے نجیب خان!..... اگرچہ ٹیپ کی ہوئی آوازیں عدالت کے لیے ٹھوس ثبوت نہیں ہوں گی لیکن اگر اس ٹیپ کی بنیاد پر میں تم لوگوں کو عدالت میں گھسیٹوں تو پولیس مزید تحقیق کر کے تم لوگوں کے خلاف خاصے ثبوت اکٹھا کر لے گی۔ میں اس کے لیے بے تحاشا اخراجات کے لیے بھی تیار ہوں لیکن میں ایسا نہیں کرنا

اس سے پہلے یہاں سے چلے جائیں گے۔“
اب نجیب خان اور الماس کے چہرے سفید پڑ چکے تھے۔ اس دوران میں الماس نادر تو کچھ بول ہی نہیں سکی تھی۔
”ریشماں!“ عارف نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”چلو کی ما میرے ساتھ؟“
ریشماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ تیزی سے قریب آئی۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے عارف کے قدموں میں گر پڑے گی لیکن عارف نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے قریب صوفے کے ہتھے پر بٹھالیا۔ ”میری چھوٹی سی پیاری سی بہن! اب تمہیں رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تمہاری زندگی میں صرف خوشیاں بکھریں گی۔ بڑی دھوم دھام سے شادی کروں گا میں اپنی بہن کی۔“
اس وقت یاسمین کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

عارف نے لاکٹ پھر اسے پہنا دیا۔ ٹیپ ریکارڈر اٹھا کر اپنی جیب میں رکھا اور نجیب خان کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجہ میں بولا۔ ”اب ہمیں اجازت ہے اما صاحب!“
نجیب خان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔
عارف پھر بولا۔ ”یہ تم دونوں کی خوش قسمتی ہے کہ میں اپنی بیوی کی بدنامی نہیں چاہتا، ورنہ تم دونوں کو کیل میں سڑنا پڑتا۔“
پھر وہ یاسمین کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔
”ریشماں کو تم سنبھالو۔“ عارف نے اس سے کہا۔
ریشماں ابھی تک روئے جا رہی تھی۔

”اور ہاں!“ عارف پھر نجیب خان کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ہمارے جاتے ہی تم اپنی بیوی رانی بیگم کو فون کر ہی دو گے کہ کھل ختم ہو چکا ہے۔ اس کے بعد وہ بھی فرار ہی کا راستہ تلاش کرے گی۔ اس کے غائب ہو جانے سے میرے والد پریشان ہو سکتے ہیں لیکن میں انہیں بتا دوں گا کہ اس سے ان کی شادی ہوئی ہی نہیں تھی کیونکہ وہ تمہاری بیوی ہے۔ ساری تفصیلات میں ان کو بہر حال نہیں بتاؤں گا۔ میں اپنی محبوب بیوی کو ان کے سامنے ایک پوز نہیں کر سکتا۔“
اس کے بعد بھی نجیب خان کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔
الماس نادر پہلے ہی خاموش تھی۔

عارف، یاسمین اور ریشماں کے ساتھ بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔ نجیب خان اور الماس نادر بے بسی سے انہیں جاتے دیکھتے رہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے دماغ میں اس وقت یہ خیال ضرور ہوگا کہ ان کی جان تو بچی!

چاہتا۔ اس صورت میں میری محبوب بیوی کو بھی عدالت میں جانا پڑے گا۔ اس کی بھی بدنامی ہوگی جو میں گوارا نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں بس یہ چاہتا ہوں کہ تم دونوں جہنم میں جاؤ۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم آئندہ کس قسم کی زندگی گزارو گے۔ خواہش تو یہی تھی کہ تم دونوں سے بیاہنک انتقام لیا جائے لیکن اپنی بیوی سے میری محبت آڑے آ رہی ہے۔ میں تم لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتا۔ بس آج کے بعد تم ہم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا۔ ریشماں کو بھی میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم لوگ اسے اس جہنم میں نہیں جھونک سکتے..... اور ہاں نجیب خان! کوئی اوندھا سیدھا خیال اپنے دل میں نہ لانا۔ میرا مطلب ہے کہ تمہاری ایسی کوئی کوشش بار آور نہیں ہو سکتی کہ تم مجھ سے یہ ٹیپ جھین لو، اپنے ملازمین سے مدد لے لو۔ کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس سے۔ اس ٹیپ کی ایک کاپی اور بھی ہے جو میں نے اپنے ایک دوست کھلیب فارونی کو دے دی ہے۔“

کھلیب فارونی کے نام نے یاسمین کو چونکا یا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ اسی روز عارف نے صبح ہی صبح اپنے جس دوست کو بلا یا تھا، اس کا نام کھلیب فارونی ہی تھا۔

”وہ یہاں کی ایک لائسنسڈ ایجنسی میں کام کرتا ہے۔“ عارف نے اپنی بات جاری رکھی۔ اگرچہ یہ سم اور اس قسم کے آلات اب مکمل مارکیٹ میں دستیاب ہیں لیکن میں نے اس سلسلے میں اپنے دوست کی مدد لی تھی۔ اسے فون کر کے اپنے گھر بلا یا تھا۔ وہ کئی مہینے ساتھ لایا تھا تاکہ تمہاری لگائی ہوئی سم کی جگہ ان میں سے کوئی نہ کوئی سم فٹ ہو جائے۔ لاکٹ میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کرنا پڑے۔ میں نے اپنے دوست کو یہ ساری باتیں بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اگر بتا دیتا تو یاسمین ہمیشہ اس کے سامنے شرمسار رہتی۔ اسی لیے میں نے ریکارڈنگ بھی خود کی تھی۔ بس اس سے طریقہ کار دیکھ لیا تھا اس کام کا۔ جو دوسرا ٹیپ اس کے پاس ہے، وہ اسے سنے گا ہرگز نہیں۔ یہ وعدہ لے چکا ہوں میں اس سے.....! مجھے یقین بھی ہے کہ وہ اپنے وعدے کا پاس کرے گا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے۔ یہ خدشہ تو مجھے تھا اور ہے کہ تم شاید مجھے یہاں سے زندہ واپس نہ جانے دو۔ ایسی صورت میں کھلیب حرکت میں آجائے گا۔ اس وقت بھی اس کی کار تہارے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کرنا چاہی میرے ساتھ تو پھر کھلیب حرکت میں آجائے گا۔ اسے صرف ایک گھنٹے انتظار کرنا ہے میرے باہر نکلنے کا اور ابھی ایک گھنٹا ہونے میں کافی دیر ہے۔ ہم